بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
مارچ 2012
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

انٹرویو

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	4000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

مارچ 2012

جلد 26 شمارہ 7

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91 بی بی ایریا، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی بات

شعاع کا مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

عہد حاضر میں ذرائع ابلاغ کی حیران کن ترقی نے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے۔ موبائل فون، انٹرنیٹ اور ٹی وی چینلز ہماری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ ایک خبر منٹوں میں پوری دُنیا کا سفر طے کر لیتی ہے لیکن ایک ایک لمحے سے باخبر ہم آج بھی زندگی کی بنیادی سچائیوں سے ناآشنا ہیں۔ لفظوں کے انبار، مختلف آرا کے ہجوم میں حق اور صداقت تک پہنچنا ناممکن ہی ہو گیا ہے۔ سبقت لے جانے کی دوڑ میں مبتلا میڈیا نے ذہنوں کو جس انتشار اور افراتفری کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس سے کوئی نظریہ کوئی سوچ مستحکم نہیں ہو پا رہی ہے۔ بولنے، سوچنے اور اظہار رائے پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی لیکن آزادی اظہار کا یہ مفہوم بھی نہیں ہے کہ اخلاق اور شائستگی کو بالائے طاق رکھ دیا جائے۔ ملک کی سالمیت اور قومی اداروں کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا جائے۔

صحافت کا مقصد عوام کے پیچھے چلنا نہیں، ان کی رہنمائی کرنا ہے۔ کوئی بھی چیز خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، اس کا غلط استعمال نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ میڈیا کو کچھ حدود کا تعین کرنا ہو گا۔ کچھ معیار مقرر کرنا ہوں گے۔ تب ہی ایک مستحکم معاشرہ وجود پا سکے گا۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے،
- نفیسہ سعید کا مکمل ناول۔ شہر پتھر کے باسی،
- مہوش مغل کا مکمل ناول۔ جان دے، جان لے،
- سونیا نوید کا ناولٹ۔ تجدید وفا،
- نسرین خالد، سائرہ رضا، زینب ظفر ذرّین، نگہت مروت اور مریم ساجد کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے ناول،
- عاصم بٹیر اور نور عین کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا۔ آمنہ ذرّین کا تبصرہ،
- شعاع کے ساتھ ساتھ۔ قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کے سلسلوں کی خوبصورتی قارئین کی مرہونِ منت ہے۔ آپ ہمیں معیاری اشعار، عمدہ لطیفے اور سبق آموز واقعات اور تحریریں منتخب کر کے بھجوائیں۔ ہم ضرور شائع کریں گے۔ شعاع کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے ضرور لکھیے گا۔

ہر اک شے پہ اُس کا کرم دیکھتے ہیں
بصیرت کی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں

پکارا اُسے مرکزِ دل سے جس دم
معاً اپنی پلکوں کو نم دیکھتے ہیں

انہیں عالم الغیب پر کیا بھروسا
جو ہر بات میں جامِ جم دیکھتے ہیں

نہیں ہم ہیں مایوس رحمت سے اُس کی
فلک کی طرف دم بدم دیکھتے ہیں

ہوا سرفگندہ جو رحماںؐ کے در پر
جہاں میں اُسے محترم دیکھتے ہیں

چمن میں نوا سنجیاں پھول نے کیں
شیاطیں کو مصروفِ غم دیکھتے ہیں

تنویر پھول

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سُوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مِس خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا

الطاف حسین حالی

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

زہد سے متعلق احکام و مسائل

دنیا سے بے رغبتی

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دنیا سے بے رغبتی حلال کو حرام کرنے یا مال ضائع کرنے سے نہیں ہوتی۔ دنیا سے بے رغبتی کا مطلب یہ ہے کہ تجھے اپنے پاس موجود چیز پر اللہ کے پاس موجود چیزوں سے زیادہ اعتماد نہ ہو اور تجھ پر جو مصیبت آئے تو اس کے ثواب کی زیادہ رغبت رکھتا ہو' کہ وہ (دنیا میں آنے کے بجائے آخرت میں پیش آنے کے لیے) تیرے لیے باقی رہے۔"

ابو ادریس خولانی رحمتہ اللہ نے فرمایا۔ یہ حدیث دوسری احادیث کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے عام سونے کے مقابلے میں خالص سونا۔

حکمت

حضرت ابو خلاد (عبدالرحمٰن بن زہیر) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ اسے دنیا سے بے رغبتی اور کم گوئی دی گئی ہے تو اس سے قریب ہوا کرو کیونکہ وہ حکمت کی باتیں کرتا ہے۔"

لوگوں کی پسندیدگی

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

"اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتائیے کہ جب میں وہ کروں تو اللہ مجھ سے محبت کرے اور لوگ مجھے پسند کریں۔" اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ' اللہ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے' اس سے بے نیاز ہو جاؤ' لوگ تم سے محبت کریں گے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ زہد کا مطلب یہ نہیں کہ انسان دنیا والوں سے الگ تھلگ ہو جائے۔ یہ رہبانیت ہے جو اسلامی طریقہ نہیں۔ زہد کا مطلب یہ ہے کہ حلال آمدنی پر کفایت کی جائے' خواہ کم ہو اور حرام کمائی کی راہیں تلاش نہ کی جائیں۔

2۔ یہ امید رکھنا کہ دوسرے مجھے کچھ دیں' حرص کا اظہار ہے۔ دوسروں کے مال سے بے نیازی' زہد و قناعت میں شامل ہے۔

3۔ انسانوں سے طمع رکھنے سے انسان ذلیل ہوتا ہے اور قناعت سے ان کی نظروں میں محبوب و معزز بن جاتا ہے۔

4۔ اللہ تعالیٰ سے امید رکھنا اور حلال روزی تلاش کرنا زہد کے منافی نہیں۔

5۔ اللہ تعالیٰ سے آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا کی ضرورت بھی مانگتے رہنا چاہیے کیونکہ اسباب اس کے اختیار میں ہیں لیکن آخرت کی طلب زیادہ ہونی چاہیے۔

مال جمع کرنا

حضرت سمرہ بن سہم رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا: میں حضرت ابوہاشم خالد بن عتبہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا' جب وہ (نیزے سے) زخمی ہو گئے تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کو تشریف لائے تو ابوہاشم رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"ماموں جان! آپ کیوں روتے ہیں؟ کیا درد زیادہ پریشان کر رہا ہے یا دنیا (کے چھوٹنے) پر غمگین ہیں' اس (زندگی) کا عمدہ حصہ تو گزر گیا؟ (اب تو نکما حصہ ہی باقی ہے' جس میں دکھ تکلیفیں زیادہ ہوتی ہیں۔)"

حضرت ابوہاشم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ان میں سے کسی بات پر نہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا' کاش میں اس کے مطابق چلا ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

"شاید تم کو بہت اموال ملیں جو لوگوں میں تقسیم کیے جا رہے ہوں۔ (ان کا لالچ نہ کرنا) تمہارے لیے تو اس میں سے ایک خادم اور ایک سواری کا جانور اللہ کی راہ میں (جہاد کرنے کے لیے) کافی ہے۔" مجھے مال ملا اور میں نے جمع کر لیا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کا مسلمان پر حق ہے۔

2۔ عیادت کے موقع پر مریض کی پریشانی معلوم کر کے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

3۔ ضرورت سے زیادہ مال ملے تو جمع کرنے کے بجائے دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے خرچ کرنا چاہیے۔

4۔ اگر حلال طریقے سے مال جمع ہو جائے اور نیکی کی راہوں میں خرچ کرنے کے باوجود دولت باقی رہے تو یہ گناہ نہیں۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے اپنے اعلیٰ مقام کے منافی سمجھ کر افسوس کرتے تھے۔

خوف خدا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کے لیے گئے تو دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا۔

"بھائی جان! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں رہے؟ کیا آپ نے فلاں کام نہیں کیا؟ فلاں کارنامہ انجام نہیں دیا؟"

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: "میں دو چیزوں میں سے کسی ایک پر بھی نہیں رو رہا۔ میں نہ دنیا کے چھوٹنے کی وجہ سے روتا ہوں' نہ آخرت کو ناپسند کرتے ہوئے۔ لیکن (میں اس لیے اشکبار ہوں کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس سے تجاوز کیا ہے۔"

انہوں نے کہا: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے کیا وعدہ لیا تھا؟"

فرمایا: "آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا: "آدمی کو اتنا کچھ کافی ہوتا ہے جتنا مسافر کا زاد راہ۔" اور مجھے یقین ہے کہ میں (اس) حد سے تجاوز کر گیا ہوں اور اے سعد! آپ جب (کسی جھگڑے کا) فیصلہ کریں تو اپنے فیصلے میں اللہ کا خوف پیش نظر رکھیں۔ اور جب (مستحقین میں کوئی چیز) تقسیم کریں تو تقسیم کے وقت (تقویٰ کو ملحوظ رکھیں) اور جب آپ (کسی پروگرام کے بارے میں) سوچیں (یا ارادہ کریں) تو اپنی سوچ میں (اور ارادے میں اللہ سے ڈریں)۔"

حضرت ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: "مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے ترکے میں صرف تقریباً" بیس دینار چھوڑے جو ان کے ذاتی اخراجات کے لیے تھے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بشارتیں دی تھیں۔ اس کے باوجود وہ معمولی سی کوتاہی کو بھی بہت بڑی غلطی تصور کرتے تھے۔

2۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے پاس دنیاوی ضروریات کے پیش نظر تھوڑے بہت سامان کا جمع ہو جانا' یہ ان کی کوتاہی نہیں تھی لیکن کمال تقویٰ کی وجہ سے وہ خوف زدہ رہتے تھے۔

3۔ کسی جھگڑے کا فیصلہ کرتے وقت اور کسی مشترک چیز کی تقسیم کے وقت تقویٰ کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ لوگ اعتماد کرکے یہ ذمہ داری دیتے ہیں۔ ان کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنا بڑی غلطی ہے۔ مومن کے مستقبل کے پروگرام تقویٰ پر مبنی ہوتے ہیں۔

دُنیا کی فکر کرنا

حضرت ابان بن عثمان رحمتہ اللہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ دوپہر کے وقت مروان (رحمتہ اللہ) کے پاس سے باہر نکلے۔ میں نے کہا۔

"انہوں نے اس وقت انہیں کوئی (اہم) مسئلہ دریافت کرنے ہی کے لیے بلایا ہوگا۔" میں نے زید رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے کہا۔

"انہوں نے ہم سے کچھ احادیث کے بارے میں دریافت کیا تھا (کہ وہ کس طرح ہیں) جو ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔

"جس شخص کا مقصود حصول دنیا ہو' اللہ تعالیٰ اس کے کام بکھیر دیتا ہے اور اس کا فقر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور اسے دنیا اتنی ہی ملتی ہے' جتنی اس کے لیے مقدر ہے اور جس کی نیت آخرت کا حصول ہو' اللہ تعالیٰ اس کے کام مرتب کر دیتا ہے اور اس کے دل میں استغنا پیدا فرما دیتا ہے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے پاس آتی ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ جو شخص دنیاوی مال و دولت اور جاہ و حشمت کا طالب اور حریص ہوتا ہے' وہ دنیا کے لیے بہت محنت کرتا ہے۔ اسے جتنی بھی دولت ملے' مزید کی حرص کی وجہ سے وہ مطمئن نہیں ہوتا' اس لیے مفلس آدمی کی طرح پریشان رہتا ہے۔

2۔ حریص آدمی دنیا کمانے کے لیے کئی پروگرام شروع کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر ایک پر پوری توجہ دے اور اسے جلد سے جلد اس کی کوشش کے نتائج حاصل ہوں لیکن فطری طور پر انسان کئی امور کی طرف بیک وقت برابر توجہ نہیں دے سکتا' لہٰذا اسے اس کی حرص کے مطابق نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ اس طرح وہ دولت حاصل ہونے کے باوجود پریشان رہتا ہے۔

3۔ آخرت کی طرف توجہ کرنے سے دنیا کی اہمیت کم ہو جاتی ہے' لہٰذا قناعت کی دولت حاصل ہو جاتی ہے اور بندہ مطمئن اور خوش کن زندگی گزارتا ہے۔

4۔ آخرت کو مقصود بنا لینے سے دنیا کے معاملات میں بھی نظم و ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے کاروبار میں بہتر نتائج حاصل ہوتے ہیں اور رزق میں برکت ہوتی ہے۔

5۔ اللہ کی رضا کو مد نظر رکھنے والے کے دنیاوی معاملات بھی سلجھ جاتے ہیں اور حرص ختم ہو کر استغنا بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

6۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو رزق مقدر کر رکھا ہے' وہ حلال ذرائع اختیار کرنے سے بھی مل جاتا ہے' لہٰذا ناجائز طریقے اختیار کرنے سے سوائے پریشانیوں کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

فکر آخرت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

"جو شخص سارے تفکرات کو جمع کرکے ایک ہی فکر' یعنی آخرت کی فکر میں ڈھال لے' اللہ اس کو دنیاوی تفکرات سے بے نیاز کر دیتا ہے اور جسے دنیا کے معاملات کے تفکرات مختلف گھاٹیوں میں لیے پھریں' اللہ کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ (ان تفکرات کی) کون سی وادی میں ہلاک ہوتا ہے۔"

فائدہ : دنیا کے تفکرات سے بے نیاز کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جائز ضروریات آسانی سے پوری ہو جاتی ہیں اور جو شخص حرص و ہوس کی وجہ سے طرح طرح کے تفکرات میں مبتلا ہوتا ہے' اس کے تفکرات ختم نہیں ہوتے' وہ خود ہی ان میں الجھا ہوا اللہ کے حضور پیش ہو جاتا ہے۔

اللہ نے فرمایا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً" مروی ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے:

آدم کے بیٹے! میری عبادت کے لیے فارغ ہو جا' میں تیرا سینہ استغنا سے بھر دوں گا اور تیرا فقر دور کر دوں گا اور اگر تُو نے ایسا نہ کیا تو میں تیرے سینے کو اشغال سے بھر دوں گا اور تیرا فقر دور نہیں کروں گا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ انسان کی تخلیق کا اصل مقصد عبادت ہے' روزی کمانے کا مقصد صرف اتنی جسمانی قوت کا حصول ہے جس سے اللہ کے احکام کی تعمیل کماحقہ ہو سکے۔

2۔ عبادت کے لیے فارغ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روزمرہ کے پروگرام میں بنیادی اہمیت عبادت کو دی جائے اور دنیاوی ضروریات کے دوران میں بھی اللہ کے احکام کی تعمیل کی نیت ہو تاکہ یہ اعمال بھی عبادت بن جائیں۔

3۔ دینی اور دنیوی اعمال میں فرائض کو نوافل پر فوقیت حاصل ہے' لہٰذا اگر کسی نفلی عمل سے فرض کی ادائیگی متاثر ہوتی ہو تو فرض کو اہمیت دی جائے' نفلی کام کو کسی اور مناسب موقع کے لیے مؤخر کر دیا جائے۔

دنیا کی مثال

حضرت مستورد بن شداد بن عمرو قرشی فہری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرما رہے تھے۔

"آخرت کے مقابلے میں دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص سمندر میں انگلی ڈالے' پھر دیکھے کہ اس نے کتنا پانی لے لیا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ دنیا کی زندگی انتہائی قلیل ہے' جب کہ آخرت کی زندگی ابدی ہے' جس کی انتہا نہیں۔

2۔ جنت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں کے مقابلے میں اس قدر قیمتی ہیں کہ جنت میں چند انچ خالی زمین کی قیمت دنیا کی تمام دولت اور خزانوں سے زیادہ ہے' پھر اس کے محلات اور باغات اور ان میں موجود نعمتیں' پاک باز بیویاں' خدام وغیرہ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے' خصوصاً" دیدار الٰہی کی نعمت تو ایسی ہے کہ اس کے مقابلے میں جنت کی بڑی سے بڑی نعمت ہیچ ہے۔

3۔ مثال دے کر بیان کرنے سے مسئلہ زیادہ واضح اور قابل فہم ہو جاتا ہے۔

دنیا سے تعلق

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر (آرام کرنے کے لیے) لیٹے تو اس کے نشان آپ کے جسم مبارک پر ظاہر ہو گئے۔ میں نے عرض کیا۔

"اللہ کے رسول! اگر آپ ہمیں فرماتے تو ہم آپ کے لیے کوئی چیز (بستر وغیرہ) بچھا دیتے جس کے ساتھ اس (چٹائی کی سختی) سے بچاؤ ہو جاتا۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرا دنیا سے کیا تعلق! میری اور دنیا کی مثال تو ایسے ہے' جیسے کوئی سوار (مسافر) سائے کے لیے درخت کے نیچے ٹھہرا' پھر اسے چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔"

فوائد و مسائل : 1۔ بود و باش میں سادگی مستحسن

ہے۔

2۔ عمدہ چیز سے اجتناب اگر اس لحاظ سے ہو کہ جو رقم اپنی ذات پر خرچ ہونے والی ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں خرچ ہو تو بہتر ہے' اگر بخل کی وجہ سے ہو تو بری عادت ہے۔ اگر حلال چیز کو اپنے آپ پر حرام کر لیا جائے تو شرعاً" ممنوع ہے۔

3۔ زہد کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی نعمت کے لیے حرص نہ کی جائے' اگر بغیر حرص کے' جائز طریقے سے مل جائے تو استعمال کر لی جائے۔ اہتمام اور تکلف زہد کے منافی ہے۔

4۔ جس چیز کی دعوت دی جائے اس کا عملی نمونہ پیش کرنے سے تبلیغ کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

5۔ حکومت کے عہدے داروں کو پر تکلف زندگی سے خاص طور پر بچنا چاہیے تاکہ عوام کی ضروریات اور فلاح و بہبود کے لیے زیادہ رقم خرچ ہو سکے۔

دنیا کی حقیقت

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ذوالحلیفہ کے مقام پر تھے۔ اچانک آپ کو (راستے میں) ایک مری ہوئی بکری نظر آئی (وہ مر کر پھول گئی تھی اور) اس کی ٹانگ اوپر اٹھی ہوئی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمہارا کیا خیال ہے' کیا یہ بکری مالک کی نظر میں حقیر ہے؟ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' جتنی یہ بکری مالک کی نظر میں حقیر ہے' دنیا اللہ کی نظر میں اس سے زیادہ حقیر ہے۔ اگر دنیا اللہ کے ہاں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی وزن رکھتی تو وہ کسی کافر کو کبھی ایک قطرہ بھی پینے کو نہ دیتا۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ کے ہاں اصل اہمیت انسان کے اعمال کی ہے۔ دنیا کے اسباب اگر نیکی کے کام میں استعمال کیے جائیں تو وہ انسان کے لیے مفید ہیں ورنہ مال و دولت یا جاہ و حشمت کی اللہ کے ہاں کوئی اہمیت نہیں۔

2۔ دنیا کے اسباب کو جائز ذرائع سے حاصل کرنا چاہیے اور انہیں ایسے کام میں خرچ کرنا چاہیے جس سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔

3۔ اللہ کی رضا اور انعامات کا اصل مقام جنت ہے۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی بڑی سے بڑی دولت کی کوئی قیمت نہیں۔

نادار لوگ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

"نادار مہاجرین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ثروت حضرات کو ان پر فضیلت عطا فرمائی ہے" (جس کی وجہ سے وہ لوگ مالی نیکیاں زیادہ کر کے بلند درجات حاصل کر سکتے ہیں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے ناداروں کی جماعت! کیا میں تمہیں خوش خبری نہ دوں؟ نادار مومن دولت مند مومنوں سے آدھا دن' یعنی پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔"

پھر (یہ حدیث سنا کر حدیث کے ایک راوی) حضرت موسیٰ (بن عبیدہ رحمتہ اللہ) نے یہ آیت تلاوت کی: "آپ کے رب کے نزدیک ایک دن تمہاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال کا ہے۔"

غریبوں کے ساتھ بیٹھنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا:

"حضرت جعفر بن ابو طالب رضی اللہ عنہ غریبوں سے محبت کرتے اور ان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرتے اور ان کی باتیں سنتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان (جعفر رضی اللہ عنہ) کو ابوالمساکین کی کنیت سے یاد فرمایا کرتے تھے۔"

بندھن

عاصم بشیر اور نورعین

شاہین رشید

شادی کا بندھن ایک خوب صورت بندھن ہے اور یہ اس وقت اور بھی زیادہ خوب صورت ہو جاتا ہے جب اللہ تعالیٰ اولاد کی نعمت سے نواز دیتا ہے ایف ایم 101 کے آر جے عاصم بشیر 25 نومبر 2010ء کو نورعین کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھے اور 19 ستمبر 2011ء کو اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک پیارے سے بیٹے سے نوازا۔ بیٹے کا نام اسد عاصم ہے۔

عاصم بشیر

"کیسے ہیں عاصم بشیر صاحب! ریڈیو کیسا چل رہا ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے اور ریڈیو ماشاء اللہ بہت اچھا چل رہا ہے۔"

"شادی کے بعد زندگی اچھی گزر رہی ہے یا کوئی پچھتاوا ہو رہا ہے؟"

"زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے اور پچھتاوے کا تو سوال ہی نہیں' پچھتاوا تو اس وقت ہوتا ہے جب لائف اچھی نہ گزر رہی ہو۔ میں تو یہ کہوں گا کہ لائف میں ڈسپلن آجاتا ہے۔ ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اور اپنی ایک فیملی بن جاتی ہے۔ اس لیے شادی کرنا میرے خیال سے بہت ضروری ہے۔"

"آپ نے کہا کہ فیملی بن جاتی ہے۔ ماشاء اللہ آپ کا چھ ماہ کا بیٹا ہے "اسد" اس کے آجانے سے کیا چینج آیا زندگی میں؟"

"بہت اچھا چینج آیا ہے زندگی میں یوں لگتا ہے کہ زندگی تو اب مکمل ہوئی ہے۔ پہلے تو زندگی ادھوری

تھی۔ نامکمل تھی۔ ایک ذمہ دار انسان لگنے لگا ہوں۔ مستقبل کی فکر لاحق ہوگئی ہے۔"

"کیوں؟ مستقبل کی فکر کیوں لاحق ہوگئی ہے؟"

"اس لیے کہ پہلے میں اکیلا تھا۔ کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ کسی کو میرا انتظار نہیں ہوتا تھا۔ دوست یار اور میں۔ ایک لاابالی پن تھا۔ مگر اب ایک نہیں بلکہ دو کی ذمہ داری میرے کاندھوں پر ہے۔ اور اولاد کے لیے اچھے سے اچھا سوچنا ان کے حال کے بارے میں ان کے مستقبل کے بارے میں باپ کا ہی فرض ہے۔"

"گویا گھبرا رہے ہیں۔"

"ارے نہیں، یہ تو بہت ہی خوب صورت احساس ہے۔ اولاد جیسی نعمت کے لیے تو اچھے سے اچھا سوچنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت ہی خوب صورت ذمہ داری ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ڈالتا ہے۔"

"آپ نے کہا کہ پہلے لاابالی پن تھا، کسی کو میرا انتظار نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کوئی ذمہ داری تھی۔ تو کہاں ہوتی ہے آپ کی فیملی؟"

"ایسا میں نے اس لیے کہا کہ میرے والدین حیات نہیں ہیں اور باقی بہن بھائی اپنی اپنی زندگی میں بہت خوش ہیں، اس لیے کوئی ذمہ داری نہیں تھی، جو کمایا کھائی کر فارغ کر دیا مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب لاابالی پن بھی ختم ہوگیا ہے۔"

"گڈ۔۔۔ بیگم نورعین کیسی ہیں۔۔۔ خوش مزاج یا غصے کی تیز؟"

"بہت اچھی ہیں ہماری بیگم۔۔۔ بہت خوش مزاج۔ ڈیڑھ سال ہوگیا ہے شادی کو اور ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوا ہے۔ غصہ بھی کوئی ایسا تیز نہیں ہے کہ شکایت کرنی پڑے۔"

"ملاقات کہاں ہوئی تھی؟ آپ کی پسند کی ہے شادی؟"

"نہیں، پسند کی شادی نہیں ہے بلکہ میری بہنوں کی پسند ہے۔ پہلی ملاقات ان کے گھر پر ہی ہوئی تھی۔ بہنوں نے مجھے بتایا کہ ایک لڑکی پسند کی ہے۔ ہمیں بہت اچھی لگی ہے۔ اب آپ بھی چل کر دیکھ لیں چنانچہ میں بہنوں کے ساتھ ان کے گھر گیا تھا۔ بہنوں کی پسند مجھے بھی اچھی لگی، اس لیے میں شادی کے لیے رضامند ہوگیا۔"

"اپنی پسند سے کیوں نہیں کی؟"

"بس کبھی اس طرف خیال ہی نہیں گیا کہ کسی کو پسند کرلوں اور ویسے بھی محبت کی نہیں جاتی، محبت ہو جاتی ہے اور مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی نہ ہی میں نے کوئی آئیڈیل بنایا ہوا تھا۔"

"پھر نورعین آپ کے معیار پر پوری اتریں؟"

"بالکل پوری اتریں۔ ماشاء اللہ ہر لحاظ سے اچھی ہیں۔ ویسے بھی کافی کم گو ہیں، اس لیے لڑائی جھگڑے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔" (قہقہہ)

"شادی کی بہت سی رسمیں ہوتی ہیں۔ آپ کو کون سی رسم پسند آئی اور آپ نے انجوائے کیا!"

"واقعی بہت سی رسمیں ہوتی ہیں۔ لیکن جب شادی سے ہفتہ پہلے اور گھر میں جو رونق اور ہلا گلا ہوتا ہے اسے میں نے بہت انجوائے کیا۔ لڑکے والوں کی طرف سے اور لڑکیوں والوں کی طرف سے گانے کے جو مقابلے ہوتے تھے۔ وہ مجھے بہت اچھے لگے۔"

"اب تو خیر سے آپ صاحب اولاد ہوگئے ہیں تو کیا بیگم کا ہاتھ بٹاتے ہیں گھر کے کاموں میں؟"

"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ والدین حیات نہیں ہیں تو ان کے بعد زندگی کچھ عرصہ اکیلے گزری۔ چنانچہ اپنے سارے کام میں خود ہی کیا کرتا تھا۔ اس لیے مجھے پرانی عادت ہے اپنے کام خود کرنے کی اور بیٹا ہونے سے پہلے میں تھوڑا کم ساتھ دیتا تھا مگر اب میں کافی ساتھ دیتا ہوں۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی۔۔۔؟ پرستاروں کو بلایا تھا یا صرف خاندان کے ہی لوگ تھے؟"

"جی بالکل۔۔۔ بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔۔۔

اور سامعین بہت خوش ہوئے [illegible] شادی [illegible] مگر اس لیے نہیں کہ ہماری [illegible] شمار پرستار ہیں اور [illegible] فنکشن تھا جہاں صرف اپنے خاندان کے لوگ اور دوست احباب شامل تھے۔"

"آپ نے بہنوں کی پسند سے شادی کی۔ منگنی کے بعد ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ملاقات کی؟"

"نہیں، ملاقات نہیں کی، کیونکہ میں ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتا اور نہ ہی ہماری تربیت اس طرح کی ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی ملاقاتیں کریں اور ایک دوسرے کے مزاجوں کو سمجھیں، میری ماشاء اللہ چھ بہنیں ہیں اور جب میں اپنی بہنوں کے لیے یہ بات اچھی نہیں سمجھتا تو اپنے لیے کیوں سمجھوں۔ ہاں، فون پر اکثر بات ہو جاتی تھی۔"

"شادی سے پہلے جو قدرتی شرم و حیا ہوتی ہے لڑکے اور لڑکی میں وہ ملاقاتوں سے کم ہو جاتی ہے کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بالکل۔۔۔ اس لیے تو ارینج میرج کو ترجیح دی جاتی ہے اور بڑے جو سوچتے ہیں، اپنے بچوں کے لیے۔ اپنے چھوٹوں کے لیے وہی بہتر ہوتا ہے۔"

"شادی ناکام کیوں ہوتی ہے؟"

"بہت سمپل بات ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کے حقوق کا خیال نہیں رکھیں گے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مائنڈ کریں گے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایشو بنالیں گے تو پھر بات بگڑے گی ہی اور بات علیحدگی تک پہنچے گی۔"

نورعین

"کچھ اپنے بارے میں اور پھر عاصم بشیر صاحب کے بارے میں بتائیں؟"

"جی میں تو 7 جون کو کراچی میں پیدا ہوئی۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میرا نمبر آخری ہے میں نے گریجویشن کیا ہے۔ جبکہ عاصم 23 جون کو کراچی میں پیدا ہوئے اور یہ دو بھائی اور چھ بہنیں ہیں۔ یہ اپنے بہن

بھائیوں میں پانچویں نمبر پر ہیں۔"

"ماشاء اللہ آپ ایک بڑی فیملی میں آئی ہیں۔ سب کچھ کیسا لگ رہا ہے آپ کو اور اب تو خیر ڈیڑھ سال ہو گیا ہے۔ شروع میں ایڈجسٹ ہونے میں دیر لگی؟"

"جی ماشاء اللہ میں ایک بڑی فیملی میں آئی ہوں اور مجھے جوائنٹ فیملی میں بھی رہنا پڑتا تو میرے لیے کوئی مشکل نہ ہوتی۔ لیکن بدقسمتی سے میرے ساس سسر حیات نہیں ہیں اور باقی نندیں، جیٹھ بھی اپنی اپنی لائف میں سیٹ ہیں تو ہم بھی علیحدہ ہی رہتے ہیں۔ اس لیے ایڈجسٹ ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔"

"والدین کے گھر میں لڑکی چونکہ پڑھائی میں مصروف رہتی ہے تو گھریلو ذمہ داریوں سے واقف نہیں ہوتی۔ سسرال میں بڑوں کا ساتھ ملتا ہے تو سب کچھ آجاتا ہے۔ جبکہ آپ کو ایسا سسرالی ماحول نہیں ملا تو کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

"نہیں جی۔ اللہ کا شکر ہے کہ والدین نے سب کچھ سکھایا ہوا تھا اور چونکہ گھر میں چھوٹی تھی تو بہنوں سے بھی بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ اس لیے الحمد اللہ کوئی

مسئلہ نہیں ہوا۔"

"سسرال میں کون سا رشتہ بہت اچھا لگا؟"

"سب رشتے پیار محبت کے ہیں۔ پیار دیں گے عزت دیں گے تو ویسی ہی عزت اور پیار حاصل کریں گے۔ یہ تو گیو اینڈ ٹیک کے رشتے ہیں۔"

"ان کے ریڈیو پروگرام کیسے لگتے تھے؟"

(ہنستے ہوئے) "سچی بات بتاؤں، پڑھائی میں اور گھر کی تھوڑی بہت ذمہ داری میں اتنی مصروف رہتی تھی کہ کبھی ریڈیو سننے کا خیال بھی نہیں آیا اور نہ ہی مجھے کوئی ایسی دلچسپی تھی اور پھر اگر ریڈیو سن بھی لو تو نام وغیرہ کہاں یاد رہتے ہیں۔۔۔ اس لیے مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔"

"اچھا۔۔۔ حیرت ہے اور پھر جب معلوم ہوا تو کیا ری ایکشن تھا آپ کا؟"

"حیران ہوئی، اچھا لگا۔ پوچھا کہ کب ہوتا ہے ان کا پروگرام پھر پروگرام بھی سنا تو اچھا لگا کہ اس بندے سے شادی ہو رہی ہے جو ریڈیو کا مشہور آر جے ہے اور جسے سامعین بہت پسند کرتے ہیں۔"

"ریڈیو کے بندے سے شادی کر کے لڑکیاں اس لیے بھی پریشان نہیں ہوتیں کہ جب تک یہ بولیں گے نہیں لوگ پہچان نہیں سکیں گے۔ ٹی وی سے تعلق ہوتا تو یقیناً" آپ کو پریشانی ہوتی جب لوگ ان کو پہچان لیتے؟"

"ہاں شاید لوگ آواز سے ان کو پہچان لیتے ہیں اور اس وقت مجھے ان کی پہچان اچھی لگتی ہے۔ مجھے ان پر اور پھر اپنے آپ پہ فخر محسوس ہوتا ہے۔"

"جب پہلی مرتبہ یہ آپ کو دیکھنے آپ کے گھر آئے تو دل چاہا کہ بس ان کے بعد کوئی نہ آئے، یہ بہت اچھے ہیں؟"

"اچھے لگے تھے، مگر ایسا کچھ نہیں سوچا تھا۔ کیونکہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں اور فیصلہ ہمارے بڑوں نے ہی کرنا ہوتا ہے اور وہ جو فیصلہ کرتے ہیں، ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔"

"عاصم کہہ رہے ہیں کہ وہ گھر کے کاموں میں آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔ آپ کو اچھا لگتا ہے؟"

"بیٹے کی پیدائش کے بعد کبھی کبھار ساتھ دے دیتے ہیں۔ ورنہ میری کوشش ہوتی ہے کہ سارے کام میں خود کروں۔ ان سے کچھ نہ کرواؤں۔"

"کھانے پینے کے معاملے میں پریشان تو نہیں کرتے؟"

"پریشان کرنے کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ میں کھانا وقت پر ہی تیار کر دیتی ہوں اور ویسے بھی ان کا مزاج ایسا نہیں ہے کہ اگر وقت پر کھانا نہ ملے تو یہ پریشان کریں گے۔ بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔"

"کھانا آپ دونوں مل کر کھاتے ہیں؟ کیا آپ ان کا انتظار کرتی ہیں؟ ویسے بھی ان کی ڈیوٹی تو رات کی ہوتی ہے۔"

"ہم کھانا ساتھ مل کر کھاتے ہیں۔ یہ کہیں گئے ہوئے ہوتے ہیں تو میں ان کا انتظار کرتی ہوں اور جہاں تک نائیٹ ڈیوٹی کی بات ہے تو ان کا پروگرام رات کو دس بجے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کھانا کھا کر ہی ریڈیو جاتے ہیں۔"

"ایک زمانہ تھا جب لڑکی دلہن بننے کے لیے گھر پر ہی تیار ہوتی تھی۔ بڑے بزرگ کہتے تھے کہ لڑکی گھر سے باہر نہ جائے۔ اب بیوٹی پارلر جاتی ہیں لڑکیاں۔ کیوں؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ لڑکی جب دلہن بنتی ہے تو قدرت اس کو روپ دیتی ہے۔ مگر کیا کریں کہ اب بیوٹی پارلر سے بجنا رواج بن گیا ہے اور ہم بھی اس رواج کا حصہ ہیں اس لیے گھر پر کیسے تیار ہو سکتی تھی۔"

"ماں باپ سے جدا ہونا، نئے گھر کی شروعات کرنا۔۔۔ ڈیپریشن تھا یا نئی زندگی کا جوش و جذبہ تھا؟"

"ڈیپریشن تو نہیں تھا۔ خوشی تھی اور نئی زندگی کو شروع کرنے کی دل ہی دل میں پلاننگ تھی گھر، ماں باپ، بہن بھائیوں کو چھوڑنے کی اداسی بھی بہت تھی۔"

"رونا آیا تھا۔۔۔؟ کب زیادہ رونا آیا تھا؟"

"ہمارا نکاح پہلے ہو گیا تھا اور نکاح کے وقت میں بہت روئی تھی۔ رخصتی کے وقت بھی رونا آیا تھا۔ یہ تو قدرتی احساسات ہوتے ہیں جن کو دبایا نہیں جا سکتا اور اس وقت یہ پرواہ نہیں ہوتی کہ ہمارا میک اپ خراب ہو جائے گا۔ لڑکیاں میری اس بات سے یقیناً" اتفاق کریں گی کہ اس موقع پر میک اپ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔"

"ہنی مون منانے کہاں گئے تھے؟"

"گھومنے پھرنے کو میں ہنی مون نہیں کہتی۔ شادی کے بعد ہم ناردرن ایریا میں گئے تھے اور پھر چند دن کے بعد واپس آ گئے تھے۔ تو بس آپ اسے گھومنا پھرنا کہہ سکتی ہیں۔"

"آپ بولتی ہی کم ہیں یا انٹرویو میں کم بول رہی ہیں؟"

"میں بولتی ہی کم ہوں۔ مجھے زیادہ بولنے کی عادت ہی نہیں ہے، میں ہمیشہ سے ہی ایسی ہوں۔"

"بڑی بات ہے۔ چلیں اچھا ہے۔ پھر لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہی نہیں ہو گا؟"

ہنستے ہوئے "یہ کون سی بڑی بات ہے، دل چاہے گا تو جھگڑا ابھی کر لوں گی۔ ویسے اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک جھگڑا ہوا نہیں ہے۔"

"کہتے ہیں کہ جہاں لڑائی جھگڑا ہوتا ہے، وہاں محبت بھی زیادہ ہوتی ہے، کیا ایسا ہے؟"

"ضروری نہیں ہے۔ اب ہم دونوں میں محبت ہے اور بغیر کسی لڑائی کے، لڑائی سے دلوں میں میل تو آ ہی جاتا ہے۔"

"جوائنٹ فیملی ہو تو بہت کام ہوتے ہیں۔ آپ تو گھر کے کام کاج سے جلدی فارغ ہو جاتی ہوں گی تو پھر فارغ اوقات میں کیا کرتی ہیں؟"

"شروع دنوں میں زیادہ فارغ رہتی تھی مگر جب سے بیٹے صاحب تشریف لائے ہیں۔ فرصت کے لمحات میسر ہی نہیں ہیں۔ ماشاء اللہ بیٹے نے مصروف کر دیا ہے۔"

"اور ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق ہے؟"

"نہیں مجھے شوق نہیں ہے، ہماری امی کو بہت شوق ہے، وہی پڑھتی ہیں اور ہمیں انہوں نے کبھی ڈائجسٹ پڑھنے نہیں دیا۔ ان کی اپنی کوئی سوچ ہو گی۔"

"آپ گریجویٹ ہیں۔ جاب کرنے کی خواہش ہے یا گھرداری ہی بہت ہے؟"

"اب تو گھرداری ہی بہت ہے۔ ویسے اگر کبھی ان کی طرف سے اجازت ملی تو ضرور جاب کروں گی۔"

"پیسہ آتا ہوا اچھا نہیں لگتا کیا؟"

"پیسہ اچھا لگتا ہے۔ لیکن اگر گھر میں خوش حالی ہے تو پھر عورت کے لیے گھر سے باہر نکلنا ضروری نہیں ہے، ہاں اگر پریشانی ہے تو پھر ضرور کام کرنا چاہیے۔ گھر کی خوش حالی کے لیے بچوں کی اچھی تربیت کے لیے۔"

"آر جے تو آپ بن نہیں سکتیں کہ آپ بولتی بہت کم ہیں۔"

(قہقہہ) "تو کوئی بات نہیں۔ کچھ اور کر لوں گی۔"

"اور آخر میں اپنے میاں صاحب سے کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"نہیں کچھ نہیں، سوائے اس کے کہ عاصم بہت اچھے ہیں۔"

دستک دستک دستک

شاہین رشید

محسن عباس حیدر

"کیسے ہو محسن ۔۔۔ بی این این (BNN) بہت کامیاب پروگرام ہے آپ کی ٹیم کا۔"

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک۔ اور پروگرام پسند کرنے کا شکریہ۔ یہ واقعی ٹیم ورک ہے، جس کی وجہ سے پروگرام کامیاب ہے۔"

"تم نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ تم گلوکار بننا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں کچھ دھوکے بھی کھائے ۔۔۔ وہ کیا کہانی ہے؟"

"کہانی کچھ یوں ہے کہ فیصل آباد سے میرا تعلق ہے اور وہاں کا میڈیا اتنا فاسٹ اور اتنا پاپولر نہیں ہے جتنا کہ کراچی اور لاہور کا ہے، مجھے میوزک کا بے انتہا شوق تھا اور میں گلوکار بننا چاہتا تھا ۔۔۔ ایک بندہ، جس کا مجھے نام یاد نہیں ہے اس نے میرے شوق کو دیکھتے ہوئے کہا کہ تم اگر میوزک میں کچھ کرنا چاہتے ہو تو مجھے بتاؤ۔ تو اس نے کسی سے ملوایا جو کہ ایک پیٹرول پمپ کا منیجر تھا اور پارٹ ٹائم میوزیشن تھا۔ اس نے میرے گانے کا میوزک بنایا اور ایک ویڈیو بھی بنا دی جو کہ آن ایئر ہوئی اور مجھے احساس ہوا کہ یہ بہت ہی بری ویڈیو بنی ہے تو میں نے اس کو رکوا دیا اور آپ یقین کریں کہ اس کام میں میرا بہت پیسہ خرچ ہوا جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔"

"طالب علمی کے زمانے میں ایسی حماقتیں سرزد ہوتی رہتی ہیں ۔۔۔ پڑھائی کہاں تک کی تم نے؟"

"میں نے فیشن ڈیزائننگ میں ماسٹرز کیا اور میوزک میں بھی گریجویٹ ہوں۔ اپنی فیشن ڈیزائننگ کو پریکٹیکل لائف میں اس لیے نہیں لایا کہ مجھے شروع سے ہی میوزک میں اور ریڈیو، ٹی وی میں کچھ کرنے کا شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں کالج کا طالب علم تھا تو مجھے ایف ایم 101 میں کام کرنے کا شوق ہوا۔ ایک باغ میں بیٹھ کر ایک کاغذ پہ اپنی سی وی لکھی اور ایف ایم 101 کے اسٹیشن کے اندر جانے لگا تو چوکیدار نے مجھے روک لیا اور پوچھا کہاں جا رہے ہو، میں یونیفارم میں تھا۔ میں نے کہا کہ اندر سی وی دینا ہے۔ اس وقت تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ پراپر سی وی کمپیوٹر سے بنائی جاتی ہے۔ خیر اس نے کہا کہ ایسے اندر نہیں جانے دیتے۔ تم مجھے دے دو میں آگے پہنچا دوں گا۔ اس نے یقیناً آگے نہیں دی ہوگی۔ چند ماہ انتظار کیا پھر بھول گیا اور یونیورسٹی میں آ گیا، خیر کافی جدوجہد کے بعد آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو ہی گیا۔"

"گھر کے اکلوتے بیٹے، بہنیں اپنے گھر کی، کراچی آنے کی ضد، والدین نے کچھ کہا نہیں؟"

"میں نے ہر جگہ اپنے اکلوتے ہونے کا فائدہ اٹھایا۔ میں ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ جب کراچی آنے لگا تو والدین سے یہی کہا کہ میں کراچی جا کر سب کچھ خود کروں گا۔ گھر سے پیسے نہیں منگواؤں گا۔ اپنے بل بوتے پر کچھ بننا چاہتا ہوں۔ گھر والے حیران تھے کہ میں یہ سب کچھ کیسے کروں گا جب کہ گھر میں میرے ہر معاملے میں نخرے بہت ہوتے تھے۔ سب کا لاڈلا تھا۔ مگر جناب میں نے اپنا قول نبھایا اور کچھ بن کے دکھا ہی دیا۔ لاڈلا اتنا تھا کہ جب واش روم جاتا تھا تو اماں باہر کھڑی ہوتی تھیں۔ کراچی آیا تو تھوڑا عرصہ ڈیپریشن میں رہا۔ بس پھر اللہ کا شکر ہے، سب سیٹ ہو گیا۔ آج میں ایف ایم 107 میں پروڈیوسر بھی ہوں اور آر جے بھی ہوں۔"

"اب بھی فیملی فیصل آباد میں ہی ہے کیا؟"

"جی جی ۔۔۔ اب بھی فیملی فیصل آباد میں ہی ہے اور میں یہاں اکیلا رہتا ہوں اور اپنے اکیلے ہونے کا بہت فائدہ اٹھاتا ہوں۔ اپنی مرضی سے سب کام کرتا ہوں۔ مجھے دیر سویر کا، سونے جاگنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہو رہا ہوتا۔ کوئی انتظار نہیں کر رہا ہوتا میرا گھر پہ۔"

"تمہارے سب سے زیادہ کون سے شوز پسند کیے گئے؟"

"جو شوز بہت زیادہ پسند کیے گئے ان میں "دل کے بہلانے کو"، 'بی فار بھنگڑا'، ان پروگراموں کو نوجوان، چاچے، ماسے، خالائیں، پروفیسرز غرض کہ ہر عمر کے لوگ بہت شوق سے سنتے تھے۔ اس طرح "غزل شو" کو بھی طالب علموں کے علاوہ نقاد، شاعر اور بڑی عمر کے لوگ بھی سنتے تھے۔ ایک پروگرام تھا "پانچ کا پہاڑا" وہ بھی بہت ذوق و شوق کے ساتھ سنا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک پروگرام "فن کی تتلی" کے نام سے پیش کیا۔ اسے یاسر جلوانی اور میں مل کر کرتے تھے۔ اس کو خالصتاً "نوجوان ہی سنا کرتے تھے اور "بی فار بھنگڑا" تو اب لاہور، ملتان، کراچی اور نیٹ کے ذریعے پوری دنیا میں سنا جاتا ہے۔"

"تم بتا رہے ہو اکیلے رہتے ہو، کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ اپنی مرضی سے سارے کام کرتے ہو۔ محسوس نہیں ہوتا کہ گھر والے ہوتے تو زیادہ اچھا تھا؟"

"جون ایلیا صاحب نے کیا خوب کہا ہے کہ۔

"اب مجھے کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا"

اور کمی اسی وقت محسوس ہوتی ہے جب آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ اکیلے ہیں۔ میری اماں مجھے اکثر کہا کرتی تھیں کہ تم میں ایک "بڈھی روح" ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ بڈھی روح مجھ پر بہت حاوی رہتی ہے لیکن پھر بھی فیملی کو بہت مس کرتا ہوں۔"

"اکیلے رہنے والوں کے تو موڈ بھی خراب نہیں ہوتے۔ کیونکہ فیملی ہو تو سو باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ تم ایسے مسائل سے دوچار تو نہیں ہوتے ہو گے؟"

"بے شک روک ٹوک نہیں ہے۔ مگر مسائل سے تو چھٹکارا نہیں پایا جا سکتا۔ میں بہت سے مسائل میں گھرا ہوں۔ مثلاً "کراچی کی ٹریفک سے کون واقف نہیں ہے۔ شو شروع ہونے والا ہے اور میں روڈ کراس نہیں کر پا رہا کیونکہ ٹریفک بہت ہے۔ تو اس طرح کے مسائل ہیں، جو روزمرہ زندگی کے ہی ہیں۔ ویسے اکیلے رہنے کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے کہ میرا غصہ جو بہت تیز تھا۔ اس پر میں نے کافی حد تک قابو پا لیا ہے۔"

"اتنی محنت کی، کچھ کمایا ۔۔۔ اور یہاں اچھی آمدنی ہوئی یا فیصل آباد میں؟"

"اب تو بہت اچھا کما رہا ہوں اور جب فیصل آباد میں تھا تو بہت اچھے طریقے سے کما رہا تھا۔ میں ایڈورٹائزنگ کمپنی کے لیے کام کرتا تھا، میں ریڈیو پہ کام کرتا تھا اور جب یہاں ریڈیو سے پہلی سیلری ملی تو میں تو ہکا بکا رہ گیا کہ اتنی کم؟ ۔۔۔ تو میں نے انہیں کہا کہ یہ کیا ہے۔ تو کہا گیا کہ ابتدا میں تو ایسا ہی ہوتا ہے اور پریشانی کی بات یہ تھی کہ جس کمرے میں میں رہتا تھا، اس کا کرایہ زیادہ تھا اور میری سیلری کم تھی۔ اب آپ خود

"اندازہ لگائیں کہ میں نے کیسے گزارا کیا ہوگا۔"

"کتنے سال ہو گئے کراچی آئے ہوئے اور اب خوش ہو؟"

"مجھے تقریباً ساڑھے تین سال ہو گئے ہیں کراچی میں اور ان سالوں میں میرا گروتھ لیول اتنا بڑھا ہے کہ آج میں پاکستان کی سب سے بڑی آرگنائزیشن کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ اب بہت خوش ہوں۔"

"محنت کے بعد جو کامیابی ملتی ہے' اس کا تو مزا ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

"جی بالکل..... میرے پاس میرا پہلا اور آخری فخر ہی یہی ہے کہ میں سیلف میڈ ہوں۔ میں کسی کے آگے جھکا نہیں' ہاتھ نہیں پھیلائے' نہ ہی کسی سفارش کا سہارا لیا۔"

✿ ✿ ✿

احسن خان

"کیسے ہیں..... آج کل آپ کا سیریل "میرے قاتل میرے دلدار" اور "میرے چارہ گر" بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ آپ کو کیسا رسپانس مل رہا ہے؟"
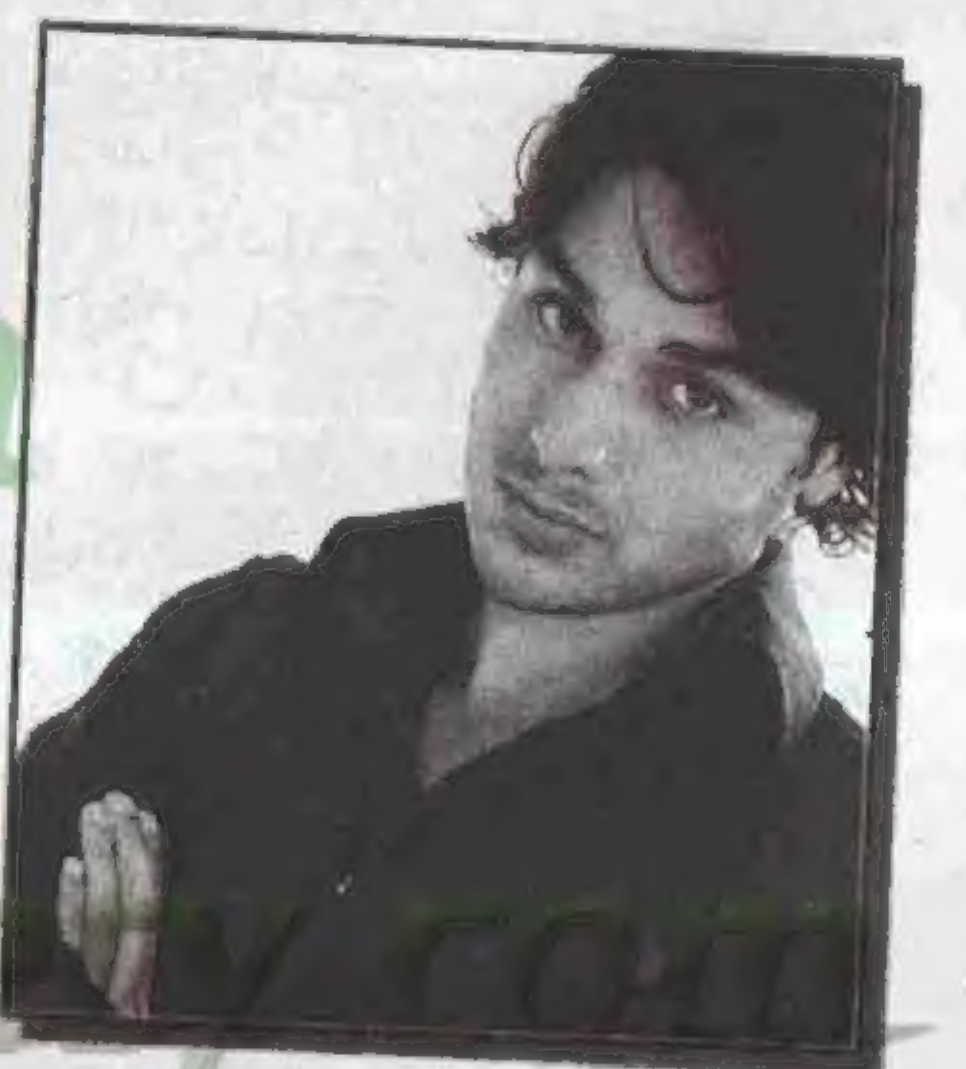
"آپ یقین کریں کہ دونوں ڈراموں کا بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ کم سے کم میری تو جن سے بھی ملاقات ہوتی ہے' وہ بے حد تعریف کرتے ہیں۔"

"آپ کا زیادہ وقت کراچی میں گزرتا ہے۔ کیا کراچی میں کام زیادہ ہو رہا ہے؟"

"جی بالکل اس وقت 80 سے 90 فیصد کام کراچی میں ہی ہو رہا ہے۔ اس لیے زیادہ تر وقت اب کراچی میں ہی گزرتا ہے' لاہور میں فیملی ہوتی ہے اور پھر عنقریب میں لاہور میں اپنا بوتیک بھی کھولنے والا ہوں۔"

"اوہ!..... جس طرح ہمایوں سعید' شاہد آفریدی' اعجاز وغیرہ نے کھولا ہوا ہے۔"

"جی بالکل اور ہمارے بوتیک میں خواتین و حضرات دونوں کے ملبوسات ہوں گے اور قیمت کا بھی خاص خیال رکھا جائے گا۔"

"ماڈلنگ میں بھی نظر آ رہے ہیں آج کل آپ؟"

"جی کوئی اچھا کمرشل مل جاتا ہے تو کر لیتا ہوں۔ ورنہ میری پہلی ترجیح تو اداکاری ہی ہے۔"

"آپ نے پاکستانی فلموں میں بھی کام کیا ہے۔ اب یہ انڈسٹری بحران کا شکار ہو گئی ہے..... اپنے اس تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پڑوسی ملک میں کام کرنے کا ارادہ ہے؟ کوئی آفر آئی؟"

"جی بالکل آفرز ہیں اور میرے پرستاروں کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں بالی ووڈ اور ہالی ووڈ کی فلموں میں بھی کام کر رہا ہوں۔ کر رہا ہوں سے مراد یہ ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہالی ووڈ جا رہا ہوں جہاں ایک فلم کے لیے میٹنگ ہے' کام اچھا ہوا تو ضرور کروں گا' اس طرح بھارت میں بھی بات چیت چل رہی ہے۔ دیکھیں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

"اچھا ہی نکلے گا۔ ویسے اب تک تو کافی کام کر چکے ہیں آپ۔ کچھ یاد ہے کیا کچھ کیا؟"

"بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ ترتیب وار اور نام کے ساتھ تو یاد نہیں ہے البتہ تعداد یاد ہے' وہ بھی کنفرم

نہیں ہے۔ فلمیں تو میں نے سات عدد کی ہیں اور پہلی فلم نکاح تھی۔ اس طرح ڈراما سیریلز اور ٹیلی فلمز کی تعداد بھی 40' 50 سے زیادہ ہی ہوگی۔"

"مزید پروجیکٹس ہوں گے؟ اس فیلڈ میں سوچ سمجھ کر آئے۔ یا چانس مل گیا تھا تو فائدہ اٹھا لیا تھا؟"

"جی ابھی تو کافی پروجیکٹس ہیں جن پر کام ہو رہا ہے اور اس فیلڈ میں سوچ سمجھ کر ہی آیا ہوں۔ کیونکہ میں بچپن سے ہی اداکاری کا شوقین تھا اور اسکول کالج کے زمانے میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا اور یہی نہیں پراپر طریقے سے اداکاری سیکھنے کے لیے میں نے شارٹ کورسز بھی کیے ہیں جن سے مجھے اس فیلڈ میں اپنے قدم جمانے میں کافی مدد ملی ہے۔"

"ویسے آپ نے کیا ڈگری لی ہے اور اگر اس فیلڈ میں کامیاب نہ ہوتے تو کیا کرتے؟"

"ڈگری تو میں نے ایم اے انگریزی کی لی ہے اور اگر میں اس فیلڈ میں نہ ہوتا تو یقیناً کسی اور فیلڈ میں ہوتا۔ اس فیلڈ میں جو اللہ تعالیٰ نے میرے رزق کا ذریعہ بنائی ہوئی تھی۔ میرا تو یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں انسان کا رزق باندھا ہوا ہوتا ہے اُسے وہیں پہنچا دیتا ہے۔"

"آپ لندن میں پیدا ہوئے اور وہاں کی شہریت بھی آپ کے پاس ہے۔ جس طرح کے حالات ہیں ملک کے' آپ کو تو لندن میں ہی ہونا چاہیے تھا۔"

"بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن کیا کروں کہ نہ صرف مجھے یہ ملک پسند بہت ہے بلکہ اس سے میرا روزگار بھی بندھا ہوا ہے۔ مجھے پاکستان میں رہنا اچھا لگتا ہے۔ ویسے انگلینڈ میرا آنا جانا لگا رہتا ہے۔"

"کیا کہیں گے پاکستان کی سیاست کے بارے میں؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ آج کل تو حالات بہت خراب ہیں' جتنے دھوکے اور دکھ ان سیاست دانوں نے عوام کو دیے ہیں۔ کوئی کہنے سننے کی بات نہیں ہے۔ کہنے کو یہ ہمارے ووٹوں سے آئے ہیں مگر صرف عوام کا خون نچوڑنے۔ اللہ تعالیٰ انہیں نیک ہدایت دے۔"

"اور گھر میں سب خیریت ہے۔ آپ کی بیگم اور بیٹی ٹھیک ہیں؟"

"الحمدللہ میری بیگم فاطمہ اور بیٹی سکینہ جو کہ اب ماشاء اللہ چار سال کی ہو گئی ہے' بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"چلیں ان شاء اللہ پھر بات ہوگی۔"

✿ ✿ ✿

مبصر خان

"جی مبصر خان صاحبہ! کیا حال ہیں آپ کے..... ماشاء اللہ بڑی اچھی ماں کے رول کرتی ہیں آپ؟ ٹی وی پہ آمد کیسے ہوئی؟"

"حال چال ٹھیک ہے اور جناب آپ کی تعریف کا شکریہ اور ٹی وی پہ آمد اس طرح ہوئی کہ میری ایک دوست مجھے ٹی وی اسٹیشن لے گئی جہاں میری ملاقات کاظم پاشا سے ہوئی تو انہوں نے مجھے ڈرامے میں کام کرنے کی پیش کش کی..... اور اداکاری سے پہلے میں کمپیئرنگ کیا کرتی تھی۔ ٹی وی پروگرام میں اور مختلف فنکشنز میں کیونکہ مجھے بہت شوق تھا اور جو میری کمپیئرنگ سنتے تھے وہ کہتے تھے کہ تمہاری آواز اچھی ہے تم خبروں کے لیے آڈیشن دو اور جب نیوز کے لیے گئی تو انہوں نے کہا کہ آپ ڈراموں میں کام کریں گی؟ تو میں نے کاظم پاشا سے کہا کہ مجھے تو اداکاری نہیں آتی وہ کہنے لگے کہ میں سکھا دوں گا..... میں نے کہا ٹھیک ہے میں کر لوں گی میں تیار ہوں۔"

"ہوں گڈ۔ تو پھر پہلی سیریل کون سی تھی؟"

"ان دنوں وہ جانگلوس بنا رہے تھے۔ اس میں انہوں نے مجھے ایک چھوٹا سا رول دیا۔ وہ کردار پانچ چھ منٹ کا تھا۔ میں نے نیوز کے لیے آڈیشن دیا اور

کامیاب ہوگئی تو مجھے کہا گیا کہ چھ ماہ کی ٹریننگ ہوگی.... حلق سے بولنا ہوگا سر پر دوپٹہ لے کر نیوز پڑھنی ہوں گی .... اور بھی کئی ہدایات تھیں۔ تو مجھے یہ کام مشکل لگا اور میں نے نیوز پڑھنے کا ارادہ ترک کردیا۔"

"اس فیلڈ میں آئیں تو بچے کتنے بڑے تھے اور کسی نے اعتراض تو نہیں کیا؟"

"چھوٹا بیٹا آٹھ سال کا تھا اور اعتراض تو بہت ہوئے۔ میاں نے دبے دبے لفظوں میں کیا جبکہ بھائیوں نے بہت اعتراض کیا چونکہ ہم پٹھان ہیں تو ہمارے بہن بھائیوں کی سوچ بھی پٹھانوں والی ہے کہ عورت کو باہر نکل کر کام نہیں کرنا چاہیے۔ میرا بڑا بھائی تو کافی عرصہ مجھ سے ناراض رہا اور ابھی بھی وہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہے مجھ سے۔"

"آپ نے تو بڑے اچھے رول کیے ہیں۔ بھائی کو اعتراض تو نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"اصل میں مسئلہ یہ تھا کہ ڈرامہ سیریل "آنچ" جو کہ بے حد مقبول ہوا تھا اس میں میرا نگیٹو رول تھا .... لگائی بجھائی کرنے والی "کٹنی" ٹائپ کی عورت کا رول تھا۔ بہت مقبول ہوا یہ رول اور لوگوں میں میرا امیج یہ بن گیا کہ میں شاید اس ٹائپ کی عورت ہوں۔"

"اصل میں لوگ بہت گہرائی کے ساتھ ڈراما دیکھتے ہیں۔"

"بالکل' ڈراما حقیقت کے قریب ہوتا ہے مگر اس میں کام کرنے والے ویسے نہیں ہوتے جیسے ڈرامے میں نظر آرہے ہوتے ہیں .... تو اس رول کے بعد سب نے کہا کہ ایک تو تم نے سب کی مرضی کے خلاف ڈرامے میں کام کیا۔ پھر رول بھی ایسا کیا جو تمہاری شخصیت کے برعکس ہے اور مجھے یاد ہے کہ جب میں کسی تقریب میں جاتی تھی تو لوگ مجھ سے آٹوگراف نہیں لیتے تھے کہ یہ اچھی خاتون نہیں ہیں اور جو لوگ مجھے جانتے تھے وہ کہتے تھے کہ تم نے اس طرح کا رول کیوں کیا۔ تو میں نے کہا کہ بھئی مل گیا تھا' اس لیے کرلیا۔"

"ماشاء اللہ سے کتنے بچے ہیں آپ کے؟ نام کیا ہیں ان کے؟"

"میری تین بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا ہے اور جب میں ڈراما سیریل آنچ کررہی تھی تو میرے ایک بیٹے کا انتقال ہوگیا تھا۔ اس کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال تھی۔ میری بڑی بیٹی کا نام صدف' دوسری کا ثروت' تیسری کا ندرت اور بیٹے کا نام روحیل خان ہے۔ میری بڑی بیٹی صدف جیو کے پروگرام "نادیہ خان شو" میں میک اپ آرٹسٹ تھی اور دبئی میں تھی۔ چونکہ یہ پروگرام بند ہوگیا تو پھر وہ بھی کراچی آگئی اور اب بھی جیو پہ جاب کرتی ہے۔"

"اب تو خیر آپ بہت ہی اچھی اور نرم مزاج ماں کا رول کرتی ہیں۔ عام زندگی میں آپ کیسی ہیں؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ جہاں مجھے غصہ کرنا چاہیے وہاں میں غصہ کرتی ہوں۔ خاص طور پر بچوں کی تربیت میں میں نے اپنے مزاج کو تھوڑا سخت رکھا اور غصہ میرے مزاج میں ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ پٹھانوں کے مزاج میں گرمی ہوتی ہے۔ ویسے مجھے کسی کی غلط بات برداشت نہیں ہوتی۔ دل کی نرم ہوں۔ کسی جانور کی تکلیف بھی برداشت نہیں ہے۔ اور ظلم سہنے والی عورت نہیں ہوں۔ ظلم کا جواب ظلم سے دیتی ہوں۔"

"گویا فرینڈلی ماں بھی ہیں اور سخت ماں بھی ہیں؟"

"بالکل' بیٹیوں کے ساتھ بہت دوستانہ ماحول ہے اور بہو کے ساتھ تو بہت زیادہ دوستی ہے اور دامادوں کے ساتھ تو ایسا مذاق چلتا ہے کہ جیسے ہم عمر ہوں۔ لیکن ان کو یہ بھی پتا ہے کہ ساس صاحبہ کا غصہ تھوڑا تیز ہے۔ دو منٹ میں بدل بھی جائیں گی تو داماد ڈرتے بھی بہت ہیں مجھ سے۔"

"کتنے سال ہوگئے اس فیلڈ میں؟"

"خیر سے چوبیس سال ہوگئے ہیں۔"

"چلیں جی پھر ان شاء اللہ بات کریں گے۔"

رضیہ جمیل

خط لکھیے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37. - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت' سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

پہلا خط تونسہ شریف سے سحر شہزادی کا ہے۔ لکھتی ہیں

اس ماہ کا پورا شمارہ ہی زبردست تھا اور ٹائٹل بھی بہت یونیک تھا۔ خاص طور پر ماڈل عیمہ ملک کا انداز بہت خوب صورت تھا۔ شعاع میں بندھن کا سلسلہ بہت زبردست ہے۔ پلیز اداکار فہد مصطفیٰ اور اداکار نعمان اعجاز کا بندھن میں انٹرویو ضرور دیجیے گا۔ "دیوار شب" ایک منفرد طرز کی تہذیب و اقدار کے فلسفہ سے گندھی ہوئی لاجواب تحریر ہے اور عالیہ بخاری اسے بہت خوب صورتی سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ اس تحریر کی وجہ سے میں عالیہ بخاری کی فین ہوگئی ہوں۔ دوسری وہ تحریر جسے پڑھ کر میں قلم اٹھانے پر مجبور ہوگئی اور وہ تحریر سونیا نوید کی "تجدید وفا" ہے۔ ان کا تحریر کا انداز بھی بہت منفرد اور لاجواب ہے اور کہانی کا وہ سین جب جویریہ ندیم اپنی ماں سے ملنے جاتی ہے۔ تو جواب میں اسے جو ذلت اور بے اعتنائی اٹھانا پڑتی ہے' اسے پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس طرح سے مہوش افتخار کا "ضبط عشق" بھی بہت لاجواب تھی۔ سائرہ رضا کا "سرسوں کا پھول" بھی اچھا تھا۔ بھی ہم نے دیہاتی طرز کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ لیکن یہ کہانی اپنی اپنی سی لگی۔

آمنہ ریاض کی "ستارہ شام" بھی ایک منفرد ٹاپک پر ہے۔ اس میں الجھاؤ بھی بہت ہیں۔ لیکن اب لگتا ہے جیسے یہ جمود کا شکار ہوگئی ہو۔ خاص طور پر دو تین ماہ سے صرف دو کرداروں کا ذکر ہوتا ہے۔ پلیز کہانی کی رفتار بڑھائیں۔

ج: پیاری سحر! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

شہرہ شفق نے ای میل کی ہے

میں شعاع کی ریگولر قاری ہوں مگر اس دفعہ ٹائٹل کچھ خاص نہیں لگا۔ کہانیاں ویسے تو سب اچھی ہیں مگر "دیوار شب" پلیز ختم کردیں۔ اتنا لمبا ہوچکا ہے۔ انوشہ ملک نے اچھا مگر رنجیدہ لکھا۔ "شب آرزو" بھی اچھا تھا۔ پلیز ایک درخواست ہے۔ قسط وار کہانیاں اچھی اچھی دیا کریں۔ ڈپریسو نہ ہوا کریں۔ زندگی میں ویسے ہی اتنے غم ہیں۔

ج: شفق! شعاع کی محفل میں خوش آمدید! تمہیں غم زدہ کہانیاں زیادہ اچھی نہیں لگتیں لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے اور کہانیاں زندگی کی عکاسی ہی تو کرتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

صبا سمرین نے کھوسکی سے لکھا ہے

ٹائٹل بہت خوب صورت لگا۔ حمد و نعت کے بعد پیارے نبی کی پیاری باتوں سے لے کر پورا شعاع ہی اچھا لگا۔ مجھے تو مہوش افتخار کا ناول "ضبط عشق" اچھا لگا بس! عالیہ بخاری جی اور آمنہ ریاض جی، دونوں ہی کے ناول بہت زبردست ہیں لیکن صفحات بہت کم ہوتے ہیں "سرسوں کا پھول" سائرہ رضا کا ناول واہ، سائرہ جی! حقیقت کو اتنا قریب دیکھ لیا اور بے اختیار دل نے کہا کہ کہانی حقیقت سے ہی بنتی ہے۔

"اور اب میرے چھوٹے سے شہر کا تعارف میرے شہر کا نام کھوسکی ہے یہاں ایک شوگر مل ہے۔ مل کی کالونی ہے۔ کچھ لوگ کالونی اور کچھ شہر میں رہتے ہیں۔ سب کچھ ہے ہمارے شہر میں۔ کھیت بھی، پانی بھی، گیس بھی اور سب سے بڑھ کر بہت اچھے تعلیمی ادارے، انٹر تک تعلیم کے ادارے ہمارے کھوسکی میں ہیں۔ کھوسکی کا ضلع بدین ہے اور ہمارے کھوسکی کے لوگ ملنے جلنے اور محبت والے ہیں۔

ج: صبا! خوش آمدید! آپ کے شہر کا نام پہلی بار سنا ہے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ چھوٹے سے شہر میں تمام ضروری سہولیات مہیا ہیں اور یہاں کے لوگ تعلیم سے آراستہ اور پرخلوص ہیں۔

شعاع کی تعریف کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

مسرت الطاف احمد نے کراچی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

اس ماہ کا شعاع بہترین تھا۔ عالیہ بخاری بہت ہی اچھے طریقے سے کہانی کو اینڈ کی طرف لے آئیں۔ "ستارہ شام" کی یہ قسط تو بہت ہی زبردست تھی۔

ضبط عشق کی آخری قسط بہت اچھی لگی۔ شاہ نواز کا کردار اس پورے ناول میں بہت اسٹرونگ تھا۔ "تجدید وفا" کی جب پہلی قسط پڑھنا شروع کی تو پہلے عرشی کا کردار سامنے آیا جو بہت پسند آیا جب کہ جویریہ کے کردار میں مجھے اتنی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے حذیفہ کا جویریہ میں انٹرسٹڈ ہونا کچھ اچھا نہیں لگا۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول "سرسوں کے پھول" حقیقت سے قریب تر ایک منفرد اور دلچسپ تحریر تھی سائرہ رضا نے منظر نگاری تو اتنی زبردست کی کیا بتاؤں..... !خاص طور پر جب یمنی اماں نے اپنی ذاتی چھوٹی پیٹی کھول کر آمنہ کا جہیز دکھانا شروع کیا تو دادی اور آمنہ کا ردعمل، آمنہ کا سوپ سیٹ کو انگلیوں سے پھیر پھیر کر دیکھنا اور اگلے پل ہی آنکھوں سے آنسو بہنا، اس منظر کو میں نے اتنا محسوس کیا کہ میری بھی آنکھیں بھیگ گئیں۔ سندس جبیں کا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی "شب آرزو" ایک منفرد انداز لیے دلچسپ تحریر تھی، افسانوں میں "گیلی مٹی" بہت سبق آموز اور متاثر کن تحریر تھی۔ دل میں اترتی ہوئی "بے مہر اساں" انوشیہ ملک نے تو کمال کر دیا۔ تحریر بہت ہی اثر انگیز تھی "زندگی، موسم اور خوشبو" موضوع بہت ہی جان دار تھا۔ پڑھ کر اچھا لگا۔ "زندگی کہیں جسے" حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی۔

ج: مسرت! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

شازیہ بھٹو نے بالا سندھ سے میل کی ہے

میں شعاع کی زبردست فین ہوں۔ شادی سے پہلے بھی شعاع کی دیوانی تھی۔

اب دو بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی یہی حال ہے۔ ماڈل بہت اچھی لگی۔ "ضبط عشق" کے سارے کردار بہترین تھے، خاص طور پر عالم، مگر رطابہ کا کیا بنا؟ "تجدید وفا" اور "دیوار شب" بہت اچھا ہے۔ جویا کا کردار اتنا اچھا لگتا ہے کہ دل چاہتا ہے، اڑ کے جاؤں اور اس کے تمام مسائل حل کر دوں۔ "سرسوں کے پھول" بھی بہت شاندار تھا۔ "ستارہ شام" پراسرار ہوتا جا رہا ہے۔ افسانے بس ٹھیک ہی تھے۔

ج: شازیہ! رطابہ کا کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گا۔ ضروری نہیں ہے کہ کہانی میں ہر کردار کی شادی کرائی جائے۔ شعاع کی پسندیدگی میں شادی اور دو بچوں کی مصروفیات کے باوجود کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی میل کر کے اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

جویریہ عاصم نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

"ضبط عشق" مہوش افتخار نے بہت ہی اچھا لکھا۔

میرا بھائی جاوید آپ کا شعاع اور کرن نہایت شوق سے پڑھتا ہے۔ لیکن اس کے پڑھنے پر اس کے دوست اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ تو لڑکیوں کا ہے، تم کیوں پڑھتے ہو۔ اس کا کہنا ہے میں تو اس لیے پڑھتا ہوں کہ اس سے بہت سی اچھی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اب نمرہ احمد کا ناول مصحف ہی لے لیں، کیا مرد اس کو پڑھ کر کوئی سبق نہیں حاصل کر سکتے۔

ج: پیاری جویریہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ اپنے بھائی سے کہیں کہ مطالعہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اس کے دوستوں کو مذاق اڑانے یا تنقید کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور اگر وہ تنقید کرتے ہیں تو اس کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ بہت سے مرد بھی شعاع پڑھتے ہیں۔ تمام ٹی وی چینلز پر اس وقت خواتین ڈائجسٹ اور ماہنامہ شعاع کی مصنفین ڈرامے لکھ رہی ہیں جو مرد حضرات بناتے ہیں تمام چینلز کے پروڈیوسر خواتین اور شعاع کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتے ہیں۔

حمیرا اشفاق ملک ترغیال مری! سے لکھتی ہیں

میرے خط لکھنے کی وجہ؟ تو جناب عالیہ میرے خط لکھنے کی وجہ ہے کہانی "دل کے راستے دشوار بہت" آپ سوچ رہی ہوں گی اتنا لیٹ تبصرہ؟ تو وجہ یہ ہے کہ کوئی لفافہ لا کر نہیں دے رہا تھا۔

ہاں تو رائٹر صاحبہ نے کرداروں کے ساتھ بہت ظلم کیا ذرا جو رحم آیا ہو، ماہم سب سے برا کردار تھی اور سب سے اچھا اسی کے ساتھ ہوا۔ باقی سب سلسلے ٹھیک بلکہ بہت [illegible] جا رہے ہیں لیکن اس کہانی نے دل توڑ دیا تھا۔ ہفتہ تو [illegible] نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ ہم خوشی کے لیے ڈائجسٹ [illegible] ہیں اپنی زندگی کے اہم ترین مسائل بھلا کے جب [illegible] میں کھو جائیں تو اپنا ہوش نہیں ہوتا ہاں ایک اور [illegible] بہنوں کے درمیان کیسے حالات پیدا کر دیتے ہیں [illegible] بہنوں کو ایک بدتہذیب فلرٹ شخص کے لیے [illegible]

ج: پیاری حمیرا! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ کم عمری میں ماں کی ممتا سے محرومی اور پھر باپ کی وفات یقیناً "بڑا سانحہ" ہے۔ ایسے میں خواتین اور شعاع نے آپ کا ساتھ دیا اور رہنمائی بھی کی اس کے لیے ہماری مصنفین بلاشبہ مبارک باد کی مستحق ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

شمع مسکان جام پور سے لکھتی ہیں

پہلی شعاع میں رضیہ آنٹی سے ملاقات کی، آپ کے لفظوں میں جو ملک و قوم کے لیے درد چھپا ہوتا ہے۔ وہ ہمارے دلوں میں بھی داخل ہو کر قلب و فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور خود بخود آنکھوں سے اشک اور ہونٹوں سے دعاؤں کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ عالیہ جی اور آمنہ ریاض دونوں کے ناولز بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

ج: پیاری شمع! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا پچھلا خط شائع نہ ہو سکا۔ چونکہ بات پرانی یعنی اگست کی ہے اس لیے یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ خط لیٹ ملنے کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا یا موصول ہی نہیں ہوا۔ بہرحال اب آپ کا خط شائع ہے۔ اپنی ناراضی دور کر لیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شعاع امین نے لاہور سے میل کی ہے

اس مرتبہ کا شمارہ کافی زبردست تھا۔ ٹائٹل بے حد جاندار تھا۔ "سرسوں کے پھول" اس شمارے کی جان تھا۔ آمنہ کا اپنے کچن کے حوالے سے لکھنا بہت اچھا لگا۔ "ضبط عشق" کے تو کیا کہنے۔ اختتام اچھا ہوا۔ عالم جیسے دوست آج کے مادہ پرست دور میں بھی پائے جاتے ہیں؟ "تجدید وفا" پڑھنے سے پہلے صد شکر کہ آخر میں "باقی آئندہ" دیکھ لیا اور بال بال بچ گئی۔ اس لیے تبصرہ پورا ہونے پر۔ نیر فہیم کا افسانہ سچائی پر مبنی لگا۔ میرا اپنا مشاہدہ بھی یہی ہے۔

شعاع! آپ کے والدین نے آپ کا نام نادرہ خاتون کے ناول کو پڑھ کر رکھا یا شعاع کے اجراء کے بعد رکھا؟ بہت بامعنی نام ہے۔ شعاع اندھیروں کا سینہ چاک کر کے اجالے

بکھیرتی ہے۔
فروری کا شمارہ آپ کو پسند آیا۔ تہہ دل سے شکریہ۔

اقراء اقبال نے بکھڑ یوالی گوجرانوالہ سے لکھا ہے

"اس ماہ شعاع کافی زبردست رہا۔ "دیوار شب" کے تو کیا ہی کہنے۔ عالیہ جی! خیام کو اب زیادہ دیر اس کے باپ سے دور نہ رکھیے۔ "ستارہ شام" نے تو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ سندس جبین نے کافی اچھا اچھا لکھا "ضبط عشق" میں عالم کی سوچ کو داد دینے کو جی چاہا۔ افسانے سارے ہی بہت اچھے تھے۔ اور پلیز بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا اس سلسلے کو بھی بند مت کیجیے گا۔

ج : اقرا! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ اتنا عرصہ آپ نے یہ سوچ کر خط نہیں لکھا کہ خط شائع نہیں ہوگا! اچھی بہن! اگر انسان کام کرنے سے پہلے ہی سوچ لے کہ یہ کام نہیں ہو سکتا تو پھر کوئی کام بھی نہ ہو اور جہاں تک خط کا تعلق ہے تو یہ شائع نہ بھی ہوں تو ہم آپ کی رائے سے تو آگاہ ہو جاتے ہیں جو خط لکھنے کا اصل مقصد ہے۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مہوش افتخار اور دیگر مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

صائمہ رانا نے لودھراں سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ہر ماہ "ستارہ شام" کی وجہ سے انتظار رہتا ہے مگر اس ماہ "ستارہ شام" سے بھی زیادہ انتظار "ضبط عشق" کا تھا......
کیا دنیا میں ایسے خالص دوست بھی ہوتے ہیں؟..... ماننا مشکل ہے۔ عالم، رائنہ، زرمین، نواز سب کے ساتھ ہی ٹھیک ٹھیک رہا مگر یاور کو بالکل کھلا کیوں چھوڑ دیا... کچھ تو سزا ملنا تھی نا اسے بھی..... خیر بہت زبردست ناول تھا۔
ٹائٹل گرل اچھی تھی مگر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ "عمیمہ ملک" ہی تھی یا ہمیں لگ رہی تھی۔
ستارہ شام میں الجھنیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ آمنہ ریاض اگر اس ننھی منی سی کہانی کو تھوڑا سا اور بڑھا دیا کریں تو بہت بہت مہربانی ہوگی۔
قسط وار ناول کچھ کم شائع کیا کریں۔

ج : صائمہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا اندازہ درست ہے۔ ٹائٹل پر عمیمہ ملک کی ہی تصویر تھی۔ آمنہ ریاض تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ مہوش افتخار کی کہانی آپ کو پسند آئی۔ شکریہ۔ زیادہ قسط وار ناول شائع کرنا ہمیں بھی اچھا نہیں لگتا لیکن مجبوری ہے۔ مصنفین اتنی طویل کہانیاں لکھتی ہیں کہ ایک قسط میں شائع کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اب مہوش افتخار کی کہانی کو ہی دیکھ لیں جو آپ کو بہت پسند آئی ہے اگر اسے ایک قسط میں شائع کرتے تو باقی تحریریں جگہ نہیں پا سکتی تھیں۔

مسرت حسن نے ریاض سے میل کی ہے

"ضبط عشق" اف..... ! کیا ناول تھا۔ عالم کا کردار بے حد پیارا لگا۔ نیز اس ناول میں جملے بھی بہت اچھے تھے جیسے رائنہ کو سب سے آخر میں جو خیال آیا..... وہ بے حد شاندار تھا۔ "ستارہ شام" دلچسپ موڑ پر آگیا ہے۔ "دیوار شب" اچھا جا رہا ہے مگر تھوڑی تیزی لائیے۔ "شب آرزو" اچھا لگا۔ "زندگی کہیں جسے" پرانا موضوع ہے۔ ہر جگہ یہی ہوتا ہے "سرسوں کے پھول" اچھی کاوش ہے۔ اختتام بہت اچھا لگا۔ "تجدید وفا" ابھی کچھ الجھا ہوا ہے۔ تبصرہ بعد میں۔ بندھن اچھا لگا۔ ماہرہ اور فواد خان کا انٹرویو شائع کریں۔

ج : مسرت! کافی عرصہ بعد آپ نے یاد کیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

کرن سائرہ نے لاہور سے لکھا ہے

میری موسٹ فیورٹ رائٹر نبیلہ عزیز اور نمرہ احمد ہیں۔ مجھے نبیلہ عزیز کی ہر کہانی بہت اچھی لگتی ہے چاہے اینڈ کیسا بھی کریں بشرط نہ برت یہ بے نیازی کردار بہت اچھی لگی تھیں۔ مریم عزیز بھی اچھا لکھتی ہیں۔ فائزہ افتخار بھی اچھی ہیں۔ دل کے رستے دشوار بہت تھے کا اینڈ بہت برا لگا۔ آپ نے کاشا کے ساتھ بہت برا کیا حالانکہ کاشا کھرا انسان تھا۔ اس میں دوغلا پن نہیں تھا اور پلیز یہ وضاحت کر دیں کہ کیا ماہم نے دوبارہ منصور سے شادی کی تھی۔

ج : پیاری کرن! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ منصور نے ماہم سے دوبارہ شادی نہیں کی تھی۔ اس کو اپنے بچوں کی ماں کی حیثیت سے گھر میں رکھا تھا۔ منصور کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

افشاں حاجی جعفر نے کراچی لیاری نیا آباد سے لکھا ہے

مجھے شعاع پڑھتے ہوئے دس سال سے بھی اوپر ہو گئے ہیں۔ فروری کا شعاع کا ٹائٹل اچھا تھا۔ مکمل ناول میں "سرسوں کا پھول" بہت بہت اچھا لگا۔ باقی ناولٹ اور افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ "دیوار شب" بہت خوب صورتی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ مریم عزیز، آمنہ ریاض، فرحت جی سے بھی کوئی مکمل ناول لکھوائیں، باقی سب رائٹر بھی اچھا لکھتی ہیں۔

ج : پیاری افشاں! آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں، امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

مہر گل اور دعا گل نے اورنگی ٹاؤن کراچی سے لکھا ہے

اس مرتبہ فاخرہ، راحت، فائزہ، فرحت، ثمرہ، نمرہ، نگہت ایک بھی پرانی رائٹر (ماسوائے سلسلے وار مصنفات) موجود نہیں تھی، مگر آفرین ہے نئی مصنفات پر جنہوں نے ماہنامے میں کوئی کمی محسوس نہ ہونے دی، خاص طور پر میمونہ الکبری آگئیں تے چھا گئیں ٹھاہ کر کے۔ آج میں ان تمام بہنوں سے جو کراچی اور لاہور کو بڑا شہر کہتی ہیں (نظر مت لگانا بھئی) ایک نئے کراچی سے متعارف کرانا چاہتی ہوں، جس طرح پاکستان کی 70% آبادی دیہات پر مشتمل ہے اسی طرح، منی پاکستان کراچی کی 70% آبادی بھی کچی بستیوں اور غریب عوام پر مشتمل ہے۔ اورنگی سے الطاف نگر، کلیر 15 سے کھوکھراپار، کریم آباد سے غریب آباد تک اور سرجانی ٹاؤن کی خدا کی بستی تک لوگوں کو دیہات سے زیادہ مسائل کا سامنا ہے، ابلتے گٹر، فضائی آلودگی اور گاڑیوں، مشینوں کا شور، ملاوٹ والی اشیاء (دودھ اور گھی) اضافی مسائل ہیں، ہم اس لحاظ سے بھی دیہات سے زیادہ پریشان ہیں کہ ہم شدید مہنگائی میں اپنے کھیتوں کی سبزیوں اور بھینسوں کے دودھ کو استعمال نہیں کر سکتے، جس علاقے میں میں رہتی ہوں (اورنگی ٹاؤن کئی سیکٹرز پر مشتمل ہے) وہ علاقہ سندھ اور بلوچستان کی سرحد کے نزدیک ہے، دیہات میں تو لوگ مفت اسکول بھی کھول لیتے ہیں، جب کہ یہاں کی توفیسیں ہوش ربا اور گورنمنٹ اسکول ٹیچرز کی پکنک پوائنٹ کا منظر پیش کرتے ہیں۔
ہم اورنگی ٹاؤن میں پہاڑی پر رہتے ہیں، ابھی صرف چند ماہ پہلے مین روڈ سے ہمارے علاقے تک سڑک بنی ہے، نیچے کے علاقے میں بجلی اور گیس دونوں ہے، اور بجلی تاحال نہیں آئی ہے۔ ہمارے علاقے کے نزدیک کوئی نہر یا ٹیوب ویل بھی نہیں جہاں سے پانی بھر سکیں اور اونچائی پر پانی کی لائن نہیں آتی اس لیے 80 روپے کے 10 گیلن کے حساب سے میٹھا پانی بھرواتے ہیں، مگر پھر بھی آئی لو مائی کراچی۔ مجھے یقین ہے کہ اب کوئی بہنی (چھوٹی منوں)

سانحۂ ارتحال

آپ کی پسندیدہ مصنفین راشدہ رفعت اور بشریٰ احمد کی والدہ محترمہ اس دار فانی کو الوداع کہہ گئیں۔
اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن
ماں کے سائے سے محرومی بہت بڑا سانحہ ہے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ راشدہ رفعت اور بشریٰ احمد کے غم میں [illegible] شریک ہے۔
[illegible] تعالیٰ سے دعا ہے مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے اور اہل خانہ کو صبر جمیل سے [illegible]۔ (آمین) قارئین سے مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

دیہات کو برا نہیں سمجھے گی اور ہاں ایک بات تو کہنا بھول گئی آغوش کراچی میں طول و عرض سے روزگار کی تلاش میں آئے ہوئے لوگوں کی رہائش کے لیے بھی جگہ کے مسئلے ہیں۔ ہمارے علاقے کی چیک پوسٹ بنارس ہے، جس پر آئے دن فسادات ہوتے ہیں، جس کی بنا پر ہمارے علاقے کی لڑکیاں قابلیت ہونے کے بعد بھی باہر جاب نہیں کر سکتیں، یہاں معاوضے انتہائی قلیل ہیں اور مزے کی بات یہاں کے رہنے والے بنارس کے باہر موجود علاقوں کو شہر اور اپنے علاقے کو دیہات کہتے ہیں۔ تو ہمارے دیہات کے بارے میں جان کر آپ کو کیسا لگا؟

ج : مہرا ور دعا! بلاشبہ آپ نے کراچی شہر کے بارے میں صحیح لکھا۔ شہر کے بہت سے علاقے ناانصافی کا شکار ہیں۔ وہاں رہنے والوں کو نہ تحفظ حاصل ہے، نہ ہی زندگی کی دوسری سہولیات مہیا ہیں۔ ان علاقوں میں ترقیاتی کام بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وجہ ان کے حصے کے فنڈز کی عدم ادائیگی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کر سکتے ہیں۔ وہ بہترین انصاف کرنے والا ہے۔

ام حبیبہ سیالکوٹ سے میل کرتی ہیں

شعاع ہر ماہ بہتر سے بہتر ہوتا جا رہا ہے۔ ہر دفعہ سوچتی ہوں "اس بار تو کوئی خامی ہو گی مگر پتا نہیں کیوں شعاع میں کبھی ایسا کچھ نظر نہیں آتا کہ میں اپنی بچیوں کو اس کے مطالعے سے روکوں۔ مہوش نے تو دوستی کا نام اور اونچا کر دیا ہے۔ سندس نے اچھا مگر پرانے موضوع پر لکھا اس لیے زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ افسانے بے حد اچھے تھے۔ اس بار میمونہ اور شاہدہ اچھی رہیں۔ باقی سارے سلسلے اچھے تھے۔ بندھن میں ریمبو اور صاحبہ کا انٹرویو کریں۔ کیا حیا بخاری کا تعلق پشاور سے ہے اور کیا وہ شادی شدہ ہیں؟ اور کیا وہ صرف افسانے لکھتی ہیں۔

ج: ام حبیبہ! ہمیں خوشی ہے کہ ہم شعاع کا معیار برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں۔

فرخ فاطمہ حویلی لکھا، ضلع اوکاڑہ سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

ٹائٹل بلاشبہ دیدہ زیب تھا اور ماڈل بھی پیاری لگ رہی تھی۔ فروری کا سارا شعاع پرفیکٹ تھا سوائے ستارہ شام کے۔ سارا مہینہ بے چینی سے انتظار اور کہانی صرف دس منٹ میں ختم (بلا مبالغہ) مہوش افتخار نے "ضبط عشق" بے حد دلکش پیرائے میں لکھا اور کہانی پر ان کی گرفت مضبوط رہی۔ سائرہ رضا کا سادہ سی زندگی کے متعلق سادہ سے انداز میں لکھا گیا سادہ سے نام والا سادہ سا مکمل ناول روح تک کو چھو گیا۔ بنیادی طور پر ہمارا تعلق بھی دیہات سے ہے اور ہمارے تقریباً سب ہی قریبی عزیز دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ لہٰذا یہ ناول مجھے اپنی ہی زندگی کا عکاس لگا۔ منظر نگاری تو ایسی غضب کی تھی کہ کبھی یمنیٰ مجھے اپنے سامنے بیٹھی روٹیاں بناتی نظر آئی اور کبھی آمنہ اپنے بھائی سے کچن کے چبوترے پر بیٹھ کر باتیں کرتی دکھائی دیتی۔ سندس جبیں ہمیشہ اچھا لکھتی ہیں سو اس دفعہ بھی ان کا ناولٹ اچھا تھا۔ افسانوں میں نیر فہیم خان کا افسانہ سب سے منفرد اور زبردست تھا۔ مصباح خادم کا "گیلی مٹی" بہت چھوٹی سی لیکن بڑی بات سمجھاتا ہوا افسانہ بھی بے حد پسند آیا۔ شاہدہ ملک اور انوشہ ملک کے افسانے بھی بہت اچھے تھے لیکن میمونتہ الکبریٰ کے افسانے میں ایک بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ مظفر کی بیوی کا رویہ اس طرح کا کیوں تھا۔ پلیز میرے افسانوں کے بارے میں بتا دیں۔

ج: فرخ! میمونتہ الکبریٰ کی کہانی میں مظفر کی بیوی بڑی عمر کی تھی۔ اس نے مظفر کو دل سے قبول نہیں کیا تھا اس لیے اس کا رویہ ایسا تھا آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔ آپ 32721666 پر فون کر کے ان کے بارے میں پتا کر لیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ملیحہ طاہر جھبراں سے شریک محفل ہیں

شعاع 1990ء سے ہمارے گھر میں پھوپھو کے توسط سے آ رہا ہے۔ شعاع کے گھر آنے کے تین سال بعد میں پیدا ہوئی تو پھوپھو نے مجھے گود میں لیتے ہوئے میرا نام شعاع ہی رکھا مگر سوائے ان کے یہ نام کوئی نہیں پکارتا۔ اس مرتبہ شعاع میں سائرہ رضا کا مکمل ناول "سرسوں کے پھول" بازی لے گیا۔ انتہائی خوبصورت۔ ضبط عشق کا اختتام انتہائی اچھا لگا۔

ج : ملیحہ! دس سال بہت طویل عرصہ ہے۔ اتنے عرصہ تک آپ سوچتی ہی رہیں، خط لکھنے کی ہمت نہ کی۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا نا کہ آپ کا خط شائع نہ ہوتا۔ کم از کم ہم آپ کی رائے تو جان لیتے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے اپنی پھوپھو تک ہمارا شکریہ پہنچا دیں۔ ان ہی کے توسط سے شعاع آپ تک پہنچا ہے۔

شازیہ نیاز احمد ملغانی کوئٹہ کینٹ

اس ماہ کا شعاع بیسٹ ہے، خاص طور پر ٹائٹل۔ اس شمارے میں سب سے بیسٹ ناول سائرہ رضا کا سرسوں کا پھول تھا۔ یہ ناول پورے ڈائجسٹ کی جان تھا خاص طور جب آمنہ "آپ کا باورچی خانہ" میں حصہ لیتی ہے، وہ پورا منظر زبردست لفظوں میں تھا، مجھے بے ساختہ اپنے گاؤں کا کچن یاد آ گیا۔ میں ابھی تک ان لفظوں کے سحر سے نہیں نکل سکی۔ میں بھی شادی سے پہلے یمنیٰ کی طرح تھی اور دوسرا بیسٹ ناول مہوش افتخار کا ناول "ضبط عشق" تھا۔ باقی دوسرے سلسلے وار ناول بہترین جا رہے ہیں۔ افسانوں میں اس دفعہ کوئی افسانہ پسند نہیں آیا۔ ناولٹ دونوں بہترین تھے۔

ج : پیاری شازیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

کشف بٹ اور عظمیٰ بٹ سیالکوٹ کینٹ سے شریک محفل ہیں

شعاع کی پرانی قاری ہوں۔ میں کیا میرے ددھیال میں [illegible] سے افراد کو ڈائجسٹ اور دیگر ناولز پڑھنے کا خبط ہے۔ [illegible] بھی پڑھنا شروع کریں تو جب تک اینڈ نہیں پڑھ لینا، اس [illegible] نہیں چھوڑنا۔ میرا اپنا بھی یہی حال ہے۔ اب تو [illegible] لائٹ پڑ گیا ہے۔ ورنہ تو موم بتی کی روشنی میں ڈانٹ کھا کے بھی پڑھتی تھی۔ مجھے شعاع کا ہر لفظ، ہر سلسلہ [illegible] ہے۔ (خط آپ کے) یہ سلسلہ میں سارا [illegible] کے بعد پڑھتی ہوں اور اکثر خطوط میں کوئی [illegible] نہیں ہوتی ہے جو کہ میں کہنا چاہتی ہوں اور بہت کم ایسا چانس ہوتا ہے کہ کوئی تحریر پسند نہ آئی ہو۔ اس ماہ کا شمارہ بھی بہت زبردست رہا اور ہاں غائب شدہ رائٹرز سے درخواست ہے کہ حاضر ہو جائیں۔ پلیز پلیز، پلیز ایک بات آپ سے پوچھنی ہے کہ اگر پرانی پڑھی ہوئی کہانی یا کہانیوں کے کرداروں کے نام بتائیں تو کیا آپ ہمیں بتا سکتی ہیں کہ وہ ڈائجسٹ کب شائع ہوئے تھے۔

ج: کشف اور عظمیٰ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ جو خطوط ہمیں موصول ہوتے ہیں ان میں تحریروں پر بہت جامع اور عمدہ تبصرہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام قارئین کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل کی بات کہہ دی گئی ہو۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کے ددھیال والوں کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر بے حد خوشی ہوئی امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

کہانی کے کردار اگر ہمیں یاد ہوئے تو ہم بتا دیں گے۔ ہمارے قارئین بہت ذہین ہیں۔ انہیں تمام کہانیاں یاد رہتی ہیں وہ تو ضرور ہی بتا دیں گے۔ آپ جس کہانی کے بارے میں پوچھنا چاہتی ہیں۔ لکھ کر بھجوا دیں۔

سحرش یوسف اور ارم شہزادی لکھتی ہیں

آپ کا رسالہ اتنا اچھا ہے کہ میں اس کی تعریف لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔ آپی میرے 10th کلاس کے سالانہ ایگزام ہونے والے ہیں، پلیز دعا کریں کہ میں سب میں پاس ہو جاؤں۔ مہوش افتخار کی "ضبط عشق" میں نے پہلے پڑھی۔ بہت اچھی کہانی تھی لیکن صرف ایک بات کا دکھ ہے کہ بیچاری رطابہ کا کیا قصور تھا اور وہ اکیلی کیوں رہ گئی۔ آپی مجھے آپ سے ایک فرمائش کرنی ہے پلیز پلیز پلیز ضرور پوری کریں کہ مئی کے رسالے میں قومی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی احمد شہزاد کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج : سحرش اور ارم! اللہ تعالیٰ آپ کو میٹرک کے امتحان میں ہی نہیں، ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔ انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ کوشش کریں گے کہ مئی کے شمارے میں احمد شہزاد کا انٹرویو شامل کر سکیں۔ مہوش افتخار تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔ رطابہ کی تنہائی کا

غم نہ کریں کوئی نہ کوئی اس کے لیے بھی ہوگا جو اس کی تنہائی دور کردے گا۔

ایمہا انصاری نے بھاول پور سے لکھا ہے

اس وقت میرے سامنے اکتوبر 2011ء کا شعاع ہے۔ پہلے ہم شہر میں تھے تو جلدی پرچا پڑھ لیتے تھے۔ اب پچھلے چھ ماہ سے گھر تبدیل کیا ہے تو رسالے ملنے مشکل ہو گئے ہیں۔ شعاع سے رشتہ کب جڑا یاد نہیں کیونکہ جب ہوش سنبھالا اور اردو پڑھنا سیکھی تب سے یہ اپنے گھر میں دیکھا۔ ٹائٹل بہت خوب صورت ہے۔ باقی سلسلے بھی بہترین تھے۔ میرے فیورٹ سلسلے "مسکراہٹیں" باتوں سے خوشبو آئے اور خط آپ کے "ہیں۔ اکثر خواتین اور قارئین نے سلویٰ صاحبہ پہ فل تنقید کی ہے کہ انہوں نے کاشا پہ کھلا ڈلا لکھا یا یہ کہ ارسل کے ساتھ ناانصافی کی۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں بلکہ انہوں نے ہر کردار سے پورا پورا انصاف کیا ہے۔ ایک بات پوچھنا تھی کہ فرحت اشتیاق بچوں کا اسلام" کے مدیر اشتیاق احمد کی صاحبزادی ہیں؟ اگر ہاں تو ان کا تعلق جھنگ کے بجائے کراچی سے کیوں ہے؟ پلیز ضرور بتایئے گا۔ مجھے بہت الجھن ہے۔ میری فیورٹ رائٹر عمیرہ + نمرہ احمد کہاں ہیں پلیز انہیں واپس لائیں۔ ایک بات اور کہ مجھے کسی رسالے کے دفتر میں کام کرنے کا شوق ہے کیا کروں؟

ج : پیاری ایمہا! آپ کے شہر بھاول پور میں اگر کوئی رسالہ نکلتا ہے تو آپ وہاں کوشش کر سکتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

فرحت اشتیاق بچوں کے رسالے اسلام کے مدیر کی صاحبزادی نہیں ہیں۔ نمرہ احمد کی تحریر اس ماہ شامل ہے۔

خط لکھنے کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ پرچا جلد حاصل کرنے کے لیے آپ سالانہ خریدار بن جائیں گھر بیٹھے پرچا ملتا رہے گا۔

مسز معراج ٹنڈو محمد خان سے شریک محفل ہیں

شادی سے پہلے میں آپ کے ماہنامہ میں خط لکھ کر اپنی رائے دیتی تھی.... میری شادی کو گیارہ سال ہو گئے، میرے تین بچے ہیں۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں شوہر کی اجازت سے.... شعاع اور خواتین بچپن سے پڑھ رہی ہوں۔ سب کچھ ہی بہت اچھا ہوتا ہے۔ "پیاری نبی کی پیاری باتیں" میں مشکل الفاظ کی وضاحت کردیا کریں۔ کبھی کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا ناول ناولٹ افسانے سب بہترین ہیں۔ مگر عالیہ بخاری کے ناول میں سلمان مجھے بہت برا لگتا ہے۔ سیلفش گھر والوں کا ذرا خیال نہیں۔ باقی سب سلسلے بھی بہت اچھے ہیں۔

ہمارے ٹنڈو محمد خان میں بھی کئی لوگ شعاع خواتین پڑھتے ہیں۔ مگر شاید خط لکھنے والی میں پہلی ہوں۔

عامر لیاقت حسین اگر انٹرویو دیں تو ضرور شائع کریں۔ پلیز۔

ج : مسز معراج! بہت اچھا ہوتا کہ آپ اپنا نام بھی لکھ دیتیں تاکہ ہم جان سکتے کہ شادی سے پہلے آپ کس نام سے خط لکھتی تھیں۔ شادی کے بعد گیارہ سال تک خاموشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ اتنی طویل خاموشی کیا شعاع پڑھنا چھوڑ دیا تھا؟ ہمیں ملک کے ہر حصے سے خط موصول ہوتے ہیں بہت سی جگہوں کا تو ہم نے نام بھی نہیں سنا ہوتا ٹنڈو محمد خان سے بھی قارئین خط لکھتی ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ عامر لیاقت کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

عالیہ بخاری

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو میڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بالو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو ہے۔ فاخرہ کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی مرحوم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے مگر جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔
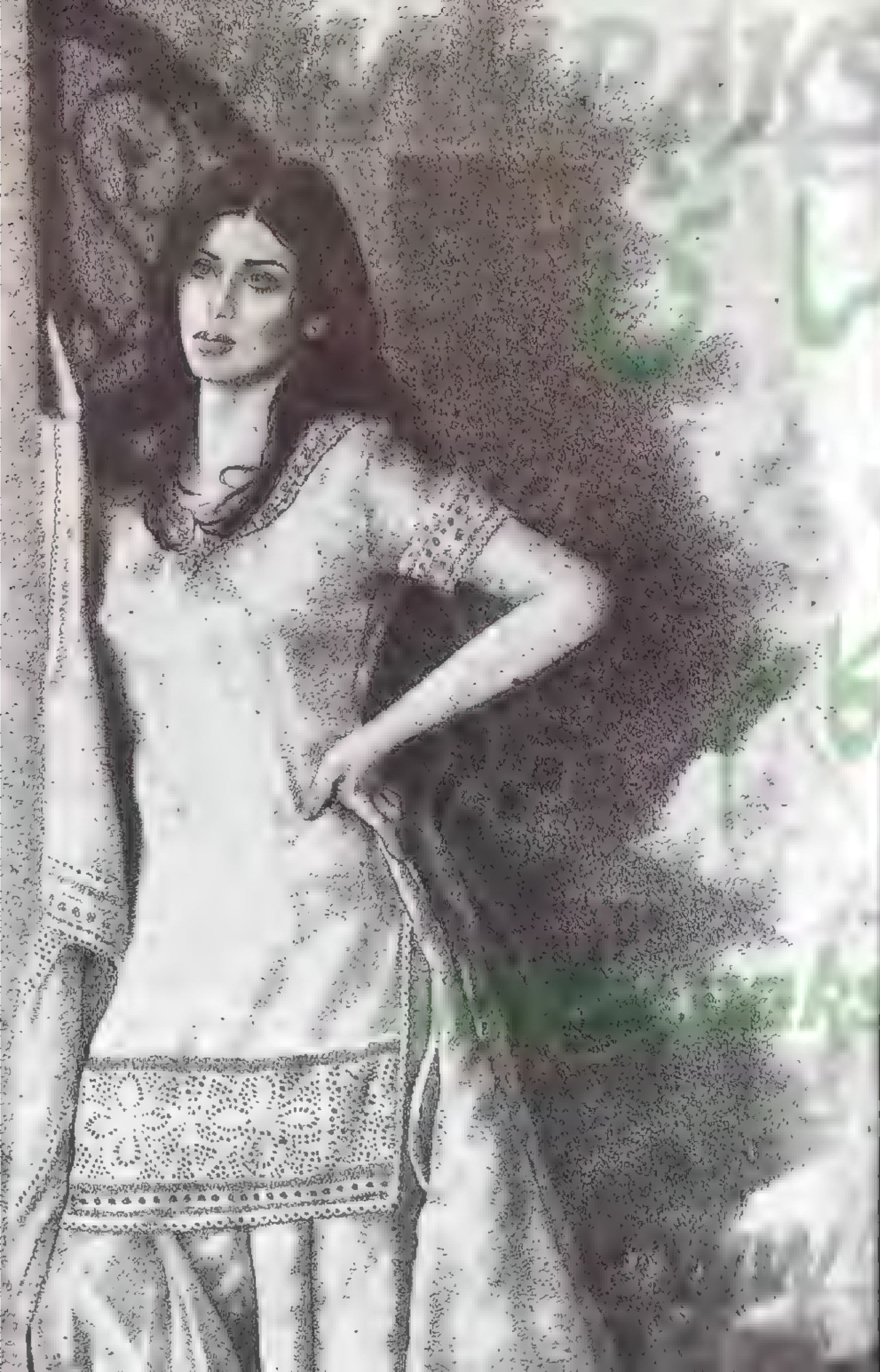
زرتاج بیگم کے بنگلے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بتول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زرتاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصہ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان رفتہ رفتہ زوبیہ کی مارت سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات منوالیتی ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے تلملانے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے، جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ربیعہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان مع سوائے جویا اور زوبیہ کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔

دلدار نانی کے چوبارے کی رونق دن بدن بڑھتی جارہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ شاما ہر موقع پر اس کی اٹنگ شوٹی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ گیتی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گیتی کی جدائی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود نمائی اور خود ستائشی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سیکریٹریز بدلنے کی عادت ہے۔ حالیہ سیکریٹری نبیل سے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جسے ڈرائیور داجو کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زرتاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جز بز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زرتاج بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر گیتی کی چوڑیاں اسے یاد کی ڈور سے باندھے ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی لایعنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل کے شوہر اکبر اپنے اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلوا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا وہم سمجھتے ہیں۔ سلمان، زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور شازو نادر ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آنا فاناً طے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے اور جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے تو وہ گم صم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دادی، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیہ، جویا کو آکساتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو رشتہ ختم کروانے میں مدد کر سکتی ہے۔ زوبیہ، آپا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔ صندل کو بالی صاحب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکتے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۲۹
انتیسویں قسط

"اچھا، بات سنو، ایک صاحب آئیں گے مجھ سے ملنے۔ وہ جب بھی آئیں، انہیں پوری عزت سے بٹھانا اور مجھے فوری خبر کرنا۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ خیام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی سے جا رہے ہیں معاذ بھائی! کچھ دیر تو رکتے۔"

"کچھ ضروری کام ہیں، پھر چکر لگاؤں گا۔ اب تم یہاں ہوتے ہو تو مجھے بہت بے فکری ہے۔" خیام ہلکے سے مسکرا دیا۔

معاذ جس طرح بار بار اس کی اہمیت کا تذکرہ کرتا تھا، وہ آہستہ آہستہ ایک خاموش سی تبدیلی کا سبب بنتا جا رہا تھا۔

"ان صاحب کا نام تو بتا دیجیے، جنہیں آنا ہے۔" خیام اس کو نکلتا دیکھ کر پیچھے پیچھے آیا۔

"ان کا نام سالار ہے۔ یاد رہے گا نا!"

بنا خیام کی طرف دیکھے سرسری سے انداز میں کہتا ہوا وہ صحن میں نکل آیا، سو خیام کا اڑا ہوا رنگ فوری طور پر نہ دیکھ سکا۔

"کیوں آرہے ہیں وہ۔" خیام کو الفاظ اپنے گلے میں پھنستے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

"کوئی ضروری کام ہے۔ اصل میں تو وہ ساجد کے ہاں سے ایڈریس لے کر گئے ہیں میرا، کچھ ایشوز ہیں، ان پر بات کرنی ہے۔ سو وہ یہاں بھی پہنچ گئے اس کا پیچھا کرتے کرتے۔"

خیام کے ہونٹوں سے ایک دبی دبی سی سانس آہ کی صورت میں خارج ہوئی، سو اس کی زندگی میں پہلی بار آئے، اس اطمینان بھرے دور کا خاتمہ بھی اتنی جلدی ہوا چاہتا تھا۔ اگر سالار اس کے سامنے ہوتا تو وہ یقیناً "اس کا گلا ہی دبا دیتا ——— معاذ نے اس کی اچانک خاموشی کو اس بار نوٹ کیا تھا۔

"تمہیں کیا ہوا ایک دم!"

"کچھ نہیں!" خیام نے سنبھل کر مسکرانے کی کوشش کی۔ "کیا کرتے ہیں یہ سالار صاحب۔ آپ ملے ہیں پہلے ان سے۔"

اسے اپنا دل بہت زور سے دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"شاید ملا ہوں کبھی، شاید نہیں! ویسے ان کا خاندان بہت اچھی طرح جانا جاتا ہے۔ بہت اونچے پیسے والے لوگ ہیں۔ شہر کے سرکردہ لوگوں میں شمار ہوتا ہے ان کا۔"

"اچھا!" سکون کا گہرا احساس خیام نے اپنے اندر اترتا ہوا محسوس کیا۔

نانی ستارہ کے محلے سے جڑی سڑک پر ایک چھوٹے سے کمرے میں، گنتی کے دو چار کپڑوں میں زندگی گزارنے والے سالار کا سلسلہ قطعی مختلف تھا۔ اور وہ اتنا بڑا احمق کہ محض نام کی مماثلت پر ہاتھ پیر چھوڑ رہا تھا۔

"دھت!"

معاذ کے سامنے وہ خود پر ہنس بھی نہیں سکتا تھا، سو بس ہلکے سے مسکرا دیا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا خیام!"

"جی بالکل ٹھیک ہے۔ آپ جائیں، خواہ مخواہ دیر ہو رہی ہے۔"

اس بار اس کے لہجے میں واقعی بے فکری اور بے ساختگی تھی۔ معاذ نے مطمئن ہو کر بائیک اسٹارٹ کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔"

... نے چونک کر دروازے میں کھڑے پیون کو دیکھا۔

"میں نے انہیں وزیٹرز روم میں بٹھا دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ آپ آ رہی ہیں۔" اطلاع مکمل ہوئی۔
جویا نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اس کا پیریڈ ختم ہونے میں اب بمشکل پانچ سات منٹ رہ گئے تھے اور بچے اپنا کام تقریباً" ختم کر چکے تھے، مگر وہ مقررہ وقت تک کلاس میں رکی رہی۔
بچوں کی پڑھائی اور دیگر مسائل پر بات کرنے کے لیے والدین کی آمد معمول کا حصہ تھی، اور اگلے فری پیریڈ میں وہ آنے والے ملاقاتی سے اطمینان سے بات کر سکتی تھی، سو کلاس سے نکل کر وہ اسٹاف روم میں جانے کے بجائے، وزیٹرز روم کی طرف آئی تھی۔ معاذ اسے آتا دیکھ کر بے ساختہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"تم!"
ہر اس جگہ جہاں وہ اس کے دکھائی دینے کی کبھی توقع بھی نہیں کرتی تھی، وہ آج کل نظر آنے لگا تھا۔ کبھی وہ وقت تھا کہ ایسے اتفاقات کو وہ اپنی خوش قسمتی میں شمار کرتی تھی۔ جویا نے حلق میں اترتے نمکین پانی کو بمشکل نیچے اتارا۔
"کیسی ہو؟"
"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا معاذ!" خود کو سنبھالتے ہوئے وہ کمرے کے وسط میں آکھڑی ہوئی۔
"نہ سلام نہ دعا!" وہ افسردگی سے مسکرا دیا۔ "خیر بیٹھو تو سہی!" اس نے صوفے کی طرف اس طرح اشارہ کیا جیسے جویا اس سے ملنے آئی ہے۔
"پریشان مت ہو۔ بس چند منٹ کے لیے آیا ہوں اور یہاں بیٹھ کر ایک مختصر سی بات کر لینے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔" اس کی اڑی ہوئی رنگت معاذ کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ وہ چپ چاپ صوفے پر آبیٹھی۔
اس کی نگاہ جھکی ہوئی تھی اور گود میں رکھے دونوں ہاتھوں نے ایک دوسرے کو مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ بنا چھوئے معاذ کو یقین تھا کہ اس کے ہاتھ بالکل سرد ہو رہے ہوں گے۔
"کاش وہ ان ہاتھوں کی یخ بستگی۔۔۔"
ایک بے ساختہ اور پوری شدت کے ساتھ ابھرتی خواہش کو جھٹکتے ہوئے وہ دل کی ہیرا پھیری پر حیران ہوا تھا۔
سو جب یہ طے ہو چکا ہے کہ وہ اس کی صرف مدد کرنا چاہتا ہے، اس کے آگے اور کچھ بھی نہیں، تو بہتر ہوگا کہ وہ وہی کچھ کرے، جو سب سے ضروری ہے۔ وہ اس کی اس خاموشی سے اور بھی کنفیوز ہو گئی تھی۔
"جلدی سے بات ختم کر لو معاذ پلیز!"
"بات تو ابھی شروع بھی نہیں کی میں نے، تم خاتمے پر پہنچ گئیں۔" ماحول میں ٹھہرے بوجھل پن کو معاذ کی مسکراہٹ دور نہ کر پائی۔ وہ یوں ہی بے تاثر سا چہرہ لیے اسے دیکھے گئی۔
"بات کو ختم ہوئے بھی ایک مدت گزر چکی ہے معاذ! میری پریشانیوں، میرے مسئلوں سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے اب۔ جو کچھ بھی میرے یا میرے خاندان کے ساتھ چل رہا ہے، اس سے تمہارا یا تمہارے گھر والوں کا کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی۔ پیچھا چھوڑ دو میرا پلیز!"
سرد لہجے میں اپنی بات کہتے ہوئے اس نے اجنبیت کی ہر حد کو پار کرنا چاہا۔ وہ بنا پلک جھپکائے، جویا کے چہرے کو دیکھے گیا اور جب وہ خاموش ہوئی تو۔۔۔
"میں نے تمہارا اچھا نہیں کیا تھا جویا! تم خود گواہ ہو اس بات کی۔" ذرا رک کر اس نے ایک تلخ یاد کو تازہ کیا۔
"یاد ہے سالگرہ کی وہ تقریب، جب میں نے دل کی پوری گہرائی سے تم سے درخواست کی تھی اور تم نے مجھ سے یہ کہہ کر ہاتھ چھڑایا تھا کہ تمہیں میرا ساتھ کسی قیمت پر منظور نہیں ہے اور میں کبھی تمہارے راستے میں نہ

آؤں۔ یاد ہے نا!"
اس کی طرف تھوڑا جھکتے ہوئے وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔ اس وقت کی جب خوشی و مسرت کی شاہراہ پر کھلتا ہر دروازہ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا، اپنی تمام سچائی کے باوجود مصلحتوں کی بچھی بساط پر وہ بری طرح پٹی تھی۔
"تم یہی بات دہرانے کے لیے یہاں آئے ہو کیا!"
"نہیں، یہ تو صرف تمہاری بات کا جواب تھا، میں تو اظہار چچا کے کیس کے بارے میں بات کرنے آیا تھا، مگر تم ہمیشہ کی طرح سب کچھ بھلائی ہوئی ہو۔"
آخری جملہ اس نے بڑبڑانے کے انداز میں ہی کیا تھا، مگر جویا نے واضح سنا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی ہر ادا، ہر لفظ، جادو سا جگاتا تھا۔
اپنی بدنصیبی کا پورا یقین ہو جانے کے باوجود کبھی کبھی جویا کو خود پر بڑا ہی رشک آنے لگتا تھا، چاہے ایک چھوٹے سے پل کے لیے ہی سہی۔
"سلمان نے ابا کی بات ٹھیک سے سنی ہی نہیں، کوئی دوسرا وکیل کر لیا ہے، اس روز وہ آئے تھے تمہارے ہاں ملنے کے۔۔۔"
"مجھے پتا ہے۔" وہ تیزی سے اس کی بات کاٹ گئی۔ اسے لگا جیسے وہ سلمان کی بدتمیزی کی شکایت کرنے کے لیے آیا ہے، جس کے لیے وہ حق بجانب بھی تھا، مگر ایسا نہیں تھا۔
"میں نے تو ابا سے کہا کہ آپ کو سیدھا شاکرہ چچی سے بات کرنی چاہیے تھی۔ سلمان تو ایک نمبر کا بے وقوف ہے، مگر وہ پتا نہیں کیوں، دروازے سے ہی واپس آگئے۔"
ایک دبی دبی سی سانس جویا کے لبوں سے نکلی۔ معاذ کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی، کڑواہٹ نہیں۔
اسلام چچا کے بارے میں اس کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے سلمان کے ہاتھوں جھیلی بے ہودگی کا کوئی ذکر معاذ سے نہیں کیا تھا۔
"میں تو خود آ رہا تھا تمہارے ہاں کہ شاید سب کو سمجھا سکوں مگر ابا نے اتنی سختی سے منع کیا کہ مجھے رکنا ہی پڑا۔"
اس نے اپنی فرماں برداری کا ذکر اتنی سادگی سے کیا کہ وہ بے ساختہ ہی مسکرا دی۔ بالکل ایسے جیسے کبھی بات بات میں مسکراتی تھی، ایک چھوٹے سے پل میں معاذ کو کتنا کچھ یاد آکر رہ گیا۔
"اچھی بات ہے کہ تم بڑوں کا کہنا تو مانتے ہو۔"
معاذ دھیمے سے مسکرایا۔ "میں تو چھوٹوں کا بھی کہنا مانتا ہوں۔ تمہارا بھی مانا تھا!" شکایت، عنایت، گلہ، جویا کے لیے اس کی طرف دیکھنا محال ہوا۔
"اسلام چچا نے تمہیں بالکل ٹھیک منع کیا ہے، تم وہاں مت آنا۔ نہ وہاں اور نہ کورٹ میں۔"
اپنی اس ایک مسکراہٹ پر شرمندہ ہو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اور تمہیں ضرورت بھی کیا ہے، سلمان بھائی، آپا کل کو نہیں جانتے ہو کیا؟"
"جانتا ہوں، تب ہی۔۔۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ "میں تمہیں اتنے مسائل کی نذر نہیں ہونے دے سکتا جویا! یہ سارے معاملات سیٹل ہو جائیں، پھر تم جو کہو گی، میں ایک بار پھر کرنے کے لیے تیار ہوں، فی الوقت۔۔۔"
"یہ نہیں ہو رہا مجھے، سمجھ کیوں نہیں رہے ہو آخر تم۔ لوگوں کے ساتھ پرابلم ہوتے ہیں، کبھی نہ کبھی ختم بھی ہو جاتے ہیں، ہمارے بھی ہو جائیں گے ان شاء اللہ۔"

وہ اس پر غصہ نہیں کرنا چاہتی تھی مگر پھر بھی جھنجلا گئی۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو رہا۔

"مجھے اگلا پیریڈ لینا ہے' اور تمہیں یہاں اتنی دیر رکنا بھی نہیں چاہیے اور پلیز آئندہ یہاں مت آنا۔"

سرسری سے انداز میں بنا معاذ کی طرف دیکھے اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور جانے کے لیے مڑی۔ تب ہی وہ اس کے آگے آکھڑا ہوا۔

"برا مت ماننا جویا! لیکن پلیز میری نیت پر شک مت کرو' آپا گل اور سلمان دونوں انتہائی درجے کے خود غرض لوگ ہیں۔ بہت ظالمانہ انداز میں استعمال کر رہے ہیں وہ تمہیں۔ انہیں کوئی پروا نہیں ہے' مرجاؤ گی تم اور وہ....."

"میں اسی یوم نجات کی منتظر ہوں اب' سمجھے تم...." جویا نے دھیمی آواز میں اس کی بات کاٹی۔

معاذ نے دیکھا' جویا کا چہرہ اور لہجہ بے تاثر تھا۔ وزیٹرز روم میں کچھ لوگ آرہے تھے۔ جویا تیزی سے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

وہ اسے دیکھے گیا' جب تک سامنے والے کوریڈور میں وہ اسے نظر آئی' اور جب وہ دوسری طرف مڑگئی' تب وہ بھی کمرے سے باہر آگیا۔

گیٹ سے نکل کر اپنی گاڑی تک آتے ہوئے معاذ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے' اس آخری بات کی کڑواہٹ کو دل میں اترتا ہوا محسوس کیا۔

سو ثابت ہوا کہ وہ مایوسی کی اس آخری حد کو بھی کب کا پار کرچکی ہے۔ جس کے آگے نفع نقصان سب برابر ہیں اور اسے اس حد کے پار کھڑا کرنے میں دوسروں کے ساتھ' وہ خود بھی شریک ہے۔

گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے' اس نے ایک بار پھر خود کو کٹہرے میں کھڑا کیا۔ جویا کی حالت پر اس کا احساس جرم شدید تر ہوا جارہا تھا اور عجیب بات تھی کہ خود اپنے حصے میں آئی محرومی پر وہ اسے کب کا معاف کرچکا تھا۔ گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے اس نے سامنے سڑک پر دوڑتے بھاگتے منظر کو دھندلاتے ہوئے محسوس کیا تو ہتھیلی سے سختی سے آنکھوں کو رگڑا۔

ساری ہتھیلی گیلی تھی۔ تب ہی اس کا سیل فون بج اٹھا تھا۔

خود کو کمپوزر رکھتے ہوئے معاذ نے اسکرین پر آئے نمبر کو دیکھا۔ پہلی نگاہ میں وہ اسے نہیں پہچان سکا۔ یہ کوئی ایسا شخص تھا' جس کا نام اس کے پاس محفوظ نہیں تھا' مگر کام کے سلسلے میں فون کالز آنا معمول کا حصہ تھا۔ سو اس نے سرسری سے انداز میں ہی کال ریسیو کی تھی۔

"ہیلو!"

"السلام علیکم معاذ..... ! سالار بات کر رہا ہوں۔" مہذب اور شائستہ لہجے میں اس نے کسی کو کہتے ہوئے سنا۔

☆ ☆ ☆

وہ نانی ستارہ سے بات مکمل کرکے فون بند کر رہی تھی' جب سالار کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے انداز میں نمایاں سی تیزی تھی اور آتے ہی وہ سیدھا اپنی وارڈروب کی طرف بڑھا تھا۔

"کیا کہیں جارہے ہیں؟"

وہ اس کے قریب آئی تاکہ کپڑوں کے انتخاب میں اس کی مدد کرسکے' مگر وہ حسب عادت سب سے پہلے دکھائی دینے والے کپڑے نکال چکا تھا۔ سفید شلوار قمیص' یا پھر جینز کے ساتھ لائٹ کلر کی مختلف شرٹس۔ وہ عموماً" یہی پہنا کرتا تھا۔

میں نے کپڑوں کے معاملے میں سالار جیسا لاپروا شخص دوسرا کوئی نہیں دیکھا تھا۔ وہاں نانی ستارہ کے گھر میں

گزرنے والی زندگی میں۔ گھر پر آنے والے مردوں سے اس کا واجبی سا سامنا ہوا تھا، مگر وہ سب بہت ویل ڈریسڈ لوگ ہوتے تھے یا شاید نانی ستارہ کے ہاں آنے کے لیے انہوں نے خصوصی تیاری کی ہوئی تھی اور گھر میں استاد فراغت بیگ کے بعد دوسرا مرد صرف خیام تھا، جس کی نازک مزاجی اور اعلا ڈریسنگ کی دھوم سات محلوں تک تھی۔ سالار کی سادہ سی وارڈروب کے سامنے کھڑی ہوئی گیتی کو بہت دن بعد خیام کا یونہی خیال سا آیا۔

کتنی پاگل ہوا کرتی تھی وہ۔ عجب نہیں تھا کہ خیام کے پیچھے رو رو کر جان ہی سے چلی جاتی۔ کتنی دعائیں، کتنے وظیفے پڑھ ڈالے اور آج وہ شکر گزار تھی اپنے رب کی اُن دعاؤں کے لیے، جو اس کے حضور قبولیت کے درجے پر نہ پہنچیں۔

"کس سوچ میں ہو!"

سالار کپڑے بدل کر ڈریسنگ روم سے باہر نکل آیا تھا اور اب ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑا تھا، مگر اس تیزی میں بھی وہ گیتی کے چہرے پر آئے گم صم سے تاثر کو نوٹ کر چکا تھا۔

"تمہیں کچھ کہا کیا زرتاج بیگم نے پھر؟"

"ارے نہیں، آج کل وہ گھر میں ہوتی کہاں ہیں، اور ہوتی ہیں تو کمرے میں ہی رہتی ہیں۔" گیتی ہلکے سے مسکرا دی۔

"چلو اچھا ہے، ویسے ایسے موقعوں کے لیے ایک محاورہ بولا جاتا ہے۔ مگر یہاں وہ اس وقت فٹ ہوگا، جب بلا ئی پوری طرح رخصت ہو جائے گی۔"

بالوں میں برش پھیر کر اس نے پرفیوم کا اسپرے کیا اور شوز اٹھاتا ہوا صوفے پر جا بیٹھا۔

"کون سا محاورہ!" گیتی کی سمجھ نہیں آیا تھا۔

"خس کم جہاں پاک!" وہ اپنی بات کہہ کر ہلکے سے ہنس پڑا۔ گیتی نے بہت محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا اور یہ ساری تیاری محض چند منٹوں کی بات تھی۔

"آپ کیسے جھٹ پٹ تیار ہو جاتے ہیں، ورنہ لوگ تو آدھا گھنٹہ کپڑوں کے انتخاب میں ہی لگا دیتے ہیں۔"

"بے وقوفی ہے، زندگی اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اسے جتنا ضروری کاموں میں صرف کر لیا جائے تو بہتر ہے، وقت کو ضائع کرنا خود اپنے آپ کو ضائع کرنا ہے... اور مردوں کو تو ویسے بھی سادگی کا حکم ہے۔"

"حکم تو عورتوں کو بھی ہے، مگر انہوں نے اپنے آپ کو شاید خود ہی چھوٹ دے لی ہے۔" گیتی آہستگی سے کہتی ہوئی سالار کا والٹ اور موبائل اٹھانے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف مڑی۔

"بات صرف کپڑوں اور دکھاوے کی نہیں گیتی! بہت خطرناک حد تک آگے جا چکی ہے۔ لوگ کبیرہ گناہ سے نہیں ڈرتے، انہیں اپنے آپ سے حیا نہیں آتی۔ جن باتوں پر ڈوب کر مر جانے کا مقام ہوتا ہے، اُن پر فخر کیا جاتا ہے۔ اللہ رحم کرے، یہ دنیا اس کی رحمت کے آسرے پر ٹکی ہے اور کچھ اس لیے کہ اللہ کے کچھ نہ کچھ نیک، بے غرض بندے اب بھی باقی ہیں ہمارے بیچ اور..." وہ بولتے بولتے کچھ خیال آنے پر خود ہی رک گیا۔

"تم قریب ہو اور میں اپنا سب سے ضروری کام بھی نہ بھول جاؤں، یہ ناممکن ہوتا جا رہا ہے اب۔ بہت ضروری ملنا ہے کسی سے... اس نیل کی اصلیت تک پہنچنے کے لیے۔ میں راجو کو بھی ساتھ لے کر جا رہا ہوں اپنے۔"

"مگر وہ تو پوری طرح ٹھیک نہیں ہیں!" گیتی نے فکر مندی سے سالار کو دیکھا، مگر وہ مطمئن تھا۔

"سنبھال رہا ہے وہ خود کو۔ یہی میں بھی چاہ رہا ہوں کل سے اسے آفس بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اچھا بھلا انٹر پاس ہے، کسی کمپیوٹر ٹریننگ پر لگاؤں گا، پھر یہیں آفس میں ایڈجسٹ ہو جائے گا ان شاء اللہ، تو اس کی زندگی کوئی مثبت راہ تو پکڑے گی۔"

گیتی کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ ابھری۔ "ان شاء اللہ۔ جائیں آپ کو دیر ہو رہی ہے۔"

"ارے ہاں، معاذ میرا انتظار کر رہا ہو گا یار! او کے اللہ حافظ۔"

"معاذ...!" گیتی نے آج پہلی بار یہ نام سالار کے منہ سے سنا تھا۔ وہ کہتا ہوا تیزی سے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں اترتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ گیتی اس کے پیچھے آنے کے بجائے نیچے لان کی طرف کھلتی کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

نیچے گاڑی کے ساتھ کھڑا ہوا راجو دکھائی دے رہا تھا۔ چند ہی لمحوں میں سالار بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔

راجو شاید خود ڈرائیو کرنا چاہ رہا تھا، لیکن سالار اسے منع کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ راجو اس کے ساتھ والی سیٹ پر تھا۔

اب اسے سالار کی بات بات پر حیرت ہونا کم ہوتی جا رہی تھی، ہر ایک کے لیے اس کی انسان دوستی اور خیال وہ اس کی فطرت کا سب سے قیمتی حصہ سمجھ کر قبول کرتی جا رہی تھی۔ گاڑی گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ گیتی نے اس کی سلامتی کی دعا کی اور واپس کمرے میں چلی آئی۔

اس کے موبائل پر نگینہ کی کال آرہی تھی۔

گیتی نے ایک تھکی تھکی سی نگاہ سیل فون پر ڈالی۔ وہاں آج کل صندل نے ایک ساتھ کئی پرابلم کھڑے کر رکھے تھے۔ شاید اتنے بڑے نہ بھی ہوں لیکن جتنی بے صبری اور جذباتی وہ ہمیشہ سے تھی، گیتی کو یہاں بیٹھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں نانی اور نگینہ امی کے لیے اسے ہینڈل کرنا کتنا مشکل ہو رہا ہو گا۔ خود وہ صندل کے لیے چاہتے ہوئے بھی نہ وہاں بیٹھ کر کچھ کر سکتی تھی، اور نہ وہاں جا کر، سو اس نے اب تک سالار سے بھی کچھ شیئر نہیں کیا تھا۔

یہاں کے مسائل ویسے بھی زیادہ گمبھیر تھے۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے نگینہ کی کال ریسیو کی۔

"السلام علیکم امی!"

☼ ☼ ☼

سنہری دھوپ بھرے اس سادہ سے کمرے میں سالار خوشی، مسرت اور حیرت کے ایک انوکھے تجربے سے دوچار تھا۔

"میری بہت بڑی خوش قسمتی ہے میں آج آپ سے مل رہا ہوں اسلام صاحب! میں تو یہاں آتے ہوئے سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری ملاقات آپ سے ہونے والی ہے۔ میرے لیے تو آپ، بلکہ میں ہی کیا لاکھوں لوگوں کے لیے آپ رول ماڈل ہیں، لوگ آپ کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتے ہیں۔ آپ کے لکھے ہر لفظ کو..."

ابا انکساری سے مسکرائے گئے۔ جانتے تھے کہ وہ جو کچھ بھی کہہ رہا ہے، دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہے۔ کچھ لوگوں کا خلوص اور ان کی اچھائی ان کے چہرے سے، ان کی آنکھوں سے، ان کی مسکراہٹ سے ہی ظاہر ہوتی ہے، یہ ان کا ذاتی تجربہ تھا، اور سالار ان ہی میں سے ایک تھا۔

"تمہاری محبت ہے بیٹا! ورنہ بہت معمولی شخص ہوں میں، جو کچھ تھوڑا بہت کر پایا ہوں، وہ صرف اور صرف اس رب کی عنایت ہے، میرا کچھ ہنر نہیں۔" سالار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے، بہت محبت سے ان کی طرف دیکھا۔

"تمہارا بہت شکریہ معاذ! جو تم نے مجھے اپنے گھر پر بلایا، ورنہ بڑی زیادتی کر جاتے مجھ سے تم۔" وہ قریب بیٹھے معاذ کی طرف مڑا۔

"اصل میں وہاں اسکول میں اس وقت بچے آنا شروع ہو جاتے ہیں اور وہاں کوئی ایک کونا ایسا نہیں ہوتا، جہاں

ہم بات کر سکتے' اس لیے بس۔" معاذ نے سادگی سے اسے یہاں گھر بلانے کی وجہ بتائی۔
سالار کو یاد آیا کہ وہ اس اسکول کے بارے میں کچھ سن چکا ہے جو کہ اسٹریٹ ورکر بچوں کے لیے کام کر رہا تھا۔
"ہوں' ہوں۔" اس نے پر سوچ نگاہوں سے معاذ کی طرف دیکھا۔ "تمہارا اسکول مجھے کہتا ہے کہ وہاں بھی آنا پڑے گا۔"
"ضرور' مگر اس وقت وہ بات ضروری ہے' جو آپ کرنے آئے ہیں۔ کیا میں زری کو بلالوں؟" وہ اٹھنے لگا تھا' مگر سالار نے اسے روکا۔
"نہیں معاذ! پہلے میں تمہیں تفصیل بتانا چاہتا ہوں' اور انکل آپ کو بھی' اگر آپ کے پاس تھوڑا سا ٹائم ہو میرے لیے۔" سالار کے انداز میں درخواست کی سی کیفیت تھی۔
معاذ اور ابا نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف الجھن بھرے انداز میں دیکھا۔

☆ ☆ ☆

زرتاج بیگم نے لاؤنج کے داخلی دروازے کے کتنے چکر اس مختصر سے وقفے میں بے قراری کے ساتھ لگائے تھے۔
"بیٹھ جاؤ۔ تھک جاؤ گی!" نبیل نے ہمدردی سے مشورہ دیا تھا' مگر وہ بری طرح آؤٹ ہوئیں۔
"کیا جتانا چاہ رہے ہو' بوڑھی ہو گئی ہوں میں' چلنے پھرنے سے قاصر... جو ایک جگہ جم کر بیٹھی رہوں۔"
"غصہ مت کرو زرتاج! میں تمہاری پریشانی کے خیال سے کہہ رہا ہوں' اب اس طرح چکر لگانے سے کیا فائدہ ہو رہا ہے' سکون سے بیٹھ کر کچھ سوچ لیتے ہیں۔"
جب سے زرتاج کی طرف سے لاحق آخری خدشہ بھی ختم ہوا تھا' وہ پھر سے پر سکون اور پر اعتماد تھا۔ زرتاج نے اس بار اس کا مشورہ مان ہی لیا' سو خاموشی سے قریب ہی کاؤچ پر آ بیٹھیں۔
"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ اس پاگل کو لے کر آخر کہاں گیا ہے۔ ابھی تو وہ پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہے۔"
"ہو سکتا ہے ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے لے کر گیا ہو' یا پھر پاگل خانے میں داخل کرانے۔"
زرتاج نے قہر آلود نگاہ نبیل پر ڈالی۔
"راجو جائے نہ جائے' تم ضرور کہیں اور پہنچو گے۔ نبیل! میں حالات کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہوں اور تم انہیں اور بگاڑنے پر تلے ہوئے ہو۔ تم سے تو اتنا بھی نہیں ہو رہا کہ اس راجو کو ہی ہاتھ میں لے لیتے کسی طرح' ورنہ مجال تھی سالار کی کہ وہ اسے اپنا مہو بناتا۔"
"میں اس دو ٹکے کے ڈرائیور کی خوشامد نہیں کر سکتا زرتاج! صاف بات ہے۔" نبیل کے ماتھے پر شکن سی ابھری۔
"وہ دو ٹکے کا ڈرائیور' روزی کا منگیتر تھا۔ وہ روزی جس کی خودکشی کے ذمہ دار تم ہو اور کسی بھی وقت پولیس تم تک پہنچ سکتی ہے۔"
زرتاج کا لہجہ سرد ہوا تھا اور چہرہ بالکل بے تاثر۔
ان کا یہ موڈ ہمیشہ کی طرح' ایک کھلی وارننگ تھا' سو وہ ایک بار پھر نبیل کو خوف زدہ کرنے میں کامیاب رہیں۔
"آہستہ بولو زرتاج! پلیز گھر میں ملازم ہیں' کسی کے کان میں ایک لفظ بھی پڑ گیا تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"
"ہونہہ!" زرتاج نے اس کے خوف زدہ خوشامدانہ انداز کو انجوائے کیا۔

"اتنا ڈرتے ہو تو پھر جرم کرتے وقت بھی ہزار بار سوچنا چاہیے تھا' ایسا کیا تھا اس معمولی ملازمہ میں جو تمہیں ب۔۔۔"

نئی رکھی گئی میڈ چائے لے کر آرہی تھی۔ زرتاج کو بات ادھوری چھوڑنی پڑی۔ نبیل بالکل سر جھکائے بیٹھا تھا۔ آج کل وہ زرتاج کی موجودگی میں کسی عورت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی بالکل بھی غلطی نہیں کرتا تھا۔ حد تو یہ کہ گیتی کی طرف بھی نہیں' پھر بھی زرتاج یہ جتانے سے باز نہیں آتی تھیں کہ وہ اپنا سارا اعتبار کھو چکا ہے۔

"مجھے تم سے زیادہ اپنی فکر ہے' تمہیں کوئی نہیں جانتا' مگر میں ایک جانی مانی عورت ہوں' تمہاری سمیٹی ہوئی گندگی کی چھینٹیں مجھ تک بھی آئیں گی' بس اسی لیے۔" چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے زرتاج نے ایک بار پھر اسے اس کی اوقات یاد دلائی۔

"کہو تو میں باہر معلوم کرکے آؤں کہ وہ لوگ کہاں گئے ہیں' شاید راجو نے کسی سے کچھ ذکر کیا ہو۔" وہ دانستہ بات بدل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ زرتاج نے ایک گہری نگاہ نبیل پر کی' مگر خلاف توقع کچھ کہا نہیں۔

خاموشی نیم رضامندی' سو وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

زرتاج کی نگاہ لاؤنج کی سیڑھیوں سے اوپر کی طرف گیتی کے بیڈ روم میں پر جا کر رکی۔ دن میں کتنی ہی بار یہ گیتی نام کا حوالہ ان کے اندر کی کڑواہٹ کو اور بھی بڑھاتا ہے۔ سالار میں آئی تبدیلیاں محض گیتی کے دم قدم کی بدولت تھیں۔

"نہ وہ ساتھ ہوتی اور نہ ہی وہ جم کر یہاں اس کا دل جلانے بلکہ اب تو ہوش اڑانے کے لیے بیٹھا ہوتا' نکل گیا ہوتا کہیں کا کہیں۔"

ان کا بس چلتا تو وہ یقیناً "سالار سے پہلے اس گیتی آرا کا بندوبست کرتیں' جو راتوں رات ان کی زندگی میں طوفان اٹھانے کا سبب بنی تھی۔

وہ اتنی گم تھیں کہ انہیں نبیل کے لاؤنج میں واپس آنے کی بھی خبر نہ ہوئی۔

"وہ کسی کو بھی کچھ بتا کر نہیں گیا۔ مالی نے تو پوچھا بھی تھا اس سے' مگر اس نے کہا کہ اسے نہیں پتا کہ سالار اسے کہاں لے کر جا رہا ہے۔"

اس مختصر سی رپورٹ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سو وہ اور بھی بدمزا ہو گئیں۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ کسی کو کچھ نہیں بتایا ہو گا راجو نے۔ لوگ تمہاری طرح عقل سے پیدل نہیں ہوتے کہ بنا سوچے سمجھے اپنے لیے مصیبتیں کھڑی کرتے رہیں۔ آوارگی کے لیے کوئی اور راستہ چن لیا ہوتا تو آج۔۔۔" وہ بات کرتے ہوئے ذرا رکیں۔

نبیل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس کا ساتھ بے شک دے رہی ہیں' مگر معاف زندگی بھر نہیں کرنے والی ہیں۔

"اس ایس ایچ او کا کچھ پتا چلا؟"

"نہیں' میں نے آدمی لگائے ہیں پیچھے' معلوم ہو جائے گا جلد ہی۔"

"تم اور تمہارے آدمی!" زرتاج نے بے زاری سے سر کو جنبش دی۔

"پولیس ڈپارٹمنٹ کو اتنا نااہل مت سمجھو نبیل! زمین کی تہہ سے بھی نکال لائیں گے وہ فی الحال تو لاکھوں روپیہ میں نے صرف اس کیس کو سلو ڈاؤن رکھنے کے لیے دیا ہے۔ تھوڑی سی مہلت میں ہی کچھ کرنا ہو گا ہمیں۔"

"تم ضرور کچھ کر لو گی زرتاج۔۔۔ مجھے پتا ہے کہ بہت اوپر تک پہنچ ہے تمہاری۔ آخر اس سے پہلے تم نے مالی کو بھی تو صاف بچا لیا تھا' ایسی ہی صورت حال میں۔ میڈیا دو چار دن شور مچا کر بیٹھ ہی گیا نا' سب بھول بھال گئے۔" نبیل کے لہجے میں گہرا اعتماد اترا۔ ظلم اور بے حسی کی ہر حد سے گزرتا ہوا۔

پہلی بار زرتاج نے خود کو اس کے آگے لاجواب محسوس کیا۔ مالی ان کی شاہانہ زندگی کا سب سے نازک پہلو تھا' جس پر وہ اس کے یہاں سے چلے جانے کے آٹھ سال بعد بھی کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔

"مالی کا کیا ذکر ہے' وہ اس کی نادانی تھی۔" اس کی آواز دھیمی پڑی۔

"انیس سال کا لڑکا بہرحال بچہ نہیں ہوتا زرتاج! شکر کرو کہ وہ قصہ سالار کے نوٹس میں نہیں آیا۔"

نبیل کو اچانک ہی اس بھولے بسرے قصے میں لطف محسوس ہونے لگا۔

"سالار اس زمانے میں یہاں نہیں رہتا تھا۔ پورے چار سال بعد وہ آیا تھا' جب مالی کو گئے ہوئے بھی دوسرا سال تھا' اور یہ وہ زمانہ تھا' جب سالار کے اوپر میرا خوف مسلط رہتا تھا' ایک ہفتہ بھی نہیں ٹک پایا تھا وہ یہاں اور پھر دوبارہ سال دو سال کے لیے غائب' تبدیلی تو اس میں اس لڑکی سے شادی کرکے آئی ہے' اس سے کچھ پہلے ہی جب پچھلے سال وہ یہاں آکر رہا تھا۔ او خدا!"

اپنی دھن میں بولتی ہوئی زرتاج کو اچانک ہی کچھ اور یاد آیا۔ نبیل نے چونک کر اب کی طرف دیکھا۔

"مجھے آج صبح ہی پتا چلا ہے کہ سالار نے حمیدی صاحب کے قتل کے کیس کو بھی ری اوپن کروایا ہے۔ سمجھتے ہو اس کا مطلب؟" وہ پھر سے آگ بگولہ ہوئیں' مگر اس بار نبیل خائف نہیں تھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے' جہاں ایک کیس ختم ہو گا' وہاں دوسرا بھی ہو جائے گا' اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔"

"میں اگر بیچ میں سے ہٹ جاؤں تو تمہیں ایک گھنٹے میں پتا چل جائے گا کہ کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ اس کے اطمینان پر بری طرح تپی تھیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو' لیکن تم بیچ میں سے ہٹ بھی تو نہیں سکتیں نا۔ یہی میری خوش قسمتی ہے۔" نبیل کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہوئی۔

نبیل کا یہ لب و لہجہ نیا بھی تھا اور سخت ناقابل قبول بھی۔ زرتاج تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو نبیل! آج میں تم سے طلاق لے کر خود کو اس سارے مسئلہ سے نکال سکتی ہوں' سالار خواہ مخواہ کی دشمنی پالنے والا شخص نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارے بزنس انٹرسٹ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں اور اس کی ساری دلچسپی روزی اور حمیدی صاحب کے قاتل کو سزا دلوانے میں ہے۔"

غصہ کی شدت سے ان کا چہرہ سرخی مائل ہوا تھا اور آواز قدرے اونچی۔

ایسے ہر موقع پر' آج سے پہلے نبیل نے ان کے پیر پکڑنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ مگر اس وقت وہ بڑے اطمینان سے اٹھ کر ان کے بالکل قریب آکھڑا ہوا تھا' اور اس کی نگاہ زرتاج کے چہرے پر جمی تھی۔

"نہ تم مجھ سے طلاق لے سکتی ہو زرتاج! اور نہ ہی میرے مسئلہ سے خود کو الگ کر سکتی ہو' ورنہ۔۔۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "حمیدی صاحب اور روزی کے کیس کے ساتھ ایک اور کیس بھی ری اوپن ہو گا۔ تمہارے بیٹے کے جرم کا قصہ' میڈیا کو بھولا نہیں ہے۔ وہ جرنلسٹ ابھی بھی اس شہر میں گھوم رہا ہے' جس کا منہ تم اب تک بند رکھے ہوئے ہو۔ اور بھی لوگ ہیں۔ سالار کو خبر ہونے کی دیر ہے' بس اور اس کی انصاف پسند طبیعت اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی سے بھی وہ سلوک کرے گی' جو مجھ غریب سے کر رہی ہے۔"

زرتاج کا چہرہ خطرناک حد تک پیلا پڑا تھا۔ "تم ایسا نہیں کر سکتے نبیل!" ان کی آواز دھیمی پڑی تھی۔

"میں واقعی ایسا نہیں کروں گا' مگر اس وقت تک' جب تک تم مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کرو گی۔" نبیل کا انداز قطعی تھا۔ زرتاج تھکے تھکے انداز میں صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ان کی آستین میں محاورۃً "نہیں حقیقتاً" [illegible] پالا تھا۔

"اور میں اس ہفتے کے آخر تک کچھ دنوں کے لیے لاہور جاؤں گا۔ کچھ دن کے لیے ہٹنا چاہ رہا ہوں یہاں سے' مجھے یقین ہے کہ تم سب کچھ اچھی طرح سنبھالے رکھو گی۔"

اپنی بات اطمینان سے پوری کر کے وہ کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس نے ایک بار بھی زرتاج کے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی' وہ اس کے پیچھے بھی نہیں آئی تھیں۔

اور وہ خود کتنا بڑا ڈفر جو آج سے پہلے اس عورت کی عقل ٹھکانے لگانے کے بارے میں سوچتا بھی نہیں تھا۔

آج نبیل کو سب سے زیادہ غصہ اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سہ پہر ابھی پوری طرح ڈھلی نہیں تھی۔

بڑی سی کھلی کھڑکی کے اس پار چمپا کے زردی مائل پھولوں کے جھنڈ پر چمکتی ہوئی دھوپ خوش امیدی کا احساس دلا رہی تھی اور خوشبو سے بوجھل ہوا کے جھونکوں کی دل فریبی میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔

پھر بھی اس روشن' اجلے' پرسکون کمرے میں دکھ کا گہرا احساس پھیلا تھا۔ سالار نے ان سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔

"خدا کی پناہ!"

اسلام صاحب کی آواز درد میں ڈوبی تھی۔ "ظلم و بربریت کی کتنی داستانیں یہاں اس طرح رقم ہوتی ہوں گی اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی ہوگی روز قیامت کے لیے یہ درندے شب و روز اپنا میزان بھاری کر رہے ہیں اور اس روز کی سنگینی کا احساس کیا' یقین بھی کھو چکے ہیں' اور خدا ہم جیسے مجبوروں کو معاف فرمائے۔ جو ان کی طرف سے جانتے بوجھتے بھی چشم پوشی کرتے ہیں' جواب دہی تو ہمارے بھی ذمہ آتی ہے۔"

سالار نے آنکھ کے گوشے پر رکا آنسو انگلی کے قطرے سے جھٹک کر گرایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں راجو کو باہر سے بلا کر لاتا ہوں تاکہ اس کے سامنے نبیل کی بہن سے بات ہو سکے۔"

"ایک منٹ سالار!" وہ بے ساختہ ہی اٹھ کر کھڑے ہوئے۔

"جی!"

ایک قدم آگے بڑھا کر وہ اس کے بالکل قریب آکر کھڑے ہوئے' سالار نے ان کی آنکھوں میں اتنی دیر میں کتنی ہی بار نمی محسوس کی تھی۔ جب وہ انہیں اس ساری داستان کا خلاصہ سنا رہا تھا۔

نادانستہ ہی سہی' وہ ان جیسے پیارے اور باوقار شخص کو دکھی کرنے کا سبب بنا۔

"میں شرمندہ ہوں انکل! شاید مجھے یہ سب۔۔۔۔"

اسلام صاحب نے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تھا۔ شفیق محبت بھرا لمس' ان کے بازو اس کے کندھوں کے گرد تھا۔ سالار کا دل بے ساختہ جی چاہا کہ وہ اسی طرح اسے گلے لگائے رکھیں۔ اس نے یقین اور تحفظ کا ایسا احساس پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔ یہی وہ کندھا تھا' جس پر سر رکھ کر وہ برسوں کے رکے آنسو بہا سکتا تھا' مگر اس وقت نہیں! وہ نرمی سے ان سے الگ ہوا۔

"مجھے کہہ لینے دو بیٹا! کہ آج تم نہیں' بلکہ میں ایک عظیم شخص سے مل رہا ہوں' انتہائی خراب ترین حالات میں' خود کو سنبھالنا اور انسانیت کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کرنا' کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں سالار!" وہ جھینپ کر مسکرا دیا۔

"بس اب آپ لگے مجھے شرمندہ کرنے!" وہ کہتا ہوا راجو کو لینے باہر نکل گیا۔

"دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے ابا! مجھے تو بڑا حوصلہ ملا ہے سالار سے مل کر۔"
معاذ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہ بہت دیر سے بالکل خاموش تھا اور کوئی شک نہیں کہ آج وہ تینوں ہی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔
"تم زری کو بلا کر لاؤ معاذ! دیکھتے ہیں وہ کیا کہتی ہے' لیکن کچھ بھی ہو' ہم سالار کا ساتھ ضرور دیں گے ان شاءاللہ۔ اللہ کی مہربانی ہے' جو وہ ہمیں ایک نیکی کمانے کا موقع دے رہا ہے۔" ابا اب بہت پرسکون تھے۔
معاذ نے دھیرے سے سر ہلایا اور کمرے سے نکل گیا۔ زری کو اس نے صرف ابا کے کمرے میں چلنے کے لیے کہا تھا اور وہ بنا کوئی سوال کیے اطمینان سے ساتھ چلتی ہوئی آ گئی تھی' مگر اندر قدم رکھتے ہی وہ جس بری طرح چونکی تھی' اسے سب نے ہی نوٹ کیا تھا۔
"آجاؤ زری بیٹا! کچھ ضروری بات کرنی ہے تم سے۔"
ابا کے شفقت بھرے لہجے سے ہی حوصلہ پا کر وہ سر پر دوپٹہ رکھتی' ان سب سے ذرا فاصلے پر کونے والی کرسی پر آ کر بیٹھی۔
"ان سے ملو زری! یہ سالار صاحب اور یہ ... راجو۔"
"السلام علیکم!" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے سرگوشی۔
"وعلیکم السلام!" سالار ہلکے سے مسکرا دیا۔
"دیکھو زری! ہم تم سے تمہارے بھائی کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں اور ....."
بنا کسی تمہید کے سالار نے جو بات شروع کی تھی' زری نے تیزی سے کاٹ ڈالی۔
"میرے بھائی انتقال کر گئے ہیں۔ شاید آپ کو بتایا نہیں ان لوگوں نے۔"
وہ اتنی پر یقین تھی کہ ان سب نے ہی الجھن محسوس کی تھی۔ سوائے راجو کے۔ سالار نے اسی کے اشارے پر بات کو آگے بڑھایا۔
"میں تمہارے دوسرے بھائی کی بات کر رہا ہوں' جس کا نام نبیل ہے۔"
"نہیں ہے وہ میرا بھائی' کب کا مر چکا ہے وہ ہمارے لیے اور ہم اس کے لیے۔ اب میں اس کے حوالے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔"
زری کے لہجے میں سرد مہری تھی اور ماتھے پر گہری شکن' مگر سالار نے اس کے موڈ کی قطعی پرواہ نہیں کی۔
"تمہارے کہہ دینے سے رشتہ ختم نہیں ہو سکتا زری! تمہیں اپنے بھائی سے چاہے کتنی بھی تکلیف پہنچی ہو' لیکن بہرحال وہ ایک حقیقت ہے' یہاں اسی شہر میں رہ رہا ہے' بہت پیسے والا شخص ہے۔"
"وہ صرف کمینہ' بے غیرت اور دنیا کا ذلیل ترین شخص ہے۔ میں اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی۔" زری کی آواز شدت جذبات سے کپکپا رہی تھی۔
معاذ نے اسے گلاس میں پانی نکال کر دیا۔ مگر وہ اسے یوں ہی ہاتھ میں تھامے بیٹھی رہی۔
"ابا! کیا آپ مجھے اپنے گھر سے نکالنا چاہ رہے ہیں؟" اس کا دل وسوسوں سے بھرتا جا رہا تھا۔
"نہیں بیٹا! خدا نہ کرے' یہ تمہارا اپنا گھر ہے' سب تمہارے ہیں' ایسی بات سوچی بھی کیوں تم نے؟" اسلام صاحب نے نہایت محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ بے اختیار رو پڑی۔
سالار اور راجو نے بے اختیار ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں چند لمحے زری کے سنبھلنے کا انتظار کرنا پڑا۔
"جذباتی ہوئے بغیر میری بات کا جواب دو زری! اگر نبیل تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہے' یا ویسے ہی ملنا چاہے' تو کیا ہم اسے تمہارا پتا بتا دیں؟ بہرحال وہ تمہارا بھائی ہے۔" سالار کا لہجہ ... تھا۔

زری نے ہتھیلی سے رگڑ کر اپنے چہرے کو خشک کیا۔
"بار بار ایک ہی گالی مت دیں صاحب! اگر آپ نے اس آدمی کو میرا پتا دیا تو میں یہاں سے کہیں اور چلی جاؤں گی۔ اس کے ہاتھ لگ گئی تو بیچ ڈالے گا مجھے' پہلے بھی دو بار میرے رشتے کا جھانسا دے کر وہ لوگوں سے روپیہ لے چکا ہے۔ وہ تو میرے چچا حیدرآباد لے گئے تھے' مجھے کسی رشتے دار کے ہاں چھپایا ...." جو بات بہت حوصلے سے شروع کی تھی' پھر سے نمی میں ڈوبی۔
ان سب کے لیے ایک دوسرے سے آنکھ ملانا مشکل ہوئی۔
"ڈر کے کتنے عنوان اور ظلم کی کتنی داستانیں۔" سالار نے شہادت کی انگلی سے ماتھے کو ہلکے سے مسلا۔
"یارب! تیرے یہ مظلوم و مجبور بندے۔"
"تم جاؤ زری! اور معاف کر دینا' میری وجہ سے تمہیں جو تکلیف اٹھانی پڑی اس وقت۔"
"شکریہ صاحب!" وہ اشارے کی ہی منتظر تھی' فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ویسے اس آدمی کے بارے میں جو شخص سب سے زیادہ جانتا ہے' وہ تو آپ کے ساتھ ہی بیٹھا ہے' اس سے پوچھ لیجیے! جو بھی کہا ہے' وہ غلط ہے یا صحیح۔ کیوں راجو! تم کیوں چپ بیٹھے ہو؟ سب سے گہرے دوست تو تم ہی ہو اس کے' ہر بات سے واقف ہو' بولتے کیوں نہیں ہو' یا پیسہ کھلا رکھا ہے تمہیں؟ جو حرام وہ کما رہا ہے اس میں سے۔"
راجو نے اضطراب سے پہلو بدلا۔
وہ ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں تھا۔ سالار نے فکرمندی سے اسے دیکھا۔
"جاؤ زری! تم جاؤ باہر!" معاذ نے ذرا سختی سے اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔
ان سب کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ زری کمرے میں آتے ہی کیوں چونکی تھی۔
"ٹھیک ہے! پھر ہم چلتے ہیں' سو اجازت؟" سالار اٹھ کر کھڑا ہوا۔
معاذ اور ابا اسے باہر تک چھوڑنے آئے۔
"میں اور معاذ ہر طرح' ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں سالار! پولیس کو اپنا کام کرنے دو اور نبیل اور زرتاج بیگم کو اپنی طرف سے زیادہ ہوشیار کرنے کی بھی ضرورت نہیں' خود کو جان بوجھ کر خطرے میں مت ڈالنا بیٹا! یہ میرا حکم بھی ہے اور نصیحت بھی۔"
جب وہ گاڑی کے قریب کھڑے تھے تو اسلام صاحب نے بہت سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔ سالار کو اچھا لگا۔
"خدا حافظ معاذ!" اس نے آگے بڑھ کر معاذ کو گلے لگایا۔ "بہت جلد میں اور گیتی تمہارے اسکول آ رہے ہیں۔ وہ بہت خوش ہو گی' اگر تم اسے بھی وہاں پڑھانے کی آفر کرو گے ..... اور میں بھی۔"
"اس سے اچھی کیا بات ہو گی' پڑھانے والے مل جائیں تو ہم بچوں کی تعداد بڑھا سکتے ہیں۔"
"ہوں!" سالار کے ذہن میں کچھ اور آئیڈیا آ رہا تھا' مگر فی الحال خاصی دیر ہو چکی تھی۔
"تمہیں زری کا انداز برا لگا راجو؟" واپسی پر اس نے گم صم بیٹھے راجو کو نارمل کرنے کے لیے بات چھیڑی تھی۔
"زیادہ فیل مت کرو پلیز! وہ بے چاری یوں ہی مظلوم سی لڑکی ہے۔"
"مظلوم تو روزی بھی تھی سر! زری سے کہیں زیادہ۔" راجو کے دھیمے لہجے میں بہت ہی نمایاں گلہ تھا۔
"اس بے چاری نے تو یتیمی میں آنکھ کھولی تھی' اور پھر زرتاج بیگم جیسی سخت دل عورت کے پاس رہی وہ' مرنا بھی بے عظمت تھا اس کے لیے۔" وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔
سالار نے غیر دانستہ طور گاڑی کی رفتار بڑھائی تھی۔ روزی نام کا یہ دل دکھاتا بوجھ' اب زندگی کا حصہ تھا۔

"مجھے زری کی باتوں کا رنج نہیں ہے سر! میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔"
ڈرائیو کرتے سالار نے راجو کی طرف دیکھا۔
"میں سوچ رہا تھا کہ نبیل جیسے درندے کی بہن کو خدا نے کیسے محفوظ اور شریف گھرانے کا حصہ بنا دیا۔ نبیل ایسی کسی آزمائش میں کیوں نہیں پڑا' جو اس کی وجہ سے دوسروں کے حصے میں آئیں؟ اللہ نے اسے اتنی ڈھیل کیوں دی.....؟" کھوئے کھوئے انداز میں وہ کہتا چلا گیا۔
سالار نے دھیرے سے اس کا کندھا تھپکا۔
"اس رب سے کبھی مایوس نہ ہونا راجو! وہ سریع الحساب ہے۔" راجو گم صم سر جھکائے بیٹھا تھا۔
"اس نے اپنی دنیا میں مکافات عمل کا قانون رائج رکھا ہے۔ پناہ مانگنی چاہیے ہر بندے کو' اس چھوٹے سے چھوٹے عمل سے' جس سے وہ کسی بھی انسان کی جان' مال اور آبرو کو بہت ہلکی سی بھی چوٹ پہنچاتا ہے۔ نبیل کے حصے میں بھی وہ کچھ آئے گا' جس کا اس وقت میں اور تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بس بھروسا رکھو اس پر۔"
راجو کا جھکا ہوا سر ہلکے ہلکے اوپر اٹھا۔
محض ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں امید کی چھوٹی سی کرن جگمگائی۔
سالار ہلکے سے مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

"مجھ سے کچھ کرنے کو نہ کہا جائے' میں سخت ڈپریشن میں مبتلا ہوں۔"
"کیا؟" شاکرہ امی کمرے سے نکلتے ہوئے' چونک کر واپس مڑیں۔ "کیا کہا تم نے؟"
"جو کہنا تھا' ایک بار کہہ دیا' آپ کو پتا نہیں ہے ڈپریشن کا مریض زیادہ بولنا بھی پسند نہیں کرتا' اسے خاموشی پسند ہوتی ہے۔"
منہ پر اخبار ڈالے وہ صبح سے اسی بڑے صوفے پر نیم دراز تھا' جو پرانے اچھے وقت کی یادگار تھا۔ وہ چپ چاپ چلتی ہوئی اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔
"دیکھ سلمان! تجھے اللہ کا واسطہ' میرے حوصلے کو اتنا مت آزما۔۔۔ پتا نہیں کیسے کھڑی ہوں میں ان حالات میں۔ اپنی بیماری وبیماری سب بھول گئی۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا کڑا وقت بھی دیکھنا لکھا ہے نصیب میں۔"
"عجیب بات ہے' ورنہ اب تک تو آپ کو عادی بھی ہو جانا چاہیے تھا' ایک لمبا عرصہ ہو رہا ہے اب تو اس خستہ حالی کو جھیلتے ہوئے۔۔۔" اخبار چہرے سے ہٹاتے ہوئے' وہ تلخی سے مسکرایا۔ وہ نہ ان کی آنسوؤں سے بوجھل آواز سے متاثر ہوا تھا اور نہ ہی آج کے دن کی اہمیت ہی کو وہ لفٹ دینے کے لیے تیار تھا۔
شاکرہ امی' اداس نظروں سے اس کی شکل دیکھے گئیں۔
اس مرادوں کے ساتھ پلنے والی' اس اکلوتی اولاد نرینہ نے پتا نہیں' انہیں کہاں کہاں مایوس کرنے کی ٹھانی تھی۔

"تمہارے ابو پیشی پر عدالت آئیں گے تو تمہیں نہ دیکھ کر انہیں کتنی مایوسی ہو گی۔ پچھلی دفعہ بھی تم نہیں گئے تھے۔"
"اب اتنی جلدی جلدی کون جا سکتا ہے' کورٹ کون سا یہاں رکھا ہے اور پھر ذرا وہاں کا رش دیکھیں! کانوں کو ہاتھ لگائیں گی آپ بھی۔ آسان نہیں ہے وہاں ایک بار بھی جانا۔"
"جویا تو ہر بار ہی جاتی تھی۔" ان کے منہ سے بے ساختہ ہی نکلا۔

سلمان نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
"جویا کی کارکردگی جتانے کے بجائے' اگر آپ آپا گل کو ان کی نااہلی کا احساس دلائیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ دعوے تو بہت کیے تھے انہوں نے کہ اب وہ اور اکبر بھائی سارے معاملات کو دیکھا کریں گے' مگر صرف وکیل کو پکڑ لانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کیا گیا ان سے۔"
"بغیر فیس کا وکیل ہے' یہ بھی کم احسان ہے کیا؟" وہ ٹھنڈی سانس لے کر واپس بیٹھیں۔
"بے کار کی باتیں!" اپنے ڈپریشن کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا کر وہ آپا گل کے احسان کے بخیے ادھیڑنے کے لیے تیار ہوا۔
ہزار' دو ہزار' ہر پیشی پر نکلوا لیتے ہیں' آپا گل کے وکیل صاحب۔ فوٹو کاپیاں کروانی ہیں۔ اس کو دینے ہیں' اس کو دینے ہیں' ان سے تو وہ پہلے والے ہی اچھے تھے' جنہیں جویا نے معاذ اور اسلام چچا کے چکر میں آکر ہٹایا تھا۔"
"وہ خود چھوڑ گئے تھے۔ پیسوں کے بغیر کام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پتا تو ہے تمہیں۔"
اعصاب کو مستقل توڑتی صورت حال' نادانستہ ہی سہی' کچھ نہ کچھ سچ کہنے پر مجبور کرتی تھی۔
"اسی طرح کرنا تھا تمہیں' تو پھر اسلام بھائی کے ساتھ جھگڑا مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو خود چل کر آگئے تھے۔" اپنی بات کہہ کر وہ خود بھی جھینپ سی گئیں۔
"اب ڈال دیں سب الزام میرے سر' ایک بار آپ اور آپا گل' یہ طے کر لیں کہ ابو کو چھڑانا زیادہ ضروری ہے یا گھر کی عزت کو بچانا اور پھر اس بات پر قائم رہیے گا۔" وہ بری طرح تلملایا تھا۔
"اسلام چچا' ابو اور آپ کی محبت میں نہیں چلے آئے تھے۔ وہ صرف معاذ اور جویا کی سیٹنگ کو ٹھیک کرنے کے چکر میں' ہم پر احسان لادنے آئے تھے' ٹھیک کہہ رہا ہوں یا غلط؟"
شاکرہ امی' زیر لب کچھ بڑبڑا کر رہ گئیں۔
ادھ کھلے دروازے سے سامنے کچن میں کام کرتی جویا دکھائی دے رہی تھی۔
آج اس کا اسکول کسی تفریحی ٹرپ پر گیا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح' کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے' جانے سے گریز کر گئی تھی۔
گھر والوں کے لیے بہانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ یہاں عرصہ ہوا یہ بات خارج از بحث ہوئی تھی کہ اسے بھی کسی تفریح یا سکون کی ضرورت ہے۔
شاکرہ امی یوں ہی خالی خالی نگاہوں سے اسے کام کرتے دیکھے گئیں۔ ذہن ابھی تک وہیں اسی مسئلہ میں اٹکا ہوا تھا۔
"میری خاطر چلا جا سلمان! تھوڑی سی دیر کے لیے ہی' بس اپنی شکل اپنے ابو کو دکھا کر آجانا ورنہ کوئی نہیں گیا تو وہ ایک اودھم مچا کر رکھ دیں گے۔ پتا ہے نا ان کے غصہ کا۔"
خوشامد۔۔۔ ذرا ذرا کچھ تو کارگر ہوتا' مگر وہ تو بے حسی کے ساتھ ہنستا ہی چلا گیا۔
"وہاں ہنگامہ کریں گے' تو بہت برا بھگتیں گے بھی۔ یہ انہیں بھی خبر ہے اس لیے وہاں ایسا کچھ نہیں کرنے والے وہ۔ آپ بے فکر رہیں۔"
اپنی بات کہہ کر' وہ پھر سے اس طرح ہنسا' جیسے آج کے دن کا بہترین لطیفہ تخلیق کر کے' خود اپنے آپ کو ہی داد دے رہا ہو۔
بڑے چھوٹے کا لحاظ کیے بغیر ان کے ہاں ایسی باتوں پر قہقہے لگانے کا دستور پرانا تھا' مگر پہلے یہ ہنسی دوسروں کی اڑائی جاتی تھی۔

"اچھا! پریشان نہ ہوں، میں کرتا ہوں بندوبست۔" اتنا ہنس لینے کے بعد اس کا موڈ اچھا ہو چکا تھا۔ شاکرہ امی کے دل پر رکھا بوجھ بھی کچھ کم سا ہوا۔

"جویا، جویا!" شاید اس نے جانے سے پہلے چائے کا ایک کپ پینا چاہا تھا، شاکرہ امی کو ایسا ہی لگا تھا، سو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں لاتی ہوں چائے، تم جا کر کپڑے بدل لو۔"

مگر وہ ان کی بات سننے کے بجائے دروازے میں کھڑی جویا سے مخاطب تھا۔

"آج تو تم بالکل فارغ ہو جویا! دو گھنٹے بعد پیشی ہے ابو کی۔ پتا ہے نا۔"

شاکرہ امی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ جویا کو کیوں اطلاع دے رہا ہے جب کہ وہ اس معاملے سے قطعی علیحدہ کر دی گئی تھی۔

"ایسا کرو، تم کورٹ چلی جاؤ، عارف صاحب سے مل لینا، میں انہیں فون پر بتا دوں گا کہ تم آ رہی ہو۔ ابو کا حال چال پوچھ لینا اور زیادہ دیر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کام ختم ہوتے ہی سیدھی گھر واپس آؤ۔"

عجیب کھردرے سے لہجے میں اس نے سامنے کھڑی جویا کا ٹائم ٹیبل سیٹ کیا اور اطمینان بھری سانس لی۔ شاکرہ امی نے بوکھلا کر سلمان کی طرف دیکھا۔

"جویا نہیں جائے گی، ارے گل نے سن لیا تو طوفان کھڑا کر دے گی، پہلے ہی کتنا ہنگامہ ہو چکا ہے اس بات کو لے کر۔"

"وہ ہنگامہ دوسری بات پر تھا، ابو کے کیس کی وجہ سے نہیں تھا، جاؤ! دیر ہو رہی ہے۔"

سلمان کا فیصلہ حتمی تھا اور گھر میں اس کی حیثیت مستحکم تر۔ شاکرہ امی نے ٹھنڈی سانس لی۔

"چلی جا جویا! آخر پہلے بھی تو جاتی ہی تھی اتنے عرصے سے، آج سلمان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ورنہ یہ تو خود ہی چلا جاتا۔"

نہ ان کی سلمان سے محبت نئی تھی اور نہ ہی بے حسی کی حدوں کا کب کا پار کر لینے کا رویہ ہی، پھر بھی کسی کسی وقت تو دل کو بہت زور کا دھکا لگتا ہی تھا۔

کپڑے بدلتے، بالوں میں الٹا سیدھا برش پھر ہیئر بینڈ میں کستے ہوئے، جویا نے کتنی ہی بار رگڑ کر آنکھوں کو خشک کیا اور بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

شاکرہ امی اور سلمان نے اسے سیڑھیوں کا رخ کرتے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی تھی۔

"یہ کچھ ایب نارمل ہوتی جا رہی ہے، اب دیکھ لیں جاتے ہوئے اتنا بھی نہ کہا کہ میں جا رہی ہوں۔" ریموٹ اٹھاتے ہوئے سلمان نے شاکرہ امی کی طرف دیکھ کر کہا اور پھر سے اسی صوفے پر نیم دراز ہوا۔

"اچھا ہے! اسکول میں جاب کر رہی ہے۔ اس کے لیے مصروفیت اچھی چیز ہے۔ اب کچھ وقت کورٹ آنے جانے میں بھی گزر جائے گا۔ میں تو زویا کے بھی میڈیکل میں جانے کا مخالف تھا۔ وہ بھی کہیں اسکول وغیرہ میں پڑھا رہی ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔۔۔"

"میں تمہارے لیے چائے بنا لاتی ہوں۔" شاکرہ امی کو خود بھی طلب ہو رہی تھی۔ سلمان کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

ٹی وی پر تصویر صاف نہیں آ رہی تھی، آج کل وہ اسی طرح مسئلہ کرنے لگا تھا۔

ایک کے بعد ایک اس نے کتنے ہی چینل بدل ڈالے اور پھر اکتا کر ٹی وی بند کر دیا۔

ڈیفنس کے اس خوب صورت گھر کی یاد دن میں کتنی ہی بار بے چینی کا سبب بنتی تھی۔

آسائشوں سے بھرا ہوا، آرام دہ گو پرسکون نہیں، مگر کیا فرق پڑتا تھا۔ زوبیہ کی تلخ مزاجی کو جھیل لینے کے بعد اس جیسے سہل پسند کے لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

موسم گرما اب زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا اور اس چھوٹے سے بالائی منزل پر بنے پورشن میں ایک اور تپتا جھلستا سیزن گزارنے کا تصور ابھی سے ہوش اڑا رہا تھا۔

"کاش اس نے زوبیہ کے گھر سے قدم نکالنے کی غلطی نہ کی ہوتی۔ معافی تلافی، خوشامد، غلامی، کچھ بھی سہی مگر اس بار وہ زوبیہ کو سمجھنے میں بڑی بھاری غلطی کر گیا تھا، جو خفگی محض چند دنوں کے دورانیے پر مشتمل ہونے والی تھی۔ اب نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر آرہی تھی۔

"بدشکل، کم عقل، ناشکری عورت!"

سامنے الماری کے شیشے میں نظر آتے اپنے عکس کو فخریہ نظروں سے دیکھتے ہوئے سلمان نے زوبیہ کی عقل پر افسوس کیا، جو اس جیسے جوان رعنا کو ٹھکرانے کی بے وقوفی کی مرتکب ہوئی تھی اور ایک نہ ایک دن لازمی پچھتانے والی تھی۔

موبائل پر زوبیہ کے نمبر کو بار بار ٹرائی کرتے رہنا، اب معمول کا حصہ تھا۔ کسی وقت وہ اس کا فون ریسیو کرتی اور زیادہ تر نہیں۔ مگر آج اس کا فون آف تھا۔ سلمان نے تھک ہار کر فون ایک طرف رکھا۔ شاکرہ چائے لے آئی تھیں۔

"کیا ہوا؟ ہاتھوں میں درد ہو رہا ہے؟" اسے ہاتھوں کی انگلیاں دباتے دیکھ کر انہیں فکر ہوئی۔

"نہیں، کچھ نہیں۔" اس نے چائے کا کپ لیتے ہی منہ سے لگایا۔

"اف! اتنی گرم۔"

"تو تمہیں بھی ایسی کیا جلدی تھی، چائے کہیں بھاگی جا رہی تھی کیا؟ سارا منہ جل کر رہ گیا ہوگا۔"

"چائے نہیں بھاگی جا رہی، مجھے جانا ہے۔" اس کے انداز میں بڑی واضح عجلت تھی۔

"کہاں جا رہے ہو؟ ڈاکٹر کے پاس؟ چلو! میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ بہت دن سے بی پی چیک نہیں کروایا۔"

"مجھے زوبیہ کے پاس جانا ہے۔ جب تک وہ نہیں مانتی، کوشش تو کرتے ہی رہنا ہے۔ اب یہیں تو نہیں بیٹھا رہوں گا ساری عمر۔"

شاکرہ امی نے ایک خاموش سی نگاہ سلمان کے چہرے پر ڈالی۔ کتنی ہی بار وہ اپنی بے عزتی کروا کر آچکا تھا۔ ہر بار ان کا دل پہلے سے زیادہ دکھتا تھا۔ اب ایک دفعہ پھر!

"کیا فائدہ ہوگا؟ وہ پھر نوکروں سے دھکے دلوائے گی، پٹوائے گی۔ میری مان! رہنے دے، بہت بڑی فسادن ہے زوبیہ۔ کبھی نیکی آئی اس کے دل میں تو خود ہی آجائے گی۔ ورنہ چھوڑ دے اس بدذات کا پیچھا۔"

ان کے لہجے میں تلخی اور بھی گہری ہوئی۔

"بس یہی تو جاہلانہ باتیں ہیں۔ زوبیہ میری وجہ سے نہیں آپ لوگوں کی وجہ سے تنگ آئی تھی۔ اوپر سے یہ ابو نے جو کارنامہ سرانجام دیا، وہ بے چارے شریف لوگ سارے میں ذلیل ہو کر رہ گئے اور خود ہمارے والد صاحب آرام سے منہ چھپا کے وہاں جیل میں آرام فرما رہے ہیں۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑا، صرف میری زندگی برباد ہو گئی۔"

وہ چائے کا ادھ پیا کپ پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی ناکامی کا غصہ وہ اکثر ہی اتار لیا کرتا تھا، مگر اس وقت کس بات کا غصہ تھا؟ اسے کمرے سے نکلتا دیکھ کر شاکرہ امی نے حیرت سے سوچا۔

جویا جا چکی تھی اور اب وہ آرام سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھ سکتا تھا۔ چائے بنا کر لانے کے مختصر سے وقفے میں ہی اس کی ذہنی رو بہک گئی تھی۔

انہیں نہیں پتا تھا کہ اس وقت، سارا قصور محض ٹی وی کی خرابی کا تھا۔

"میرا بدنصیب بچہ، حاسدوں کی نظر کھا گئی اسے۔"

بہت رقت سے انہوں نے اللہ سے حاسدوں کی شکایت لگائی۔

☼ ☼ ☼

کورٹ کے پرہجوم اور افراتفری میں ڈوبے ماحول میں اکیلی کھڑی جویا کے سر پر کسی دست دعا کا سایہ نہیں تھا۔

فریدالدین ایڈووکیٹ اسے ٹھیک وہیں ملا، جہاں سلمان نے بتایا تھا۔

"تو آپ ہیں ابرار احمد کی بیٹی، جویا احمد!" اپنی چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھیں جویا کے چہرے پر جمائے اس نے بڑے شوق سے تصدیق چاہی تھی۔

"جی!" مختصر سا جواب دے کر وہ اس کی آفر کی ہوئی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔

"آج سلمان بھائی نہیں آسکے کسی وجہ سے، اس لیے مجھے آنا پڑا۔" اس شخص سے نگاہ چراتے ہوئے جویا نے خود کو خاصا مضطرب محسوس کیا تھا۔

"وجہ کچھ بھی سہی، آپ سے مل لینا تو میری اپنی ذاتی خوشی کا سبب بن رہا ہے۔ کیا منگواؤں آپ کے لیے؟" چھوٹی چمکتی آنکھوں میں معنی خیزی اتری تھی۔

☼ ☼ ☼

باہر دروازے پر اچانک ہی ہنگامہ سا جاگ اٹھا تھا۔ اوپری منزل کے ٹھنڈے پرسکون لاؤنج میں ٹی وی دیکھتی ہوئی زوبیہ نے پہلے چند منٹ تو اسے توجہ کے قابل بھی نہیں سمجھا تھا، مگر جب آوازیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں، تو پھر دخل اندازی بھی ضروری ٹھہری۔

"نسرین!" ملازمہ کا اولین فرض اس کی آواز پر کان لگائے رکھنا ہی تھا، سو دوڑی چلی آئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیسا جھگڑا ہے گیٹ پر؟ کچھ ہوش ہے ان لوگوں کو کہ آس پاس بھی آوازیں جا رہی ہوں گی۔ بند کرواؤ یہ سب۔" وہ بری طرح بگڑی تھی۔

نسرین غریب شش و پنج کا شکار ہوئی وہیں کھڑی تھی۔ زوبیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ جی، وہ آئے ہیں۔ بڑا جھگڑا کر رہے ہیں اندر آنے کے لیے۔ گارڈ کو پتھر کھینچ کر مارا ہے انہوں نے اتنا بڑا ..." ہاتھوں کے اشارے سے اس نے پتھر کے سائز کو بھی واضح کیا تھا۔ "وہ تو شکر ہے کہ بے چارہ بچ گیا، ورنہ سر کھل جاتا تو دس بارہ ٹانکے آجاتے۔"

ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے زوبیہ نے بے اختیار سر پکڑا۔

"جاؤ تم!" وہ اسے جانے کا کہہ کر، خود چلتی ہوئی کھڑکی کی طرف آئی۔

نیچے سلمان کی ملازموں کے ساتھ ہاتھا پائی ابھی تک جاری تھی۔ چند لمحوں میں ہی زوبیہ کو سلمان کی زیادتی کا [illegible] اندازہ ہونے لگا۔

[illegible] بری طرح سے پیش آرہا تھا۔ پتھر، لکڑی جو بھی ہاتھ لگتا، کسی کے دے مارتا، جبکہ ملازم اس کی سابقہ حیثیت کا [illegible] کر کے اس پر ہاتھ اٹھانے سے اب بھی گریز ہی کر رہے تھے۔

[illegible] سلمان کے ہاتھ اور زبان ایک ساتھ چل رہے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نسرین خالد

"سر پلیز! ایک چانس اور دے دیں' اب سارا کام ٹھیک ہوگا۔" ریحام نے التجا کی۔

"نو نو۔۔۔ نیور۔ ان چار مہینوں میں ہم تمہیں چار سو چانسز دے چکے ہیں' اب بالکل نہیں۔ خدا کے واسطے ہمارے میگزین کا پیچھا چھوڑ دو۔" سہیل صاحب نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے۔

"یہ تو قیامت تک نہیں ہوگا۔" ریحام نے ڈھٹائی کی حد کردی اور کرسی کھسکا کر بیٹھ گئی۔

"اوہ خدا۔۔۔ تم نے تو ہمارا میگزین تباہ کرنے کا ٹھیکہ لے لیا ہے' کیوں نہیں چھوڑتیں ہمارے میگزین کا پیچھا۔" سہیل صاحب تنگ آکر بولے۔

"ٹھیک ہے سر' ٹھیک ہے۔" ریحام نے اوور ایکٹنگ کی۔ "میں جا رہی ہوں' ہمیشہ کے لیے۔" ریحام کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"تمہاری بڑی مہربانی' جاؤ جاؤ' مگر اس طرف تو کھڑکی ہے۔" سہیل خان حیرت سے بولے۔

"سر! آپ سمجھ نہیں رہے۔ میں اس دنیا سے جا رہی ہوں۔ میں کھڑکی سے کود کر خودکشی کر رہی ہوں۔" ریحام نے انہیں ڈرانے کی کوشش کی۔

"خودکشی؟ تم کو مرنے کے لیے بھی ہمارا آفس ہی ملا ہے؟" سہیل خان جھنجلائے۔ "اچھا تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"جی سر! بالکل۔" ریحام نے اٹل انداز میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔" سہیل صاحب' ایک سادہ کاغذ ریحام کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "تم مرنے سے پہلے اپنا بیان لکھ جاؤ کہ تم اپنی مرضی سے مر رہی ہو۔"

"سر میں مر رہی ہوں اور جہاں تک رہی بیان کی بات' تو وہ تو میں ضرور لکھوں گی کہ میری موت کے ذمہ دار سہیل خان ہیں۔" ریحام نے پیپر سہیل خان سے لیتے ہوئے انہیں دھمکایا۔

"واٹ۔" سہیل صاحب نے ریحام کے ہاتھ سے کاغذ کھینچا۔ "لڑکی! آخر ہم نے تمہارا بگاڑا کیا ہے؟" سہیل صاحب نے چشمہ اتارتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

"سر اب روئیے مت' نہیں تو مجھے آپ پر ترس آجائے گا۔" ریحام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سر! اک چھوٹی سی پرابلم یہ ہے کہ میں آپ کے کام سے' آپ کی پرسنالٹی سے اتنی متاثر ہوں کہ میرا دل ہی نہیں کرتا یہ جاب چھوڑنے کو۔" ریحام نے مسکہ لگایا۔

سہیل صاحب کی گردن فخر سے تھوڑی اکڑ گئی۔ وہ یہ میگزین آٹھ سالوں سے نکال رہے تھے۔ "شمع" نامی یہ ہفت روزہ میگزین عام سا تھا۔ "ہم بھی سوچتے تھے کہ جب تم کو کوئی فنانشل مسئلہ نہیں ہے' پھر بھی کیوں نہیں چھوڑتیں ہمارا میگزین۔" سہیل صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

ریحام مسکرائی۔ "آخر لگا دیا نا باتوں میں۔"

"مگر سب باتوں کی ایک بات۔" سہیل صاحب نیبل پہ مکا مارتے ہوئے بولے۔

"وہ کیا سر؟"

"وہ یہ کہ تم ہماری جتنی مرضی تعریف کرلو' مگر ہمیں تم کو اپنے آفس میں نہیں رکھنا۔ ان چار مہینوں میں تم نے دس شخصیات کے انٹرویو لیے ہیں جن میں سے کسی ایک نے بھی تمہیں پورا انٹرویو نہیں دیا' تمہارے اوٹ پٹانگ سوالوں کی وجہ سے' اور تم ایک دن بھی وقت پر نہیں آئیں۔" وہ غلطیاں گنواتے گنواتے ایک دم بولے۔ "مگر خیر! یہ تو بہت اچھا ہوا' نہیں تو روز تم کو پورے پانچ گھنٹے برداشت کرنا پڑتا۔ ویسے ایک بات تو بتاؤ!"

"جی سر! پوچھیں۔" ریحام نے مودب انداز میں کہا۔

"ہم تمہیں چار گھنٹے برداشت نہیں کرسکتے تو یہ تمہارے گھر والے تم کو مستقل کیسے برداشت کرتے ہیں؟" سہیل صاحب نے ایسے پوچھا جیسے اس کے گھر والوں کی ہمت کو سراہ رہے ہوں۔

"سر! بابا تو زیادہ تر بزی ہوتے ہیں اور دادو کو تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ آخر ان کے اکلوتے بیٹے کی اکلوتی بیٹی ہوں۔" ریحام نے فخر سے کہا۔

"اور تمہاری والدہ؟"

"وہ تو میری پیدائش سے ایک مہینہ پہلے ہی وفات پا گئی تھیں۔"

"واٹ؟" سہیل صاحب کا حیرت سے کھلا منہ دیکھ کر ریحام کو غلطی کا احساس ہوا۔ "میرا مطلب ہے کہ میں ایک مہینے کی تھی تب ان کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔" ریحام نے فوراً تصحیح کی۔ "مجھے بچپن سے میری دادو نے پالا ہے۔"

"اوہ! ویری سیڈ' ویری سیڈ۔" سہیل صاحب نے گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے دکھ سے کہا۔

"سر! ان باتوں کو چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ آپ مجھے میگزین میں رکھ رہے ہیں یا نہیں؟"

"ہمارا خیال ہے کہ تم کو ایک چانس دے دیں، بٹ آخری چانس، تم کو کل حارث خان کا انٹرویو کرنا ہے۔"

"حارث خان؟" ریحام کی حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں۔ "فیمس سنگر حارث خان؟"

سہیل صاحب نے مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔

"سر! وہ مانا کیسے؟" اس کی حیرت کم نہ ہوئی۔

"ارے! ہمیں کون انکار کر سکتا ہے۔" سہیل صاحب نے فخر سے کہا۔

"بس سر! ابھی مت چھوڑیں۔ عام سے عام پرسنالٹی تو انٹرویو دینے کے لیے راضی نہیں ہوتی اور وہ تو سپر اسٹار ہے۔ اچھا! یہ بتائیں، جانا کب ہے؟" ریحام نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"پرسوں پانچ بجے کا ٹائم لیا ہوا ہے، اگلے ہفتے کے میگزین میں چھپنا ہے سجاد (فوٹو گرافر) بھی جائے گا۔"

"او کے سر! پھر میں چلوں۔" ریحام اٹھتے ہوئے بولی۔

"مگر یاد رکھنا! یہ آخری چانس ہے۔" سہیل صاحب کی بات سن کر وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

ریحام خاصی پرجوش تھی۔ وہ اور بھی اسٹارز کا انٹرویو کر چکی تھی، مگر حارث خان تو آج کل عروج پر تھا۔ اس نے کچھ دن پہلے ایک عام سے پاپ سنگر سکندر علی کا انٹرویو کیا تھا۔ اس کی عجیب سی شخصیت تھی۔ ضرورت سے زیادہ خود پسند اور ریحام صاحبہ میں تو تھی ہی برداشت کی کمی۔ بس جی! اسے وہ وہ سنائیں کہ اس نے نہ صرف انٹرویو دینے سے انکار کر دیا، بلکہ نکل جانے کا حکم بھی "فوراً" ہی دیا تھا... اور پھر وہ انٹرویو بھی اور انٹرویوز کی طرح ادھورا رہ گیا۔

سہیل صاحب ہر دفعہ اسے نکل جانے کا حکم دیتے، مگر وہ ہر دفعہ انہیں انکار کر دیتی۔ اس نے بوریت سے بچنے کے لیے ملازمت کی تھی۔ جب اس نے ملازمت کا ارادہ کیا تھا تو پہلے پہل تو بابا نے انکار کر دیا، مگر پھر اس کی ضد کے آگے ہارتے ہوئے نہ صرف اسے اجازت دی بلکہ "شمع" کا پتا بھی، کیونکہ سہیل صاحب اس کے بابا کے ایک دوست کے کلاس فیلو رہ چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

"آج ہمارا بیٹا صبح کیسے جلدی اٹھ گیا؟" فراز علی ناشتے کے لیے آئے تو اسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔

"بابا! آپ کو پتا تو ہے، آج مجھے حارث خان کا انٹرویو کرنا ہے ـــــ اسی کی تیاری کر رہی ہوں اور آپ کو یہ بھی معلوم ہی ہے کہ میرے لیے آخری چانس ہے۔" ریحام نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مت تنگ کیا کرو سہیل کو اتنا... اور بھئی آج ناشتے کا کچھ پروگرام نہیں ہے کیا؟"

"آج خانساماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے ناشتا میں نے بنایا ہے۔" ریحام نے جیسے اطلاع دی تھی۔

"پھر تو خدا رحم کرے۔" فراز علی مسکرائے، جس پر ریحام نے انہیں خفگی سے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

انہیں حارث کا انتظار کرتے ہوئے دس منٹ گزر چکے تھے۔ خدا خدا کر کے حارث خان آیا۔ اس کا حلیہ دیکھ کر وہ دونوں بہت حیران ہوئے۔ وہ انتہائی عام سے حلیے میں تھا۔ سجاد کو تصویریں کھینچ کر "فوراً" واپس چلے جانا تھا۔

"تو لے لیجیے۔" حارث خان نے بے پروائی سے کہا۔

"اس حلیے میں..." ریحام منہ میں بڑبڑائی، کیونکہ سہیل صاحب نے اسے اچھی طرح باور کروا کر بھیجا تھا کہ "اپنی زبان پر کنٹرول رکھنا۔"

سجاد تصویریں لے کر جا چکا تھا۔ ریحام نے انٹرویو شروع کیا۔

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟" ریحام نے اس کے حلیے کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بتاؤں؟" اس کی بیزاری اپنے عروج پر تھی، اس کے البم کی طرح۔

ریحام جل گئی۔ "یہی کہ کب پیدا ہوئے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ کیوں پیدا ہوئے اور کیسے؟" ریحام کو جیسے ہی احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط پوچھ گئی ہے تو "فوراً" زبان دانتوں تلے دبالی، مگر سمجھنے والا سمجھ چکا تھا اور عجیب سی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"میں چھ ستمبر کو پنڈی میں پیدا ہوا۔ کیوں ہوا؟ اس کے بارے میں تحقیقات جاری ہیں۔" حارث خان نے کچھ توقف کے بعد مسکراتے ہوئے جواب دیا اور ریحام نے شکر ادا کیا۔

"سن بتانا پسند کریں گے؟"

"1984ء۔"

ریحام کو انگلیوں پر حساب لگاتے دیکھ کر حارث خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اٹھائیس سال۔"

ریحام تھوڑا شرمندہ ہوئی اور اپنی بے ساختہ عادت کو کوسا اور قدرے سنجیدہ ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

حارث کی بیزاری اب کافی حد تک کم بلکہ ختم ہو چکی تھی۔ وہ ریحام کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔

"کافی ڈفرنٹ لڑکی ہے۔" جب سے وہ مشہور ہوا تھا لڑکیاں اس کے آگے بچھی جاتی تھیں۔ پاگلوں کی طرح فون کرتی تھیں، جس کی وجہ سے وہ کافی لیے دیے رہنا شروع ہو گیا تھا۔

ریحام ابھی اگلا سوال پوچھ ہی رہی تھی کہ اس کا موبائل فون بج اٹھا۔ اس نے "ایکسکیوزمی" کہتے ہوئے اپنا بھاری بھرکم بیگ اٹھایا جسے سہیل صاحب عمرو عیار کی زنبیل اور دادو تھیلا کہتی تھیں کہ "نگوڑ مارا ایسا ہے جیسے سودا سلف لانے کے لیے ہو بھلا پرس اتنے بڑے ہوتے ہیں... اور اوپر سے اس لڑکی نے اس میں سارے جہاں کا گند بھر رکھا ہے۔"

ریحام نے بیگ کھول کر موبائل تلاشنے کی ناکام کوشش کی۔ موبائل تلاش کرنے کی آرزو میں وہ بیس ٹمیس پاؤڈر، لپ اسٹک، برش، کاجل، ایک کی چین جس میں اس کی الماری کی چابیاں تھیں، چاکلیٹس، چیونگم اور اس کے خالی ریپرز صوفے پر بکھیر چکی تھی کہ آخر کار موبائل کا رخ روشن نظر آیا۔ وہ یہ بھی نہ دیکھ سکی کہ حارث خان کتنی دلچسپی سے صوفے پر بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔

موبائل اسکرین پر روحہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ ریحام نے دل ہی دل میں اسے خوب گالیاں دیتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"کوئی ٹائم ہوتا ہو گا کسی کو تنگ کرنے کا؟" ریحام نے اپنا غصہ اتارا۔

"ہائیں! میں تنگ کر رہی ہوں؟ خود ہی تو مما کو کہا تھا کہ میں جیسے ہی لاہور سے آؤں، تمہیں کال کروں، کوئی زبردست نیوز ہے؟"

"روحہ! ابھی میں بزی ہوں۔ میں حارث خان کا انٹرویو کر رہی ہوں۔" زبردست نیوز سنا کر اس نے نہ صرف کال کاٹ دی، بلکہ موبائل بھی آف کر دیا۔ وہ جانتی تھی کہ روحہ احسان کے پیٹ میں درد ہو رہا ہو گا۔ آخر حارث خان اس کا پسندیدہ ترین گلوکار ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ مسکرائی... اور اس کی مسکراہٹ تب شرمندگی میں بدل گئی، جب اس نے حارث خان کی نظریں صوفے پہ پڑی چیزوں پر مرکوز دیکھیں۔ اس نے جلدی جلدی سب کچھ بیگ میں ٹھونسا اور مشکلوں سے زپ بند کی۔ دل کھول کر روحہ کو گالیاں دیں اور پھر سے سوالات کا سلسلہ جوڑا۔

ابھی اس نے دو، تین سوال ہی کیے تھے کہ حارث خان کے موبائل پر الارم بج اٹھا وہ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ایم سوری مس ریحام! مجھے ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ میرا نمبر لے دیں۔ باقی سوال آپ فون پر کر لیجیے گا۔" یہ کہتے ہی "فوراً" اٹھ کھڑا ہوا۔

"مگر ابھی تو بہت سے سوالات رہتے ہیں اور اس کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ مجھے باقی انٹرویو دیں گے؟"

"میں آپ کو اپنا نمبر دے تو رہا ہوں۔" وہ ایسے بولا جیسے کوئی احسان کر رہا ہو۔ کم از کم ریحام کو تو ایسے ہی لگا۔ نمبر لکھنے کے بعد اس نے حارث کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویسے یہ یاد رکھیے گا! اگر آپ نے باقی انٹرویو نہ بھی دیا تو آپ کا پورا انٹرویو ہی چھپے گا میگزین میں۔" ریحام نے شرارت سے کہا۔ "کیونکہ تصویریں تو ہم آپ کی لے ہی چکے ہیں۔"

"اوہ! تو آپ مجھے بلیک میل کر رہی ہیں؟" حارث نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، یہ بدلہ ہوگا اگر آپ نے مجھے ڈاج دینے کی کوشش کی تو۔"

"اچھا؟" حارث نے اس کی بات سے لطف لیا تھا۔

"ویسے میم! میں بہت کمیٹڈ بندہ ہوں۔"

"چلیں! یقین آ تو نہیں رہا مگر کر کے دیکھتے ہیں۔" ریحام نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ جائیں گی کیسے؟ ایسا کرتے ہیں میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔ آپ کچھ سوالات گاڑی میں کر لیجیے گا۔ اوکے؟"

ریحام اس کے پیچھے چل پڑی۔

☼ ☼ ☼

حارث خان واقعی اپنی زبان کا پکا نکلا۔ ریحام کی اب اس کے بارے میں رائے بہت اچھی ہو چکی تھی۔ ریحام کافی خوش تھی اور سہیل صاحب کافی حیران اور پریشان کہ واقعی حارث خان کا انٹرویو خیر و عافیت سے ہو گیا۔ جبکہ روحہ بے حد پرجوش تھی کہ واقعی ریحام نے حارث خان کا انٹرویو لیا ہے اور جب اسے معلوم ہوا کہ حارث نے اسے گھر ڈراپ بھی کیا تھا اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"روحی پلیز! منہ بند کرو مکھی چلی جائے گی۔" ریحام نے مکھی کو روحی کے اردگرد منڈلاتے دیکھا تو تنبیہ کی۔

"حامی! اس نے تمہیں نمبر بھی دیا تھا نا؟"

"ہاں! دیا تھا۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"تو پلیز! مجھے تو دو نا حارث کا نمبر۔" روحہ نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے درخواست کی۔

"میں نے نمبر ڈیلیٹ کر دیا تھا۔" اس کے بے پروائی سے کہنے پر روحہ کے منہ سے چیخ برآمد ہوئی۔

"کیا... تم... تم نے حارث خان کا نمبر... او مائی گاڈ!" اسے جیسے یقین نہ آیا۔

"ہاں! تو کر دیا ڈیلیٹ، مجھے کیا کرنا تھا۔"

روحہ نے اس کے انداز پر اپنا سر پیٹ لیا۔ "اور کچھ نہیں تو مجھے ہی دے دیتیں نمبر۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ میں کتنی بڑی فین ہوں اس کی۔"

"ہاں! تمہیں دے دیتی، تاکہ تم سارا دن فون سے چپکی اسے تنگ کرتی رہتیں اور وہ مجھے بددعائیں دیتا۔" روحہ کا صدمے سے جبکہ ریحام کا اسے دیکھ کے ہنس ہنس کر برا حال تھا۔

"اچھا بھئی روحی! میں تو چلوں اور جاتے ہوئے آنٹی سے کہہ کر جاؤں گی کہ تمہیں تین دن تک بالکل تنگ نہ کریں، کیونکہ تم سوگ میں ہو۔" ریحام یہ کہتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگی، مگر روحہ کا پھینکا ہوا تکیہ اس کی کمر میں لگا اور ساتھ ہی آواز بھی آئی۔

"دفع ہو جاؤ! اپنی شکل نہ دکھانا مجھے۔"

☼ ☼ ☼

مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ روحہ تیسرے دن خود ہی اس کی شکل دیکھنے پہنچ گئی، کیونکہ خبر ہی ایسی تھی کہ "حارث خان نے اپنا پروپوزل بھیجا ہے ریحام علی کے لیے۔"

"حامی! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ حارث خان کا پروپوزل...؟" وہ حیرت کے باعث صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"ہاں! ٹھیک سنا ہے تم نے۔ کل شام حارث خان کے پیرنٹس آئے تھے۔"

"حامی! مجھے تو لگ رہا ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی ...لم ہے، تب ہی وہ تم جیسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ... یہاں تو تین سال سے عمر سے کہہ کر تھک گئی ... مروہ تو تمہارا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے کہ ...ی! میں کسی ابنارمل سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"تم اپنے اس اسٹوپڈ بھائی کو چھوڑو، یہ بتاؤ! مجھ ...ی لڑکی سے تمہاری کیا مراد ہے؟" اس نے روحہ کو گھورا۔

"تم جیسی... جیسے بدھو، جاہل، بدتمیز، بدزبان، بددماغ اور بدسلیقہ وغیرہ وغیرہ۔"

"تمہاری یہ باتیں سن کر میرا تمہیں تین لفظ کہنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"تین لفظ۔" روحہ جیسے سمجھتے ہوئے بولی۔ "اچھا! وہ تین لفظ جو ہیرو ہیروئن کو بولتا ہے... تو بولو نا!" وہ دوپٹہ کو انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

"دور فٹے منہ۔ یہ ہیں وہ تین لفظ۔" ریحام کے جل کر کہنے پر روحہ نے اسے گھورا۔

"روحی! یہ تم نہیں، تمہاری جیلسی بول رہی ہے اور جہاں تک رہی بات میرے جیسے لڑکی کی تو سیف علی خان اگر مجھے دیکھ لے تو کرینہ کپور کو چھوڑنے پر تیار ہو جائے۔" ریحام فخر سے بولی۔

"اچھا... اچھا! اب زیادہ پھیلو مت، یہ بتاؤ! انکل کا کیا ارادہ ہے؟"

"ان کے ارادے کا تو پتا نہیں، مگر میرا ارادہ ہے کہ صاف انکار۔"

"کیا؟" وہ چیختے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔ "خبردار! ایسی کوئی حرکت کی۔"

"ارے ارے روحہ! مذاق کر رہی تھی یار۔ میں ...سب بابا پر چھوڑ دیا ہے۔" ریحام کی بات پر روحہ ...ے کا سانس لیا، کیونکہ اس پاگل لڑکی کا کچھ اعتبار نہیں تھا۔

"اچھا! پھر انکل کے کیا ارادے ہیں؟"

"...تو سب ٹھیک ہے پر بابا کو سنگنگ پر ...بس کا انہوں نے اظہار بھی کر دیا تھا۔"

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	500/-
ذرد موسم	راحت جبیں	600/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	400/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	250/-
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	450/-
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	500/-
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	250/-
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	300/-
مین سے عورت	فرزانہ عزیز	200/-
دل اُسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	350/-
بکھرنا جائیں خواب	آسیہ رزاقی	200/-
زخم کو ضد تھی مسیحائی سے	فوزیہ یاسمین	250/-
اماوس کا چاند	بشریٰ سعید	200/-
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی	450/-
درد کے فاصلے	رفیعہ جمیل	500/-
آج صحن پر چاند نہیں	رفیعہ جمیل	200/-
درد کی منزل	رفیعہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	تنسیم سحر قریشی	300/-
تیری راہ میں رُل گئی	میمونہ خورشید علی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

"تو پھر؟" روحہ نے بے چینی سے ریحام کی طرف دیکھا۔

"پھر کیا" حارث نے بابا سے پرامس کیا ہے کہ وہ اپنی تمام کمٹمنٹس پوری کرنے کے بعد سنگنگ چھوڑ دیں گے۔" ریحام کے کہنے پر روحہ حیرت سے صوفے میں بالکل دھنس گئی اور آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے گئی۔

"ھائی! آئی کانٹ بلیو' وہ تمہارے لیے اپنا عروج چھوڑ دے گا۔" پھر روحہ فوراً" صوفے سے اٹھی اور بیگ اٹھا کر جانے لگی تو ریحام نے پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"اب تو رشتہ پکا ہو گیا ہے۔ میں جا رہی ہوں' سب کو بتانے اور شاپنگ بھی تو کرنی پڑے گی تمہاری انگیجمنٹ کے لیے۔"

"انگیجمنٹ نہیں ہو گی۔ وہاں سے ڈائریکٹ شادی کا پیام آیا ہے اور اب پلیز! آنکھیں مت پھاڑ لینا حیرت سے۔" ریحام نے روحہ کو تنبیہہ کی۔

"نہیں' نہیں! اب حیران ہونے کا ٹائم بالکل نہیں ہے۔ شادی کی تیاریاں کرنی ہیں۔ سی یو!" وہ کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیوں؟" اس کا استعفیٰ دیکھ کر انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔

ان کے سوال پر اس نے شادی کارڈ ان کی ٹیبل پہ رکھ دیا۔

"کیا؟ تمہاری شادی ہو رہی ہے؟ ویسے وہ کون گدھا ہے جو تم سے شادی کر رہا ہے؟"

"حارث خان ہے اس گدھے کا نام۔" ریحام نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا؟" ان کے ہاتھ سے کارڈ چھوٹ گیا۔ "پھر تو وہ واقعی گدھا ہے۔" سہیل صاحب کی خوشی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

"ویسے... تم تو کہتی تھیں کہ قیامت تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑو گی۔" سہیل صاحب مسکرائے۔

"وہ تو سر! میں اب بھی کہوں گی کہ اگر قیامت تک زندہ رہی تو آفس آتی جاتی رہوں گی... اور سر! میں آپ کو دعوت بھی دیتی ہوں۔ ہماری شادی کی کوریج کے لیے بھی کسی کو بھیج دیجیے گا۔ اور سر! میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اتنا برداشت کیا۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"نہیں... نہیں... رونا نہیں۔ تم تو صرف رلاتے ہوئے اچھی لگتی ہو۔" انہوں نے ریحام کو ٹشو دیا۔

"اچھا سر! میں چلوں۔" وہ اپنا بیگ اٹھا کر جانے لگی تو سر سہیل بھی کھڑے ہو گئے۔"

"سنو! اپنے اس گدھے باپ کو کہنا کہ تمہاری شادی کی دعوت ہماری طرف سے ہے۔ آخر کو ہمارے دوست کی بیٹی ہو' اتنا حق تو بنتا ہے نا ہمارا۔ اور ہاں! اگر کبھی زندگی میں بھرپور ہو تو ہمارے آفس کا دروازہ کھلا ہے۔" وہ اسے دروازے تک چھوڑتے ہوئے بولے۔

وہ مسکرائی۔ "اس کی تو سر! آپ فکر ہی نہ کریں اور اس ریزائن کو بھی ٹمپریری سمجھیں۔ کیونکہ میں دوبارہ ضرور آؤں گی۔"

اس کی یہ بات سنتے ہی سہیل خان قریب رکھے صوفے پر ڈھے گئے۔

زینب ظفر زریں

"بینا... بینا! میری ٹائی کہاں رکھی ہے۔" وہ کچن میں چائے کا پانی چولہے پر رکھ رہی تھی کہ فاران نے پکارا۔

"ابھی تو آئرن اسٹینڈ پر رکھ کے آئی ہوں۔ دیکھتے نہیں اور شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔" بینا نے فقرہ قدرے اونچی آواز میں اور دوسرا نسبتاً" دھیمی آواز میں کہا اور چائے کی پتی کا ڈبا کیبنٹ میں سے نکالا۔

"ماما... ماما! شیری میرا ڈوگی نہیں دے رہا۔" اب لاؤنج سے فہد کی آواز گونجی اور ساتھ ہی شیری کے رونے کی آواز آئی۔

"فادی کے بچے! تم نے پھر شیری کو مارا... ٹھہر جاؤ ابھی آتی ہوں۔"

بینا نے جلدی سے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈالی اور کچن سے باہر آئی دفعتاً" پھر فاران کی آواز آئی۔

"پتا نہیں کون سے اسٹینڈ پر رکھی ہے' مجھے تو نہیں مل رہی اور ایک بوٹ بھی غائب ہے۔"

"آتی ہوں بابا! تم بھی نہ..." بینا کا فقرہ منہ میں ہی رہ گیا' جب اس نے دیکھا۔ فہد اپنے پاپا کا بوٹ ان کی ٹائی سے باندھے گھسیٹ رہا تھا اور شیری "میرا ڈوگی' میرا ڈوگی" کہتا ہوا اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ بینا کو غصے

کے باوجود ہنسی آگئی۔ اس نے ایک دھپ فہد کی پیٹھ پر لگائی۔

بوٹ اور ٹائی لے کر وہ کمرے میں آئی جہاں فاران ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بالوں میں برش کر رہا تھا۔ بینا کو آئینے سے کمرے میں آتا دیکھ کر اس کا پارہ مزید ہائی ہو گیا کیونکہ وہ بوٹ کو ٹائی کے بندھن سے آزاد کر رہی تھی۔

"اوہ گاڈ۔۔۔ یہ بچے۔۔۔ بینا! تم ان کی تربیت کرو' ورنہ یہ بہت بگڑ جائیں گے۔۔۔ مجال ہے' تمیز نام کی کوئی چیز چھو کر بھی گئی ہو ان الو کے پٹھوں کو۔۔۔" فاران نے بینا کے ہاتھ سے ٹائی تقریباً" چھینتے ہوئے کہا۔ وہ دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ باہر نکل گئی۔

فاران جتنا غصیلا اور گرم مزاج تھا' بینا اتنی ہی ٹھنڈی اور نرم خو تھی۔ وہ ایک ملٹی نیشنل ادارے میں منیجر تھا اور بینا ایم ایس سی کرنے کے باوجود گھرداری میں مصروف تھی۔

فہد اور شیراز صرف ڈیڑھ سال کے فرق سے ان کی زندگی میں رنگ بھر رہے تھے۔ فہد ابھی ساڑھے تین سال کا ہوا تھا کہ اسے اسکول داخل کروا دیا۔ دو سالہ شیری گھر میں خوب رونق لگائے رکھتا لیکن فاران کو بچوں کا شور اور گھر میں ہر طرف بکھیڑا' ایک آنکھ نہ بھاتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ چھٹی والے دن بھی کوئی پروگرام بنا کر گھر سے نکل جاتا۔

"فہد! پاپا سے کہو ناشتا تیار ہے۔" بینا نے کچن سے آواز لگائی' فہد کے کہنے سے پہلے ہی فاران ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل پر آبیٹھا۔

"تم نہیں کرو گی ناشتا؟" فاران نے بینا کو کچن میں جاتے دیکھ کر پوچھا۔

"ابھی دل نہیں چاہ رہا۔" بینا نے شیری کو فیڈر تھما کر اسے لاؤنج میں پڑے صوفے پر لٹا دیا اور خود کارپٹ پر پڑے کھلونے سمیٹنے لگی۔

"چھٹی والے دن بھی اکیلے ناشتا کرو۔" فاران بڑبڑاتے ہوئے ناشتا کرنے لگا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ چھٹی والے دن بھی اکیلے رہو تو۔۔۔؟" بینا نے پلٹ کر جواب دیا۔

"میں شوق سے نہیں جاتا' کوئی نہ کوئی کام ہوتا ہے اور پھر تم اکیلی کہاں ہوتی ہو۔ یہ دو شیطان بھی تو ہوتے ہیں تمہارے ساتھ۔۔۔"

"یہ شیطان تمہارے کچھ نہیں لگتے؟" بینا نے مسکراتے ہوئے نرمی سے کہا۔

وہ خاموشی سے ناشتا کیے گیا۔ بینا فہد کے لیے ناشتا بنانے لگی۔

"دوپہر کو کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا' میں سیفی کی طرف جاؤں گا۔"

سیفی کا نام سنتے ہی بینا کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ فاران نے ٹی وی ٹرالی سے بائیک کی چابی اور ٹیبل سے موبائل اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

وہ جانتی تھی کہ شام میں جب فاران کی واپسی ہو گی تو ایک گھنٹہ بھر لیکچر اسے سننے کو ملے گا۔

"فضا بھابھی گھر کو اس طرح مین ٹین رکھتی ہیں۔ ان کے گھر میں ہر چیز اپنی جگہ پر ملتی ہے۔ کہیں کوئی بدنظمی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اتنا پرسکون ماحول ہوتا ہے کہ اٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔"

ہر ہفتے اسی طرح کی تعریفیں سننے کی وہ عادی ہو چکی تھی لیکن ایک دفعہ بھی اس نے فاران کو یہ باور کرانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ فضا بھابھی کے گھر میں بدنظمی پھیلانے والا ہے کون؟ صبح کی ہوئی صفائی پورا دن گزرنے کے بعد بھی کہیں ماند نہیں پڑتی کہ چیزیں بکھیرنے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ شادی کے دس سال بعد بھی اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد جیسی نعمت سے محروم رکھا تھا' جبکہ ادھر ساڑھے چار سال کے عرصے میں دو پیارے اور شرارتی بچے اس گھر کے آنگن کی زینت بن چکے تھے۔ وہ کتنی بھی کوشش کرتی گھر کو صاف ستھرا رکھنے کی لیکن یہ دو بھوت پل بھر میں گند ڈال دیتے۔ صوفے سے کشن اتار کے کارپٹ پر رکھ لیتے۔ جگہ جگہ کھلونے بکھرا دیتے۔ کہیں کوئی ٹافی کا ریپر تو کہیں کوئی چاکلیٹ کی پیکنگ۔ غرضیکہ ہر وقت کچھ نہ کچھ بدنظمی پھیلی ہی رہتی تھی۔ اسے کبھی کبھی خود بھی شرمندگی ہوتی کہ وہ گھر صاف رکھنے کی لاکھ کوششوں میں گھن چکر بن جانے کے باوجود بھی گھر کو صاف نہ رکھ پاتی۔

فاران کے باہر جانے کے بعد اس نے کچن سمیٹا۔ ڈائننگ ٹیبل سے برتن اٹھا کے ٹیبل صاف کی۔ ٹی وی لاؤنج کی سیٹنگ درست کی صفائی ستھرائی کے بعد دونوں بچوں کے کپڑے تبدیل کیے۔۔۔ پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔

"میں ایسا کیا کروں کہ گھر بھی صاف ستھرا رہے اور فاران بھی خوش رہیں۔"

اسی سوچ میں غلطاں وہ دوپہر کا کھانا بنا چکی تھی۔ بچے خلاف توقع ٹی وی پر کوئی کارٹون مووی دیکھ رہے تھے۔ وہ خود بھی صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔ کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی لیکن اکیلے چائے پینے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

فاران آفس کے لیے نکل چکے تھے اور وہ ابھی فادی کو تیار کر کے اسکول چھوڑ کے آئی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ اسکول قریب ہی تھا' ورنہ فاران کبھی اس کو اسکول چھوڑنے کی ذمہ داری نہ لیتے۔ شیری ابھی سو رہا تھا' اس نے کچن میں ہی بیٹھ کر ایک کپ چائے کا پیا اور برتن دھونے لگی۔ لاؤنج میں بجنے والی فون کی گھنٹی نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔ امی کا فون تھا۔

"رضوانہ آ رہی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے تم بھی آجاؤ۔ وہ صرف ایک مہینے کے لیے آ رہی ہے۔ دو ہفتے یہاں میں بھی گزارے گی۔"

حال احوال پوچھنے کے بعد امی نے اس کی بہن کے آنے کا بتایا۔ رضوانہ امریکہ میں رہتی تھی اور اب بچوں سمیت ایک ماہ کے لیے پاکستان آ رہی تھی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ ویسے بھی بہت دنوں سے وہ امی کی طرف نہیں جا پائی تھی۔

شام کو فاران کے آنے پر اسے بتایا تو وہ بھی خوش ہوا' اس کی خوشی کی وجہ رضوانہ کی آمد ہرگز نہیں تھی' بلکہ بچوں اور بینا کے کچھ دن گھر سے جانے کی تھی۔ بینا بجھ سی گئی۔ دوسرے دن صبح سے ہی وہ جانے کی تیاری میں مگن ہو گئی۔ بچوں کی پیکنگ کے بعد اس نے فاران کے لیے دو تین سالن بنا کے رکھے۔ پہلے سے بنے شامی کباب چیک کیے کہ ایک ہفتہ گزر جائے گا۔ ایک ہفتے کے لیے اس کے کپڑے استری کر کے' جرابیں اور ٹائیاں ایک جگہ رکھیں کہ فاران کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

امی نے کہا تھا دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھاؤں۔ سو دو بجے تک وہ بچوں کو تیار کر چکی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی رمیض اسے لینے آ رہا تھا۔ بینا نے سارا گھر اچھی طرح سے صاف کیا اور دھلی ہوئی بیڈ شیٹ بچھا کر بیڈ روم بند کر دیا کہ بچے دوبارہ خراب نہ کر دیں۔ اس نے فون پر فاران کو اطلاع دے دی کہ وہ جا رہی ہے۔ اس کا شدت سے دل چاہا کہ فاران ایک دفعہ ہی سہی اسے رکنے کو کہے کہ ابھی رکو میں شام میں تمہیں خود چھوڑ آؤں گا مگر۔۔۔ وہ بوجھل دل لیے اسے گھر کے بارے میں ہدایات دیتی ہوئی رمیض کے ساتھ چلی گئی۔

فاران بہت مطمئن اور خوش تھا کہ آج جاتے ہی گھر میں نہ بچوں کا شور ہو گا اور نہ پھیلاوا' وہ سکون سے کھانا کھا کر ٹی وی دیکھے گا اور پھر سو جائے گا۔۔۔

دو دن تو واقعی بہت سکون اور آرام سے گزارے تیسرے دن وہ آفس سے آیا تو گھر کے سناٹے نے ایک بے چین سی کیفیت پیدا کر دی۔ اس نے کھانا نکالا' گرم کیا مگر کھانے کو دل نہ چاہا۔ ویسے ہی فریج میں رکھ دیا' پھر سوچا سیفی کے گھر جا کے چائے پیے۔ سیفی اس کا کزن اور دوست تھا اور اس کی بیوی فضا ان دونوں کی کلاس فیلو تھی۔ تینوں میں خاصی بے تکلفی تھی۔ اس نے بائیک نکالی' گھر کو لاک کیا اور سیفی کی طرف چل پڑا۔ وہ لوگ ابھی چائے پینے ہی والے تھے۔

"سرپرائز۔۔۔ آج اس وقت۔۔۔!" سیفی نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔ بڑے اچھے موڈ میں چائے پی گئی۔ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ رات گئے وہاں سے لوٹا۔

دوسرے دن بھی وہ آفس سے ہی سیفی کی طرف چلا گیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد چائے پی اور گھر آ گیا۔

اگلا دن چھٹی کا تھا۔ چونکہ وہ رات کو جلدی سو گیا تھا' سو اس وقت بھی جلدی آنکھ کھل گئی۔ بستر پر دو تین کروٹیں بدلنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ واش روم گیا۔ پھر کچھ دیر کے لیے واک پر چلا گیا واپس آکر کچن میں جا کر چائے بنائی۔ لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پینے کے ساتھ ساتھ وہ ٹی وی دیکھنے لگا۔

آج گھر کی خاموشی کچھ زیادہ ہی کھل رہی تھی۔ دل اداس ہو رہا تھا۔ اگرچہ کل رات بچوں سے بات بھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر ٹی وی لاؤنج کی طرف دیکھا' ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے رکھی تھی۔ فہد کی چھوٹی سی سائیکل سامنے دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ لاؤنج سے چڑھتی سیڑھیوں کے نیچے رکھے کارٹن میں شیری کے کھلونے رکھے تھے۔

اس نے چائے ختم کی اور اخبار دیکھنے بیٹھ گیا۔ ایک ہی نظر میں ساری سرخیاں پڑھ ڈالیں۔ ٹی وی پر چینل بدل بدل کر جی اوب سا گیا تھا۔ ایک جیسی خبریں' واہیات میوزک چینل۔ اس نے بیزاری سے ریموٹ ٹیبل پر پٹخا اور ٹیرس پر آ گیا۔ آج اتوار تھا۔ کالونی کے بچے سامنے سڑک پر کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کچھ دیر انہیں کھیلتے دیکھتا رہا پھر واش روم میں گھس گیا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو شیو بنانے کا خیال آیا۔ شیو بنا کر نہایا پھر تیار ہو کر بائیک لیے سیفی کی طرف نکل پڑا۔ صبح کے گیارہ بج رہے تھے' جب اس نے بیل دی۔

"رانی! دیکھ' صبح ہی صبح کون آ گیا۔" اندر سے فضا بھابھی کی آواز آئی۔

"صبح ہی صبح!" فاران نے گھڑی کی طرف دیکھ کر فضا بھابھی کا کہا فقرہ دہرایا۔

"وہ جی فاران صاحب آئے ہیں۔" رانی نے بتایا۔

کچھ ہی دیر میں دروازہ کھلا اور فضا بھابھی کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری دیکھ کر فاران کو کچھ شرمندگی سی ہوئی۔

"اوہ! آپ... سیفی تو ابھی سو رہا ہے۔ آپ صبح ہی صبح... میں نے تو ابھی گھر کی صفائی بھی اچھی طرح سے نہیں کروائی۔"

فضا بھابھی نے اسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگا تو فضا کی تیز آواز نے چونکا دیا۔

"ادھر ہی آ جائیں' ڈرائنگ روم ابھی ابھی صاف کروایا ہے۔" وہ لاؤنج میں کھڑی انہیں بلا رہی تھی۔

فاران وہیں صوفے پر بیٹھ گیا اور فضا بیڈ روم میں چلی گئی۔

"فاران آیا ہے۔ اٹھ جاؤ۔" لاؤنج کا فاصلہ بیڈ روم سے زیادہ نہیں تھا' اسی لیے ادھ کھلے دروازے سے فضا بھابھی کی تیز آواز باہر آ گئی تھی۔

"تم نے اسے بتایا نہیں کہ میں سو رہا ہوں۔" سیفی کی نیند میں ڈوبی آواز آئی۔

"کہا تھا مگر... پتا نہیں لوگ کیسے منہ اٹھا کے وقت بے وقت دوسروں کے گھروں میں چلے آتے ہیں۔"

فاران کو یکدم ڈھیر ساری شرمندگی نے آ گھیرا۔ اس نے ٹیبل سے بائیک کی چابی اٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بائیک اسٹارٹ ہونے کی آواز یقیناً سیفی نے بھی سن لی ہو گی۔ اب اس کے موبائل پر سیفی کی کال آ رہی تھی' جسے وہ اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔

گھر کا دروازہ کھولتے ہی' سناٹا اس کی وحشت کو لپیٹنے لگا۔ لاؤنج میں آکر اس نے صوفے سے گدیاں اٹھا کر کارپٹ پر رکھ دیں

فہد کی سائیکل کاریڈور میں عین بیڈ روم کے دروازے کے سامنے کھڑی کر دی۔ اب وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا بینا کو فون کر رہا تھا۔

"تم تیار ہو جاؤ' میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔"

"کیوں... ابھی دو ہی دن تو ہوئے ہیں اور..."

ادھر سے بینا نے حیرانی سے پوچھا۔

"بچوں کے بغیر گھر کاٹ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ جا کے بھول ہی گئی ہو۔ بس کہہ دیا نا... رضوانہ تمہارے گھر بھی تو رہنے اور ملنے آ سکتی ہے۔ بس' تم بچوں کو تیار کرو' میں آ رہا ہوں..."

فاران نے ایک نظر بھرے گھر پر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بائیک کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

نگہت مروت
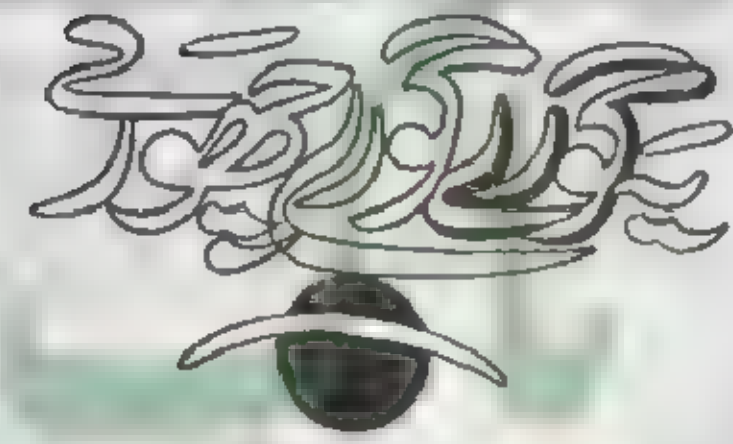
کوئی کہتا ہے "لاہور لاہور ہے" تو کوئی کہتا ہے "پشاور خو پشادے کنہ" (پشاور تو پشاور ہے) اور میں۔ میں کہتی ہوں "چھورے 'چھورے ہی رہتے ہیں" آپ چھچھورے بھی کہہ سکتے ہیں۔

کیا کہا' آپ نہیں مانتے؟

ارے مان لیجیے' نہیں مانتے تو چلیے ان سے ملیے۔

یہ ہیں وقاص احمد۔ کون وقاص احمد؟ بتاتی ہوں بھئی' بڑے بے صبرے ہیں آپ۔

وقاص احمد' لمبا قد' خوب صورت نقوش اور سونے پہ سہاگہ گورا چٹا رنگ۔ بات یہاں ختم نہیں ہوتی' پرسنالٹی بھی ہے جناب کے پاس اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ دلکش شخصیت کے بھرپور احساس نے ان کے دل کو بہت نرم بنا دیا ہے اور وہ اسی لیے کسی لڑکی کا دل توڑنا گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ سو اسی وجہ سے کچھ کے لیے اپنی آنکھوں کے دروازے اور کچھ کے لیے اپنے موبائل کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔ رہی بات دل کی تو اس معاملے میں جناب توحید کے قائل ہیں۔ ایک ہی ہستی کو محبوب بنا کے رکھا ہوا ہے اور مستقبل میں بھی بدلنے کے ارادے ہیں نہ آثار۔

زارا محمود خوب صورت ہے' مگر وقاص کے مقابلے میں ذرا کم۔ لیکن کہتے ہیں نا جب دل کے دروازے کھلتے ہیں تو آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ وقاص احمد کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے مگر آنکھیں بند کرنے سے منہ کیوں کھل جاتا ہے' یہ سمجھ سے بالاتر ہے۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ انھیں اتنی لڑکیاں مل کیسے جاتی ہیں۔ تو جناب! "حسین خوابوں کی رنگین تعبیر یعنی کالج میں پڑھتے ہیں۔ جس طرح مقناطیس دھات کو اپنی جانب کھینچنے کی طاقت رکھتا ہے' بالکل اسی طرح وقاص احمد بھی لڑکیوں کو اپنی جانب کھینچنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ تعارف تو ہو گیا اب ذرا مل بھی لیجیے۔۔۔

"اوئے وقاص! کدھر رہتا ہے تو آج کل یار!"

"مجھے کہاں جانا ہے' یہیں تو ہوتا ہوں۔" موبائل کے بٹنوں پر تیزی سے انگلیاں چلاتے ہوئے سر اٹھانے کی زحمت کیے بغیر جواب دیا۔

"لیکن کائنات نے تو پیغام بھیجا ہے کہ آج کل تم اس کی کلاس کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کو سلام پیش نہیں کرتے۔" احمد نے اس کے موبائل اسکرین پر جگمگاتے نام کو پڑھنے کی کوشش کی۔

"کیا کر رہا ہے یار! پرسنل ہے۔" وقاص جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ ایک خوب صورت سی مسکراہٹ نے لبوں کا احاطہ کر لیا۔

"واہ! یہ تیرے اور میرے بیچ "پرسنل" کہاں سے آ گئی۔ کائنات' عائشہ' ماہم' کومل' کرن' نازیہ' رابعہ۔۔۔" احمد کی لسٹ وقاص کے اشارے کی وجہ سے نامکمل رہ گئی۔

"ہیلو زارا۔۔۔ نو سے دس کی لوڈشیڈنگ کے دوران ٹھیک ہے' ارے نہیں یار۔۔! تم سے ملنے کے لیے تو میں انٹارکٹیکا بھی آ سکتا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ ٹائم پاس کر رہا ہے۔ اگر تم سب جانتے بوجھتے سیریس ہو گئی تو اس میں وقاص کا کیا قصور؟"

"ہاں' سارا قصور تو میرا ہی ہے۔" رابعہ کے گلے میں آنسوؤں کا گولا پھنس گیا۔

"اس میں اتنا اداس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس نہ سہی میں سہی۔" احمد نے موقع دیکھ کر بات سنائی۔

"تم۔۔۔ ہاں تم بھی ہو سکتے ہو' مگر ایک شرط پر۔ تم آج مجھے وقاص کی ہونے والی دکھاؤ گے۔"

"پھر میری بھی ایک شرط ہے۔ زارا کو دیکھنے کے بعد تم میرے ساتھ آئس کریم کھانے چلو گی۔"

"ٹھیک ہے' پھر جب رات کو لائٹ جائے تو تم پارک آ جانا۔"

☼ ☼ ☼

"یار! میں سوچ رہا ہوں کہ اب امی کو تمہارے گھر بھیج ہی دوں رشتے کے لیے۔"

"پاگل ہو گئے ہو وقاص! اتنی جلدی۔ ابھی تو تم صرف سیکنڈ ایر میں ہو اور میں فرسٹ ایر میں۔ بھول ہی جاؤ کہ گھر والے مانیں گے۔"

"میں کون سا شادی کا کہہ رہا ہوں۔ بس رشتہ طے ہو جائے' تاکہ تمہاری امی اِدھر اُدھر تمہارے رشتے نہ ڈھونڈتی پھریں۔"

"ہائے وقاص!" نسوانی آواز پر زارا اور وقاص نے مڑ کر دیکھا تو وہاں رابعہ اور احمد کو پایا۔

"تم... یہاں؟" وقاص کو لگا کہ اس کا حلق خشک ہو گیا ہے۔ شدید دھند اور ٹھنڈ کے باوجود اسے اپنے ماتھے پر پسینہ محسوس ہوا۔

"ہاں! میں یہاں۔ تعارف نہیں کرواؤ گے اپنی کزن سے میرا۔"

"ہاں... کیوں نہیں، زارا! یہ میری... یہ میری کلاس فیلو ہے، رابعہ۔"

"ارے تم بھول رہے ہو وقاص! کلاس فیلو نہیں گرل فرینڈ۔ تمہاری یادداشت بھی نا...." رابعہ نے آنکھیں مٹکا کر وقاص کو دیکھا۔

"جھوٹ مت بولو۔ زارا! یہ جھوٹ بول رہی ہے، یہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔"

"اچھا تو پھر تم روز مجھے یہ کیوں کہتے ہو کہ تم ہمارے کالج کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو۔ تم سے بات کیے بغیر مجھے چین نہیں آتا، وغیرہ وغیرہ۔"

"ہاں... نہیں... وہ تو..." وقاص کو لگا، تمام لفظ کہیں کھو گئے ہیں۔ اس نے بے بسی اور غصے کے ملے جلے تاثرات سے باری باری تینوں کو دیکھا اور سر جھکا دیا گویا اپنی تمام غلطیوں کو تسلیم کر لیا۔

زارا نے بے یقینی سے وقاص کو دیکھا اور پھر رشک بھری نظروں سے رابعہ کو۔ وہ بلاشبہ اچھی خاصی حسین تھی۔ کچھ سوچتے ہی اس کی آنکھیں بھر آئیں، مگر وہ سب کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی، اس لیے تیزی سے اپنے گھر کی جانب چل پڑی۔

دل ٹوٹے خبر نہیں، لیکن اعتبار ٹوٹے تو بہت زیادہ درد ہوتا ہے، کیونکہ دل کے گھاؤ تو ہمیشہ رستے رہتے ہیں، لیکن اگر اعتبار ٹوٹ جائے تو گھاؤ لگنے کا موقع ہی نہیں آتا کیونکہ دل اس سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔

☼ ☼ ☼

پہلے تو زارا نے موبائل آف کر دیا، پھر جب کچھ دنوں کے بعد کھولا تب بھی نہ وقاص کی کال اٹینڈ کی اور نہ ہی کسی میسج کا جواب دیا۔ ایک مہینہ ہونے کو تھا کہ وقاص کو اس کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی اور کہاں وہ وقت، جب ملے بغیر دونوں کو چین نہیں ملتا۔ اداسی کی دبیز تہہ نے سردی کی دھند کی طرح اس کے دل و دماغ کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ جب بھی نو سے دس بجے کی لائٹ جاتی، وہ زارا کے گھر کے سامنے والی سڑک پر آجاتا اس امید پر کہ شاید وہ نظر آجائے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

اڑتی اڑتی اس تک ایک خبر پہنچی تھی کہ زارا کے لیے رشتہ آیا ہے، جس پر گھر میں کسی کو اعتراض نہیں ہے، یہاں تک کہ زارا کو بھی نہیں۔ اس خبر نے اسے پہلے سے زیادہ بے چین و مضطرب کر دیا تھا۔ بھوک اور پیاس اڑا کے رکھ دی تھی۔ کالج بہت کم جاتا اور جاتا بھی تو سب سے کترایا کترایا، ناراض ناراض سا رہتا۔ کتابوں میں پہلے کب دل لگا، جواب لگتا۔ نہ آنکھوں میں رہنے والی آنکھوں کو بھاتی اور نہ موبائل والی کانوں کو بھاتی۔ تنگ آکر سم بدل دی، مگر ایک نمبر نہ بدلا ... زارا کا۔

☼ ☼ ☼

دو مہینوں سے زیادہ وقت ہو گیا تھا، لیکن زارا کی ناراضی ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس لیے اداسی بھی ختم نہیں ہو رہی تھی، بلکہ جنوری کی دھند کی طرح بڑھتی جارہی تھی۔

آج پھر وہ بے مقصد جاگنگ ٹریک پر واک کر رہا تھا۔ ٹھنڈ اور دھند کے باعث پارک میں بہت کم لوگ تھے۔ اتنی ٹھنڈ بھی آئس کریم والے کا کاروبار متاثر نہ کر سکی۔ لوگ اب بھی آئس کریم خرید رہے تھے۔ اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ لائٹ آنے میں ابھی دس منٹ رہتے تھے۔ آج صبح اسے اڑتی اڑتی پھر ایک خبر ملی تھی کہ زارا کے والد نے رشتے سے انکار کر دیا ہے، کیونکہ لڑکے والے "فوراً" شادی کرنا چاہ رہے تھے۔ وقاص احمد نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ مگر ٹریک کے ساتھ لگے بینچ پر بیٹھے لڑکے اور لڑکی کو دیکھ کر اس کی بے چینی اور اضطراب میں پھر سے اضافہ ہونے لگا

تھا۔ آس پاس موجود ہر شخص، دھند اور بادلوں کی اوٹ سے جھانکتا چاند۔ اسے سب خود پہ ہنستے ہوئے محسوس ہوئے۔

کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

پارک میں موجود کسی کے موبائل پہ سجاد علی دھیمے سروں میں گنگنایا اور اس کی اداسی میں مزید اضافہ کر گیا۔ لائٹ آنے میں صرف ایک منٹ رہتا تھا۔ وہ مایوس ہو کر واپسی کے لیے مڑا تو اسے خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔

ساری بے چینی، سارا اضطراب، سارا انتظار اڑن چھو ہو گیا۔

"آچھوں!" وقاص نے چھینک ماری اور پھر خود ہی ہنس دیا۔

"کس نے کہا تھا کہ اتنی ٹھنڈ میں واک کرو۔" زارا نے کہا تو وقاص نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، مگر پھر اسے چھینک آگئی۔

"آچھیں!" زارا بھی مسکرا دی۔

"خوشی کے اظہار کا نیا طریقہ ایجاد کیا ہے کیا؟" زارا نے ہنستے ہوئے کہا تو وقاص کو لگا، ہر سو روشنی پھیل گئی ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہو ایسے؟" زارا نے اسے خاموشی سے مسلسل اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو کہا۔

"تمہارے ہنسنے سے ہر طرف کتنی روشنی پھیل گئی ہے۔" وقاص نے پلکیں جھپکائے بغیر کہا۔

"ڈیئر! روشنی میرے ہنسنے سے نہیں لائٹ آنے سے ہوئی ہے۔" زارا نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا تو وقاص چونک گیا۔

"اوہ۔" وہ ہنستے ہوئے اس کے قریب آیا تو دونوں قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔ "ویسے مجھے پتا تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔"

"مجھے بھی پتا تھا کہ میں ضرور آؤں گی۔" زارا نے اسی کے انداز میں جواب دیا۔

"کوئی گلہ؟" وقاص چلتے چلتے اس کے سامنے آیا۔

"محبتوں میں ایک چانس کی گنجائش ہونی چاہیے۔ اس لیے کوئی گلہ نہیں۔ بس لاسٹ چانس۔"

وقاص نے ایک گہری سانس خارج کی "مطلب، اس بار غلطی کی گنجائش نہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تو زارا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

"ارے! آپ کہاں چل دیے، قصہ تو ابھی باقی ہے۔

اس رات اداسی اور ناراضی کی دھند چھٹنے کے بعد جب وہ گھر گیا تو خبر ہے اس نے سب سے پہلے کیا کیا؟ شکرانے کے نفل پڑھے؟

ارے جائیے!

گھر آتے ہی اس نے سب سے پہلے دراز میں رکھی سم واپس لگائی۔ زارا سے گھنٹہ بھر بات کی، پھر اس کے سونے کے بعد احمد کو ایک، دو گالیاں سینڈ کیں اور خوش خبری سنائی۔

"کمینے! بال بال بچ گیا، ورنہ تیری وجہ سے میں اپنی محبت سے ہاتھ دھو بیٹھتا۔"

"اچھا! یہ بتا، آگے کیا ارادے ہیں۔" احمد نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کیا ارادے ہیں بھلا، امی سے صبح بات کروں گا کہ وہ زارا کے گھر جائیں۔"

"مبارکاں! اور باقیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"نیک خیالات ہیں یار! تو جانتا ہے میں کسی کا دل نہیں توڑ سکتا اور زارا کہہ رہی تھی کہ اب غلطی کی گنجائش نہیں ہے، یعنی اب قدم پھونک پھونک کے رکھنے ہوں گے۔"

دیکھا! کیا کہا تھا میں نے۔ یہ جو گورے گورے چھورے ہوتے ہیں نا۔ یہ چھورے ہی رہتے ہیں۔ (آپ یہاں ایک بار پھر "چھچھورے" استعمال کر سکتے ہیں)

☼

جنت کے پتے

نمرہ احمد

لیپ ٹاپ تکیے پہ رکھا تھا اور وہ اس کے سامنے کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی تھی۔ اسکرین کی روشنی اس کے چہرے کو چمکا رہی تھی۔ وہ ٹھوڑی تلے ہتھیلی رکھے دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی لیپ ٹاپ کے ٹچ پیڈ پر پھیر رہی تھی۔

لمبے 'سیدھے' سیاہ بال پیچھے کمر پہ پڑے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی ویسی ہی تھیں۔ سیاہ بڑی بڑی مغلئی آنکھیں جن میں چاندنی کی سی چمک تھی اور چہرہ تو ملائی کا بنا لگتا تھا' سفید' ملائم اور چکنا سا۔

وہ اسی مگن انداز میں اسکرین پر نگاہیں مرکوز کیے' ٹچ پیڈ پہ انگلی پھیر رہی تھی۔ ایک کلک کے بعد کوئی صفحہ کھلا تو ایک دم اس کی متحرک انگلی ٹھہر گئی۔ اسکرین پہ جمی آنکھوں میں ذرا سا تفکر ابھرا اور پھر بے چینی۔ اس نے جلدی جلدی دو' تین بٹن دبائے۔

لوڈنگ......

اگلے صفحے کے لوڈ ہونے کا انتظار کرتے ہوئے اسی مضطرب انداز میں اس نے انگلی سے چہرے کے دائیں طرف پھسلتی لٹیں پیچھے کیں۔

چند سیکنڈ بعد صفحہ لوڈ ہو گیا تھا۔ وہ بے چینی سے چہرہ اسکرین کے قریب لائی تو سلکی بالوں کی چند لٹیں پھر سے شانے پہ پھسل کر آگے کو گریں۔

جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی اس کی سیاہ آنکھیں حیرت

مکمل ناول
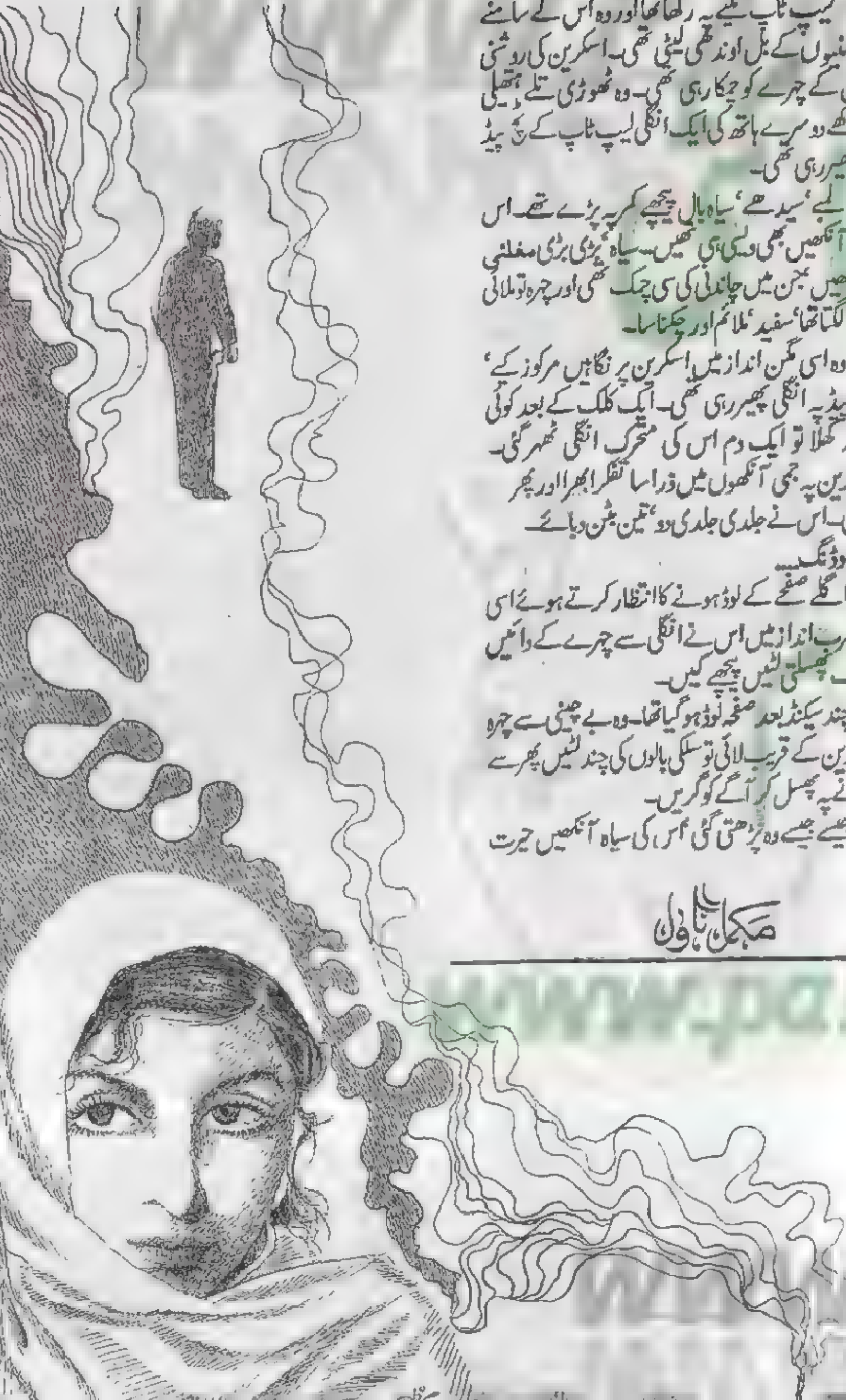
سے پھیلتی گئیں۔ لب ذرا سے کھل گئے اور پورا وجود بے یقینی میں ڈوب گیا۔ ڈھیر سارے لمحے لگے تھے' اسے خود کو یقین دلانے میں کہ جو وہ پڑھ رہی ہے' بالکل سچ ہے اور جیسے ہی اس کے ذہن نے یقین کی دھرتی کو چھوا' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

اس کا سیل فون سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سیل اٹھایا اور جلدی جلدی کوئی نمبر ملانے لگی۔ رات کی مقدس خاموشی میں بٹنوں کی آواز نے ذرا سا ارتعاش پیدا کیا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ دوسری جانب گھنٹی جا رہی تھی۔

"ہیلو زارا؟" شاید رابطہ مل گیا تھا' تب ہی وہ دبے دبے جوش سے چہکی۔ "کیسی ہو؟ سو تو نہیں گئی تھیں؟ حیا بول رہی ہوں۔"

دوسری طرف اس کی دوست کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ لمحے بھر کو سننے کے لیے رکی' پھر دھیرے سے ہنس دی۔

"ساری باتیں چھوڑو زارا! میرے پاس جو بڑی خبر ہے' وہ سنو!" اب وہ عادتاً" سیاہ بالوں کی ایک موٹی لٹ انگلی پہ لپیٹتی کہہ رہی تھی۔

"اور تم یقین نہیں کرو گی' میں جانتی ہوں۔"

"ارے نہیں' داور بھائی کی شادی کے متعلق نہیں ہے۔" دوسری جانب زارا نے کچھ کہا تو اس نے فوراً" تردید کی۔ "بلکہ یوں کرو' تم گیس کرو کہ میں تمہیں کیا بتانے والی ہوں۔"

اس نے ایک ہاتھ سے لیپ ٹاپ پرے کیا اور تکیہ نکال کر بیڈ کراؤن کے ساتھ سیدھا لگایا' پھر اس سے ٹیک لگا کر پاؤں سیدھے کر لیے۔ ساتھ ساتھ وہ زارا کے کیے اندازوں کی تردید بھی کرتی جا رہی تھی۔

"نہیں' بالکل نہیں۔"

"ایسا تو ہے ہی نہیں۔"

"ارے میری شادی بھی نہیں ہو رہی۔"

"جی نہیں' ارم کی بھی نہیں ہو رہی۔"

"سیریسلی زارا! تمہاری سوچ بس یہیں تک ہے۔ اب کان کھول کر سنو! تمہیں وہ اریسمس منڈس ایکسچینج پروگرام (Erasmus Mundus Programe Exchange) یاد ہے۔ جس کے لیے ہم نے اپلائی کیا تھا؟ کین یو بلیو اٹ زارا! کہ مجھے یورپی یونین نے اسکالرشپ کے لیے سلیکٹ کر لیا ہے؟"

دوسری جانب زارا اتنی زور سے چیخی کہ موبائل کا اسپیکر آف ہونے کے باوجود اس کی چیخ سارے کمرے میں سنائی دی۔

"بالکل سچ کہہ رہی ہوں زارا! ابھی پندرہ منٹ پہلے مجھے یونیورسٹی کی طرف سے میل ملی ہے۔"

اس نے ساتھ ہی ایک ہاتھ سے پرے پڑے لیپ ٹاپ کا رخ اپنی جانب موڑا اور سر آگے کر کے غور سے دوبارہ دیکھا۔

"ہاں' پندرہ منٹ پہلے' ٹھیک ساڑھے دس بجے سلیکشن کی میل آئی ہے۔ تم بھی فوراً" چیک کرو' تم نے بھی اپلائی کیا تھا' تمہیں بھی میل آئی ہو گی۔"

وہ فون ایک ہاتھ سے پکڑے دوسرے سے بٹن دبا کر لیپ ٹاپ آف کرنے لگی۔

"نہیں' اسپین کی Deusto نے نہیں بلکہ ترکی کی سبانجی یونیورسٹی نے ہمیں سلیکٹ کیا ہے اور اب ہم ایک سمسٹر پڑھنے پانچ ماہ کے لیے استنبول جا رہے ہیں۔"

لیپ ٹاپ کی اسکرین اندھیر ہوئی تو اس نے اسے ہاتھ سے دبا کر بند کیا' پھر تار نکال کر سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔

"ہاں' میں نے سبانجی کو نیٹ پہ دیکھا ہے۔ بہت خوب صورت یونیورسٹی ہے' مگر....."

وہ لمحے بھر کو خاموش ہو گئی۔ دوسری جانب سے غالباً" استفسار کیا گیا تو وہ گویا ہوئی۔

"بس ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے' لیکن ہم اس کے بارے میں اپنی فیملیز کو آگاہ نہیں کریں گے۔"

دھیمی آواز میں بولتے ہوئے' اس نے گردن موڑ کر بند دروازے کو دیکھا۔ "دراصل سبانجی میں لڑکیوں کے ہیڈ اسکارف پر پابندی ہے۔ ادھر سر ڈھکنا منع ہے۔ گھر والوں کو بتا کر متفکر کرنے کی بجائے اس بات کو گول کر جانا۔ ویسے بھی ہم دونوں میں سے کوئی اسکارف نہیں لیتا۔"

اسی پل کھڑکی کے اس پار کچھ کھڑکا تھا۔ وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ قد آدم کھڑکیوں کے آگے بھاری پردے گرے تھے' البتہ پیچھے جالیاں کھلی تھیں۔ شاید اس کا وہم تھا۔ وہ سر جھٹک کر فون کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"ابا نے مجھے کبھی اسکارف لینے یا سر ڈھکنے پہ مجبور نہیں کیا' تھینک گاڈ۔ ہاں ارم گھر سے باہر اسکارف لیتی ہے' اس کے ابو تایا فرقان' ذرا سخت ہیں نا۔" وہ پھر سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے' نیم دراز مگن سی بتانے لگی۔

"پرمیشن کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ابا اسپین جانے کی اجازت نہ دیتے مگر ترکی میں سبین پھوپھو رہتی ہیں نا' سو وہ مان گئے تھے۔ ویسے بھی انہیں اپنی بیٹی پہ پورا بھروسا ہے۔"

پھر وہ چند لمحے ایرپیس سے ابھرتی اپنی دوست کی بات سنتی رہی۔ زارا خاموش ہوئی تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کل نہیں' داور بھائی کی مہندی پرسوں ہے' تم آ رہی ہو نا؟"

"اور ہاں' میں اور ارم لہنگا پہن رہے ہیں۔"

"سارے کزنز بہت ایکسائیٹڈ ہیں' خاندان کی پہلی شادی ہے نا۔"

"اوکے تم اب جا کر میل چیک کرو' میں بھی سوتی ہوں' رات بہت ہو گئی ہے۔" الوداعی کلمات کہہ کر اس نے موبائل کان سے ہٹایا اور تکیے پہ اچھال دیا۔ پھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر لاؤنج خاموشی میں ڈوبا تھا۔ حیا نے آہستہ سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا اور ننگے پاؤں چلتی لاؤنج سے کچن کی طرف آئی۔ سیاہ لمبی قمیص اور سیاہ کھلے ٹراؤزر میں اس کا قد مزید دراز لگ رہا تھا۔

کچن میں اندھیرا پھیلا تھا۔ وہ دروازے کے قریب رکی اور ہاتھ سے دیوار پہ سوئچ بورڈ ٹٹولا۔ بٹن دبنے کی آواز آئی اور ساری بتیاں جل اٹھیں۔

اس نے آگے بڑھ کر فریج کا دروازہ کھولا اور پانی کی بوتل نکالنے کو جھکی۔ جھکنے سے ریشمی بال کندھوں سے پھسل کر سامنے کو آ گرے۔ حیا نے نزاکت سے انگلی سے ان کو پیچھے ہٹایا اور بوتل نکال کر سیدھی ہوئی' پھر کاؤنٹر پہ رکھے ریک سے شیشے کا گلاس اٹھایا اور بوتل اس میں انڈیلی۔ پانی کی ندی سی گلاس میں گرنے لگی۔ تب ہی اس کی نگاہ کاؤنٹر پہ رکھی کسی سفید چیز پہ پڑی۔ وہ جیسے چونک اٹھی' بوتل وہیں سلیب پہ رکھ کر اس طرف آئی۔

وہ سفید ادھ کھلے گلابوں کا بکے تھا' جس میں کہیں کہیں سبز پتے جھلک رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک بند سفید لفافہ رکھا تھا۔

حیا نے گلدستہ اٹھایا اور چہرے کے قریب لا کر آنکھیں موندے سونگھا۔ دلفریب تازگی بھری مہک اس کے اندر تک اتر گئی۔ پھول بالکل تازہ تھے' جیسے ابھی ابھی توڑے گئے ہوں۔ جانے کون رکھ گیا ادھر؟

اس نے بند لفافہ اٹھایا اور پلٹ کر دیکھا۔ اس پہ گھر کے پتے کے اوپر نمایاں سا "حیا سلیمان" لکھا تھا۔ پیچھے بھیجنے والے کا پتا نہ تھا' بس کوریئر سروس کی مہر اور اسٹیکر لگے تھے۔ مہر پہ ایک روز قبل کی تاریخ تھی۔

اس کو کبھی کسی نے یوں پھول نہیں بھیجے تھے۔ کیا معاملہ تھا یہ بھلا؟

الجھتے ہوئے حیا نے لفافہ چاک کیا۔ اندر ایک موٹا کاغذ تھا۔ اس نے دو انگلیاں لفافے میں ڈال کر کاغذ پکڑا اور باہر نکالا۔

سفید کاغذ بالکل صاف تھا۔ نہ لکیر' نہ کوئی ڈیزائن۔ بس اس کے وسط میں انگریزی میں تین لفظ لکھے تھے۔

"Welcome to sabanci"

وہ سناٹے میں رہ گئی۔

یہ کیا مذاق تھا؟ بھلا خط بھیجنے والے کو کیسے پتا کہ وہ سبانجی جا رہی ہے؟ خط پہ تو ایک روز قبل کی تاریخ تھی' جبکہ قبولیت کی وہ ای میل اسے ابھی پندرہ منٹ پہلے

موصول ہوئی تھی۔ جو بات اسے آفیشلی بتائی ہی پندرہ منٹ قبل گئی تھی' وہ اس شخص کو ایک روز پیشتر کیسے معلوم ہوئی؟

اگر زارا کو اس نے خود ابھی نہ بتایا ہوتا تو وہ سمجھتی کہ یہ اس کی حرکت ہے' اور یہ خط سبانجی یونیورسٹی کی طرف سے بھی نہیں آسکتا تھا' کیونکہ اس پہ ایک قومی سطح کی کوریئر کمپنی کی مہر لگی تھی' پھر کس نے بھیجا اسے یہ؟

پانی سے بھرا گلاس وہیں سلیب پہ چھوڑ کر' بکے اور لفافہ اٹھائے وہ الجھتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

اس نے چابی لاک میں گھمائی ہی تھی کہ گیٹ کے اس پار اسے زارا آتی دکھائی دی۔ وہ دروازہ کھول کر مسکراتی ہوئی سیدھی ہوئی۔

"حیا! مجھے تو کوئی میل نہیں آئی۔" زارا نے ادھ کھلے گیٹ کو دھکیل کر اندر قدم رکھا۔ اس کے چہرے پہ اداسی تھی۔

"کوئی بات نہیں' ایک دو دن میں آجائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم نے ساتھ ہی اپلائی کیا تھا' میرا سلیکشن ہوگیا ہے تو تمہارا بھی ہوجائے گا۔"

"مگر اسکالرشپ پروگرام کو آرڈینیٹر کے آفس کے باہر آج جو لسٹ لگی ہے' اس میں بھی میرا نام نہیں ہے۔"

"اور میرا؟"

"صرف تمہارا ہے ہمارے ڈپارٹمنٹ سے اور انوائرمینٹل سائنسز کی ایک لڑکی خدیجہ رانا کا ہے۔ میرا خیال ہے میرا سلیکشن ہی نہیں ہوا۔"

"اوہ۔" اسے واقعتاً" افسوس ہوا۔ رات فون کال کے بعد اس کی زارا سے اب بات ہو رہی تھی۔

"خیر' تم کہیں جارہی تھیں؟" زارا چہرے پہ دوبارہ بشاشت لاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں' مارکیٹ جارہی تھی ارم کے ساتھ۔ کل داور بھائی کی مہندی کا فنکشن ہے اور میرے لہنگے کے ساتھ کی ہائی ہیلز گم ہوگئی ہیں۔ شاید کام والی اٹھا کر لے گئی ہے۔ اب نئے جوتے لینے پڑیں گے۔ تم چلوگی؟"

وہ گاڑی سے کہنی ٹکائے "تفصیلاً" بتانے لگی۔ وہ ہلکی آسمانی لمبی قمیص اور تنگ چوڑی دار پاجامے میں ملبوس تھی۔ قمیص کا دامن ٹخنوں سے ذرا اوپر تک تھا۔ ہم رنگ دوپٹہ گردن کے گرد لپٹا تھا اور بال کمر پہ گر رہے تھے۔

"ہاں۔ چلو پھر جلدی نکلتے ہیں۔" زارا فوراً" تیار ہوگئی اور فرنٹ سیٹ کی طرف بڑھی۔

"ارم کو بھی لینا ہے۔" حیا نے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کیا۔

"ویسے تمہارے سخت سے تایا ارم کو یوں تمہارے ساتھ شاپنگ پہ جانے کی اجازت دے دیتے ہیں؟"

ارم ان دونوں سے جونیئر تھی اور اس کا ڈپارٹمنٹ بھی دوسرا تھا' سو زارا کی اس سے زیادہ ملاقات نہ تھی۔

"ان کی سختی صرف اسکارف تک ہے۔ ایسے ویسے نہیں ہیں وہ۔"

وہ کار باہر گیٹ پہ لے آئی۔ ارم کا گھر حیا کے ہمسائے میں تھا۔ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار میں آنے جانے کا راستہ بھی موجود تھا' لیکن اسے جب بھی ارم کو پک کرنا ہوتا' تو وہ اس کے گیٹ پہ ہارن دیا کرتی تھی۔ اب بھی زور کا ہارن دیا تو چند ہی لمحے بعد ارم باہر نکل آئی۔

کاسنی لمبی قمیص اور ٹراؤزر میں ملبوس ہم رنگ دوپٹہ پھیلا کر سینے پہ ڈالے' چہرے کے گرد میچنگ کاسنی اسکارف لپیٹے وہ تقریباً" بھاگتی ہوئی پچھلی سیٹ کے دروازے تک آئی تھی۔

"ہیلو حیا! ہیلو زارا!" بے تکلفی سے چہکتے ہوئے اس نے اندر بیٹھ کر دروازہ بند کیا۔ حیا کے ساتھ آؤٹنگ کے پروگرام اسے یونہی خوش کیا کرتے تھے۔

"کیسی ہو ارم! تم سے تو ملاقات ہی نہیں ہوپاتی۔" زارا نے ترچھے ہو کر رخ پیچھے کو کیا۔

"آپ کا ڈپارٹمنٹ دور پڑتا ہے نا' تب ہی اور ہاں' حیا بتا رہی تھی آپ لوگوں کا ترکی کا سلیکشن آگیا ہے؟"

"میں سلیکٹ نہیں ہوئی' حیا ہوگئی ہے۔ خیر' اس میں کوئی بہتری ہوگی۔ تم نے نہیں اپلائی کیا تھا؟"

"ابا اجازت دیتے تب نا!" وہ اداس ہوگئی۔

"ویسے پیرنٹس کو اتنا سخت نہیں ہونا چاہیے۔" زارا نے کہا۔

"حیا نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا کہ کہیں پہلے سے احساس کمتری میں مبتلا ارم مزید اداس نہ ہوجائے' مگر زارا گردن موڑے پیچھے دیکھ رہی تھی اور ارم۔ ارم حسب توقع اداس ہوگئی تھی۔

"ابا بھی پتا نہیں کس پہ چلے گئے۔ اتنی گرمی میں اسکارف لینا آسان ہوتا ہے کیا؟ اور پھر کل مہندی کے لہنگے کی بھی آدھی آستین نہیں بنانے دی مجھے۔ حیا کی بھی تو آدھی آستین ہیں۔ اتنی اچھی لگتی ہیں' مگر ابا ذرا بھی سلیمان چچا کی طرح نہیں ہیں۔"

"ارم! تمہیں آج کیا لینا ہے؟ میں نے تو جوتے لینے ہیں۔" اس نے کوفت چھپاتے ہوئے بات کا رخ بدلا۔ ارم کا ہر وقت کا شکایتی رویہ اسے بے حد برا لگتا تھا۔

"چوڑیاں لینی ہیں' مگر لہنگے کے بلاؤز کی فل سلیوز کے ساتھ چوڑیاں اچھی بھی نہیں لگیں گی۔" وہ منہ بسورے پھر سے شروع ہوگئی تو حیا نے سر جھٹک کر کیسٹ پلیئر آن کردیا۔

عاطف اسلم کا گیت بلند آواز سے گونجنے لگا' تو ارم کو خاموش ہونا پڑا۔

مارکیٹ پہنچ کر ارم تو چوڑیاں ڈھونڈنے نکل گئی' جبکہ وہ دونوں میٹرو آگئیں۔

"یہ گولڈن والا جو تیسرے نمبر پہ رکھا ہے' یہ دکھائیں۔" بہت دیر بعد ایک اونچی ہیل اس کی نظر میں جچی تھی۔

"یہ والا میم؟" سیلز مین نے پورا جوڑا نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ وہ زمین پہ پنجوں کے بل بیٹھا تھا جبکہ حیا اور زارا سامنے کاؤچ پہ بیٹھی تھیں۔

"پہنا دوں میم؟" بہت مودب اور شائستہ انداز میں پوچھتے ہوئے سیلز مین نے ہاتھوں میں پکڑا جوتا اس کے پاؤں کے قریب کیا' جو خوب صورت کولہاپوری چپل میں مقید تھے۔

"میرے ہاتھ نہیں ٹوٹے ہوئے' میں خود پہن سکتی ہوں۔"

"جی شیور' یہ لیجیے۔" سیلز مین نے مسکرا کر جوتا اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے اسے یوں پکڑ رکھا تھا کہ اسے تھامتے ہوئے حیا کی انگلیاں لازما" اس کے ہاتھ سے مس ہوتیں۔

"سامنے رکھ دو' میں اٹھالوں گی۔" اس کے روکھے لہجے پہ سیلز مین نے گنگناتے ہوئے جوتا سامنے رکھ دیا۔

پھر بل کی ادائیگی کے بعد کاؤنٹر پہ کھڑے لڑکے نے بقیہ رقم اس کی طرف بڑھائی تو حیا نے دیکھا' چند نوٹوں کے اوپر پانچ کا سکہ رکھا تھا اور لڑکے نے سکے کو یوں پکڑ رکھا تھا جیسے سیلزمین نے جوتے کو۔۔۔

"شکریہ۔" حیا نے نوٹ کنارے سے پکڑ کر کھینچے' سکہ لڑکے کے ہاتھ میں رہ گیا۔

"میم! آپ کا سکہ!" لڑکے نے فاتحانہ انداز میں سکہ اس کی جانب بڑھایا کہ اب تو لازمی پکڑے گی اور۔۔۔

"یہ سامنے رکھے صدقے کے باکس میں ڈال دو۔" وہ بے نیازی سے شاپر تھامے پلٹ گئی۔ زارا نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔

"اس لڑکے کی شکل دیکھنے والی تھی حیا!"

"دل تو کر رہا تھا اس کی اسی شکل پہ شاپ کے سارے جوتے دے ماروں' معلوم نہیں ہمارے مردوں کی ذہنیت کب بدلے گی۔ یوں گھورتے ہیں جیسے کبھی لڑکی دیکھی نہ ہو۔"

وہ تنفر سے ناک سکوڑتی غصے میں بولتی زارا کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہی تھی جب قریب سے آواز آئی۔

"تو اتنا بن سنور کر باہر نہ نکلا کرو لی بی!" وہ چونک کر آخری سیڑھی پہ ٹھہر گئی۔ وہ ایک معمر خاتون تھیں' بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی' ناگواری بھری نگاہ اس پہ ڈال کر آہستہ آہستہ اوپر زینے چڑھ رہی تھیں۔

"ایک تو لوگوں کو راہ چلتے تبلیغ کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔" زارا اس کو کہنی سے تھامے وہاں سے لے آئی۔ تب ہی ارم سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس کا سینے پہ پھیلا دوپٹہ اب سمٹ کر گردن تک آگیا تھا۔ اس نے کچھ خاص شاپنگ نہیں کی تھی۔ شاید وہ صرف ان کے ساتھ آؤٹنگ پہ آئی تھی۔ میٹرو سے وہ "اسکوپ" چلی آئیں کہ کچھ ہلکا پھلکا کھالیں۔ رات کی دعوت تو تایا فرقان کی طرف تھی' جو وہ بیٹے کی شادی کے لیے جمع ہوئے خاندان والوں کے لیے دے رہے تھے۔

"میرے لیے پائن ایپل سلیش منگوانا میں ذرا بیکری سے کچھ لے لوں۔" ارم جھٹ باہر کو لپکی۔ حیا نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنی جانب کا شیشہ نیچے کیا۔ سرد ہوا کا تھپیڑا تیزی سے اندر آیا تھا۔ مگر اتنی سردی میں سلیش پینے کا اپنا مزا تھا۔

وہ پارکنگ لاٹ میں موجود تھیں اور ٹھنڈی ہوا نے ساری جگہ کو گھیر رکھا تھا۔

"ارم خاصی کمپلیکسڈ لگتی ہے' نہیں؟" ارم دور ہو گئی تو زارا اس کی طرف گھومی۔

"اور تم اس کے انہی کمپلیکسز کو ہوا دے رہی تھیں۔" وہ الٹا اسی پہ خفا ہوئی۔

"تایا فرقان صرف اسکارف کی سختی کرتے ہیں۔ وہ بس اسی بات پہ خود ترسی کا شکار ہے اور تم بھی اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔"

"میں نے کہا کہ بے چاری۔۔۔"

"نہیں ہے وہ بے چاری' اب اس کو بھی یہی سمجھانا کہ خوامخواہ کی خود ترسی نکل آئے۔"

ویٹر ہاتھ میں کارڈ پکڑے حیا کی طرف کھلے شیشے کے باہر آچکا تھا۔

"تمہیں یاد ہے زارا! پچھلے سال جب یونیورسٹی والوں نے ہمیں ترکی کے ٹرپ کی آس دلائی تھی اور آخر میں پہنچ کر سارا پروگرام ہی کینسل کر دیا تھا۔"

آرڈر لکھوا کر وہ شیشہ اوپر چڑھاتے ہوئے یاد کر کے کہنے لگی۔

"میں تو اتنی مایوس ہو گئی تھی کہ سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی جا سکوں گی۔" اس کی آواز میں آس جڑنے کی خوشی در آئی تھی۔

زارا اور وہ ایل ایل بی آنرز (شریعہ اینڈ لاء) کے پانچویں سال میں تھیں۔ ان کا ساتواں سمسٹر درمیان میں تھا' جب یورپی یونین کی اسپانسرڈ اسکالر شپ کا اعلان ہوا۔ جس کے تحت یورپ اور ایشیاء کی یونیورسٹیز کے مابین طلبا کا تبادلہ ہونا تھا۔ جب یورپین یونیورسٹیز میں درخواست دینے کی باری آئی تو اسے ترکی کی سبانجی یونیورسٹی کا فارم سب سے آسان لگا' پھر ایک ہسپانوی یونیورسٹی میں بھی ساتھ ہی اپلائی کر دیا تھا اور اب بالآخر سبانجی نے اسے منتخب کر لیا تھا۔

ساتواں سمسٹر پورا کر کے اسے پانچ ماہ کے لیے ترکی جانا تھا' جہاں اس کے اپنے مضامین (شریعہ اینڈ لاء) تو نہ تھے کہ ترکی کا قانون پاکستان کے قانون سے مختلف تھا' سو پانچ ماہ کے لیے وہ اپنی مرضی سے کوئی بھی مضمون پڑھ سکتی تھی۔ پھر واپس پاکستان آکر اسے ایل ایل بی کا آٹھواں سمسٹر شروع کرنا تھا۔

"کتنا مزا آئے حیا! اگر کوئی رومانٹک سا' ہینڈسم سا' ہم سفر تمہیں مل جائے' تو تمہارا سفر کتنا خوب صورت ہو جائے گا۔"

"ہم سفر کوئی نہیں ملنے والا' کیونکہ پاکستان سے سبانجی صرف ہم دو لڑکیاں ہی جا رہی ہیں اور پھر ہم ٹھہرے آل ویمن یونیورسٹی میں پڑھنے والے۔"

"وہ خدیجہ رانا جو تمہارے ساتھ جا رہی ہے' اس سے کوئی بات ہوئی؟"

ویٹر نے شیشہ بجایا تو حیا نے گردن اس طرف موڑی' پھر شیشہ نیچے کرنے لگی۔

"نہیں۔ خدیجہ رانا کو تو میں جانتی بھی نہیں ہوں۔ معلوم نہیں کون ہے۔" اس نے سلیش کے گلاس پکڑے۔ زارا کا اسے تھمایا اور ارم کا ڈیش بورڈ پہ رکھا۔ بے دھیانی میں وہ شیشہ بند کرنا کب بھولی' اسے علم نہ ہو سکا۔

دفعتاً زارا کا موبائل بجا۔ زارا نے سپ لیتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو اماں! جی؟ کیا؟ آواز خراب ہے' ایک منٹ۔" زارا کے فون پہ غالباً سگنل ٹھیک نہیں آ رہے تھے۔ وہ سلیش کا گلاس ہاتھ میں پکڑے دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

حیا اپنے گلاس سے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے زارا کو ونڈ اسکرین کے پار سے دیکھتی رہی۔ اب وہ دور ایک درخت کے ساتھ کھڑی فون پہ بات کر رہی تھی۔

"ہیلو مائی بیوٹی۔" کوئی ایک دم سے اس کے بہت قریب آکر بولا۔ وہ ڈر کر اچھلی۔ ذرا سا جوس کپڑوں پہ چھلک گیا۔

کھلی کھڑکی پہ ایک عورت مسکراتے ہوئے جھکی ہوئی تھی۔ میک اپ سے اٹا چہرہ' چمکتا ہوا آئی شیڈ' بھڑکتی ہوئی سرخی' بالوں کا جوڑا' چم چم کرتے کپڑے۔۔۔ وہ عورت نہیں تھی مگر وہ مرد بھی نہیں تھا۔

"کیسے ہو سوہنیو!" وہ اس کی کھڑکی پہ پورا جھکا کھڑا تھا۔ گلاس اس کے ہاتھ میں کانپا' بے اختیار اس نے شیشہ اوپر چڑھانا چاہا' مگر اس کے ہاتھ درمیان میں تھے۔

"ڈور نہیں سوہنیو! میں تمہاری دوست ہوں' ڈولی کہتے ہیں مجھے۔"

"ہٹو' ہٹو' جاؤ۔" وہ گھبرا گئی۔ خواجہ سرا کے وجود سے سستے پرفیوم کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی' اسے کراہیت سی آئی۔

"اچھا سوہنیو! ذرا بات تو سنو۔" اس نے اپنا چہرہ مزید جھکایا اور اس سے پہلے کہ وہ آگے بڑھتا' حیا نے سلیش کا بھرا ہوا گلاس اس کے منہ پہ الٹ دیا۔ ٹھنڈی ٹھار برف چہرے پہ پڑی تو وہ بلبلا کر پیچھے ہٹا۔ اس نے پھرتی سے شیشہ اوپر چڑھا لیا۔

"سنو جی۔۔۔" وہ مسکرا کر چہرہ صاف کرتا' شیشہ بجانے لگا۔ بند شیشے کے باعث اس کی آواز ہلکی ہو گئی تھی اور اب وہ کوئی گیت گنگنانے لگا تھا۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ اور گاڑی وہاں سے نکال لائی۔ بیکری کے داخلی دروازے کے سامنے کار لا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

وہاں درختوں کے ساتھ وہ ڈولی نامی خواجہ سرا ابھی تک کھڑا تھا۔ وہ اس کے پیچھے نہیں آیا تھا اور اب گا بھی نہیں رہا تھا۔ بس خاموش گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے بے اختیار جھرجھری سی آئی۔

"کہاں رہ گئیں یہ دونوں؟" اس نے جھنجھلا کر ہارن پہ ہاتھ رکھ دیا' پھر گردن موڑ کر دوبارہ دیکھا۔ وہ ابھی تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ارم اور زارا کو ڈراپ کر کے وہ سیدھی اپنے کمرے میں آئی تھی۔ ڈنر کا وقت ہونے والا تھا۔ اس نے یہ کپڑے ڈنر کی مناسبت سے ہی پہنے تھے، مگر جوس چھلکنے سے ذرا سا داغ پڑ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے دوپٹے کا وہ حصہ دھو کر اسے استری کیا۔ اسے رہ رہ کر وہ خواجہ سرا یاد آ رہا تھا۔

اس برادری کے لوگ اکثر آکر پیسے مانگتے تھے مگر ایسی حرکت تو کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ اس خواجہ سرا کی عجیب نگاہیں اور انداز... اسے پھر سے جھرجھری آئی۔

پھر جب اپنی تیاری سے مطمئن ہو کر وہ باہر آئی اور لابی کا دروازہ کھولا تو پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا، وہ چونک گئی۔

دروازے کے ساتھ فرش پہ سفید ادھ کھلے گلابوں کا بکے پڑا تھا۔ وہ جھکی اور بکے اٹھایا۔ ساتھ میں ایک بند لفافہ بھی تھا۔ وہ دونوں چیزیں اٹھا کر سیدھی ہوئی اور لفافہ کھولا، جس پہ "حیا سلیمان" لکھا تھا۔

اندر وہی سفید، بے سطر، چوکور کاغذ تھا۔ اس کے وسط میں اردو میں لکھا تھا۔

"امید کرتا ہوں کہ آپ کا آج کا ڈنر اچھا گزرے گا۔"

اس نے لفافہ پلٹ کر دیکھا۔ کہیں بھی کچھ اور نہیں لکھا تھا، بس لفافے پہ گزشتہ روز کی مہر لگی تھی۔ یہ کون تھا اور کیوں اسے پھول بھیج رہا تھا؟ وہ بکے اور خط کمرے میں رکھ کر سارے معاملے پہ الجھتی باہر آ گئی۔

تایا فرقان کے گھر خوب چہل پہل لگی تھی۔ لاؤنج میں سب کزنز بیٹھے تھے۔ ایک طرف خواتین کا گروہ خوش گپیوں میں مشغول تھا۔ مرد حضرات یقیناً" ڈرائنگ روم میں تھے۔ ان کے خاندان میں کزنز کی بے تکلفی کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

تایا فرقان چاروں بہن بھائیوں میں سب سے سخت تھے اور ان کی سختی بس ارم کے اسکارف لینے اور گھر سے باہر لڑکوں سے بات کرنے پہ تھی۔ ارم اور باقی کزنز بھی عموماً" اپنے کزنز کے سوا باہر کے کسی لڑکے سے بات نہیں کرتی تھیں۔ حیا اور ارم تو پڑھتی بھی آل ویمن یونیورسٹی میں تھیں۔ ہاں دوسرے چچا اور خود سلیمان صاحب مستقبل میں اپنے بچوں کی شادیاں یقیناً" مکسڈ گیدرنگ میں رکھیں گے، یہ سب کو معلوم تھا۔

ان کا خاندان زیادہ بڑا نہ تھا۔ وہ لوگ تین بھائی اور ایک بہن تھے۔ تایا فرقان سب سے بڑے تھے۔ داور، فرخ، سمیع اور ارم ان کے بچے تھے۔ فرخ میڈیکل کر چکا تھا اور آج کل پولی کلینک سے ہاؤس جاب کر رہا تھا، وہ حیا سے تین سال بڑا تھا۔ سمیع، فرخ سے سال بھر چھوٹا تھا اور ایم بی اے کے بعد جاب کر رہا تھا۔ سب سے بڑے داور کی شادی ہو رہی تھی۔

تایا فرقان کے بعد سلیمان صاحب تھے۔ حیا ان کی اکلوتی بیٹی تھی اور روحیل اکلوتا بیٹا۔ روحیل پڑھائی کے سلسلے میں امریکہ میں ہوتا تھا۔

پھر زاہد چچا تھے۔ ان کی بڑی دو جڑواں بیٹیاں مہوش اور سحرش تھیں، پھر بیٹا رضا انجینئر تھا۔ سب سے چھوٹی بیٹی ثنا او لیول کر رہی تھی۔

اس وقت سوائے روحیل کے جو امریکہ میں تھا اور داور بھائی کے جو غالباً" ڈرائنگ روم میں تھے، باقی تمام لڑکے لڑکیاں لاؤنج میں موجود تھے۔ لڑکیاں کارپٹ پہ دائرہ بنا کر بیٹھی تھیں۔ ارم کے ہاتھ میں ڈھولک تھی۔ اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر کندھے پہ آ گیا تھا۔ (اگر ابھی تایا فرقان آ جاتے تو وہ فوراً" اس کو سر پہ لے لیتی) اور وہ مہوش، سحرش اور ثنا کے ہمراہ سر ملا رہی تھی، جبکہ رضا، فرخ اور سمیع اوپر کرسیوں پہ بیٹھے مذاقاً" لڑکیوں کی طرف فقرے اچھال رہے تھے۔

"ہیلو ایوری ون!"

وہ سینے پہ ہاتھ باندھے چلتی ہوئی ان کے قریب آ کر رکی، تو سب کی نگاہیں اس کی جانب اٹھیں۔ سپید چہرے کے دونوں اطراف میں گرتے سیدھے سیاہ بال اور بڑی بڑی کاجل سے لبریز آنکھیں... وہ تھی ہی اتنی حسین کہ ہر اٹھی نگاہ میں ستائش اتر آئی۔

"حیا! کیسی ہو؟"

"آؤ چلو ان لڑکوں کو ہراتے ہیں۔"

"آؤ بیٹھو نا!"

بہت سی آوازیں اس سے ٹکرائیں، مگر اس نے بے نیازی بھری مسکراہٹ سے شانے اچکائے۔

"پہلے میں صائمہ تائی کی کچن میں ہیلپ کروا دوں۔" اس نے ارم کی امی کا نام لیا، جن کو اس نے آتے ہوئے اٹھ کر کچن کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ صائمہ تائی نے یقیناً" اس کو آتے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ اسے بلوا لیتیں۔ ارم سے زیادہ سمجھ دار تو بقول ان کے، حیا تھی۔ صائمہ تائی کے پیچھے زاہد چچا کی بیگم عابدہ چچی بھی چلی گئی تھیں۔ اب صوفے پہ حیا کی امی فاطمہ بیگم تنہا بیٹھی تھیں۔

"اماں! میں ذرا صائمہ تائی کے ساتھ ہیلپ کروا دوں۔" ان کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے اپنی بات دہرائی تو انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔

وہ مطمئن سی آگے بڑھ گئی۔ راہداری پار کر کے کچن کے دروازے کی سمت بڑھی ہی تھی کہ صائمہ تائی کی تیز آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"جیسے میں جانتی ہی نہیں ہوں کہ یہ سارے رنگ ڈھنگ کس لیے ہوتے ہیں، ایک میرے ہی بیٹے ملے ہیں اس کو پاگل بنانے کے لیے۔"

وہ بے اختیار دو قدم پیچھے دیوار سے جا لگی۔ یہ صائمہ تائی کس کی بات کر رہی تھیں؟

"تب میں کہوں بھابھی! کہ رضا کیوں ہر وقت حیا، حیا کرتا ہے۔" وہ عابدہ چچی تھیں۔ اپنے نام پہ وہ چونک گئی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"پچھلی دفعہ جب ہم سلیمان بھائی کے گھر کھانے پہ آئے تھے تو کیسے نک سک سے تیار پھر رہی تھی، تب سے رضا میرے پیچھے پڑا ہے کہ حیا کا رشتہ مانگیں۔"

"اس لڑکی کو لڑکوں کو متوجہ کرنے کا فن آتا ہے عابدہ! کتنی مشکل سے داور کے دل سے اس کا خیال نکالا تھا، میں نے اور فرقان نے۔ وہ تو اڑ ہی گیا تھا کہ شادی کرے گا تو صرف حیا سے، مگر جب فرقان نے سختی کی کہ بھلا ایسی بے پردہ اور آزاد خیال لڑکی کو اپنی بہو بنا کر ہم نے اپنی آخرت بگاڑنی ہے کیا، تب کہیں جا کر وہ مانا، مگر اب فرخ... کیا کروں اس لڑکے کا۔ یہ ابھی بھی اس طرح کیل کانٹوں سے لیس ہو کر آ جائے گی اور فرخ پھر اس کے جانے کے بعد ضد پکڑ لے گا۔ اب میری ارم بھی تو ہے، مجال ہے کہ سر پہ دوپٹہ لیے بغیر گھر سے نکلے۔"

صائمہ تائی فخر سے کہہ رہی تھیں اور وہ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بمشکل دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی۔ اسے لگا اگر اس نے مزید کچھ سنا تو اس کے اعصاب جواب دے جائیں گے۔ بدقت اپنے وجود کو سنبھالتے وہ واپس پلٹ آئی۔

کسی بات پہ ہنستے ہوئے فرخ کی نگاہ اس پہ پڑی، جو راہداری سے چلی آ رہی تھی تو اس کی ہنسی تھم گئی، وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ قبول صورت سا فرخ جس کی رنگت ٹف روٹین کے باعث مزید سنولا گئی تھی مگر مسئلہ اس کی واجبی شخصیت یا حیا کی بے پردگی کا نہ تھا، اصل بات تو وہ سب جانتے تھے۔ پھر بھلا اس کے بارے میں رضا یا فرخ نے سوچا بھی کیسے؟

وہ ایک سپاٹ نگاہ فرخ پہ ڈال کر چپ چاپ فاطمہ بیگم کے ساتھ صوفے پہ آ بیٹھی۔

"تمہیں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں اماں!" وہ بدقت خود کو نارمل کر پائی۔ فاطمہ مطمئن ہو گئیں اور وہ صائمہ تائی کے بارے میں سوچنے لگی، جن کا "حیا میری جان" کہتے منہ نہ تھکتا تھا اور تایا فرقان کے لیے تو وہ ہی بڑی بیٹی تھی، لیکن اندر سے ان لوگوں کے ایسے خیالات ہوں گے، وہ گمان بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اور وہ پھول؟ وہ بھی رضا یا فرخ میں سے ہی کسی نے بھیجے ہوں گے، مگر جس روز پہلی دفعہ پھول آئے تھے، تب تو فرخ شہر سے باہر تھا اور رضا تھا تو اسلام آباد میں ہی مگر ان دونوں میں سے کسی کو اس کے سبانجی کے سلیکشن کے بارے میں کیسے علم ہوا؟ شاید جب وہ زارا کو فون پہ بتا رہی تھی، تب کھڑکی کے باہر کچھ کھڑکا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا' یقیناً "اس نے کھڑکی کے باہر سے ساری بات سن لی ہوگی اور سن کر ہی وہ خط لکھ کر پھولوں کے ساتھ ادھر رکھا ہوگا' مگر۔۔۔ اس پہ تو کوریئر کی ایک روز قبل کی مہر تھی۔ شاید اس نے کوئی جعلی مہر استعمال کی ہو۔ مگر اتنے جھمیلوں میں فرخ اور رضا جیسے جاب والے مصروف بندے کیوں پڑیں گے بھلا؟

اس کا دل کہتا تھا' یہ نہ فرخ ہے' نہ رضا' بلکہ کوئی اور ہے۔ خیر' لعنت ہے اس پر وہ جو بھی ہے' ان دونوں کا دماغ تو ابھی ٹھیک کرتی ہوں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر لڑکے لڑکیوں کے گروپ کے پاس چلی آئی۔

"ارم!" سامنے کھڑے اس نے مخصوص بے نیازی سے سینے پہ ہاتھ باندھے ارم کو پکارا' تو سب رک کر اسے دیکھنے لگے۔

"کیا؟"

"تم لوگوں نے سبین پھپھو کو شادی کا کارڈ بھیجا تھا ترکی؟" کنکھیوں سے اس نے فرخ اور رضا کے چہروں کو ماند پڑتے دیکھا تھا۔

"سلیمان چاچا کو کارڈ دیا تھا ان کا' انہوں نے بھجوادیا ہوگا اور سبین پھپھو کو ابا نے فون کردیا تھا' وہ آئیں گی؟"

"آنا تو چاہیے' آخر قریبی رشتہ ہے' تم سے نہ سہی' ہم سے تو ہے۔" اس نے قریبی رشتہ پہ زور دے کر ایک جتاتی نظر فرخ اور رضا پہ ڈالی۔ ان کے چہرے پھیکے پڑے تھے اور دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

پھر کھانے کے وقت صائمہ تائی نے سب سے پہلے اسے بلایا۔

"حیا' میری جان! یہ ارم کسی کام کی نہیں ہے' تم سمجھ دار ہو' ٹیبل پہ تم نے خیال رکھنا ہے کہ جیسے ہی کوئی ڈش آدھی ہو' فوراً" ظفر (کک) کو اشارہ کرنا' ٹھیک؟"

"شیور تائی! میں خیال کروں گی۔" وہ بدقت مسکراتی ہوئی سرو کرنے لگی۔

چند منٹ بعد سب ڈائننگ ہال میں کھڑے اپنی اپنی پلیٹوں میں کھانا نکال رہے تھے۔ ڈائننگ ٹیبل کے اطراف سے کرسیاں ہٹا کر دور ایک دیوار کے ساتھ لگا دی گئی تھیں' تاکہ سب اپنی مرضی سے کھانا نکال کر ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے کھاتے رہیں۔

"تایا جان! آپ نے سلاد نہیں لیا۔" وہ رشین سلاد سے بھرا شیشے کا بڑا پیالا اٹھائے تایا فرقان اور سلیمان صاحب کے پاس آئی' جو اپنے دھیان میں محو گفتگو تھے' اس کے پکارنے پر چونکے۔

"تھینک یو بیٹا!" تایا فرقان مسکرا کر چمچے سے سلاد اپنی پلیٹ میں نکالنے لگے۔ وہ شلوار کرتے میں ملبوس تھے۔ کندھوں پہ شال تھی اور بارعب چہرے پہ مونچھیں۔

سلیمان صاحب ان کے برعکس کلین شیو' ڈنر سوٹ میں ملبوس' خاصے اسمارٹ اور ہینڈسم لگ رہے تھے۔ دونوں کی سوچ بھی اپنے حلیوں کی مانند تھی۔

"ابا! آپ بھی لیں نا۔"

"سلیمان! تم نے سبین کو کارڈ پوسٹ کردیا تھا؟" تایا کو اچانک' شاید اس کی شکل دیکھ کر یاد آیا۔

سلیمان صاحب کا چمچے میں سلاد بھرتا ہاتھ ذرا سست ہوا اور چہرے پہ کڑواہٹ پھیل گئی۔ بہت آہستہ آہستہ سے انہوں نے سلاد سے بھرا چمچہ اپنی پلیٹ میں پلٹا۔

"کردیا تھا۔" ان کے لہجے میں عجب کاٹ تھی' جو حیا کے لیے نئی تھی۔

"ابا! سبین پھوپھو شادی پہ آئیں گی؟" وہ پوچھے بنا رہ نہ سکی۔

"کل مہندی ہے' آنا ہوتا تو اب تک آگئی ہوتی۔ تیس سالوں میں جو عورت صرف چند دفعہ ملنے آئی ہو' وہ اب بھی نہ آئے تو بہتر ہے۔"

حیا تو کیا' فرقان تایا بھی دنگ رہ گئے۔

"سلیمان! کیا ہوا ہے؟"

"تھینک یو بیٹا!" جواب دینے کی بجائے سلیمان صاحب نے اسے مخاطب کیا تو وہ اب "تم جاؤ" کا اشارہ سمجھ کر سر جھکائے وہاں سے چلی آئی۔ بہت آہستہ سے سلاد کا پیالا میز پہ رکھا اور اپنی آدھی بھری پلیٹ اٹھائی' مگر اب کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

یہ ابا کو کیا ہوگیا تھا؟ وہ پھپھو کے بارے میں ایسے گفتگو کیوں کررہے تھے؟ پھر وہ رہ نہیں سکی۔ اپنی پلیٹ لیے اس ستون کے پیچھے آکھڑی ہوئی' جس کی دوسری جانب تایا اور ابا کھڑے تھے۔ بظاہر اپنی پلیٹ پہ سر جھکائے اس کے کان ان ہی کی طرف لگے تھے۔

"حیا کے لیے لغاری نے اپنے بیٹے کا پرپوزل دیا ہے۔" سلیمان صاحب اپنے دوست کا نام لے کر کہہ رہے تھے اور اس کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ لرز گئی' دل سہم اٹھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" تایا فرقان ششدر رہ گئے تھے۔

"بھائی! اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ ولید اچھا لڑکا ہے' کل مہندی پہ آئے گا تو آپ کو ملواؤں گا۔ سوچ رہا ہوں' حیا سے پوچھ کر ہاں کردوں۔"

"مگر۔۔۔ مگر سلیمان! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"کیوں نہیں ہوسکتا بھائی!"

"تم حیا کی شادی یوں کیسے کرسکتے ہو؟"

"باپ ہوں اس کا' کرسکتا ہوں' فاطمہ بھی راضی ہے اور مجھے یقین ہے کہ حیا کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"اور جہان۔۔۔ جہان کا کیا ہوگا؟"

"کون جہان؟" سلیمان صاحب یکسر انجان بن گئے۔

"تمہارا بھانجا' سبین کا بیٹا جہان' جس سے تم نے حیا کا نکاح کیا تھا' تم کیسے بھول سکتے ہو؟"

"وہ اکیس سال پرانی بات ہے اور حیا اب بائیس سال کی ہوچکی ہے۔ بے وقوفی کی تھی میں نے کہ سبین پر اعتبار کرکے اپنی بچی کا نکاح اس کے بیٹے سے کردیا تھا۔ کیا ان اکیس برسوں میں کبھی سبین نے مڑ کر پوچھا کہ اس نکاح کا کیا بنا؟ یا کیا بنے گا؟ زیادہ سے زیادہ وہ چھ ماہ میں ایک فون کرلیتی ہے اور تین منٹ بات کرکے رکھ دیتی ہے۔ آپ کو واقعی لگتا ہے کہ وہ لوگ اس رشتے کو قائم رکھنا چاہتے ہیں؟"

"مگر سبین تو سکندر کی وجہ سے' تم جانتے ہو وہ الٹے دماغ کا شخص ہے اور۔۔۔"

"میں کیسے مان لوں کہ صرف اپنے مغرور اور بددماغ شوہر کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے کا نکاح بھول سکتی ہے؟ اتنے برس بیت گئے' اس نے پھر کبھی رشتے یا شادی کی بات منہ سے نہیں نکالی۔ میں اس سے کیا امید رکھوں؟"

"مگر جہان تو اچھا لڑکا ہے' تم اس سے ملے تو تھے پچھلے سال جب تم استنبول گئے تھے۔"

"جی۔۔۔ جہان سکندر۔۔۔ اچھا لڑکا۔۔۔ مائی فٹ!" انہوں نے تلخی سے سر جھٹکا۔

"اس کے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔ وہ ترکی میں پیدا ہوا ہے' اس نے کبھی پاکستان کی شکل نہیں دیکھی۔ نہ اسے اردو آتی ہے' نہ پنجابی۔ کبھی ان تمام برسوں میں اس نے اپنے کسی ماموں کا حال پوچھا؟ کبھی فون کیا؟ میں یہ سب بھول جاتا' مگر جب میں پچھلے سال استنبول گیا تو کیا آپ یقین کریں گے بھائی! کہ میں اٹھارہ روز وہاں رہا۔ میں روز سبین کے گھر جاتا تھا' سکندر تو ملا ہی نہیں اور جہان۔۔۔ جہان آخری روز مجھ سے ملا اور وہ بھی پندرہ منٹ کے لیے بس۔ وہ بھی جب اس کی ماں نے میرا نام بتایا تو کافی دیر بعد اسے یاد آیا کہ میں اس کا کوئی دور پار کا ماموں ہوتا ہوں۔ پھر جانتے ہیں وہ مجھ سے کیا پوچھنے لگا۔۔۔؟ کیا پاکستان میں روز بم دھماکے ہوتے ہیں اور کیا وہاں انٹرنیٹ کی سہولت موجود ہے؟ پھر اس کا فون آیا اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔ میں کبھی حیا کے لیے کورٹ سے خلع لینے کے متعلق نہ سوچتا' اگر میں اس روز ایک ترک لڑکی کو جہان کو گھر ڈراپ کرتے نہ دیکھ لیتا' جب میں فلائٹ پکڑنے سے قبل سبین کو خدا حافظ کہنے گیا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ اس کی بے تکلفی۔۔۔ الاماں۔ وہ سکندر شاہ کا بیٹا ہے اور وہ اپنے باپ کا ہی پرتو ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ اگر احمد شاہ جیسے عظیم انسان کا بیٹا ہو کر سکندر ان کے برعکس نکلا' تو ویسے ہی جہان بھی اپنے باپ کے برعکس نکلے گا' اور ایک اچھا انسان ہوگا' مگر نہیں۔ وہ اسی مغرور آدمی کا

مغرور بیٹا ہے۔ حیا کون ہے' اس کا ان سے کیا تعلق ہے' یہ بات نہ جہان کو یاد تھی' نہ سبین کو۔ سبین تو یہ ذکر ہی نہیں کرتی' اب میں اپنی بیٹی کو زبردستی ان کے گھر بھیج دوں کیا؟ خیر! کل ولید سے ملواؤں گا آپ کو' اب جو رشتہ بھی اچھا لگا' میں حیا کی ادھر شادی کردوں گا اور۔۔۔"

اب اس میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی۔ وہ سفید چہرہ لیے بوجھل قدموں سے چلتی ان سے دور ہٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

جہان سکندر کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس بچپن سے اپنے اور اس کے رشتے کے متعلق سنا تھا۔ وہ سال بھر کی تھی' جب سبین پھپھو پاکستان آئیں اور فرط جذبات میں اپنے آٹھ سالہ بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ جذباتی سی کارروائی ہوئی اور دونوں بہن' بھائیوں نے بچوں کا نکاح کردیا۔ تب آٹھ سالہ جہان ان کے ساتھ تھا۔ پھر وہ ترکی چلا گیا۔

اکیس سال گزر گئے' وہ ترکی میں ہی رہا' کبھی پاکستان نہیں آیا اور اس وزٹ کے بعد تو سبین پھپھو بھی نہیں آئیں۔ نہ کبھی انہوں نے کوئی تصویر بھیجی' نہ خط لکھا۔

اگر کبھی کوئی ترکی چلا جاتا تو ان سے مل آتا' ورنہ ان سے رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ انٹرنیٹ وہ استعمال نہیں کرتی تھیں۔ اگر جہان کرتا تھا تو بھی اس کا کوئی ای میل' فیس بک' ٹوئٹر کسی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ارم وغیرہ اسے فیس بک پہ سرچ کرکرکے تھک گئے تھے' مگر ترکی کا کوئی جہان سکندر انہیں نہیں ملتا تھا۔

شروع کے چند برس پھپھو بہت فون کرتی تھیں' پھر آہستہ آہستہ یہ رابطے زندگی کی مصروفیات میں کھو گئے۔ تین ماہ میں ایک فون ان کا آجاتا اور تین ماہ بعد ایک فون ادھر سے چلا جاتا۔ یوں چھ ماہ میں دو ہی دفعہ بات ہو پاتی۔ رسمی علیک سلیک' موسم کا حال' سیاست پہ تبادلہ خیال اور پھر اللہ حافظ۔

ان تمام باتوں کے باوجود وہ خود کو ذہنی اور جذباتی طور پر جہان سے وابستہ کرچکی تھی۔ نکاح کے وقت کی تصاویر آج بھی اس کے پاس محفوظ تھیں۔ آٹھ سالہ بھورے بالوں اور سنہری رنگت والا خوب صورت سا لڑکا' جس کو اس نے اپنے روبرو کبھی نہیں دیکھا تھا اور شاید ترکی جانے کی ساری خوشی کی وجہ بھی یہی تھی' جس پر ابا نے پانی پھیر دیا تھا۔ اس روز اسے رہ رہ کر پھپھو اور جہان پہ غصہ آرہا تھا' جن کی بے رخی کے باعث اب یہ رشتہ ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"حیا۔۔۔ حیا! کدھر ہو؟"

وہ لابی میں آویزاں آئینے کے سامنے کھڑی ماتھے پہ ٹیکا درست کررہی تھی' جب فاطمہ بیگم اسے پکارتی آئیں۔

ہر طرف گہما گہمی تھی۔ ایک ناقابل فہم شور سا مچا تھا۔ مہندی کا فنکشن باہر شروع ہوچکا تھا۔ سب باہر جانے کی جلدی مچائے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھیں۔

"کیا ہوا اماں؟" وہ ٹیکے کے ساتھ الجھی ہوئی تھی جو ماتھے پہ سیٹ ہو کر ہی نہیں دے رہا تھا۔ سونے کا گول سکے کی شکل کا ٹیکا جس کے نیچے ایک سرخ روبی لٹک رہا تھا۔ بار بار اِدھر اُدھر جھول جاتا' ٹیکے کو ٹھیک کرتے ہوئے مسلسل اس کی کلائیوں میں بھری چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔

"جلدی آؤ' تمہارے ابا بلا رہے ہیں' کسی سے ملوانا ہے تمہیں۔" ان کی آواز میں خوشی کی رمق محسوس کرکے وہ چونک کر ان کو دیکھنے لگی۔ نفیس سی سلک کی ساڑھی اور ڈائمنڈز پہنے' وہ خاصی باوقار اور خوش لگ رہی تھیں۔ اس کی انگلیوں نے ٹیکا چھوڑ دیا۔ دل زور سے دھڑکا۔

"کدھر ہیں ابا؟" وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ان کے پیچھے باہر نکلی۔ گیٹ کے قریب سلیمان'

کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک خوبرو سا لڑکا کھڑا تھا' جس کے شانے پہ ہاتھ رکھے' وہ کچھ کہہ رہے تھے۔ سامنے خاصے باوقار سے سوٹ میں ملبوس ایک صاحب اور ایک ڈیسنٹ سی خاتون تھیں۔

وہ دونوں پہلوؤں سے لہنگا ذرا سا اٹھائے' ہوئی ان کے قریب آئی۔

"یہ حیا ہے۔۔۔ میری بیٹی!" سلیمان صاحب نے مسکرا کر اسے شانوں سے تھاما۔

"السلام علیکم۔" اس نے نگاہیں جھکائے مدھم سا سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بیٹا!" وہ تینوں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔

اس نے ڈل گولڈن لہنگا اور کامدار بلاؤز پہن رکھا تھا۔ بلاؤز کی آستین آدھی سے بھی چھوٹی تھیں اور ان سے نکلتے اس کے دودھیا بازو سنہرے موتیوں کی شعاعوں میں سنہرے دکھ رہے تھے۔ بھاری کامدار دوپٹہ اس نے گردن میں ڈال رکھا تھا۔ بال ہمیشہ کی طرح سیدھے کرکے کمر پہ گرا رکھے تھے۔ ٹیکے کے ساتھ کے سنہرے جھمکے کانوں سے لٹک رہے تھے اور ملائی سے بنا چہرہ ہلکے سے سنگھار سے مزید دلکش لگ رہا تھا۔ اس نے کاجل سے لبریز پلکیں اٹھائیں۔ وہ تینوں ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"اور حیا! یہ میرے دوست ہیں یوسف لغاری۔ یہ مہناز بھابھی ہیں اور یہ ان کے صاحبزادے ہیں ولید۔"

اس کے دل پہ ایک بوجھ سا آگرا۔ آنکھوں میں بے اختیار نمکین پانی بھر آیا' جسے اس نے اندر اتار لیا۔

"نائس ٹو میٹ یو' وہ۔۔۔ وہ مہمان آنے لگے ہیں' میں پھول کی پتیاں ادھر رکھ آئی تھی' سب مجھے ڈھونڈ رہے ہیں' تو میں۔۔۔"

"ہاں ہاں تم جاؤ' انجوائے کرو۔" سلیمان صاحب نے آہستگی سے اس کے شانوں سے ہاتھ ہٹایا۔ وہ معذرت خواہانہ مسکراتی ہوئی گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ باہر آکر اس نے بے اختیار آنکھوں کے بھیگے گوشے صاف کیے۔

ان کے گھر کے ساتھ خالی پلاٹ میں شامیانے لگا کر مہندی کا فنکشن ارینج کیا گیا تھا۔ مہندیاں دونوں گھرانوں کی الگ الگ تھیں۔

گیندے کے پھولوں اور موتیے کی لڑیوں سے ہر کونا سجا تھا۔ روشنیوں کی ایک بہار سی اتری ہوئی تھی۔ تقریب سیگریگیٹڈ تھی۔ مرد الگ' عورتیں الگ۔ ہاں عورتوں والی طرف خاندان کے مردوں کا آنا جانا لگا تھا۔ میوزک سسٹم کے ساتھ ڈی جے بیٹھا تھا اور مووی میکر کیمرا لیے پھر رہا تھا۔ ارم بھی سلور کامدار لہنگے میں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ وہاں ڈی جے' مووی والے اور ریفرشمنٹ سرو کرتے ویٹرز' باہر کے مرد تھے' مگر آج تو شادی کا ایک فنکشن تھا' پھر سر ڈھکنے کی پابندی کیسے ہوتی؟ شادیوں پہ تو خیر ہوتی ہے نا۔

"حیا! ڈانس شروع کریں؟" ارم اپنا لہنگا سنبھالتی اس کے پاس آئی۔ داور بھائی پہ سارے ارمان نکال کر تمام رسمیں کرکے ان کو مردانے میں بھیج دیا گیا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے' تم گانا لگواؤ اور۔۔۔ یہ کون ہے؟"

وہ مصروف سے انداز میں ارم سے بولتی لحظہ بھر کو چونکی۔ سامنے والی کرسیوں کی قطار کے ساتھ ایک لڑکی کھڑی ایک کرسی پہ بیٹھی خاتون سے جھک کر مل رہی تھی۔ اس نے سیاہ عبایا اور اوپر اسٹول لے رکھی تھی۔ وہ عورتوں کا فنکشن تھا' پھر بھی عجیب بات تھی کہ اس لڑکی نے انگلیوں سے نقاب تھام رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں اور ماتھے کا کچھ حصہ نقاب سے جھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔ وہ جیسے مسکراتے ہوئے ان خاتون سے کچھ کہہ رہی تھی۔

"کون؟" ارم نے پلٹ کر دیکھا' پھر گہری سانس لے کر واپس مڑی۔ "یہ ایلین ہیں۔"

"کون؟" حیا نے حیرت سے کہا۔

"ایلین ارے بھئی شہلا بھابھی ہیں یہ۔ پوری دنیا سے الگ ان کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ہوتی ہے۔ بس توجہ کھینچنے کے لیے فنکشنز پر بھی عبایا' نقاب میں ملتی ہیں۔ اب پوچھو بھلا عورتوں کے فنکشن میں کس

سے پردہ کر رہی ہیں؟"
"ہاں، واقعی، ایلین نہ ہو تو!" اس نے شانے اچکائے، وہ ان کے ایک سیکنڈ کزن کی وائف تھیں اور سال بھر پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔
ڈی جے نے گانا سیٹ کر دیا تھا۔ خوب شور ہنگامہ شروع ہو گیا۔
انہوں نے مووی والے کو ڈانس کی مووی بنانے سے منع کر دیا اور پھر اپنا مہارت سے تیار کردہ رقص شروع کیا۔ ایک سنہری پری لگ رہی تھی تو دوسری چاندی کی۔ جب پاؤں دکھ گئے اور خوب تالیاں بجیں تو وہ ہنستی ہوئی واپس کرسیوں کی طرف آئیں۔
"السلام علیکم شہلا بھابھی!" وہ لڑکی ابھی اسی میز پہ موجود تھی۔ ارم نے فوراً "سلام کیا" حیا نے بھی پیروی کی۔
"وعلیکم السلام، کیسی ہو تم دونوں؟" وہ مسکرا کر خوشدلی سے ملی۔ ایک ہاتھ کی دو انگلیوں سے اس نے ابھی تک سیاہ نقاب تھام رکھا تھا۔
"بالکل ٹھیک، شہلا بھابھی! نقاب اتار دیں، ادھر کون ہے؟"
شہلا نے جواباً" مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا، مگر نقاب اسی طرح پکڑے رکھا۔
"ماشاءاللہ تم دونوں بہت پیاری لگ رہی ہو۔"
وہ بات کرتے کرتے ذرا سی ترچھی ہو گئی۔ حیا نے حیرت سے دیکھا۔ شاید اس طرف مووی والا فلم بنا رہا تھا اسی لیے۔
"عجیب عورت ہے، اتنی بھی کیا بے اعتباری، ہماری فیملی مووی ہے، ہم کون سا باہر کسی کو دکھائیں گے۔" حیا بڑبڑائی۔
پھر وہ جلد ہی معذرت کر کے وہاں سے چلی آئی۔ اماں جانے کدھر تھیں۔ کس سے پوچھے کہ سبین پھپھو آئی ہیں یا نہیں۔ کافی دیر کشمکش میں مبتلا رہی، پھر گھر چلی آئی اور لاؤنج میں ٹیلی فون اسٹینڈ کے ساتھ رکھی ڈائری اٹھائی۔ رقص کے باعث پاؤں درد کرنے لگے تھے۔ وہ صوفے پہ دھم سے گری، ایک ہاتھ سے

گولڈن ہائی ہیلز کے اسٹریپس کھول کر انہیں اتارا اور ننگے پاؤں ٹھنڈے ماربل کے فرش پہ رکھ دیے۔ ساتھ ہی وہ ڈائری کے صفحات پلٹتی سبین پھپھو کا نمبر تلاش کر رہی تھی۔ اس نے کبھی ان کو یوں فون نہیں کیا تھا، مگر آج وہ دل کے ہاتھوں ہار گئی تھی۔ ترکی کا وہ نمبر مل ہی گیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی جانے لگی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ پانچویں گھنٹی پہ فون اٹھا لیا گیا۔
"ہیلو۔" بھاری مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔
"السلام علیکم۔" اس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری۔
جواباً" وہ کسی انجان زبان میں کچھ بولا۔
"میں پاکستان سے بات کر رہی ہوں۔" وہ گڑبڑا کر انگریزی میں بتانے لگی۔
"پاکستان سے کون؟" اب کے وہ انگریزی میں پوچھ رہا تھا۔
اس کی آنکھوں میں پانی بھرنے لگا۔
"میں سبین سکندر کی بھتیجی ہوں۔ پلیز ان کو فون دے دیں۔"
"وہ جواہر تک گئی ہیں، کوئی میسج ہے تو بتا دیں۔"
وہ مصروف سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اب یہ جواہر کیا تھا اسے کچھ اندازہ نہ تھا۔
"وہ... وہ سبین پھپھو نے پاکستان نہیں آنا کیا دادا اور بھائی کی شادی پر؟"
"نہیں، وہ بزی ہیں۔" شاید وہ فون رکھنے ہی لگا تھا کہ وہ کہہ اٹھی۔
"آپ... آپ کون؟"
"ان کا بیٹا... جہان!" کھٹ سے فون رکھ دیا گیا۔
اس نے بھیگی آنکھوں سے ریسیور کو دیکھا اور پھر زور سے اسے کریڈل پہ پٹخا۔ بے اختیار امڈ آئے آنسو صاف کرتی وہ جھک کر سینڈل پہننے لگی۔ آنسوؤں نے آنکھوں کا میک اپ ذرا سا خراب کر دیا تھا۔ وہ اسے پھر سے ٹھیک کر کے کچھ دیر بعد باہر آئی تو گیٹ کی طرف

سے ظفر چلا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سفید ادھ کھلے گلابوں کا بکے تھا۔
وہ بے اختیار ٹھنک کر رکی، پھر لہنگا سنبھالتی، برآمدے کے زینے اتر کر آئی۔
"یہ کیا ہے ظفر؟"
"او تسی اچھے ہو؟ یہ کوریئر والے نے دیا ہے آپ کے لیے۔" ظفر نے گلدستہ اور ایک بند لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ پچھلے سات سال سے تایا فرقان کا ملازم تھا۔ وہ گاؤں سے اسے لے کر آئے تھے، جب آیا تھا تو پنجابی بولتا تھا، پھر ان سات برسوں میں اردو سیکھنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا۔ اب وہ کوئی درمیانی زبان بولتا تھا۔
"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" اس نے بوکے کو بازو اور سینے کے درمیان پکڑا اور دونوں ہاتھوں سے بند لفافہ کھولنے لگی۔
حسب معمول اس میں سفید سادہ کاغذ تھا، جس کے بالکل درمیان میں اردو میں ایک سطر لکھی تھی۔
"اس لڑکی کے نام... جو کبھی کسی ان چاہے رشتے کے بننے کے خوف سے روتی ہے، تو کبھی کسی بن چکے ان چاہے رشتے کے ٹوٹنے کے خوف سے۔"
وہ سن رہ گئی پھر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔
گیٹ کھلا تھا۔ مہندی والی جگہ سے روشنیاں اور موسیقی کا بے ہنگم شور یہاں تک آ رہا تھا۔ درمیان میں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ مہمان، نوکر چاکر، ویٹرز۔ ایسے میں کیا کوئی ادھر تھا، جو اس کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا؟
اس نے لفافے کو پلٹا۔ کوریئر کی مہر ایک روز قبل کی
ابھی دس منٹ قبل وہ جہان کے ساتھ پہلی دفعہ بات کر کے روئی تھی۔
"بن چکا ان چاہا رشتہ۔"
اور گھنٹہ بھر پہلے ولید اور اس کے والدین سے ملی
"ان چاہے رشتے کے بننے کا خوف..."

یہ کون تھا جو اتنا باخبر تھا؟ ایک دن قبل ہی اسے کیسے علم ہوا کہ وہ آج دو دفعہ روئے گی؟
وہ خوف زدہ سی کھڑی، بار بار وہ تحریر پڑھے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ابا نکل تو نہیں گئے؟"
وہ پرفیوم کی بوتل بند کر کے سنگھار میز پہ رکھتی، مخصوص ہارن اور گیٹ کھلنے کی آواز پہ موبائل اور پرس اٹھا کر باہر کو بھاگی۔ کافی دیر سے وہ کمرا بند کر کے بارات میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ فاطمہ بیگم جلدی جلدی کا شور مچائے دس بار دروازہ بجا چکی تھیں۔ مقررہ وقت ہونے کو تھا اور سلیمان صاحب کو تو سب سے پہلے ہال پہنچنا تھا اور اس کی سست روتیاریوں سے بھی وہ واقف تھے۔
پورچ خالی تھا۔ تایا فرقان کے پورشن سے البتہ شور سنائی دے رہا تھا، غالباً" وہاں پر ابھی سب نہیں نکلے تھے۔ اب کیا کرے؟ ابا کو فون کرے یا تایا فرقان کے گھر جا کر کسی سے لفٹ مانگے؟
وہ انہی سوچوں میں الجھتی اندر جانے کو پلٹی ہی تھی کہ کھلے گیٹ پہ ہارن ہوا۔ اس نے رک کر دیکھا۔
نیلی چمکتی اکارڈ باہر کھڑی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس خاصی تیز تھیں۔ حیا کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے بے اختیار ماتھے پر ہاتھ کا سایہ بنا کر دیکھنا چاہا، تب ہی ہیڈ لائٹس دھیمی ہوئیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کا چہرہ واضح ہوا۔
وہ ولید لغاری تھا۔ ساتھ فرنٹ سیٹ پر اس کے والد تھے اور پیچھے والدہ۔
"السلام علیکم حیا!" وہ دروازہ آدھا کھول کر باہر نکلا اور ایک نرم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔
وہ دھیمی ہوتی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔ گہرے سرخ کامدار بغیر آستینوں والا فراک جو پاؤں تک آتا تھا، اور نیچے ہم رنگ تنگ پاجامہ۔ فراک بہت لمبا تھا، سو پاجامے کی چوڑیاں

بمشکل بالشت بھر ہی دکھائی دیتی تھیں۔ دوپٹہ گردن میں تھا اور کانوں سے لٹکتے لمبے لمبے آویزے کندھوں کو چھو رہے تھے۔ کاجل سے لبریز سیاہ آنکھیں اور کمر پہ گرتے سیدھے بال۔

"ہمیں میرج ہال کا علم نہیں ہے' انکل ہیں؟" وہ نگاہوں میں اسے جذب کرتے پوچھ رہا تھا۔

وہ متذبذب سی آگے آئی اور لغاری صاحب کے دروازے کے ساتھ رکی۔ "انکل! پیراڈائز ہال جانا ہے اور ابا شاید نکل گئے۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔" وہ واقعتاً" پریشان تھی۔

"اوہ۔۔۔ تو آپ کے چچا وغیرہ؟"

"وہ تو ابا سے بھی پہلے چلے گئے تھے۔ ٹھہریں! ابا زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے' میں انہیں واپس۔۔۔"

"ارے وہ کیوں واپس آئیں؟ ان کا جلدی پہنچنا ضروری ہے' آپ ہمارے ساتھ آجاؤ بیٹا! ہم نے بھی تو وہیں جانا ہے۔"

"ہاں بیٹا' آؤ!" مسز مہناز لغاری نے فوراً" اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور دوسری طرف ہو گئیں۔

وہ چند لمحے تذبذب میں کھڑی رہی۔

اب اگر ابا کا انتظار کرتی تو آدھا فنکشن نکل جاتا اور اگر ان کے ساتھ جاتی تو۔۔۔ ابا برا نہیں مانیں گے۔ یہ تو اسے یقین تھا۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے پچھلی سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

"تو ہماری بیٹی کیا کرتی ہیں؟" راستے میں لغاری صاحب نے پوچھا تھا۔ (میں ان کی بیٹی کب سے ہو گئی؟)

"جی میں شریعہ اینڈ لاء میں ایل ایل بی آنرز کر رہی ہوں۔"

"یعنی کہ آپ اسلامی وکیل ہو؟"

"جی!" وہ پھیکا سا مسکرائی۔ یہ لوگ اتنی اپنائیت کیوں دے رہے ہیں مجھے؟

"تو یہ شریعہ اینڈ لاء کیسا سبجیکٹ ہے؟ کیونکہ میں بنیادی طور پہ ایک انجینئر ہوں اور انجینئرنگ شروع میں مجھے مشکل لگتی تھی بعد میں آسان ہو گئی۔"

"مجھے بھی شریعہ شروع میں مشکل لگتی تھی' بعد میں عادی ہو گئی۔" وہ تینوں ہنس پڑے تو اسے احساس ہوا کہ اسے خوامخواہ ان کے ساتھ زیادہ بے تکلف نہیں ہونا چاہیے۔

"حیا بیٹا! آپ کا شادی کے بعد پریکٹس کا ارادہ ہے؟ کیونکہ میں اور آپ کے انکل تو کبھی اس معاملے میں زبردستی کے قائل نہیں رہے۔ ہم نے فیلڈ منتخب کرنے سے لے کر کیریر بنانے تک' ہر چیز میں اپنے بچوں کی مرضی کو مقدم رکھا ہے۔ خود ولید کو بھی شادی کے بعد بیوی کے جاب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

مہناز کہہ رہی تھیں اور وہ ہکا بکا ان کو دیکھ رہی تھی۔ کیا معاملات اتنے آگے بڑھ چکے تھے یا وہ اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ ابا ان کو کبھی انکار نہیں کریں گے؟

بمشکل ہوں ہاں میں ان کے سوالات کے جوابات دیتی' وہ اس وقت پرسکون ہوئی جب میرج ہال کی بتیاں نظر آنے لگیں۔

"لفٹ کا شکریہ انکل۔" وہ انکل اور آنٹی کے ساتھ ہی باہر نکلی تھی۔ اسی پل لغاری انکل کا موبائل بجا تو وہ معذرت کر کے ایک طرف چلے گئے' مہناز بھی ان کے پیچھے گئیں۔

"حیا سنیے!" وہ جانے ہی لگی تھی کہ ولید نے پکارا۔ وہ ابھی تک اندر اسٹیئرنگ وہیل تھامے بیٹھا تھا۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیے اس سے مخاطب تھا۔

"مگر یہ مناسب نہیں ہے۔"

"مگر مجھے اسی رشتے کے حوالے سے بات کرنی ہے۔ اگر آپ دو منٹ اندر بیٹھ کر میری بات سن لیں تو۔" ساتھ ہی اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔

روشنی کا ایک کوندا اس کے ذہن میں لپکا۔ موقع اچھا تھا۔ وہ اس کو اپنے نکاح کے بارے میں بتا کر معاملہ یہیں دبا سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے' لیکن یہاں ہمارے رشتے دار ہیں اگر۔۔۔"

"ڈونٹ وری' میں کار بیک سائیڈ پر لے جاؤں گا' آپ بیٹھیے۔"

وہ متذبذب سی اندر بیٹھ گئی۔

زندگی میں پہلی دفعہ وہ یوں کسی لڑکے کے ساتھ تنہا بات کرنے بیٹھی تھی۔ ابا کو پتا چلتا تو ان کی ساری وسیع النظری بھک سے اڑ جاتی۔ اسے لباس پہننے کی آزادی تھی' سر ڈھکنے کی پابندی بھی نہ تھی' مگر لڑکوں سے بے تکلفی یا دوستی کی اجازت ابا نے کبھی نہیں دی تھی۔

وہ بیٹھی تو ولید زن سے گاڑی بھگا لے گیا۔

"آپ کو جو بھی کہنا ہے' جلدی کہیے' پھر مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔" وہ سر جھکائے گود میں رکھے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ عجیب مضطرب حالت ہو رہی تھی اس کی۔

"پہلے آپ کہیے۔" ولید میرج ہال کی پچھلی طرف ایک نسبتاً" سنسان گلی میں گاڑی لے آیا تھا۔

"او کے۔۔۔ مجھے کچھ بتانا تھا۔" وہ گردن جھکائے کہنے لگی۔ "میرے ابا نے معلوم نہیں آپ کو بتایا ہے یا نہیں' مگر میں بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔ میرا نکاح میری پھپھو کے بیٹے سے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ وہ لوگ ترکی میں ہوتے ہیں۔ کچھ خاندانی مسائل کے باعث میرے ابا ان سے ذرا بدظن ہیں۔ اور اب مجھے ڈائیورس دلا کر میری شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں' میں ایسا نہیں چاہتی۔"

اس نے سر نہیں اٹھایا۔ ولید کی خاموشی سے اس نے یہی مراد لی کہ وہ سخت شاک کے عالم میں ہے۔

"میں اپنے شوہر کی وفادار ہوں مسٹر ولید! میں نے ان کے خواب دیکھے ہیں اور ذہنی طور پر خود کو اسی سے [illegible] پاتی ہوں۔ اب کسی اور سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

وہ اب بھی کچھ نہ بولا۔ حیا گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھتے بولتی جا رہی تھی۔

"پلیز آپ انکار کر دیں۔ میں کسی اور کی بیوی ہوں۔ نکاح پر نکاح نہیں ہو سکتا' پلیز! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں۔"

اس نے چہرہ اوپر اٹھایا۔ وہ یک ٹک خاموش گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کا وہ چہرہ تو نہ تھا' جو وہ سارا راستہ ڈرائیونگ کے دوران دیکھتی آئی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی شخص تھا۔

"پھ۔۔۔ پھر آپ نے کیا سوچا؟" اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔ ولید کی آنکھوں میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ اسے لگا وہ ایک سنگین غلطی کر چکی ہے۔ خطرے کا الارم زور' زور سے اس کے اندر بجنے لگا۔

"کس بارے میں؟" وہ بوجھل آواز میں بولا تو وہ دروازے کی طرف سمٹی۔ نامحسوس انداز سے اس کا ہاتھ ہینڈل پر رینگ گیا۔

"آپ کے اس رشتے سے انکار کے بارے میں۔"

"ساری عمر پڑی ہے یہ باتیں کرنے کے لیے حیا! ابھی تو ان لمحوں سے فائدہ اٹھاؤ جو میسر ہوں۔" وہ ایک دم اس پر جھکا۔ حیا کے لبوں سے چیخ نکلی۔ ولید نے دونوں ہاتھ اس کی گردن پہ رکھنے چاہے' مگر اس نے زور سے ہینڈل کھینچ کر دروازہ دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے ولید کو دھکا دے کر باہر نکلی۔ اس کا دوپٹہ ولید کے ہاتھوں میں آگیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر بھاگی تو ولید نے دوپٹہ کھینچا۔ دوپٹہ اس کی گردن کے ساتھ رگڑتا ہوا پیچھے ولید کے ہاتھوں میں رہ گیا۔ وہ بنا پیچھے مڑ کے دیکھے بھاگی جا رہی تھی۔

اسے ولید کے دروازہ کھول کر کوئی اونچی سی انگریزی گالی دینے کی آواز سنائی دی تھی۔ اس کے بھاگتے قدموں میں تیزی آگئی۔

گلیاں سنسان تھیں۔ جانے وہ کہاں لے آیا تھا۔ آج اتوار تھا اور دکانوں کے شٹر گرے ہوئے تھے۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر بدحواس سی دوڑتی ہوئی ایک گلی میں مڑ گئی۔

پیچھے کوئی دوڑتا ہوا آرہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی گلی کے دوسرے سرے تک پہنچی' مگر یہ کیا؟ گلی بند تھی۔ ڈیڈ اینڈ۔

وہ بے ساختہ پلٹی۔ بھاگتے قدموں کی آواز قریب آرہی تھی۔

وہ دوڑ کر گلی کے بند سرے تک گئی اور دیوار کی اینٹوں کو چھو کر ٹٹولا۔ شاید اندر کوئی جادوئی دروازہ ہو۔ شاید ہیری پوٹر کی کہانیاں سچ ہوں مگر۔۔۔

"کیوں بھاگتی ہو؟" مسرور سے انداز میں کسی نے پیچھے سے کہا تو وہ گھبرا کر پلٹی۔

ولید سامنے سے قدم قدم چلتا آرہا تھا۔ اس کے لبوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ نڈھال سی دیوار سے لگ گئی۔ اس کا دوپٹہ تو وہیں رہ گیا تھا۔ اب بغیر آستینوں کے جھلکتے بازو اور گلے کا گہرا گھاٹ۔ اس نے بے اختیار سینے پہ بازو لپیٹے۔

"مجھے جانے دو!" اس کی آواز بھرا گئی۔ پہلی دفعہ یہ غلطی کی تھی اور پہلی ہی دفعہ اتنی بڑی سزا؟

"کیسے جانے دوں' پھر تم نے ہاتھ تھوڑا ہی آنا ہے؟" وہ چلتے چلتے اس سے چند قدم کے فاصلے پہ آکھڑا ہوا تھا۔ دور لگے اسٹریٹ پول کا بلب اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

"پلیز میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔"

"تو کیسی لڑکی ہو؟ مجھ سے لفٹ لے لی مگر شادی سے انکار ہے؟ تب ہی گاڑی میں اتنی بے رخی دکھا رہی تھیں؟" وہ اس کے بالکل سامنے آرکا۔

"پلیز۔۔۔" وہ ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اب ولید کو دھکا دیتی۔

"شش!" وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھا۔ حیا نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔

تب ہی اس نے زور سے کسی ضرب لگنے کی آواز سنی اور پھر ولید کی کراہ۔ اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

ولید چکرا کر نیچے گر رہا تھا اور اس کے پیچھے کوئی کھڑا نظر آرہا تھا۔

شوخ نارنجی شلوار قمیص میں ملبوس' میک اپ سے اٹا چہرہ لیے' وہی اس روز والا خواجہ سرا' ڈولی اس کے ہاتھ میں ایک فرائنگ پان تھا' جو اس نے شاید ولید کے سر پہ مارا تھا۔ وہ ساکت سی اس کو دیکھ رہی تھی۔

ڈولی نے پاؤں سے ایک ٹھوکر ولید کو ماری تو اس کا بے ہوش وجود ذرا پرے ہوا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور عین حیا کے سامنے رکا۔ اس کی سلور چمکیلے آئی شیڈ سے اٹی آنکھوں میں ایسی کاٹ تھی کہ وہ سانس روکے اسے دیکھے گئی۔

تب ہی اس نے ہاتھ بڑھایا اور حیا کو گردن کے پیچھے سے دبوچا یوں کہ گدی پہ گرے بال بھی اس کی گرفت میں آگئے۔ ڈولی کے ہاتھ اور حیا کی گردن کے درمیان اس کے بال تھے' پھر بھی اس کے ہاتھ کا کھردرا پن وہ محسوس کر سکتی تھی۔ لیکن لبوں سے کراہ تک نہ نکلی۔

اس کی گردن کو یوں ہی پیچھے سے دبوچے' ڈولی نے ایک جھٹکے سے اسے آگے دھکیلا۔ وہ بے اختیار کھانسی' مگر ڈولی کی بے رحم گرفت ڈھیلی نہ پڑی۔ وہ اسے اسی طرح پکڑے اپنے آگے آگے دھکیل کر چلا رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چل رہی تھی۔

گلی کے آغاز تک جہاں سے وہ آئی تھی' وہ اسے لے گیا' پھر مخالف سمت میں مڑ گیا۔ سامنے ہی میرج ہال کا پچھلا حصہ تھا۔ وہ اسے اپنے آگے دھکیلتا پچھلے گیٹ تک لے آیا اور ایک جھٹکے سے اسے چھوڑا۔ حیا کو لگا' اس کی گردن کے گرد سے ایک کھردرا طوق ہٹا ہے۔ اس نے پلٹ کر ڈبڈبائی آنکھوں سے ڈولی کو دیکھا۔

وہ ابھی تک لب بھینچے' تلخ کاٹ دار نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

حیا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ اسے لگا' وہ اب کبھی بول نہیں پائے گی۔ دفعتاً" ڈولی نے اپنی گردن سے لپٹا نارنجی دوپٹہ کھینچا اور اس پہ اچھالا۔ دوپٹہ اس کے سر پہ آن ٹھہرا' پھر سلکی بالوں سے پھسلتا ہوا شانوں پہ ڈھلک گیا۔ ڈولی چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا' آہستہ سے بولا۔

"بے حیا!"

اس کے لہجے میں برچھی کی کاٹ تھی۔ پھر وہ پلٹ گیا۔ وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دور جاتے دیکھتی

رہی۔ نارنجی دوپٹہ اس کے کندھوں سے پھسل کر قدموں میں آگرا تو وہ چونکی' پھر جھک کر دوپٹہ اٹھایا۔ ریشمی بھڑکیلا نارنجی دوپٹہ جس پر سستا سا گولڈن تاروں کا کام تھا۔ وہ کبھی اپنی مائی کو بھی ایسا دوپٹہ نہ دیتی' مگر آج۔۔۔

اس نے اچھے طریقے سے خود کو اس دوپٹے میں لپیٹا' تاکہ پہچانی نہ جائے اور پچھلے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

ہال میں جانے کی بجائے وہ باتھ روم کی طرف آئی اور اپنا حلیہ درست کیا۔ رونے سے کاجل بہہ گیا تھا۔ بال بھی بکھرے تھے۔ موبائل اس چھوٹے سے کلچ میں تھا' جو اس نے اس سارے عرصے میں اپنے بائیں ہاتھ میں دبوچے رکھا تھا' شکر!

اندر فنکشن اپنے عروج پہ تھا۔

اسٹیج پہ دولہا' دلہن' رشتے داروں' کزنز اور دوستوں کے جلو میں مسکرا رہے تھے۔ سونیا بھابھی بہت اچھی لگ رہی تھیں اور داور بھائی بھی۔ ارم فیروزی فراک میں چمکتی ہوئی ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ اصولاً" اسے بھی وہیں ہونا چاہیے تھا' مگر وہ ایسی ذہنی حالت میں نہ تھی کہ دو قدم بھی چل پاتی' سو بے دم سی ایک آخری نشست پر گری ہوئی تھی۔

"بے حیا۔"

"بے حیا۔"

"بے حیا۔"

ڈولی کے الفاظ کی بازگشت ہتھوڑے کی طرح اس کے دماغ پہ برس رہی تھی۔ وہ بے حیا تو نہیں تھی۔ وہ تو کبھی کسی لڑکے کی گاڑی میں نہیں بیٹھی تھی۔ اس نے تو یہ غلطی پہلی دفعہ ہوئی تھی' پھر۔۔۔؟ سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جاتا تھا۔

وہ آدھے فنکشن کے بعد ہی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر چلی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

داور اور سونیا کی شادی کے چند روز بعد کا ذکر ہے۔

صبح سے سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ دسمبر ختم ہونے کو تھا اور ہوا ٹھٹھرا دینے والی بن چکی تھی۔ ایسے میں وہ کیمپس میں اسکالر شپ کو آرڈینیٹر کے آفس کے باہر دروازے پہ لگی لسٹ دیکھ رہی تھی۔ "ایریسمس منڈس ایکسچینج پروگرام" کے تحت اسٹوڈنٹس میں سے صرف دو لڑکیاں سبانجی یونیورسٹی جا رہی تھیں۔ حیا سلیمان اور خدیجہ رانا۔

"یہ خدیجہ رانا ہے کون بھلا؟" وہ سوچتے ہوئے اپنے یخ ہوتے ہاتھ آپس میں رگڑ رہی تھی۔ سردی سے اس کی ناک سرخ پڑ رہی تھی۔ لانگ شرٹ اور ٹراوزر پر اسٹائلش سالانگ سوئیٹر پہنے وہ دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ دفعتاً" عقب سے کسی نے پکارا۔

"ایکسکیوز می!"

وہ چونک کر پلٹی۔ پیچھے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ کندھے پہ بیگ' ہاتھ میں ڈائری اور پین اور آنکھوں پر بڑا سا چشمہ۔ وہ اس کو نام سے نہیں پہچانتی تھی' مگر اس کو کئی دفعہ یونیورسٹی میں دیکھا ضرور تھا۔ وہ لڑکی اسے خوامخواہ ہی بہت بری لگتی تھی۔

"یہ حیا سلیمان کون ہے بھلا؟" وہ چشمے کے پیچھے سے آنکھیں سکیڑے سوچتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

حیا نے ایک طنزیہ نگاہ میں اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا' پھر ذرا روکھے انداز میں بولی۔ "میں ہوں!"

"اوہ!" اس نے جیسے بمشکل اپنی ناگواری چھپائی۔

"میں آپ کے ساتھ ترکی جا رہی ہوں حیا! میں خدیجہ ہوں' میری فرینڈز مجھے ڈی جے کہتی ہیں' مگر آپ میری فرینڈ نہیں ہیں' سو خدیجہ ہی کہیے گا۔"

"مجھے بھی حیا صرف میرے فرینڈز کہتے ہیں۔ آپ مجھے مس سلیمان کہہ سکتی ہیں۔" وہ کہہ کر پلٹ گئی۔

عجیب بد دماغ لڑکی تھی وہ خدیجہ رانا۔ اسے خوامخواہ ہی بہت بری لگتی تھی' اور اب اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے بھی حیا کے بارے میں خیالات کچھ ایسے ہی تھے۔

وہ جیسے ہی گھر آئی' ظفر سامنے آگیا۔ بھاگتا ہوا' ہانپتا ہوا۔

"حیالی بی۔ حیالی بی!"

"بول بھی چکو اب!" وہ گاڑی لاک کرتی کوفت زدہ ہوئی۔

"آپ کو ارمی بی بلا رہی ہیں۔"

"خیریت؟"

"خیریت نہیں لگتی جی۔ وہ بہت رو رہی ہیں۔" ظفر نے رازداری سے بتایا تو وہ چونکی۔

"اچھا۔ میں آتی ہوں' تم یہ میرا بیگ اندر رکھ دو۔" وہ سیدھا ارم کے گھر کھلنے والے درمیانی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

لاؤنج میں صائمہ تائی اور سونیا بیٹھی تھیں۔ سامنے کوئی کامدار دوپٹہ پھیلا رکھا تھا اور دونوں اس کے ساتھ الجھی تھیں۔ آہٹ پہ سر اٹھایا۔ اسے دیکھ کر دونوں ہی مسکرا دیں۔

"حیا! کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک' ارم کدھر ہے تائی اماں! مجھے بلا رہی تھی۔"

"اندر کمرے میں ہوگی۔"

"او کے' میں دیکھ لیتی ہوں۔" وہ مسکرا کر راہداری کی سمت بڑھ گئی۔

ارم کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ڈور ناب گھما کر دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا' بیڈ پر ارم اکڑوں بیٹھی تھی۔ سامنے لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا' چمکتی اسکرین کی روشنی ارم کے چہرے کو چمکا رہی تھی' جس پہ آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔

"ارم! کیا ہوا؟" وہ قدرے فکرمندی سے ارم کے سامنے آ بیٹھی۔

ارم نے سرخ متورم آنکھیں اٹھا کر حیا کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا' جو اسے ٹھٹکا گیا۔

"حیا! ایک بات بتاؤ!" اس کا رندھا ہوا لہجہ عجیب سا تھا۔

"بولو!"

"ہم شریف لڑکیاں ہیں کیا؟"

"اپنے بارے میں تو یقین ہے مگر تمہارا معاملہ ذرا مشکوک ہے۔" اس نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کو کہا' مگر ارم مسکرائی تک نہیں۔

"نہیں حیا! ہم دونوں کا ایک ہی معاملہ ہے۔"

"کیوں پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟ ہوا کیا ہے؟"

"حیا مجھے بتاؤ' کیا ہم مجرا کرنے والیاں ہیں؟" وہ ایک دم رونے لگی تھی۔

"ارم!" وہ ششدر رہ گئی۔

"بتاؤ' کیا ہم طوائفیں ہیں؟" وہ اور زور سے رونے لگی۔

"ارم! بات کیا ہوئی ہے؟"

"حیا! بولو' بتاؤ' ہم ایسی ہیں کیا؟"

"نہیں' بالکل نہیں!"

"پھر۔ پھر یہ کیا ہے!" ارم نے لیپ ٹاپ کی اسکرین کا رخ اس کی طرف کیا۔

"کیا ہے یہ؟" اس نے الجھن سے اسکرین کو دیکھا۔ ایک ویڈیو اپ لوڈنگ ویب سائٹ کھلی ہوئی تھی اور اس پہ ایک ویڈیو چل رہی تھی۔ ویڈیو کا کیپشن اوپر رومن اردو میں لکھا تھا۔

"شریفوں کا مجرا۔"

ویڈیو کسی شادی کے فنکشن کی تھی۔ ہر سو سجی سنوری خواتین اور درمیان میں ڈانس فلور پہ محو رقص دو لڑکیاں۔

ایک کا لہنگا گولڈن تھا اور دوسری کا سلور۔

پوری چھت جیسے اس کے سر پہ آن گری۔

"نہیں!" وہ کرنٹ کھا کر اٹھی۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ شریفوں کا مجرا ہے حیا! اور یہ ہم نے کیا ہے' یہ داور بھائی کی مہندی کی ویڈیو ہے' جو کسی نے ادھر انٹرنیٹ پر ڈال دی ہے۔ یہ پڑھو' ویڈیو ڈالنے والے نے اپنا ای میل ایڈریس بھی دیا ہے' جس پہ میل کر کے پورے ڈانس کی ویڈیو حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہ دیکھو۔ اس ویڈیو کو تین دن سے اب تک سیکڑوں لوگ دیکھ چکے ہیں۔ حیا! ہم برباد ہو گئے ہیں' ہم کہیں کے نہیں رہے۔"

ارم پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور وہ ساکت سی اسکرین کو تکے جا رہی تھی۔ یہ کوئی بھیانک خواب تھا۔ ہاں یہ خواب ہی تھا' اور اب وہ جاگ جانا چاہتی تھی۔

اسکرین پہ رقصاں پریوں کے سراپے میں مختلف حصوں پہ کسی نے سرخ دائرے کھینچ رکھے تھے' جیسے ہی کوئی لڑکی کسی اسٹیپ پہ جھکتی' گلے کا گہرا گھاٹ جھلکتا تو فوراً" سرخ دائرہ ابھرتا۔

اس کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔

"نہیں۔ یہ میں نے نہیں کیا۔" وہ ایک ایک قدم پیچھے ہو رہی تھی۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ ارم اسی طرح بلک رہی تھی۔

"میں۔ میں مجرا کرنے والی نہیں ہوں' میں شریف لڑکی ہوں۔" وہ قدم قدم پیچھے ہوتی دیوار سے جا لگی۔

"یہ ہم ہی ہیں حیا! ہم برباد ہو گئے ہیں۔"

اس کا سر چکرانے لگا۔ یہ سب کیا ہو گیا تھا؟ ویڈیو کے سیکڑوں ویوز لکھے آ رہے تھے۔ کیا وہ پورے شہر میں پھیل گئی تھی؟ اور اگر اس کے خاندان والوں تک پہنچی تو۔

"ابا تو مجھے گولی مار دیں گے ارم!"

"مجھے تو زندہ گاڑھ دیں گے۔"

"مگر یہ ویڈیو کس نے بنائی؟ ہم نے تو مووی والے کو بھی منع کر دیا تھا۔"

"کسی نے چھپ کر بنائی ہوگی۔ خاندان کی شادی پر صرف عورتوں میں ڈانس کی اجازت ابا لوگوں نے دی تھی' اگر انہیں پتا چلا کہ ہمارا یہ ڈانس پورے شہر کے لوگ انجوائے کر رہے ہیں تو کیا ہوگا؟"

"کچھ کرو ارم!" اس کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ تیزی سے ارم کے قریب آئی۔

"میں نے اس ویب سائٹ پر رپورٹ تو کی ہے لیکن اگر سائٹ نے ایکشن لے کر ویڈیو ہٹا دی تو بھی یہ سی ڈیز تو ہر جگہ مل رہی ہے۔ ایسی چیزیں تو منٹوں میں ۔۔۔ ہم کہاں کہاں سے اسے ہٹوائیں گے؟"

"خدایا۔ یہ کیا ہو گیا ہے؟" وہ بے دم سی زمین پہ بیٹھ گئی۔ "اگر ابا یا کسی بھائی وغیرہ کو معلوم ہو گیا تو۔ اوہ خدایا۔ ہم کیا کریں؟"

ارم نے بھی خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا' اور وہ بھی بس کمرے کی ہو کر رہ گئی۔ سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جاتا تھا مگر کوئی حل ذہن میں نہیں آتا تھا۔

شام میں فاطمہ بیگم نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

"حیا! اٹھو' کتنا سوؤ گی؟ روحیل کا فون ہے امریکہ سے۔"

وہ جو چہرے پہ بازو رکھے لیٹی تھی' کرنٹ کھا کر اٹھی۔

"روحیل کا؟ کیوں؟ کیا کہہ رہا ہے؟" اس کے ذہن میں خطرے کا الارم بجنے لگا تھا۔

"کہہ رہا ہے اسے تم سے بات کرنی ہے۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں اور وہ شل سی بیٹھی رہ گئی۔ سکون کی ندی میں زور سے پتھر آ گرا تھا۔

روحیل امریکہ میں تھا اور وہاں پر تو لوگ عموماً" سارا وقت ہی آن لائن رہتے تھے' پھر ایسے میں اس کی نگاہوں سے اس ویڈیو کا گزر جانا عین ممکن تھا۔ خدایا اب وہ کیا کرے؟

اس نے پیروں میں سلیپرز ڈالے اور مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی باہر لاؤنج میں آئی۔ کریڈل کے ساتھ الٹا ریسیور پڑا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

"ہ۔ ہیلو؟"

"ہیلو حیا؟ کیسی ہو؟" روحیل کی آواز میں گرم جوشی تھی' وہ کچھ اندازہ نہیں کر پائی۔

"ٹھیک۔ تم۔ تم ٹھیک ہو؟"

"ایک دم فٹ۔ میں نے تمہیں مبارک باد دینی تھی۔" اس کا دل زور سے دھڑکا۔ کیا وہ طنز کر رہا تھا؟

"ک۔ کس بات کی؟"

"بھئی تم ایکسچینج پروگرام کے تحت ترکی جا رہی ہو اور کس بات کی بھلا!"

"اوہ اچھا۔" اس کی اٹکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ وہ نڈھال سی دھپ سے صوفے پہ گری۔

"ہاں جا رہی ہوں۔ تھینک یو سو مچ۔" ان گزرے

تین دنوں میں وہ یہ بات بھلا چکی تھی۔
"کب تک جانا ہے؟" وہ خوشی سے پوچھ رہا تھا۔
"جنوری کے اینڈ یا فروری کے شروع تک۔"
"تو کیا تم ادھر سبین پھپھو کی فیملی سے ملو گی؟"
"پتا نہیں' ابھی سوچا نہیں ہے۔" اس کے پاس اس وقت سوچنے کے لیے زیادہ بڑے مسائل تھے۔
"کیا بات ہے' تم اپ سیٹ لگ رہی ہو؟" وہ ذرا پریشان ہوا۔
"ارے نہیں۔۔۔" وہ فوراً" سنبھلی اور پھر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے خود کو نارمل ظاہر کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔
فون بند ہوا تو وہ ارم کی طرف چلی آئی۔ وہ تکیہ منہ پہ رکھے لیٹی تھی۔
"یوں سر منہ لپیٹ کر بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔"
"تو کیا کریں؟" ارم نے تکیہ پھینکا اور اٹھ بیٹھی۔
"سب سے پہلے تو دونوں گھروں کے تمام کمپیوٹرز پہ اس ویب سائٹ کو بلاک کرتے ہیں تاکہ کم از کم گھر والوں کو تو نہ پتا چلے' پھر اس کا کوئی مستقل حل سوچتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے' چلو!" امید کا سرا دیکھ کر ارم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہنا کسی دقت کے جب وہ تمام کمپیوٹرز پہ اس ویب سائٹ کو بلاک کر چکیں تو صائمہ تائی نے آکر بتایا کہ رات میں ارم کو دیکھنے تایا فرقان کے کوئی فیملی فرینڈ بمع خاندان آرہے ہیں۔ رسمی کارروائی تھی' کیونکہ وہ رشتہ تو ڈھکے چھپے الفاظ میں مانگ ہی چکے تھے۔ حیا سب کچھ بھلا کر پُر جوش ہوگئی۔
"ہمارے دولہا بھائی بھی ساتھ ہی آئے ہیں۔" حیا ڈرائنگ روم میں جھانک کر اندر کمرے میں آئی تو وہ منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔
"تم ایسے کیوں بیٹھی ہو؟"
ارم نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ سر پہ سلیقے سے دوپٹا جمائے وہ بر دکھوے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ ہاں! آنکھیں ذرا ویران سی تھیں۔
"دفع کرو اسے۔ آؤ سب بلا رہے ہیں۔ لڑکے کو اس کی والدہ ماجدہ نے اندر بلایا ہے' تمہیں دکھانے کے لیے۔ آؤ!" اس نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔
"اور ابا؟" ارم کی آنکھوں میں ذرا سی پریشانی اتری۔
"ان سے اجازت لے لی ہے' اور وہ باہر مردوں میں بیٹھے ہیں۔" وہ ارم کو ہاتھ سے پکڑے ڈرائنگ روم کی طرف لے آئی۔ جالی دار پردے کے پیچھے وہ دونوں لمحے بھر کو رکی تھیں۔
اندر صوفوں پہ صائمہ تائی' فاطمہ بیگم اور سونیا بھابھی بیٹھی تھیں۔ سامنے والے دو سنگل صوفوں پہ ایک نفیس سی خاتون اور ایک خوبرو سا نوجوان بیٹھا تھا۔ سامنے رکھی میز لوازمات سے سجی تھی اور سونیا بصد اصرار مہمانوں کو بہت کچھ پیش کر رہی تھی۔
"بس بھابھی! ہمیں تو اپنے جیسی ہی بچی چاہیے۔ باحیا' باپردہ' صوم صلوٰۃ کی پابند۔" وہ خاتون مسکرا کر کہہ رہی تھیں۔
"ارے مسز کریم! ہماری ارم تو کبھی سر ڈھکے بغیر گیٹ سے باہر نہیں نکلی۔"
"السلام علیکم۔" وہ ارم کو ساتھ لیے اندر داخل ہوئی۔ اس کے سلام پہ سب نے سر اٹھا کر دیکھا۔
گلابی پوری آستینوں والی شلوار قمیص میں ہم رنگ دوپٹہ اچھی طرح پھیلا کر سر پہ لیے ارم جھکی جھکی نگاہوں سے سامنے ایک صوفے پہ آ بیٹھی۔
حیا بھی ساتھ ہی تھی۔ کمر پہ گرتے سلکی بال' گرے اے لائن شرٹ اور ٹراؤزر زیب تن کیے' دوپٹہ کندھے پہ ڈالے ارم کے ساتھ ہی ٹانگ پہ ٹانگ رکھے پُر اعتماد طریقے سے بیٹھ گئی یوں بیٹھنے سے ٹراؤزر کے پائنچے ذرا اوپر کو اٹھ گئے اور گرے قینچی چپلوں میں مقید سپید پاؤں ٹخنوں تک جھلکنے لگے۔
بیگم کریم کی مشفق سی آنکھوں میں ارم کو دیکھ کر پسندیدگی کی جھلک اتری تھی۔ انہوں نے تائیدی انداز میں اپنے اسمارٹ سے بیٹے کو دیکھا' مگر وہ ارم کو نہیں' بلکہ بہت غور سے حیا کو دیکھ رہا تھا۔
"اور بیٹا! آپ کیا کرتی ہو؟" بیٹے کو متوجہ نہ پا کر وہ سنبھل کر ارم سے مخاطب ہوئیں۔
"جی ماسٹرز کر رہی ہوں انگلش لٹریچر میں۔" ارم نے جھکی جھکی نگاہوں سے جواب دیا۔
تب ہی حیا کو محسوس ہوا' وہ لڑکا مسلسل اسے دیکھ رہا ہے۔ ستائش یا پسندیدگی سے نہیں' بلکہ غور سے' جانچتی پرکھتی نظروں سے۔
دفعتاً" اس نے پاکٹ سے اپنا قیمتی موبائل نکالا اور خاموشی سے سر جھکائے بٹن پریس کرنے لگا۔
خواتین آپس میں گفتگو میں مصروف تھیں' مگر حیا کچھ عجیب سا محسوس کرتی کنکھیوں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ جو اپنے فون پہ جھکا تھا۔ تب ہی ہولے سے اس کے موبائل سے "مائی نیم از شیلا" کی آواز گونجی تھی۔ اس نے فوراً" بند کر دیا' مگر وہ سن چکی تھی۔ شیلا کے ساتھ شادیوں کا مخصوص شور بھی سنائی دیا تھا' اور ارم نے بھی شاید کچھ سنا تھا' تب ہی چونک کر گردن اٹھائی' اور پھر قدرے بے بسی سے واپس جھکا دی۔
حیا کو اپنی جان جسم سے نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ کیا دنیا اتنی چھوٹی تھی؟
وہ اب موبائل پہ کچھ دیکھ رہا تھا' کبھی اسکرین پہ دیکھتا اور کبھی حیا اور ارم کے چہروں پہ نگاہ ڈالتا۔ صاف ظاہر تھا' وہ کچھ ملانے کی سعی کر رہا تھا' یقین دہانی' تصدیق' ثبوت سب صاف ظاہر تھا۔
پھر ایک دم وہ اٹھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔ ایک شرمندہ سی خاموشی نے سارے ماحول کو گھیر لیا۔
حیا نے سر جھکا دیا' اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت بے چین سی بیٹھی تھی۔ پاؤں اوپر صوفے پہ لیے' ہاتھ میں ریموٹ پکڑے' وہ جھلائی ہوئی سی چینل بدل رہی تھی۔ مضطرب' بے بس' پریشان۔
اسمارٹ ٹی وی کی اسکرین پہ پورے میوزک کے ساتھ اشتہار چل رہا تھا۔ وہ غائب دماغی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی' جہاں موبائل کمپنی کے لوگو کے ساتھ "غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً" جرم ہے۔ پی ٹی اے" لکھا آرہا تھا۔ جانے کب pause کا بٹن اس سے دبا اور اشتہار وہیں رک گیا۔ وہ اتنی دور بھٹکی ہوئی تھی کہ پلٹے بھی نہ کر سکی۔
دفعتاً" دروازے میں فاطمہ بیگم کی شکل دکھائی دی۔ وہ تھکی تھکی سی اندر داخل ہو رہی تھیں۔ حیا ریموٹ پھینک کر تیزی سے اٹھی۔
"کیا بات تھی؟ صائمہ تائی نے کیوں بلوایا تھا؟" وہ بے چینی سے ان کے قریب آئی۔
"ارم کے رشتے کے لیے جو لوگ اس روز آئے تھے۔" وہ نڈھال سی کہتی صوفے پہ بیٹھیں۔
"ہاں' کیا ہوا انہیں۔" وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ ان کے نزدیک بیٹھی۔
"انہوں نے انکار کر دیا ہے' حالانکہ رشتہ مانگ چکے تھے۔"
اور حیا کا دل بہت اندر تک ڈوب کر ابھرا تھا۔
"کیوں؟ کیوں انکار کر دیا؟" اس کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔
"کوئی وجہ نہیں بتاتے۔ بس ایک دم پیچھے ہٹ گئے ہیں' صائمہ بھابھی بہت پریشان تھیں۔"
"مگر کچھ تو کہا ہوگا!"
"بس یہی کہا ہے کہ ہم نے کسی آزاد خیال اور بے پردہ لڑکی کو بہو بنا کر اپنی عاقبت نہیں خراب کرنی۔"
وہ متحیر رہ گئی۔ چند روز قبل سنا تائی کا فقرہ سماعت میں گونجا تھا۔
"جب فرقان نے سختی کی کہ بھلا ایسی بے پردہ اور آزاد خیال لڑکی کو اپنی بہو بنا کر ہم نے اپنی آخرت بگاڑنی ہے کیا' تب کہیں جا کر وہ مانا۔"
کیا اس کو مکافات عمل کہتے ہیں؟ کیا دوسروں کی بیٹیوں پہ انگلیاں اٹھانے والوں کے اپنے گھروں پہ وہی اٹھی انگلیاں لوٹ کر آتی ہیں؟ اتنی جلدی بدلے ملنے لگتے ہیں؟ مگر وہ خوش نہیں ہو پائی۔ اگر بات کھل جاتی تو اصل بدنامی تو اسی کے حصے میں آتی۔ ارم کو تو شاید

اس کی ماں "حیا نے اسے بگاڑا ہے" کہہ کر درمیان سے نکل لیتی اور بات تو اب بھی کھل سکتی تھی۔ وہ ویڈیو تو اب بھی انٹرنیٹ پہ موجود تھی۔

فاطمہ بیگم اٹھ کر کچن کی جانب چلی گئی تھیں اور وہ صوفے پہ گر سی گئی۔ ٹی وی اسکرین پہ وہ اشتہار ابھی تک رکا ہوا تھا۔ وہ بس خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔

اب شاید ارم کے لیے کبھی کوئی رشتہ نہ آئے۔ آیا بھی تو یہی ہوگا‘ جو اس دفعہ ہوا تھا اور ہر کوئی ان کی طرح تو نہیں ہوگا کہ بات دبا جائے۔ کسی نے منہ پہ ساری بات کردی تو۔۔۔ خدایا! وہ کدھر جائیں گی؟

"غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً" جرم ہے۔ پی ٹی اے۔"

وہ بے خیالی سے اسے تکتی‘ سوچوں کی الجھن سے نکل کر ایک دم چونکی۔

"غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال قانوناً" جرم ہے‘ پی ٹی اے۔"

بجلی کا ایک کوندا سا اس کے ذہن میں لپکا تھا۔ اوہ خدایا‘ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہیں آیا؟

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر کو لپکی۔

"ارم۔۔۔ ارم۔۔۔" بہت جوش سے چلاتے ہوئے حیا نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا۔

ارم موبائل پکڑے بیڈ پہ بیٹھی تھی‘ دروازہ کھلنے پہ گڑبڑا کر موبائل سائیڈ پہ رکھا۔

"کیا ہوا؟" ساتھ ہی ارم نے اپنا موبائل الٹا کر دیا تاکہ اسکرین چھپ جائے۔

"سنو وہ۔۔۔" تب ہی رشتے والی بات یاد آئی۔ "وہ آئی ایم سوری ان لوگوں نے رشتے سے انکار کر دیا۔"

"وہ تو ویڈیو دیکھ کر کرنا ہی تھا‘ خیر جانے دو‘ اچھا ہی ہوا۔" وہ مطمئن تھی۔ حیا کو حیرت ہوئی‘ مگر وہ وقت حیرت ظاہر کرنے کا نہیں تھا۔ وہ جلدی سے اس کے ساتھ آ بیٹھی۔

"ارم! میری بات سنو۔ تم نے کبھی موبائل کنکشنز کے اشتہاروں میں وہ عبارت پڑھی ہے کہ غیر تصدیق شدہ سم کا استعمال جرم ہے؟"

"ہاں تو؟"

"تو کیا تمہیں معلوم ہے سم رجسٹر کروانا کیوں ضروری ہوتا ہے؟"

"کیوں؟"

"تاکہ کوئی کسی سم کا غلط استعمال نہ کرسکے‘ چاہے وہ دہشت گردی کی واردات میں ہو یا کسی کو رانگ کالز کرنے میں‘ یہ سب سائبر کرائم کے تحت آتا ہے۔"

"سائبر کرائم؟" ارم نے پلکیں جھپکائیں۔

"ہاں اور ہر سائبر کرائم پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کو رپورٹ کیا جاسکتا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو حیا! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"ارم۔۔۔ ارم۔۔۔ ہماری پرسنل ویڈیو انٹرنیٹ پہ ڈال دینا بھی تو ایک سنگین جرم ہے‘ سائبر کرائم۔ ہم اس کی رپورٹ کرسکتے ہیں۔"

"تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟" وہ فوراً بدکی۔ "اگر کسی کو پتا چل گیا تو؟"

"پتا تو تب چلے گا جب ہم اس ویڈیو کو وہیں رہنے دیں‘ چار دن سے میں سولی پہ لٹکی ہوں‘ اب اس مسئلے کو ختم ہو جانا چاہیے۔"

"مگر۔۔۔ مگر ہم کس کو رپورٹ کریں گے؟" وہ نیم رضامند ہوئی تو حیا نے جھٹ اپنا موبائل نکالا۔

"پی ٹی اے کو‘ دروازہ بند کرو‘ میں اپنے کنکشن کی ہیلپ لائن سے پی ٹی اے کا نمبر لیتی ہوں۔"

ارم دوڑ کر دروازہ بند کر آئی اور حیا نمبر ملانے لگی۔ پی ٹی اے کی ہیلپ لائن کا نمبر آسانی سے مل گیا‘ مگر آپریٹر نے نہایت شائستگی سے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ اس قسم کا سائبر کرائم کسی انٹیلی جنس ایجنسی کے سائبر کرائم سیل کو رپورٹ کرنا ہوگا۔ حیا نے ان سے ملک کی سب سے بڑی سرکاری ایجنسی کے سائبر کرائم سیل کا ای میل ایڈریس لے تو لیا‘ مگر اب وہ متذبذب بیٹھی تھی۔

"یہ انٹیلی جنس والے خطرناک لوگ ہوتے ہیں

ارم!"

"مگر اب یہ کرنا تو ہے نا!"

اور واقعی کرنا تو تھا۔

ارم نے لیپ ٹاپ کھولا اور پھر بہت بحث و تمحیص کے بعد انہوں نے ایک کمپلینٹ لکھی اور اس پتے پہ بھیج دی جو پی ٹی اے سے ان کو ملا تھا۔

بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ حیا کا موبائل بجا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ چمکتی اسکرین پہ انگریزی میں پرائیوٹ نمبر کالنگ لکھا آرہا تھا۔ ساتھ کوئی نمبر وغیرہ نہیں تھا۔ اس کے موبائل پہ نام اور نمبر دونوں آتے تھے اور اسے نہیں یاد تھا کہ کبھی کوئی نمبر اس نے پرائیوٹ نمبر کے نام سے محفوظ کیا ہو اور عجیب بات تو یہ تھی کہ نمبر تو سرے سے آ ہی نہیں رہا تھا۔

"یہ کون ہوسکتا ہے؟" اس نے اچنبھے سے موبائل کان سے لگایا۔

"ہیلو۔" دوسری جانب ذرا دیر کی خاموشی کے بعد ایک بھاری گمبھیر آواز سنائی دی۔

"السلام علیکم مس حیا سلیمان؟"

"جج۔۔۔ جی۔۔۔ آپ کون؟"

"میں میجر احمد بات کررہا ہوں‘ سائبر کرائم سیل سے۔ آپ نے ہماری ایجنسی میں رپورٹ کی ہے‘ ہمیں ابھی آپ کی کمپلینٹ موصول ہوئی ہے۔"

وہ جو بھی تھا‘ بہت خوب صورت بولتا تھا۔ گہرا‘ گمبھیر‘ مگر نرم لہجہ جس میں ذرا سی چاشنی بھری تپش تھی۔ گرم اور سرد کا امتزاج۔

"مگر۔۔۔ میں نے کمپلینٹ میں اپنا نمبر تو نہیں لکھا تھا۔" وہ دھک دھک کرتے دل کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ ارم بھی حیرت بھرے خوف سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ جواباً وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"نمبر تو بہت عام سی چیز ہے مس سلیمان! میں تو آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔"

"کیا؟"

"یہی کہ آپ سلیمان اصغر کی بیٹی ہیں۔ آپ کے والد کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔ آپ کا بھائی روحیل جارج میسن یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ خود آپ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی میں ایل ایل بی آنرز شریعہ اینڈ لاء کے پانچویں سال میں ہیں۔ فروری میں آپ ایکسچینج پروگرام کے تحت استنبول جارہی ہیں‘ غالباً" سبانجی یونیورسٹی میں اور پچھلے ہفتے اپنے کزن داور فرقان کی مہندی کے فنکشن پہ بننے والی ویڈیو کی انٹرنیٹ پہ اپ لوڈنگ کو آپ نے رپورٹ کیا ہے۔ از دیٹ رائٹ میم؟"

وہ جو دم بخود سی سنتی جارہی تھی‘ بمشکل بول پائی۔

"جی۔۔۔ جی‘ وہی ویڈیو۔"

"اب آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"یہی کہ آپ اسے اس ویب سائٹ سے ہٹا دیں۔" اس کی آواز میں بہت مان‘ بہت منت بھر آئی تھی۔

"اوکے اور کچھ؟"

"اور۔۔۔ اور جن لوگوں کے پاس اس کی سی ڈی ہے وہ بھی۔۔۔" آگے اس کا گلا۔۔۔ رندھ گیا‘ احساس توہین سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

"میں شہر کے ایک ایک بندے سے وہ ویڈیو نکلوالوں گا‘ آپ بے فکر رہیے۔" اور اسے لگا منوں بوجھ اس کے اوپر سے اتر گیا ہو۔

"تھینک یو میجر احمد۔" اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ فون رکھنے ہی والی ہے کہ وہ کہہ اٹھا۔

"تھینک یو تو آپ تب کہیں جب میں یہ کام کردوں اور اس کام کو محض شروع کرنے کے لیے بھی مجھے آپ کا تعاون چاہیے۔"

"کیسا تعاون؟"

"مادام! آپ کو ذرا سی تکلیف کرنی ہوگی‘ آپ کو اس ویڈیو کی باقاعدہ رپورٹ کرنے کے لیے میرے آفس آنا ہوگا۔"

"کیا؟ نہیں نہیں‘ میں نہیں آسکتی۔" وہ پریشانی سے ہکلا گئی۔ ارم بھی فکرمندی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

"پھر تو یہ کام نہیں ہو پائے گا۔ ایسے اسٹیپ فون پہ نہیں لیے جاتے۔" اسے لگا' وہ محظوظ سا مسکرا رہا تھا۔

"مم... مگر میں نہیں آسکتی۔" اور وہ کیسے آسکتی تھی؟ کسی کو پتا چل جاتا تو کتنی بدنامی ہوتی۔

"آپ کو آنا پڑے گا' میں گاڑی بھیج دیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں' اچھا خدا حافظ۔" اس نے جلدی سے فون بند کردیا۔

"بھاڑ میں گیا یہ اور اس کا سائبر کرائم سیل۔ اگر ابا یا تایا فرقان کو پتا لگ گیا کہ ہم ایک ایجنسی کے ہیڈ کوارٹرز گئے ہیں' وہ بھی پنڈی... تو ہماری ٹانگیں توڑ دیں گے وہ۔"

"میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ رپورٹ نہ کرو۔" پرائیوٹ نمبر سے پھر کال آنے لگی تھی۔ اس نے جھنجلا کر فون ہی آف کردیا۔ اس ویڈیو سے زیادہ میجر احمد نے اسے بلیک میل کیا ہے۔ یہ خیال پھر پورا دن اس کے ذہن میں گونجتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت تھکی ہوئی پاسپورٹ آفس سے نکلی تھی۔ اسلام آباد سے پنڈی کا اتنا لمبا اور رش بھری سڑک پہ تھکا دینے والا سفر کرکے وہ آج پاسپورٹ آفس اپنا پاسپورٹ اٹھانے آئی تھی' مگر یہاں علم ہوا کہ چودہ جنوری کو ہی پاسپورٹ مل پائے گا اور ابھی چودہ جنوری میں ہفتہ رہتا تھا۔

واپسی پہ بھی اتنا ہی رش تھا۔ ہائی وے گاڑیوں سے بھری پڑی تھی اور گاڑیوں کا یہ سیلاب بہت سست روی سے بہہ رہا تھا۔ سگنل پہ اس نے گاڑی روکی اور شیشے کھول دیے۔ اس کا ذہن ابھی تک پاسپورٹ میں الجھا تھا۔

اگر چودہ جنوری کو پاسپورٹ ملے تو بھی ویزا لگتے لگتے بہت دیر ہوجائے گی۔ ابھی ٹکٹس نہیں آئے تھے' مگر کچھ اندازہ تو تھا کہ فروری کے آغاز یا جنوری کے اختتام تک اسے ترکی جانا ہے' یعنی کم و بیش پندرہ دن اس کو ویزے کے لیے ملتے اور ترکی کا ویزا تو بھی پندرہ دن میں نہیں لگ پاتا' پھر؟

وہ انہی سوچوں میں الجھی تھی' یکایک کوئی اس کی کھلی کھڑکی پہ جھکا۔

"سوہنیو... کیا سوچ رہے ہو؟"

وہ بری طرح چونکی اور سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ وہی تھا' ڈولی چم چم کرتے ہرے لباس میں ملبوس' وگ والے بالوں کا جوڑا اور شوخ میک اپ۔

ناگواری کی ایک لہر اس کے چہرے پہ سمٹ آئی۔ اسے بھول گیا کہ کبھی ڈولی نے اس پہ کوئی احسان کیا تھا۔

"ہٹو سامنے سے۔" وہ جھڑک کر بولی تھی۔ وہ کھلی کھڑکی میں کچھ یوں ہاتھ رکھے کھڑا تھا کہ وہ شیشہ اونچا کر ہی نہیں سکتی تھی۔

"تو باجی! میں تو سلام دعا کرنے آئی تھی اور آپ تو غصہ ہو رہی ہو۔" اس روز والے سخت تاثرات ڈولی کے چہرے پہ نہیں تھے' بلکہ اس کے میک اپ سے اٹے چہرے پہ سادگی و معصومیت تھی۔ کراہیت بھری سادگی اور معصومیت!

"ہٹو سامنے سے' ورنہ میں پولیس کو بلالوں گی۔"

اسے غصہ آنے لگا تھا اور بے بسی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کوئی غلط حرکت کر ڈالے۔

"ہائے باجی! آپ ڈولی سے ایسے بات کرتی ہو؟ اور آپ کی ترلیفیں (تعریفیں) کر کر کے ڈولی نے میرا سر کھا لیا تھا۔"

اس نے آواز پہ گردن گھما کر دیکھا تو فرنٹ سیٹ کی کھلی کھڑکی پہ ایک اور خواجہ سرا ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ ڈولی کی سیاہ رنگت کی نسبت اس کا رنگ ذرا صاف تھا۔ چہرے پہ البتہ اس نے بھی سوکھے آٹے کی طرح فیس پاؤڈر تھوپ رکھا تھا' مگر شوخ سرخ رنگ کی شلوار قمیص کی آستینوں سے جھلکتے بازوؤں پہ شاید وہ کچھ لگانا بھول گیا تھا' وہ دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ میں دیے جھکا کھڑا تھا۔

"یہ... کون ہو تم؟ ہٹو میری گاڑی سے۔" اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ وہ تنہا تھی اور ٹریفک بلاک' سامنے کوئی ٹریفک پولیس مین بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

"یہ جی میری بہن ہے پنکی۔ بڑا شوق تھا اسے آپ سے ملنے کا۔"

"گیٹ لاسٹ۔" اس نے بازو بڑھا کر فرنٹ ڈور کا شیشہ اونچا کرنا چاہا' مگر پنکی نے اپنا ہاتھ اندر کردیا۔ ایک دم سے اس کی کلائی سامنے آئی تھی۔ حیا نے دیکھا' پنکی کی کلائی پہ ایک گلابی سرخ سا ایک انچ کا کانٹا بنا تھا' جیسے جلا ہو' یا شاید برتھ مارک تھا۔

"ہٹو... آئی سے گیٹ لاسٹ۔" وہ عالم طیش میں فرنٹ ڈور کا شیشہ اوپر کرنے لگی' مگر پنکی نے اس پہ ہاتھ رکھ دیے تھے۔ شیشہ اوپر نہیں ہو پا رہا تھا۔

"باجی! تسی کتنے سوہنے ہو' ایسے تو نہ کرو پنکی نال۔ اس کا ہاتھ زخمی ہوجائے گا جی۔" ڈولی نے پیچھے سے کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پہ رکھا تو وہ تڑپ کر گھومی اور زور سے ڈولی کو دھکا دیا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا' سو لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔ اسے چند سیکنڈ مل گئے اور اس نے جلدی جلدی اپنی طرف کا شیشہ چڑھا دیا۔

"اب تم بھی ہٹو ادھر سے' ورنہ میں لوگوں کو اکٹھا کرلوں گی۔" وہ بازو بڑھا کر پنکی کی طرف والا شیشہ بند کرنے لگی' مگر وہ اڑ ہی گیا تھا۔

"باجی جی میں تو تہانوں ڈولی کے دل کی بات بتانے آئی تھی اور تسیاں اس طرح کر رہے ہو' یہ جو ڈولی ہے نا' یہ بڑا پیار کرتی ہے آپ سے' بڑا چاہتی ہے جی آپ کو۔" پنکی مصنوعی انداز میں بن بن کر بول رہا تھا۔

پیچھے ڈولی بند شیشہ بجانے لگا تھا۔

"شٹ اپ اینڈ گیٹ لاسٹ۔" وہ پوری قوت سے شیشہ اوپر چڑھانے لگی۔ پنکی کی انگلیاں جو شیشے کے بارے سے نکی تھیں' ساتھ ساتھ اوپر اٹھنے لگیں۔

"باجی جی... گل تو سنو۔" ڈولی گھوم کر پنکی کے ساتھ آکھڑا ہوا تھا۔

اسی اثنا میں اشارہ کھل گیا۔ گاڑیاں آگے بڑھنے لگیں۔ حیا کی گاڑی رکی کھڑی تھی۔ عقب میں گاڑیوں کے ہارن بجنے لگے' مگر دور کھڑا پولیس مین خاموشی سے تماشا دیکھتا رہا' مدد کے لیے آگے نہ بڑھا۔

ڈولی نے پنکی کے کندھے پہ ہاتھ مار کر چلنے کا اشارہ کیا۔ پنکی نے لمحے بھر کو گردن موڑ کر ڈولی کو دیکھا تو اس کی گرفت شیشے پہ ذرا ڈھیلی ہوئی۔ حیا نے عالم طیش میں فوراً شیشہ اوپر چڑھایا۔ پنکی نے چونک کر دیکھا' پھر انگلیاں کھینچنی چاہیں' مگر وہ منتقم مزاجی سے شیشہ اوپر کس رہی تھی۔ پنکی کی انگلیاں پھنس کر رہ گئی تھیں۔

"وہ چھڈ دیو باجی جی!" پنکی جھنجلا کر ہاتھ کھینچ رہا تھا۔ مگر انگلیاں نکل کر نہیں دے رہی تھیں۔

ڈولی نے غصے سے شیشہ بجایا' مگر حیا تنفر سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بازو لمبا کیے شیشہ آخری حد تک لے گئی تھی۔ عقب میں گاڑیوں کی قطار ہارن پہ ہارن دے رہی تھی' کچھ گاڑیاں ساتھ سے نکلنے لگی تھیں۔

دفعتاً پنکی کے دائیں ہاتھ کی انگلی سے خون کی بوند ٹپک کر شیشے پہ لڑھکی تو اسے جیسے ہوش آیا۔ ایک جھٹکے سے اس نے لیور نیچے کیا۔ شیشہ ایک انچ نیچے گرا۔ پنکی نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے ہاتھ باہر کھینچے۔ گاڑی آگے بھگانے سے قبل اس نے بہت غور سے پنکی کے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ دائیں ہاتھ' جس کی کلائی پر کانٹے کا جلا ہوا نشان تھا' کی شہادت کی انگلی سے خون نکلا تھا اور باقی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے اوپر پوروں کی قدرتی لکیر پہ موٹی سی بھوری لکیر بن گئی تھی۔ یقیناً اس کے ہاتھ زخمی ہوئے تھے' مگر اسے پروا نہیں تھی۔

وہ زن سے گاڑی آگے لے گئی' پھر اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ وہ دونوں خواجہ سرا بار بار مڑ مڑ کر اسے غصے سے دیکھتے سڑک پار کر رہے تھے۔ ڈولی نے پنکی کا زخمی ہاتھ تھام رکھا تھا اور غصے سے پلٹ کر حیا کی دور جاتی گاڑی کو دیکھتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر ایکسیلیٹر پہ زور بڑھا دیا۔ کم از کم اتنی امید اسے ضرور تھی کہ اب وہ ڈولی اس کا پیچھا کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

☼ ☼ ☼

"حیا۔۔۔ حیا۔۔۔!" جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوئی، لاؤنج میں بیٹھے سلیمان صاحب تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ ان کے چہرے پہ غیظ و غضب چھایا تھا۔

وہ ڈر کر پیچھے ہٹی۔ تب ہی پیچھے کہیں فون کی گھنٹی بجی۔

"یہ ویڈیو تمہاری ہے؟ تم۔۔۔ تم مجرے کرتی ہو!" روحیل جو صوفے پہ بیٹھا تھا، ایک دم اٹھا اور بہت سی سی ڈیز اس کی طرف اچھالیں۔ وہاں سب موجود تھے۔ تایا فرقان، داور بھائی، روحیل۔۔۔ سب۔۔۔ اور ایک طرف ارم زمین پہ بیٹھی رو رہی تھی۔ دور کہیں فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" وہ سرہلاتے ہوئے خوف سے ان کو کہنا چاہتی تھی۔ اس کا منہ تو ہلتا تھا، لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ سب اس کا خون لینے پہ تلے تھے۔

دفعتاً" سلیمان صاحب آگے بڑھے اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پہ دے مارا۔

"بے حیا۔۔۔ بے حیا۔" اسے تھپڑوں سے مارتے ہوئے سلیمان صاحب کہہ رہے تھے۔ ان کے لب ہل رہے تھے، مگر ان سے آواز ڈولی کی نکل رہی تھی۔ وہ سلیمان صاحب نہیں، ڈولی بول رہی تھی۔۔۔ ڈولی۔۔۔ ڈولی۔۔۔ چنگی۔۔۔ بے حیا۔۔۔ چنگی کی انگلیاں۔۔۔ فون کی گھنٹی۔۔۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کیا۔ زرد سی روشنی ہر سو پھیل گئی۔

اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھوا۔ وہ ٹھیک تھی۔ سب ٹھیک تھا۔ کسی کو کچھ علم نہیں ہوا تھا۔ وہ سب ایک بھیانک خواب تھا۔

"اوہ خدایا۔" وہ نڈھال سی بیڈ کراؤن کے ساتھ پیچھے جا لگی۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔ دل ویسے ہی دھڑک رہا تھا۔ پورا جسم پسینے میں بھیگا تھا۔

فون کی مخصوص ٹون اسی طرح بج رہی تھی۔ ہاں، بس وہ گھٹیا خواب نہیں تھی۔

اس نے سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا اور چمکتی اسکرین کو دیکھا۔

"پرائیویٹ نمبر کالنگ۔۔۔"

چند لمحے لگے تھے اسے ایک فیصلے پہ پہنچنے میں اور پھر اس نے فون کان سے لگا لیا۔

"میجر احمد! میں آپ کے آفس آ کر رپورٹ کروانے کے لیے تیار ہوں، کل صبح نو بجے میرے گھر کی بیک سائیڈ پہ موجود گراؤنڈ کے انٹرنس گیٹ پہ گاڑی بھیج دیں، نو بجے، شارپ۔"

"شیور!" اسے فاتحانہ لہجہ سنائی دیا تھا۔ اس نے آہستہ سے فون بند کر دیا۔

کبھی بھی وہ کسی لڑکے سے یوں تنہا نہیں ملی تھی، مگر نہ ملنے کی صورت میں وہ ویڈیو کبھی نہ کبھی لیک ہو جاتی تو زیادہ برا ہوتا۔

اس نے بے اختیار جھرجھری لی۔ اس خوفناک خواب نے اسے یہ سب کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اسے لگا اب اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

پلے گراؤنڈ کے گیٹ کے ساتھ توت کا تناور درخت تھا۔ وہ اس سے ٹیک لگائے منتظر کھڑی تھی۔ سرخ لمبی اے لائن قمیص اور نیچے چوڑی دار پاجامہ۔ اوپر اسٹائلش سا سرخ سوئیٹر جس کی لمبی آستین ہتھیلیوں کو ڈھانپ کر انگلیوں تک آتی تھیں اور کندھوں پہ براؤن چھوٹی سی اسٹول نما شال۔ لمبے بال پیچھے کمر پہ گر رہے تھے، سردی اور دھند میں وہ مضطرب سی کھڑی، سرخ پڑتی ناک لیے دونوں ہاتھ آپس میں رگڑ رہی تھی۔

ارم یا زارا۔۔۔ اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ یہ خطرہ اس کو اکیلے مول لینا تھا۔

دفعتاً" اس نے بے چینی سے کلائی سے سوئیٹر کی آستین پیچھے ہٹائی اور گھڑی دیکھی۔ نو بجنے میں ایک منٹ تھا۔

اسی پل زن سے ایک کار اس کے سامنے رکی۔ سیاہ پرانی مرسڈیز، اور کسی بت کی طرح سامنے سیدھ میں دیکھتا ڈرائیور۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے آگے بڑھی اور پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔ اس کے دروازہ بند کرتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بھگا دی۔

تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ سیف ہاؤس پہنچی۔

سفید دیواروں والا خالی کمرا، درمیان میں لکڑی کی میز اور کرسی، جس پہ اسے بٹھایا گیا۔ میز پہ فقط ایک ٹیلی فون رکھا تھا۔ باقی پورا کمرا خالی تھا۔

وہ مضطرب سی گردن اِدھر اُدھر گھما کر دیکھنے لگی۔ تین طرف سفید دیواریں تھیں، ان میں سے ایک دیوار میں وہ دروازہ تھا، جہاں سے وہ آئی تھی۔ البتہ چوتھی سمت اس کے بالمقابل دیوار شیشے کی بنی تھی۔ دراصل وہ شیشے کی اسکرین تھی، جو زمین سے لے کر چھت تک پھیلی تھی۔ شاید وہ چھوٹا خالی کمرا کسی بڑے کمرے کا حصہ تھا۔ جس میں شیشے کی اسکرین لگا کر پارٹیشن کر دیا گیا تھا۔

اس نے ذرا غور سے اسکرین کو دیکھا۔ اس کا شیشہ مکمل طور پہ دھندلا کر دیا گیا تھا۔ جیسے مشین پھیر کر بائنڈ کیا جاتا ہے۔ اس دھندلے شیشے کے اس پار ایک دھندلا سا منظر تھا۔ ہر شے اتنی مبہم اور دھندلی تھی کہ وہ بمشکل ایک خاکہ بنا پا رہی تھی۔ یقیناً" وہ شیشہ ایک کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے درمیان میں لگایا گیا تھا اور اس کے پار کمرے کا باقی حصہ تھا۔

بس ایک دھندلا سا خاکہ سمجھ میں آتا تھا۔ شیشے کے اس پار کوئی بڑا، پرتعیش سا آفس تھا اور آفس ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پہ کوئی بیٹھا تھا۔ اس کا رخ حیا کی جانب ہی تھا۔ اس کا چہرہ واضح نہ تھا، بس ایک دھندلی سی آؤٹ لائن ہی بنتی تھی۔ خاکی یونیفارم، سر پہ کیپ لگا کر کرسی پہ بیٹھا، میز پہ رکھی کوئی چیز انگلیوں میں گھماتا وہ کس طرف دیکھ رہا تھا، وہ فیصلہ نہ کر پائی۔ اس کا رخ تو سامنے حیا کی جانب ہی تھا، شاید دیکھ بھی اسی کو رہا تھا، مگر اس کی آنکھیں واضح نہ تھیں، واضح تھی تو بس ایک چیز، اس آفیسر کے گندمی چہرے کے دائیں طرف والے آدھے حصے پہ ایک بدنما سی کالک، جیسے آدھا چہرہ جھلس گیا ہو۔

دفعتاً" وہ شخص آگے کو جھکا اور میز سے کچھ اٹھا کر کان سے لگایا۔ غالباً" فون کا ریسیور۔

"ٹرن۔۔۔ ٹرن۔"

یک دم حیا کے سامنے میز پہ رکھا فون بجنے لگا۔ وہ چونکی۔ فون مسلسل بج رہا تھا، کیا وہ شخص اسے کال کر رہا تھا؟ اس نے دھڑکتے دل سے ریسیور اٹھایا اور کان سے لگایا۔

"ہیلو!"

"السلام علیکم مس حیا سلیمان! دس از میجر احمد۔"

وہی بھاری، نرم گرم سا خوب صورت لہجہ۔

"وعلیکم السلام!" وہ فون ہاتھ میں پکڑ کر کان پہ رکھے، یک ٹک سامنے اسکرین کو دیکھ رہی تھی، جس کے پار آدھے جھلسے چہرے والا آفیسر فون تھامے بیٹھا تھا۔ کیا وہی میجر احمد تھا؟

"میں امید کرتا ہوں کہ ہم نے آپ کو زیادہ تکلیف نہیں دی۔"

"جی۔" اس کو گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔

"میرے سامنے موجود لیپ ٹاپ پہ تمام سسٹم کھلا ہوا ہے۔ مجھے ایک کلک کرنا ہے اور آپ کی ویڈیو صفحہ ہستی سے یوں مٹ جائے گی جیسے کبھی بنائی ہی نہیں گئی تھی۔"

دیوار کے پار اس دھندلے منظر میں بیٹھے اس آفیسر کے سامنے بھی ایک لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا، تو وہی میجر احمد تھا؟ مگر سامنے کیوں نہیں آتا تھا؟

"اور شہر کے ایک ایک بندے سے میں یہ ویڈیو نکلوا چکا ہوں۔ بولیے حیا! میں کلک کر دوں؟"

"اور۔۔۔ وہ رپورٹ؟"

"سمجھیں وہ درج ہو گئی۔" اسے لگا، وہ مسکرایا تھا۔

"مگر۔۔۔ آپ نے کہا تھا کہ مجھے رپورٹ کے لیے۔۔۔"

"غلط کہا تھا' ایکسکیوز بنایا تھا۔ بعض اوقات بہانے بنانے پڑتے ہیں' تب جب مزید صبر نہیں ہوتا' سمجھیں؟"

فون کو جکڑا' اس کا ہاتھ پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ یہ شخص اتنی عجیب باتیں کیوں کر رہا تھا؟

"آپ... کلک کر دیں۔" بمشکل وہ کہہ پائی۔ وہ شخص جھکا' شاید بٹن دبانے اور پھر واپس پیچھے ہو کر بیٹھا۔

"کر دیا!"

"اوہ تھینک یو میجر احمد!" اس کا گلا رندھنے لگا تھا۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"جی؟"

"کیا یہ ویڈیو جعلی تھی؟"

"نہیں' تھی تو اصلی۔"

"تو آپ اتنی ڈر کیوں رہی تھیں؟"

"ظاہر ہے یہ ہماری فیملی ویڈیو تھی اور شادیوں پہ ڈانسز کی ویڈیو ہم نہیں بنواتے۔"

"کیوں؟" وہ پے در پے سوالات کر رہا تھا۔

"کیا مطلب کیوں؟ شادیوں کی ویڈیو سر کولیٹ ہوتی ہیں ہر جگہ۔ کیا اچھا لگتا ہے' ہماری ڈانس کی ویڈیو پرائے لوگ دیکھیں؟"

"مگر پرائے لوگ لائیو تو دیکھ سکتے ہیں' غالباً" اس ویڈیو میں مجھے ویٹرز' مووی میکر اور ڈی جے نظر آ رہے تھے' وہ بھی تو پرائے مرد ہیں نا؟ میں سمجھ نہیں پایا کہ اگر آپ اس طرح رقص کرنے کو صحیح سمجھتی ہیں تو ویڈیو کے باہر نکلنے پہ پریشان کیوں تھیں؟ چاہے مووی میکر' ویٹر' ڈی جے دیکھیں یا انٹرنیٹ پہ موجود مرد' بات تو ایک ہی ہے اور اگر آپ اس کو غلط سمجھتی ہیں' تو آپ نے یہ کیا ہی کیوں؟"

"میں آپ کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔" وہ درشتی سے بولی تو چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی۔

"ٹھیک کہا آپ نے' خیر!" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھیے!" اب کے اس کی آواز میں اجنبیت در آئی تھی۔

"کبھی کوئی آپ کے لیے جنت کے پتے توڑ کر لایا ہے؟"

"ہم دنیا والوں نے جنتیں کہاں دیکھی ہیں میجر احمد!" اس کے چہرے پہ تلخی رقم تھی۔

"تب ہی تو ہم دنیا والے جانتے ہی نہیں کہ جنت کے پتے کیسے دکھتے ہیں۔ کبھی کوئی آپ کو لا دے تو انہیں تھام لیجیے گا۔ وہ آپ کو رسوا نہیں ہونے دیں گے۔"

اس کے چہرے کی تلخی سکوت میں ڈھلتی گئی۔ وہ ٹھہر سی گئی' دھندلی دیوار ابھی تک اس کے سامنے تھی' کون تھا اس کے پار؟

"آپ سن رہی ہیں؟"

"ہوں... جی... جی۔" وہ چونک کر سنبھلی۔ "میں چلتی ہوں۔" وہ ریسیور کان سے ہٹانے ہی لگی تھی کہ وہ کہہ اٹھا۔

"ایک منٹ' ایک آخری سوال کرنا ہے مجھے۔"

وہ اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔ "جی پوچھیے!"

"آپ مجھ سے شادی کریں گی؟"

اسے زور کا دھچکا لگا تھا۔ وہ گنگ سی پھٹی پھٹی نگاہوں سے دھندلی دیوار کو دیکھے گئی۔

"بتائیے مس حیا!"

اس کے لب بھینچ گئے۔ حیرت اور شاک پہ غصہ غالب آ گیا۔

"مس حیا نہیں' مسز حیا!" چبا چبا کر ایک ایک لفظ بولتی' وہ پرس تھام کر اٹھی۔ فون کا ریسیور ابھی تک پکڑ رکھا تھا۔

"کیا مطلب؟" وہ واضح چونکا تھا۔

"افسوس کہ میرے بارے میں اتنی معلومات رکھنے کے باوجود آپ میرے بچپن کے نکاح کے بارے میں لاعلم ہیں۔ وہ نکاح جو میرے کزن جہان سکندر سے میرا بچپن میں ہی پڑھا دیا گیا تھا۔ میں شادی شدہ ہوں اور میرا شوہر ترکی میں رہتا ہے۔"

"وہ آپ کی وہ رشتہ دار فیملی جو کبھی پاکستان نہیں آئی؟ جانتا ہوں' آپ کی پھپھو کا خاندان جو ذلت اور شرمندگی کے مارے اب شاید کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا' آخر کارنامہ بھی تو بہت شرمناک انجام دیا تھا نا۔ ان کا انتظار کر رہی ہیں آپ؟ ارے بچپن کا نکاح تو کورٹ کی ایک ہی پیشی میں ختم ہو جاتا ہے۔"

"شٹ اپ' جسٹ شٹ اپ میجر احمد!" وہ چلائی تھی۔ "آپ کی ہمت بھی کیسے ہوئی یہ بات کرنے کی؟ ارے بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کی وہ ویڈیو' آپ بھلے اسے ٹی وی پہ چلوا دیں' مجھے پروا نہیں۔ میرا ایک کام کرنے کی اتنی بڑی قیمت وصولنا چاہتے ہیں آپ؟ رہا جہان سکندر' تو وہ میرا شوہر ہے اور مجھے اس سے بہت محبت ہے۔ اس کے علاوہ میری زندگی میں کوئی نہیں آ سکتا' سمجھے آپ۔"

ریسیور واپس پٹخنے سے قبل اس نے دوسری جانب سے اس کا سوگواریت بھرا قہقہہ سنا تھا۔ پیر پٹخ کر وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ اسی پل دروازہ کھول کر ایک سپاہی اندر داخل ہوا' جو اسے اندر بٹھا کر گیا تھا' گویا اسے "فوراً" اشارہ کر دیا گیا تھا۔ ملاقات ختم ہو چکی تھی اور حیا کے لیے وہ بے حد تلخ ثابت ہوئی تھی۔

"گاڑی آپ کا انتظار کر رہی ہے میم! آئیے۔" وہ راستہ چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔ حیا نے گردن موڑ کر دیکھا۔

دھند کے اس پار وہ آدھے سیاہ چہرے والا شخص میز پہ جھکا کچھ کر رہا تھا۔ شاید کچھ لکھ رہا تھا۔ اسے لگا اس نے اس کی میز پہ کسی سرخ شے کی جھلک دیکھی ہے۔ شاید سرخ گلابوں کے گلدستے کی یا شاید یہ اس کا وہم تھا۔

جس لمحے وہ اس پرانی مرسڈیز کی پچھلی نشست پہ بیٹھی تو کھلے دروازے پہ اسی سپاہی نے جھک کر ایک سرخ گلابوں کا بوکے اسے تھمایا۔ گو کہ اس کے ساتھ کوئی خط نہ تھا' اور وہ پھول ان سفید گلابوں سے قطعاً مختلف تھے' پھر بھی اسے یقین ہو گیا کہ وہ گمنام خطوط بھیجنے والا میجر احمد ہی تھا اور وہ اسے بہت پہلے سے جانتا تھا۔

"یہ جا کر اپنے میجر احمد کے منہ پہ دے مارو۔" اس نے بوکے واپس سپاہی کے بازوؤں میں پھینکا اور دروازہ کھٹاک سے بند کیا۔ مرسڈیز زن سے آگے بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"حیا... حیا۔"

شام میں ارم بھاگتی ہوئی آئی۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"وہ ویڈیو اس ویب سائٹ سے ریموو ہو گئی ہے۔" اس نے فرط جذبات سے تقریباً" بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی حیا کو جھنجھوڑ ہی دیا تھا۔

"مگر کیسے ہوا یہ سب؟"

"اس ویب سائٹ والے کو خوف خدا آ گیا ہو گا' مجھے کیا پتا۔" وہ لاپروائی سے انجان بن گئی۔

"ہوں شاید' مگر اچھا ہی ہوا' اوہ ہاں! تمہاری ترکی کی کب فلائٹ ہے؟"

"پتا نہیں' پہلے پاسپورٹ تو ملے' پھر ہی ویزا لگے گا۔" اس کو ارم کی موجودگی سے کوفت ہونے لگی تھی۔ کچھ اس کے تاثرات سے ہی ظاہر تھا' ارم جلد ہی اٹھ کر چلی گئی۔ وہ پھر سے اپنی سوچوں میں الجھ گئی۔

میجر احمد... اس کا آدھا جھلسا چہرہ... سامنے نہ آنا... پردے کے پیچھے سے بات کرنا... اور وہ اس کی عجیب فلسفیانہ باتیں... جنت' وغیرہ کا تذکرہ... بازپرس کرنا... اور پھر شادی کا سوال' اوہ خدایا...! کیسا عجیب آدمی تھا وہ... اور... اور اس کی ایک بات جس کے بارے میں وہ اس وقت شدید عالم طیش میں ہونے کے باعث سوال نہیں کر سکی تھی۔

"آپ کی پھپھو کا خاندان جو ذلت اور شرمندگی کے مارے اب شاید کبھی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ آخر کارنامہ بھی تو بہت شرمناک سرانجام دیا تھا نا۔"

کیوں کہی تھی اس نے یہ بات؟ کیسی ذلت و شرمندگی؟ کیسا شرمناک کارنامہ؟

پھپھو کا خاندان واقعتاً" پلٹ کر نہیں آیا تھا' تو کیا اس کی وجہ ان کی اپنے ملک اور خاندان سے بے زاری

نہیں تھی' جیسا کہ وہ قیاس کرتی تھی' بلکہ کوئی اور تھی؟ کوئی ذلت آمیز کام جو انہوں نے سرانجام دیا تھا؟ اور انہوں نے کس نے؟ پھپھو؟ ان کے شوہر؟ یا جہان سکندر نے؟ کیا تھی بھلا؟ مگر میجر احمد سے وہ استفسار کر نہیں سکتی تھی' نہ ہی اس کا دوبارہ کوئی فون آیا تھا۔ پھر؟

اور وہ خطوط... وہ گلدستے... وہ بھی اسی نے بھیجے تھے۔ اسے اس کے سبانجی جانے کا کیسے علم ہوا؟ "یقیناً" وہ اس کی کال ٹیپ کر رہا تھا جب زارا کو اس نے بتایا تھا اور وہ اس وقت "یقیناً" اس کے گھر کے باہر ہی ہوگا' مگر وہ گلدستہ تو کچن کی ٹیبل پہ رکھا تھا۔ تو کیا وہ ان کے گھر بھی داخل ہو سکتا ہے؟ اور اس کے کمرے میں بھی؟

خوف کی ایک لہر نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ اٹھ کر کمرے کا دروازہ لاک کرنے ہی لگی تھی کہ فاطمہ بیگم دروازہ کھول کر اندر آئیں۔

"حیا... تمہارے ابا تمہیں بلا رہے ہیں۔"

"اوکے' آ رہی ہوں۔" اس نے تکیے پہ رکھا دوپٹہ اٹھا کر گلے میں ڈالا' سلیپرز پہنے اور باہر آئی۔

"ابا؟" اس نے انگلی کی پشت سے ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"آجاؤ حیا۔"

اس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے بیڈ پہ سلیمان صاحب بیٹھے تھے۔ سوچ میں ڈوبے' متفکر' اس کے منتظر... ساتھ ایک طرف صوفے پہ فاطمہ بیگم موجود تھیں۔ ان کی خوب صورت آنکھیں سوگوار تھیں اور باوقار سراپے پہ افسردگی چھائی تھی۔

"آپ نے بلایا تھا ابا؟"

"ہاں' آؤ بیٹھو۔"

وہ خاموشی سے سر جھکائے چلتی ہوئی آئی اور بیڈ کی پائنتی پہ ٹک گئی۔ سلیمان صاحب چند لمحے خاموش رہے' شاید وہ کوئی تمہید سوچ رہے تھے' مگر حیا کو امید تھی کہ وہ بنا تمہید کے ہی سیدھی بات کر ڈالیں گے۔

"میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔"

اس نے گردن اٹھائی۔ وہ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

"اب تمہیں کورٹ کے ذریعے سبین کے بیٹے سے خلع لے لینی چاہیے۔" کوئی اس کے منہ پہ چابک دے مارتا' تب بھی شاید اسے اتنا درد نہ ہوتا جتنا اب ہوا تھا۔

"میں نے وکیل سے بات کر لی ہے۔ عدالت کی ایک پیشی میں علیحدگی ہو جائے گی اور جتنے بیزار وہ لوگ ہم سے ہیں' یقیناً" انہیں اس بات سے بہت خوشی ہوگی۔"

اس نے شاکی نگاہوں سے ماں کو دیکھا' تو انہوں نے بے بسی سے شانے اچکا دیے۔

"تمہارے ابا ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"اور اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ ان کے رویے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس رشتے کو رکھنا ہی نہیں چاہتے۔"

"ابا! کیا یہ واحد حل ہے؟" بہت دیر بعد وہ بولی تو اس کی آواز میں ٹوٹے خوابوں کا دکھ تھا۔

"کیا اس کے علاوہ بھی کوئی حل ہے؟ حیا! دنیا کا کوئی باپ اپنی بیٹی کا گھر نہیں توڑنا چاہتا اور میں بھی تمہیں یہ نہ کہتا' لیکن کس قیمت پر؟ کس قیمت پر ہم یہ رشتہ نبھانے کی کوشش کریں' جب وہ کوئی امید ہی نہیں دلاتے؟"

"اگر آپ کو واقعی لگتا ہے کہ آپ میرا گھر بسا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو مجھے ترکی جانے دیں' وہاں میں اس کو ضرور ڈھونڈوں گی اور پوچھوں گی کہ اگر وہ گھر بنانا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے' ورنہ مجھے طلاق دے دے۔ اگر نہیں دیتا تو وہیں کورٹ چلی جاؤں گی' مگر مجھے ایک آخری کوشش کر لینے دیں' پلیز!"

وہ خاموش ہو گئے' شاید قائل ہو گئے تھے۔ وہ اٹھی اور بنا کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ خبطی لڑکی اسے کلاس کے باہر ہی مل گئی تھی۔ وہ فائلیں سنبھالتی باہر جا رہی تھی' جب اس نے اسے

روک لیا۔

"سنیں مس سلیمان!" وہ جیسے مجبوراً اسے مخاطب کر رہی تھی۔ حیا نے کوفت سے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں خدیجہ رانا کھڑی تھی۔ آنکھوں پہ بڑا سا چشمہ لگائے' بالوں کی اونچی پونی باندھے' سینے سے فائل لگائے۔ ڈی جے... جسے ڈی جے صرف اس کے فرینڈز کہا کرتے تھے۔

"جی خدیجہ؟" بادل نخواستہ اس نے ذرا مروت سے جواب دیا۔

"آپ نے ویزا کے لیے اپلائی کر دیا؟ دراصل میم فرخندہ نے کہا ہے کہ ہم دونوں کو جلد از جلد ویزا کے لیے اپلائی کرنا چاہیے کیونکہ فروری کے پہلے ہفتے میں ہم نے سبانجی کو جوائن کرنا ہے اور آج تیرہ تاریخ ہے۔ ہمارے پاس بس پندرہ دن ہیں اور ترکی کا ویزا پندرہ دن میں کبھی نہیں لگا کرتا۔"

وہ پریشانی سے تیز تیز بولے جا رہی تھی۔ اس کی بات کچھ ایسی تھی کہ حیا کو سنجیدہ ہونا پڑا' ورنہ ابھی تک وہ ابا کی کہی گئی باتیں سوچ رہی تھی۔

"اوہ... تو تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"کل لازماً" ٹرکش ایمبیسی جا کر ویزے کے لیے اپلائی کرنا ہے۔ آپ کو پتا ہے ٹرکش ایمبیسی کا عجیب سا رول ہے کہ ہر روز سب سے پہلے آنے والے پندرہ امیدواروں کا ہی انٹرویو ہوتا ہے۔ ایمبیسی صبح سات بجے ہی کھل جاتی ہے اور وہاں لوگوں کی لائن لگی ہوتی ہے۔ اگر ہم ایک منٹ بھی لیٹ ہوئے تو وہ ہمیں اگلے دن پہ ڈال دیں گے۔ آپ سن رہی ہیں نا؟"

"ہوں... جی۔" اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔ پتا نہیں وہ کیا بولے جا رہی تھی۔

"آپ مجھے اپنا نمبر لکھوا دیں' تاکہ ہم کو آرڈی نیٹ کر سکیں۔"

اس نے بے دلی سے اپنا نمبر لکھوا دیا۔ خدیجہ اسے اپنے فون پہ نوٹ کرتی گئی۔

"ٹھیک ہے' کل صبح ساڑھے چھ تک آپ ڈپلومیٹک انکلیو تک پہنچ جایئے گا' میں وہیں ہوں گی۔"

اس نے اچھا کہہ کر جان چھڑانے والے انداز میں سر ہلایا۔

"اور پلیز دیر مت کیجیے گا۔ یہ نہ ہو کہ آپ کی وجہ سے میرا بھی ویزا رہ جائے مس سلیمان!" وہ ناک چڑھا کر یہ جتا گئی کہ آخر وہ بھی خدیجہ رانا ہے۔

"کیا کمپنی ملی ہے مجھے' اف!" وہ پیر پٹخ کر آگے بڑھ گئی۔ ابا کی باتوں نے اسے اتنا ڈسٹرب کیا تھا کہ اس وقت ویزا وہ آخری چیز تھا' جس کے بارے میں وہ سوچ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کی تاریکی کو دکانوں کی شیشے کی دیواروں سے جھلکتی روشنیاں روشن کیے ہوئے تھیں۔ زرد روشنیوں کا عکس سامنے لمبی سیدھی سڑک پہ بھی پڑا تھا۔ جس کے ایک طرف پارکنگ کی گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا تھا۔ چبوترے پہ دن میں بک فیئر کے اسٹال لگا کرتے تھے' آج کل وہ بند تھے۔ یہ جناح سپر تھا اور وہ اس وقت زرد روشنیوں کے عکس سے چمکتی سڑک پہ چل رہی تھی۔

سیاہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے' شانوں پہ پھسلتے لمبے بال لیے' وہ سر جھکائے خود فراموشی کے عالم میں قدم اٹھا رہی تھی۔ ابا اور اماں کی کہی گئی باتیں دل و دماغ میں گونج رہی تھیں۔

جہان سکندر کون تھا؟ اس کا منکوح' کزن' شوہر... وہ شخص جس کے خواب اس نے ساری عمر دیکھے تھے' اتنی آسانی سے وہ کیسے اس سے دستبردار ہو جائے؟ کیا ابا' اماں نہیں جانتے تھے کہ خواب اگر اپنے ہاتھوں سے توڑے جائیں تو انگلیاں بھی زخمی ہو جاتی ہیں' پھر کیسے وہ خود کو زخم دے؟ اگر وہ جہان یا سبین پھپھو کے لیے کوئی ان چاہا رشتہ تھی تو بھی ان کو صفائی کا ایک موقع دیے بغیر ہی کیسے خود کو ان سب سے الگ کر لے؟ یہ مکھن نہیں تھا جس سے بال نکالنا تھا۔ یہ تو

کانٹوں سے الجھا دامن تھا۔ اگر کھینچ کر الگ کیا تو دامن پھٹ جائے گا اور اگر کانٹے نکالنے کی کوشش کی تو انگلیاں زخمی ہو جائیں گی۔ مگر کیا پتا اس کانٹوں کے پودے پہ گلاب بھی کھلتے ہوں۔ سرخ گلاب۔ سبز پتے۔ رنگوں' خوشبوؤں اور خوابوں کے۔

وہ سیٹی کی تیز آواز تھی' جس نے اسے خیالوں کے ہجوم سے نکالا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

وہ تین لڑکے تھے۔ جینز اور جیکٹس میں ملبوس' وہ مختلف سمتوں سے اس کی طرف آرہے تھے' یوں کہ ہر طرف وہی تھے' گھیرا۔ نرغہ۔ تنگ دائرہ۔

جگہ قدرے سنسان تھی۔ خالی چبوترا تاریکی میں ڈوبا تھا۔ جگمگاتی روشن دکانیں ذرا دور تھیں' اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ تیزی سے پلٹی' مگر ادھر سے بھی ان کا ہی کوئی چوتھا آرہا تھا۔

"ہو۔ ہو۔ سویٹی۔"

"پریٹی وومن۔"

"گورجس لیڈی۔"

وہ مبہم آوازیں نکالتے' معنی خیز اشارے کرتے اس کے ارد گرد گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ دبی آوازوں کا شور اس کو گھیرنے لگا تھا۔ وہ قریب آتے دو لڑکوں کے درمیان سے تیزی سے سر جھکائے گزرنے لگی' مگر دائیں والے لڑکے نے سبک رفتاری سے اس کی کلائی کو تھام کر اپنی جانب کھینچا۔ ابھی اس کے لبوں سے چیخ بھی نہیں نکلی تھی کہ اس کی کلائی کو تھامنے والا خود بوکھلا کر پیچھے ہٹا۔ ٹن کی زوردار آواز کے ساتھ کسی نے اس لڑکے کے سر کے پچھلے حصے پہ کچھ مارا تھا۔

"مرن جوگے۔۔۔ باجی کو تنگ کرتے ہو' چھوڑوں گی نہیں میں تمہیں۔" وہ اونچی لمبی' ہٹی کٹی سی ڈولی ہاتھ میں پکڑا فرائنگ پان گھما گھما کر ان کو مار رہی تھی۔

حیا ہکا بکا سی دو قدم پیچھے ہوئی۔

جس کو لگا تھا وہ سر پکڑے بلبلاتا ہوا پیچھے بھاگا۔ باقی دو بھی ساتھ ہی دوڑے۔ ایک نے ذرا پھرتی دکھا کر ڈولی کو لات مارنی چاہی' ڈولی نے اسی فرائنگ پان کی گھما کر ایسی ضرب دی کہ اس لڑکے کا گھٹنا چیخ اٹھا۔ شاید ٹوٹ گیا تھا' کم از کم اس کی چیخ سے تو حیا کو یہی لگا تھا اور وہ لنگڑاتا ہوا بھاگ اٹھا۔

"آئے بڑے سالے' ڈولی سے پنگا لیتے ہیں۔" وہ فاتحانہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اب حیا کی طرف مڑا۔

سفید آٹے سے گویا اٹا ہوا چہرہ' آنکھوں کے گرد لمبی کالی لکیریں کھینچ کر لائنر لگایا ہوا اور آنکھوں میں نیلے سبز سے لینز' گالوں پہ سرخ پاؤڈر' بھڑکیلا آئی شیڈو اور سرخ چونچ کی طرح کی لپ اسٹک' بھورے گولڈن بالوں کی لٹیں' سر پہ لیے دوپٹے سے نکل رہی تھیں۔ یقیناً "وگ" تھی جیسے کہ عموماً ہوتی ہے۔

پہلی دفعہ جب اس نے ڈولی کو دیکھا تھا' اسے کراہیت آئی تھی۔ دوسری دفعہ خوف اور اس روز ٹریفک جام پہ اسے دیکھ کر غصہ آیا تھا' اور آج۔۔۔ آج کچھ بھی نہیں' وہ خاموشی سے تیز تیز سانس لیتی اس کو دیکھ رہی تھی۔

"چھوڑو جی ان حرام خوروں کو باجی! ان کا تو کام ہی یہی ہے' میں بھی بڑی دیر سے تاڑ رہی تھی ان کو' پر مجھے کیا پتا تھا کہ اپنی باجی جی کو تنگ کر رہے ہیں' آئے بڑے۔"

وہ پوری بات سنے بغیر ہی پلٹ گئی۔ سینے پہ بازو لپیٹے' سر جھکائے' تیز تیز قدموں سے چبوترے کی جانب بڑھنے لگی۔ ایک خواجہ سرا کے ساتھ رات کے اس پہر سڑک پہ کھڑے ہونا قطعاً" درست نہ تھا۔

"ارے باجی جی۔۔۔ گل تو سنو۔" وہ اس کے پیچھے لپکا۔ حیا چلتے چلتے رکی اور پلٹ کر سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

"کیا ہے؟" اس کا موی چہرہ دکانوں کی زرد روشنیوں میں دمک رہا تھا۔

"ہائے ربا! باجی جی تسی کتنے سوہنے ہو جی۔" وہ دونوں ہاتھ رخساروں پہ رکھے خوشی سے چہکا۔

اسے کراہیت آئی' نہ خوف' بس چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

"شکریہ ہی کہہ دو جی۔"

"شکریہ۔۔۔ اور کچھ؟" اس کا انداز سپاٹ تھا۔

"تسی تے ناراض لگدے ہو جی۔"

"ڈولی! تم کیوں ہر جگہ میرے پیچھے آتے ہو؟"

"ہاں تو ٹینشن تے نہیں دی تہانوں' ہمیشہ مدد ای کیتی اے۔"

"تمہیں کس نے کہا ہے میری مدد کو؟ کس نے تمہیں میرے پیچھے لگایا ہے؟ بولو' جواب دو۔"

ڈولی کا منہ آدھا کھل گیا۔ لینز لگی آنکھوں میں پہلے حیرت' اور پھر آنسو تیرنے لگے۔

"کسی نے نہیں جی۔" بڑی دیر بعد وہ دکھ سے بولا۔ "مجھے آپ اچھی لگتی ہو' اس لیے آپ کا خیال رکھتی ہوں' آپ کو برا لگتا ہے تو نہیں آوں گی۔"

دفعتاً" حیا کا فون بجا۔ اس نے چونک کر ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھا۔ اس پہ پرائیوٹ نمبر کالنگ لکھا آرہا تھا۔ وہ پیر پٹخ کر چبوترے کی طرف آئی اور پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ فون ابھی تک بج رہا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا اور ڈولی کو دیکھا' جو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا سسکتا ہوا اس تک آرہا تھا۔

"ہیلو؟"

"ہیلو مس حیا۔۔۔ کیسی ہیں آپ؟" وہ میجر احمد تھا۔ اس کی آواز کے پیچھے بہت شور تھا۔

ڈولی آہستہ سے اس سے ذرا فاصلے پہ چبوترے پہ بیٹھ گیا۔ سر جھکائے وہ ہتھیلی سے آنسو پونچھ رہا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے فون مت کیا کریں اور یہ جو بندے آپ نے میرے پیچھے لگائے ہیں نا' میں ان میں سے ایک ایک کا خون کر دوں گی اور اس سب کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔ میں شادی شدہ ہوں اور جلد ہی اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤں گی' میرا پیچھا چھوڑ دیں' سمجھے آپ؟"

مزید کچھ سنے بغیر اس نے فون رکھ دیا۔

"تسی گھر بار والے ہو جی؟" ڈولی نے چہرہ اس کی طرف اٹھایا۔

"ہاں' تمہارے اس میجر نے تمہیں بتایا نہیں کیا؟ اس نے میرے پیچھے لگایا ہے نا تمہیں؟"

"اللہ پاک کی قسم لے لو جی' مجھے کسی میجر وجر نے نہیں بھیجا' میں خود آتا ہوں۔ اللہ کی قسم جی۔" وہ روتے روتے کہہ رہا تھا۔ حیا کے دل کو کچھ ہوا' اسے لگا وہ سچ بول رہا ہے۔

"میں کسی کو جا کر آپ کی باتیں نہیں بتاتا۔ مجھے بڑا پیار ہے جی آپ سے' قسم سے۔" وہ لب بھینچے اسے دیکھے گئی۔ کچھ تھا اس میں' پراسرار' خوف زدہ کرتا' مگر ترس و ترحم آمیز۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' مت روؤ۔"

"میں جی بڑا پیار کرتی ہوں آپ سے۔۔۔ اسی لیے آتی ہوں' پر تسی تے الزام لا رہے ہو۔" وہ اب سسکتے ہوئے اپنا سر پیٹنے لگا تھا۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ناؤ اسٹاپ اٹ!" وہ چپ چاپ بیٹھا اسے تکتا رہا' جبکہ وہ سامنے خلاؤں میں گھورتی رہی۔

"تسی جا رہے ہو کہیں؟"

حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تسی فون میں کہہ رہا نا۔" اس نے وضاحت کی۔

"ہاں' میں یورپ جا رہی ہوں۔"

"وہ جہاں امریکہ ہے؟ وہ انگریزی فلموں والا؟" وہ رونا بھول کر خوشی سے چہکا۔ شاید وہ واقعی ایک عام خواجہ سرا تھا یا پھر کوئی بہت مکار اداکار۔

"ہاں وہی۔" اس نے تردید نہیں کی۔

"ادھر کون ہے جی؟"

"میرا شوہر رہتا ہے وہاں۔" وہ اب سامنے روشن دکانوں کی قطار کو دیکھ رہی تھی۔

"کیسا ہے جی تہاڈا شوہر؟"

"میں نہیں جانتی ڈولی۔۔۔ اگر میں جانتی ہوتی تو آج ادھر نہ بیٹھی ہوتی۔"

اس کی لانبی پلکیں ذرا سی بھیگیں' بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پانی تیرنے لگا تھا۔

"پر جی۔۔۔"

"تم دعا کرو ڈولی! وہ مجھے مل جائے۔" وہ آنکھوں کی نمی چھپاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈولی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ

انگلی کی نوک سے آنکھ کا کنارہ صاف کرتی سڑک کی طرف جارہی تھی۔

ڈولی کی آنکھوں میں بے پناہ اداسی اتر آئی۔

"خدا کرے وہ تمہیں کبھی نہ ملے حیا سلیمان۔ خدا کرے تم اس سے مایوس ہو کر جلد ہی واپس آجاؤ۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی' جب اس نے ڈولی کو کہتے سنا۔ مگر نہیں' وہ ڈولی کی آواز نہیں تھی' وہ کسی مرد کی آواز تھی۔ بھرپور' خوب صورت اور اداس' ایسی آواز جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ میجر احمد کی آواز سے زیادہ خوب صورت تھی اور اس میں جہان سکندر کی اجنبی آواز جیسی بے رخی بھی نہ تھی۔

اس کے قدم زنجیر ہو گئے۔ تیزی سے اس نے گردن موڑی۔

دور اندھیرے میں ڈوبا چبوترہ خالی تھا۔ وہاں دور' دور تک کسی کا نام و نشان نہیں تھا۔

زندگی میں پہلی بار اس کے اندر ڈولی سے دوبارہ ملنے کی خواہش نے جنم لیا تھا۔ اسے جاننا تھا کہ ڈولی کون ہے' کیا ہے' کیوں ہے۔

☼ ☼ ☼

اس رات وہ بمشکل دو' تین گھنٹے ہی سو سکی تھی۔ پھر فجر کی اذان سے بھی پہلے تیار ہو کر وہ ڈپلومیٹک انکلیو پہنچ گئی کہ خدیجہ کی بار بار کال آرہی تھی۔

"شکر ہے آپ آگئیں۔" خدیجہ اسے باہر ہی مل گئی۔ اس کی عینک کے پیچھے چھپی آنکھیں فکر مند لگ رہی تھیں۔

حیا سادہ شلوار قمیص اور سیاہ جیکٹ میں ملبوس تھی۔ لمبے کھلے بال کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے وہ خدیجہ تک آئی۔

"اب کدھر جانا ہے؟"

"اندر۔ یہ شٹل لے لیتے ہیں۔ یہ ٹرکش ایمبیسی تک پہنچادے گی۔"

تب ہی ایک عمر رسیدہ صاحب اور خاتون تیزی سے شٹل کی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔

"میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ یہ انکل آنٹی بھی ٹرکش ایمبیسی جا رہے ہیں۔ حیا! جلدی کریں' ہمیں پہلے پندرہ میں سے ہونا ہے۔" وہ حیا کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھی' پھر خیال آنے پہ پوچھ لیا۔ "اندر آئی ڈی کارڈ سے انٹری ہوگی' آپ آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ لائی ہیں نا؟"

اور حیا کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ رات اتنی ڈسٹرب رہی کہ بھول ہی گیا کہ۔۔۔

"پاسپورٹ۔ پاسپورٹ تو مجھے آج ملنا تھا۔ وہ تو ابھی بنا ہی نہیں ہے۔"

"حیا!" خدیجہ منہ کھولے ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ میں۔۔۔ اوہ خدیجہ۔۔۔ آئی ایم رئیلی سوری' میرے پاس پاسپورٹ نہیں ہے۔" اس کا سر گھومنے لگا تھا۔ وہ اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتی تھی؟

"آپ۔۔۔ آپ کے پاس پاسپورٹ نہیں ہے تو آپ خود کیوں آئی ہیں' ہاں؟ آپ کی وجہ سے میرا اسکالرشپ بھی رہ جائے گا' کتنا احساس ہے آپ کو؟"

وہ پھٹ پڑی تھی اور حیا' جو اتنی مغرور اور خود پسند تھی' جس کی شخصیت سے لباس تک ہر شے پرفیکٹ ہوتی تھی اور جس کی مثالیں اس کی کلاس فیلو دیا کرتی تھیں' وہ ایک دم رو پڑی۔

"آئی ایم سوری خدیجہ۔۔۔ میرے کچھ پرابلمز تھے' میری لائف۔۔۔ میری لائف بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے' میں۔۔۔" وہ جلدی جلدی بے اختیار امڈ آنے والے آنسو صاف کرنے لگی۔

"اٹس اوکے خدیجہ! آئی ایم سوری' مگر آپ جائیں' میں کل ٹرائی کرلوں گی۔"

خدیجہ چند لمحے خاموش رہی' پھر آہستہ سے بولی۔

"اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دیں۔"

"جی؟"

"اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دیں اور واپس جا کر پاسپورٹ آفس سے اپنا پاسپورٹ اٹھا کر لائیں۔ امید ہے آئی ڈی کارڈ سے آپ کی انٹری ہو جائے گی اور ہماری باری آنے تک آپ واپس پہنچ جائیں گی۔"

"مگر۔۔۔ مگر پاسپورٹ آفس تو پنڈی میں ہے اور مجھے تو جاتے ہوئے بھی ایک گھنٹہ لگ جائے گا اور پاسپورٹ آفس تو کھلے گا ہی نو بجے' جبکہ ایمبیسی سات بجے کھل جائے گی۔" اس نے فکر مندی سے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"یہ ناممکن ہے۔ میں کبھی بھی اتنی جلدی واپس نہیں پہنچ پاؤں گی کہ پہلے پندرہ میں سے ہو سکوں۔"

"حیا! میں نے زندگی میں ایک ہی بات سیکھی ہے کہ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی' جب تک کہ وہ خود ہار نہ مان لے۔ آپ ابھی سے ہار مان لینا چاہتی ہیں؟ لائیں' آئی ڈی کارڈ دیں' مجھے ان انکل آنٹی سے پہلے پہنچنا ہے۔" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑا آئی ڈی کارڈ جھپٹ کر شٹل کی طرف دوڑتی ہوئی چلی گئی۔

اس نے آنکھوں کے کنارے پونچھے اور پھر کلائی پہ بندھی گھڑی کو دیکھا۔ کیا اس کا ویزا لگ جائے گا؟ یا ڈولی کی بددعا پوری ہو جائے گی اور وہ کبھی ترکی نہیں جا سکے گی؟ اسے کبھی جہان سکندر نہیں مل سکے گا؟

مگر خدیجہ نے کہا تھا' انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی جب تک کہ خود ہار نہ مان لے اور اس نے سوچا' وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گی۔

بے دردی سے آنکھیں رگڑ کر وہ گاڑی کی طرف لپکی تھی۔

بہت رش ڈرائیو کر کے وہ پنڈی آئی تھی۔ تقریباً" ایک گھنٹہ اسے بند پاسپورٹ آفس کے باہر بیٹھنا پڑا۔ خدا خدا کر کے نو بجے آفس کھلا تو وہ اندر بھاگی۔ شاید اس کی ہمت دکھانے کا صلہ تھا۔ دس منٹ بعد وہ اپنا پاسپورٹ لیے آفس کی بیرونی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ تب ہی کسی غیر شناسا نمبر سے کال آئی۔ اس نے کسی خیال کے تحت فون اٹھا لیا۔

"ہیلو؟"

"ہیلو حیا؟ میں خدیجہ بول رہی ہوں۔ میرا فون تو باہر بھائی کے پاس ہے کیونکہ اندر سیل فون کی پرمیشن نہیں ہے۔ ابھی ایمبیسی کے گارڈ سے فون لے کر سو منتیں کرکے کال کر رہی ہوں۔" وہ ایک ہی سانس میں تیز تیز بولے گئی۔ "آپ کدھر ہیں؟"

"بس مجھے پاسپورٹ مل گیا ہے، میں آرہی ہوں۔ میری انٹری ہوگئی؟" اس نے گاڑی میں بیٹھ کر چابی اگنیشن میں گھمائی۔

"شکر ہے میں نے تیز بھاگ کر ان انکل آنٹی کو بائی پاس کرلیا۔ میں چودہ نمبر پہ تھی، اور آپ کی بھی انٹری کرادی ہے، آپ کا پندرہواں نمبر ہے۔"

"اوہ شکر!"

"لیکن انہوں نے ان انکل آنٹی کو روک رکھا ہے کہ اگر آپ نہ آئیں تو ان کا انٹرویو ہو جائے گا اور وہ آنٹی مسلسل تسبیح پڑھ رہی ہیں، حیا! آپ جلدی سے آجائیں۔"

"میں آرہی ہوں، بس ابھی آفس ٹائم ہے نا تو ٹریفک بہت ہیوی ہے۔"

"بس جلدی سے آجائیں، یہ بار بار پوچھ رہے ہیں کہ میری دوسری ساتھی کدھر ہیں۔"

"بس تھوڑی دیر اور!" اس نے ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھا دیا۔

ٹریفک حسب معمول بہت پھنسا ہوا تھا۔ بے پناہ رش، ہارن کا شور، بند سگنل، پھنسی ہوئی گاڑیاں۔ وہ بار بار فکرمندی سے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتی اور پھر سست روی سے چلتے ٹریفک کو، بمشکل مری روڈ سے نکل پائی تو سکون کا سانس لیا۔

معمول کی چیکنگ کے بعد وہ گیارہ بجے تک اس اوپن ایئر لاؤنج میں پہنچ پائی جہاں خدیجہ تھی۔ ترک رگز، مخصوص ترک بلیو آئی (ایول آئی) اور ترکی کے نقشوں سے وہ لاؤنج سجایا گیا تھا۔

خدیجہ ایک صوفے پر مضطرب پریشان سی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شکر ہے آپ آگئیں حیا! انہوں نے سب کے انٹرویو روک رکھے ہیں۔ پہلے ہمارا ہوگا۔"

"اچھا۔ مگر کیوں؟"

لیکن کیوں کا جواب سننے کا وقت نہیں تھا اور پھر ان کو انٹرویو کے لیے کال کرلیا گیا تھا۔

وہ خوش شکل سا ترک ڈپلومیٹ ان کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ وہ خدیجہ کے آگے چلتی ہوئی سامنے ہوئی اور اپنی فائل شیشے کی کھڑکی کے سوراخ سے اندر دی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر اس کا ویزا مسترد ہوگیا تو...؟

اس آفیسر نے ان کی فائلیں اٹھائیں، ان سے فارم نکالے اور فائلیں واپس بند کرکے رکھ دیں۔ اگر اس نے ویزا دینا ہوتا تو ان کا انٹرویو کرتا، کچھ تو پڑھتا، کوئی سوال تو پوچھتا، مگر وہ بس سرسری سا فارم کو دیکھ رہا تھا، تو کیا وہ واقعی اس کا ویزا مسترد کرنے لگا تھا؟

فارم پہ ایک نگاہ دوڑا کر اس نے سر اٹھایا اور سنجیدگی سے ان دونوں کو دیکھا، جو بنا پلک جھپکے سانس روکے اس کو دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کدھر تھیں؟ میں اتنے دنوں سے آپ کا ویٹ کر رہا تھا۔" اس نے ساتھ ہی میز پہ رکھا ایک کاغذ اٹھایا۔ "مجھے سبانجی یونیورسٹی نے یہ لسٹ بھجوائی تھی، اس میں آپ کے نام ہیں، تاکہ میں آپ کا ویزا لگا دوں۔ خیر، ویزا کل تک اسٹیمپ ہو جائے گا، آپ میں سے کوئی ایک کل آکر دونوں پاسپورٹ پک کرلے۔ شام چار بجے تک، رائٹ؟"

"رائٹ!" فرط جذبات سے ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ دل یوں دھڑک رہا تھا گویا ابھی سینہ توڑ کر باہر آجائے گا۔ وہ جیسے ہی اس کے آفس سے نکلیں، ایک ساتھ رک گئیں اور ایک دوسرے کو دیکھا۔

"آئی ایم سوری حیا!"

"آئی ایم سوری خدیجہ!"

بیک وقت دونوں کے لبوں سے نکلا تھا، اور پھر وہ دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

بالآخر اسے یقین آگیا تھا کہ ہاں، وہ واقعی ترکی جارہی

ہے۔ وہ بھی پورے پانچ ماہ کے لیے۔ وہ ترکی جہاں وہ رہتا ہے۔ وہ جو ہمیشہ سے اس کے دل کے ساتھ رہا تھا۔

"ویلکم ٹو سبانجی!" (مجھے خوش آمدید کہو، اے سبانجی!)

☆ ☆ ☆

"بھائی تو چلے گئے تھے مجھے ڈراپ کرکے، میں آپ کے سیل سے ان کو کال کرلوں کہ وہ مجھے پک کرلیں؟" ڈپلومیٹک انکلیو سے نکلتے ہوئے خدیجہ نے پریشانی ظاہر کی تو اس نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔

"نو پرابلم، میں آپ کو ڈراپ کردوں گی خدیجہ!"

"آپ مجھے ڈی جے اور تم کہہ سکتی ہیں۔"

"شیور۔" اس نے پارکنگ میں کھڑی کار کا لاک کھولا۔ "مجھے جناح سپر جانا تھا۔ یوں نہ کریں کہ کچھ شاپنگ کرلیں؟ آپ نے کچھ تو لینا ہوگا خدیجہ؟" اس کی تاکید کے باوجود وہ تکلف ختم نہ کرسکی۔

"سویٹرز لینے ہیں، وہاں بہت سردی ہوگی۔"

"پھر وہیں چلتے ہیں۔"

"سائنو شور" کے بالمقابل چبوترہ خالی تھا مگر دن کے وقت وہ اتنا ویران نہیں لگ رہا تھا، جتنا پچھلی رات لگا تھا اور وہ آواز... وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

"اوہ نیڈل امبرائیڈرز پہ سیل لگی ہے۔ آئیں، کچھ دیکھ لیتے ہیں۔" وہ کافی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ یہاں سے کوئی اچھا شرٹ پیس لے آئے اور آج تو سیل بھی لگی تھی۔ وہ اور خدیجہ آگے پیچھے شیشے کا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوئیں۔

شاپ کے اندر وہی مخصوص ماحول تھا۔ ہیٹر کی گرمی اور باہر کی خنکی کا ملا جلا تاثر۔ زرد سپاٹ لائٹس سے چمکتی چھت، اور ہر طرف شوکیسز پہ پھیلے کڑھائی والے کپڑے۔

وہ محوسی اسٹینڈ پہ لگے نمونے دیکھتی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ سامنے ورک ٹیبل تھی، جس کے پیچھے کھڑا مستعد سیلز مین اسے دیکھ کر فوراً متوجہ ہوا تھا۔

"جی میم؟"

"یہ پنک والا دکھائیں، جس پہ وائٹ امبرائیڈری ہے۔" اس نے انگلی سے پیچھے رول کیے ہوئے تھان کی طرف اشارہ کیا۔ سیلز مین نے گردن پھیر کر دیکھا۔

"میم! یہ میں نے سامنے نکال رکھا ہے، یہ سامنے ہی پڑا ہے۔" وہ اس سے چند فٹ بائیں جانب اشارہ کر رہا تھا، جہاں ایک فیملی کھڑی اسی کپڑے کا معائنہ کر رہی تھی۔

"اوہ تھینکس۔" وہ چند قدم چل کر بائیں جانب آئی، جہاں میز پہ وہ خوب صورت کڑھائی والا شرٹ کا فرنٹ پیس پھیلا ہوا تھا۔ حیا کے بالکل بائیں طرف کھڑا ایک نوجوان سر جھکائے ہاتھ میں کپڑے کو مسل کر چیک کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نفیس ہمعمر سی خاتون اور ایک کم عمر اونچی پونی ٹیل والی لڑکی کھڑی تھی۔

"ممی! یہ پنک والا لے لیتے ہیں، ثانیہ بھابھی کا کمپلیکشن فیئر ہے، ان پہ سوٹ کرے گا، کیوں بھائی؟" وہ اب نوجوان سے رائے مانگ رہی تھی۔ حیا نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اسے بس یہی جلدی تھی کہ کب وہ شخص اس کپڑے کو چھوڑے اور وہ اسے دیکھ پائے۔ اس وقت بھی گلابی شرٹ کا کپڑا اس شخص کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اسے ہاتھ میں یوں پکڑ رکھا تھا کہ اس کی ہتھیلی والی طرف اوپر تھی۔ حیا اس کے ہاتھ میں پکڑے کپڑے کو دیکھ رہی تھی، جب دفعتاً اس کی نگاہیں کپڑے سے اس شخص کی کلائی پہ پھسلتی گئیں۔ وہ بری طرح چونکی۔

اس کی کلائی پہ کانٹے کا سرخ گلابی سا نشان تھا۔ جیسے جلا ہو یا... کوئی برتھ مارک...

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مریم ساجد

جس جس نے یہ بات سنی' حیرت سے گنگ رہ گیا۔

صباحت اور فرحت کی اماں نے تو اپنا ماتھا تک پیٹ لیا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی بیٹیوں کے دماغ سے یہ خناس کیسے نکالیں۔

"چہ چہ چہ... فرحت! میں تو تجھے بڑا ہی عقل مند سمجھتی تھی مگر... تو نے تو عقل مندی کا ایسا اعلا ثبوت پیش کیا ہے کہ پورا خاندان عش عش کر اٹھا ہے۔"

"اماں! میری بھی تو سنیں۔" میں منمنا کر بولی مگر اماں...

"اے! اب کچھ سننے کے لیے بچا ہے؟ اپنے ساتھ ساتھ اس نگوڑی کو بھی ملا لیا ہے۔ توبہ توبہ! تمہارے دماغ میں یہ نادر خیال آیا تو آیا کیسے' ہیں؟ اور تو چپ کر!"

انہوں نے ایک عدد دھمو کا صباحت کو بھی جڑا' جو بے چاری میری حمایت میں کچھ بولنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"اماں!" اب اس نے اپنے لیے احتجاج کیا۔ "اب تو کچھ لحاظ کر لیں... اب تو میں شادی شدہ ہوں!" اس نے اپنے نئے نکور دوپٹے کا پلو دانتوں تلے دبا کر کہا' مگر اماں کا ایک اور کرارا سا ہاتھ پڑنے پر وہ گرتے گرتے بچی۔

"شادی شدہ ہو کر کیا پر نکل آئے ہیں تیرے' ہیں؟ اپنی حرکتیں دیکھی ہیں؟ اے! میں کہتی ہوں کہ یہ سوچ تم دونوں کے دماغ میں گھسی کیسے؟"

اماں نے دس دفعہ کا دہرایا ہوا سوال دوبارہ گھما پھرا کے کیا' مگر جواب سننے کی روادار نہ تھیں' اس لیے میں نے جیسے ہی دوبارہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

"اماں پلیز! میری بات تو سن لیں۔" مگر میرا یہ جملہ بے چارہ ہمیشہ کی طرح اماں کی گولہ باری کی نظر ہو گیا۔

"ناں! مجھے بتاؤ کہ آج کل کے لوگ اپنی لڑکیوں کے لیے اول تو چھڑے چھانٹ ڈھونڈتے ہیں... اگر قسمت اتنی تیز نہ ہو تو کم از کم یہ کوشش ضرور کرتے ہیں کہ ساس نند کا ننگنانہ ہو۔ ارے خوش قسمت ہو تم دونوں جو ایسی سسرال ملی' نہ ساس نہ نند' بس ایک بے چارہ سا سسر اور تین یہ بھائی۔ خوشی خوشی پورے گھر پہ راج کرنے کے بجائے تم لوگ اپنے ہی پیروں پہ کلہاڑی مارنے چلی ہو۔ جس شاخ پہ بیٹھی ہو' اسی کو کاٹ رہی ہو؟ تف ہے تم دونوں پر..."

میں نے صباحت کی طرف دیکھا' وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت اماں سے کچھ بھی کہنا بے کار تھا۔

☆ ☆ ☆

عابد انکل' یعنی ڈیڈی ایک بہت ہی بے ضرر سے سسر تھے۔

آج میری ہی کوششوں کی وجہ سے میری تیسرے نمبر والی بہن میری دیورانی بن کر میرے ہی گھر اتری تھی۔ آج ولیمہ کی تقریب بھی اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ اس گھر کی بڑی بہو ہونے کا اعزاز مجھے حاصل تھا۔

میرے بڑے دیور نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ پتا نہیں اس بونگی سی طیبہ میں اسے کیا نظر آگیا تھا کہ وہ اسی سے شادی کرنے پر اڑ گیا تھا حالانکہ میں نے بڑا زور لگایا کہ وہ کسی طرح میری دوسرے نمبر والی بہن سے شادی پر آمادہ ہو جائے، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا' لہٰذا طیبہ ہی آخر کار اس کی شریک سفر بنی، مگر وہ بونگی' میرے لیے کسی قسم کا خطرہ نہ بن سکی۔ سو میں بھی مطمئن ہو گئی۔

مگر پھر صباحت کے لیے میں نے عمران (دیور) اور عابد صاحب (ڈیڈی) کو راضی کر کے ہی دم لیا۔ ویسے صباحت بھی کچھ کچھ طیبہ جیسی ہی تھی۔ میری ہر بات آنکھ بند کر کے ماننے والی۔

سو اب میری راج دھانی کو کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ میں بھرپور طریقے سے شادی انجوائے کر رہی تھی۔

"ڈیڈی! آپ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟" میں کسی کام کے لیے ڈیڈی کے کمرے میں داخل ہوئی تو انہیں اندھیرے میں بیٹھا دیکھ کر چونک گئی۔

"کچھ نہیں بیٹا! بس ایسے ہی... تم لوگ انجوائے کرو ناں!"

"لیکن آپ!"

"ارے بھئی! تم لوگ انجوائے کرو۔ میں تو بوڑھا ہو چکا ہوں اب... اس شور شرابے میں دل گھبراتا ہے ناں۔" انہوں نے ٹالا تھا۔

"اوہ! ڈیڈی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!" مجھے تھوڑی پریشانی ہوئی۔ اب شادی والے گھر میں ان کی طبیعت خراب ہو گئی تو خوامخواہ رنگ میں بھنگ پڑ جائے گا۔

"ہاں ہاں... طبیعت ٹھیک ہے' بس ذرا تھکاوٹ ہو گئی ہے' ایسا کرو آج میرے لیے کچھ ہلکی پھلکی چیز بنا لینا' شادی کا کھانا کھا کر طبیعت کچھ عجیب سی ہو گئی ہے۔" انہوں نے بے چارگی سے کہا۔

"جی!" مجھے خود اپنی آواز مری مری محسوس ہوئی تھی... اب بھلا لاؤنج میں جمی محفل کو چھوڑ کر میں اتنے بھاری کپڑے پہن کر کچن میں چلی جاؤں؟ ایسے میں اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن میں آیا، مگر میں نے اسے سر کے ساتھ ہی جھٹک دیا۔

"پاگل ہوں میں بھی!" میرے قدم لاؤنج کی طرف تھے۔

"فرحت!" عاصم کی آواز پر میرے ساتھ ساتھ لاؤنج میں بیٹھے دوسرے لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔

"تم نے ڈیڈی کے لیے الگ سے کھانا نہیں بنوایا؟" اتنے سارے لوگوں کے بیچ میں ان کا یوں پوچھنا مجھے کچھ عجیب لگا۔

"وہ... مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔" حالانکہ اس وقت میں نے خود نظر انداز کیا تھا اور بعد میں واقعی بھول گئی تھی۔

"ایسے کیسے بھول گئیں تم؟ تمہیں دھیان رکھنا چاہیے تھا' تمہیں معلوم بھی تھا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں' حد ہوتی ہے لاپروائی کی۔" میرا بس نہیں چلا کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔ عاصم ڈیڈی کی طبیعت کا سن کر ان کے کمرے کی طرف لپکے جبکہ میں' طیبہ اور دلہن بنی صباحت ایک دوسرے کی شکلیں دیکھتی رہ گئیں اور وہی خیال جو میں پہلے جھٹک چکی تھی ایک دفعہ پھر میرے دماغ میں آیا۔

"ویسے اس میں کوئی ہرج بھی نہیں ہے۔" میں سوچ کر مسکرائی۔

☼ ☼ ☼

"تم پاگل ہو گیا؟" وہ بیڈ پر لیٹے لیٹے یوں اچھل کر بیٹھے جیسے انہیں بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔ ویسے ان کا یہ رد عمل میری توقع کے عین مطابق تھا، مگر انہیں ہر حال میں راضی کرنا تھا۔

"عاصم! آپ پلیز میری بات پر ٹھنڈے دماغ سے سوچیں۔"

"اس میں سوچنے والی کیا بات ہے؟ حد ہو گئی ہے فرحت!" وہ ناراضی سے بولے۔

"عاصم! دیکھیں ابھی آپ جذباتی ہو رہے ہیں۔

اگر غور کریں تو میں نے یہ بات ڈیڈی کے ہی فائدے کے لیے کہی ہے۔ اس عمر میں انسان شریک حیات کی کمی کو بہت شدت سے محسوس کرتا ہے۔ وہ بہت اکیلے ہو گئے ہیں۔" مجھے انہیں ہر حال میں قائل کرنا تھا۔

"تمہارا دماغ تو درست ہے نا؟" انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"ہم سب ساتھ تو ہیں ان کے' پھر کیسے وہ اکیلے ہو سکتے ہیں۔"

"اف!" میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں۔ ذرا سی بات میرے اتنے قابل شوہر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"عاصم! شریک حیات کی کمی انسان کا ہجوم بھی پورا نہیں کر سکتا۔ آپ سمجھیں تو سہی' جو جگہ' جو مرتبہ بیوی کا ہوتا ہے وہ کوئی اور کیسے لے سکتا ہے؟ انسان ہر بات' ہر کام اپنی اولاد اور بہوؤں کو نہیں کہہ سکتا۔"

پوری رات انہیں مناتے ہوئے گزر گئی مگر میری بات میرے سرتاج کے دماغ میں نہ سما سکی اور پھر اسی لیے صبح اٹھنے میں بھی دیر ہو گئی اور ایسا پہلی دفعہ ہوا تھا۔ اس لیے مجھے تیز تیز ہاتھ چلا کر ناشتا تیار کرنا پڑا تھا۔

عاصم اور عبید تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ ڈیڈی اخبار پڑھ رہے تھے۔

"فرحت بیٹا! میرے لیے چائے نہیں بنانا۔" میں ان کے لیے چائے بنانے لگی تو انہوں نے روک دیا۔

"کیوں ڈیڈی! وہ رات دیر سے..." عاصم اور عبید نے میری طرف اس نظر سے دیکھا کہ مجھے وضاحت دینی پڑی شرمندہ ہو کر۔

"ارے نہیں بھئی! میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ صبح میں نے چائے پی لی تھی۔" باقی لوگوں کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے آرام سے بتا دیا۔

"آپ نے خود بنائی؟" مجھے بیک وقت حیرت اور شرمندگی ہوئی۔

"ڈیڈی! مجھے اٹھا دیتے ناں!"

"ارے نہیں بھئی... ذرا سی چائے ہی تو بنانی تھی' اب اتنے سے کام کے لیے میں تم لوگوں کو جگاتا ہوا اچھا لگتا؟"

ڈیڈی کی بات کے اختتام پر میری جتاتی ہوئی نظر بڑی غیر ارادی طور پر عاصم پر پڑی تھی' جو ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئے تھے اور اگلے ہی دن عاصم نے اپنی رضامندی دے دی۔ بس عاصم کے راضی ہونے کی دیر تھی' چھوٹے دونوں بھائی بھی ذرا سی حیل و حجت کے بعد مان گئے اور ان کی بیویاں تو تھیں ہی میری فرمانبردار' سو دونوں نے چوں بھی نہ کی۔

☼ ☼ ☼

ڈیڈی رات کو کھانے کے بعد حسب معمول اسٹڈی میں گئے تو ہم سب خلاف معمول لائن بنا کر ان کے پیچھے پیچھے اسٹڈی کے دروازے تک جا پہنچے... مگر اندر جانے کی ہمت...

"اوہو!" میں جھنجلائی۔ "عاصم! چلیں بھی۔"

"مم... میں کیوں؟ پہلے تم جاؤ... لیڈیز فرسٹ!" وہ بوکھلائے۔

"اف..... آپ لوگوں کو یہیں کھڑے ٹائم ضائع کرنا ہے کیا؟" عمران میں صبر نامی چیز کی خاصی قلت تھی۔
"تو یہ چلیں ناں!" میں نے عاصم کی طرف اشارہ کیا۔
"تم چلو!" عاصم نے کہا۔
"آپ بڑے بیٹے ہیں۔" میں نے انہیں یاد دلایا۔
"اور تم بڑی بہو ہو!" عاصم نے بھی حساب برابر کیا۔

اتنے میں اسٹڈی کا دروازہ کھلا۔ جہاں ہماری سرگوشیوں کو بریک لگے' وہیں ڈیڈی بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ حیران پریشان ہمیں دیکھ رہے تھے' جو ایک لائن میں اسٹڈی کے باہر کھڑے تھے۔
"خیریت! تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو۔" ان کی حیرانی اب پریشانی میں بدل گئی تھی۔
"وہ ڈیڈی!" ہم سب یک زبان بولے اور پھر جھینپ کر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ آخر کار میرے مجازی خدا نے ہمت کی۔
"ڈیڈی! ہمیں آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"
"پھر سب کو؟" انہوں نے باری باری سب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"جی وہ..... " اتنی سی بات کہہ کر وہ میری طرف دیکھنے لگے' یعنی اب بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا؟

"اچھا آجاؤ اندر..... کوئی مسئلہ ہے تو مل کر حل کر لیتے ہیں۔" دروازے سے ہٹ کر انہوں نے سب کو اندر آنے کا راستہ دیا۔
"ہاں اب بتاؤ۔" انہوں نے عاصم سے پوچھا تو وہ مدد طلب نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگے' پھر باری باری سب کی طرف دیکھا مگر سب کے سر جھکے ہوئے تھے لہٰذا تھوک نگلتے ہوئے انہیں ہی بات شروع کرنی پڑی۔
"وہ دیکھیں ڈیڈی..... آپ نے ہم تینوں کو پال پوس کر اکیلے ہی جوان کیا ہے' پھر ہماری شادیاں کیں' ماشاء اللہ آپ نے اپنی ساری ذمہ داری پوری کی۔"
عاصم کی تمہید کافی لمبی ہو گئی تھی' مگر اصل بات پر آ کر ان کی زبان رک گئی۔
"بیٹے جی..... یہ ساری باتیں میں جانتا ہوں۔ تم اصل بات پر آؤ۔" اور اصل بات ہی کی تو مصیبت تھی جو کسی کی زبان پر آ کر نہ دے رہی تھی۔
"ڈیڈی! ہم لوگوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ ہم اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ تنہائی کا شکار ہو رہے ہیں اور اس عمر میں....."
عبید نے بڑے اعتماد سے بات شروع کی تھی مگر پھر وہی ..... اصل بات پر آ کر اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔
"اس عمر میں کیا؟" ڈیڈی نے سوالیہ انداز میں عبید کی طرف دیکھا۔
"ڈیڈی! بات اصل میں یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ اب آپ کی شادی کر دی جائے۔"
عمران سے اتنی دیر سے برداشت نہیں ہو رہا تھا' سو وہ ایک دم بول پڑا اور پھر خود ہی سکتے میں آ گیا..... پورے کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔
"کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ یہ بے ہودہ خیال تم لوگوں کے دماغ میں آیا کیسے؟" انہوں نے سب کو پورے انصاف سے گھورا۔ باقیوں کے تاثرات کیا تھے' یہ میں نہیں دیکھ سکی کیونکہ میری نظریں' میرے سر سمیت رکوع میں تھیں۔
"ڈیڈی! دیکھیں اس میں آپ کی ہی بہتری ہے۔" عاصم کی منمنانے کی آواز سنائی دی تھی مجھے۔
"تم..... تم لوگ کون ہوتے ہو مجھے میری بہتری بتانے والے؟ کیا شادی شدہ ہو کر خود کو میرا باپ سمجھنے لگے ہو؟"

ڈیڈی نے نہ بیٹوں کا لحاظ کیا نہ بہوؤں کا۔ حسب توفیق سب کو بے نقط سنائیں اور آخر میں سب کو کان لپیٹ کر باہر بھاگنا پڑا۔

☆ ☆ ☆

مگر دو ہی دن بعد انہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑی جو میری ہی پلان کردہ تھی۔
"فرحت بیٹے! میرے کپڑے پریس نہیں کیے۔" وہ اپنے کپڑے اٹھا کر آئے تو میں نے چپ چاپ بیٹھے اپنے بیٹے عبداللہ کو اٹھا کر جھلانا شروع کر دیا۔
"وہ ڈیڈی! عبداللہ نے مجھے اتنا تنگ کیا ہوا تھا' وقت ہی نہیں ملا..... بس عاصم کے ہی مشکل سے کیے ہیں..... آپ طیبہ سے کہہ دیں ناں۔" ابھی وہ طیبہ کی طرف مڑے ہی تھے کہ وہ بول اٹھی۔
"سوری بھابھی! مجھے دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنی ہے۔ آپ کو پتا ہے ناں' عبید نے آتے ہی شور مچا دینا ہے۔"
انہوں نے ایک لمحے کے لیے صباحت کی طرف دیکھا' جو لاؤنج میں بیٹھی اپنے ناخنوں پر نیل پالش لگا رہی تھی' پھر وہ کپڑے اٹھا کر اندر چلے گئے۔ اگلے دن وہ طیبہ کے پاس گئے تھے۔
"طیبہ بیٹے! کتنے دنوں سے میرے کمرے کی صفائی نہیں ہوئی۔ سارا کمرا اوندھا پڑا ہے' کام والی چھٹیوں پر ہے کیا؟"

"وہ ڈیڈی! دراصل کام والی تو آتی ہے مگر اس کے سر پر کھڑے ہو کر صفائی کروانی پڑتی ہے۔ فرحت بھابھی اور صباحت تو اپنے اپنے روم کی صفائی کروا لیتی ہیں اور میں اپنے کی تو..... " طیبہ نے رٹا رٹایا سبق پڑھ دیا تھا۔

اور صرف ایک ماہ کے ٹرائل کے بعد ہی اس کے نتائج ہمارے سامنے تھے۔ اسٹڈی میں ہی دوبارہ میٹنگ ہوئی تھی۔
"تم لوگ جیتے میں ہارا..... کر لو اپنا شوق پورا۔" ڈیڈی نے اعلان کیا تو ہم سب کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

☆ ☆ ☆

اگلے ہی دن میں نے رشتہ کروانے والی خالہ کو بلوا لیا۔ اس وقت صرف ہم تینوں ہی گھر پر تھیں۔
"ہاں بھئی! کس کا رشتہ کروانا ہے؟" اپنے برقعے کو سنبھال کر وہ آلتی پالتی مار کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔ "لڑکے کا یا لڑکی کا؟"
اس کے سوال پر ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر طیبہ ہی بولی۔
"لڑکے کا..... مگر ہے بڑی عمر کا۔"
"ہوں..... تو یہ بات ہے!" وہ شڑوپ شڑوپ کر کے چائے پیتے ہوئے بولی۔
"تو تم لوگوں کو کیسی لڑکی چاہیے؟" میں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ خالہ نے اگلا سوال داغ کر مجھے کچھ دیر کے لیے خاموش ہونے پہ مجبور کر دیا۔
"ویسے لڑکا تم لوگوں کا جیٹھ ہے یا بھائی؟" ہم لوگوں میں ایک دفعہ پھر نظروں کا تبادلہ ہوا۔
"وہ ہمارے ڈیڈی ہیں!" میرے جواب پر خالہ غور سے ہماری شکلیں دیکھنے لگیں۔
"تو تم تینوں بہنیں ہو؟ ویسے سچ کہوں' لگتی نہیں ہو۔" خالہ کو شاید خود سے اندازے لگانے کی عادت تھی مگر ہمارے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ پھر بول پڑیں۔
"لیکن تم لوگ کیوں اپنی سر پر سوتیلی ماں مسلط کرنا چاہتی ہو؟ تمہارے باوا تو اب اپنی عمر گزار چکے..... ایویں کوئی دوسری عورت اس عمر میں ورغلا کر ساری جائیداد ہتھیا لے تو ہاتھ ملتی رہ جاؤ گی تم لوگ۔ ویسے تمہاری ماں مری کب؟"
خود ساختہ اندازے لگانے کے علاوہ بغیر سوچے سمجھے نان اسٹاپ بولنے کی بھی عادت تھی انہیں۔
"ایک منٹ خالہ!" میں نے خالہ کو بریک لگوائے۔
"ڈیڈی ہمارے سسر ہیں اور ہمیں سوتیلی ماں نہیں' ساس چاہیے۔" میری اس بات پر خالہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔
"تت..... تت' تم..... تم لوگوں کا دماغ تو ٹھیک ہے ناں؟" خالہ نے حیرت سے ہمیں یوں دیکھا' جیسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ دیکھ رہی ہوں۔ "تم..... میرے ساتھ مخول کر رہی ہو' ہیں ناں؟"

خالہ زبردستی ہنس کے بولیں مگر ہم تینوں ہی سنجیدہ شکلیں بنا کر بیٹھی رہیں۔

"خالہ! ہماری شکل پہ کچھ ایسا لکھا ہوا ہے کہ ہم آپ سے مذاق کر رہی ہیں؟" صباحت نے سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر؟" خالہ بے چاری حیرت ہی حیرت میں گھری ہوئی تھیں اور ٹکر ٹکر ہمیں گھور رہی تھیں جیسے ابھی ہم ہنس دیں گی اور کہیں گی خالہ ہمیں پاگل کتے نے کاٹا ہے جو ہم ایسا کام کریں۔

"آپ بتائیں' آپ ہمارا کام کریں گی یا ہم کسی اور کو بلوالیں؟" آخر کار مجھے خالہ کی بے تکلفی کو ختم کرنا پڑا۔

"ارے نہیں۔۔۔ نہیں۔" خالہ سکتے سے نکل کر بوکھلا کر بولیں۔ آخر اپنی روزی پر کیسے لات مار سکتی تھیں۔

"اچھا بتاؤ' تم لوگوں کو اپنے ڈیڈی کے لیے کیسی دلہن چاہیے؟"

"ہوں! اب آپ نے کی نا اصل بات!" مجھے خوشی ہوئی کہ انہوں نے خود ہی پوچھ لیا تھا' ورنہ مجھے کہنا پڑتا۔ خالہ کے پوچھنے کی دیر تھی کہ میں نے وہ لسٹ لکھوانی شروع کر دی۔ جو میں نے پہلے سے ہی مرتب کر رکھی تھی۔

"شکل وصورت اچھی نہیں ہونی چاہیے۔"

"پڑھی لکھی بھی بالکل نہ ہوں۔" کہیں بہوؤں سے آگے نہ نکل جائے۔۔۔ کیونکہ میں اور طیبہ تو پھر ایف اے پاس تھے مگر صباحت نے روپیٹ کر بس میٹرک ہی کیا تھا' وہ بھی اتنے کم نمبروں سے کہ نمبر بتاتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

"ہاں' عمر درمیانی ہونی چاہیے' نہ اتنی جوان کہ بہوؤں کی برابری کرے اور نہ اتنی بڑھیا کہ سسر کے ساتھ ساتھ ساس کا وقت بھی پڑ جائے مفت کا۔"

"کام کاج میں ماہر ہو۔"

ہماری فرمائشوں کے ساتھ ساتھ خالہ کا منہ بھی کھلتا جا رہا تھا۔

"سلائی کڑھائی آتی ہو۔"

یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ درزی کے خرچے سے بچت ہو جائے' اتنے چکر لگانے پڑتے تھے' وقت اور پیسے الگ برباد ہوتے تھے۔

"ہر طرح کے کھانے پکانے آتے ہوں۔"

"صفائی پسند اور سلیقے والی ہو۔" صفائی طیبہ کے ذمے تھی۔

"غریب ہو تو زیادہ بہتر ہے اور ہاں! آگے پیچھے کوئی نہ ہو۔"

"زبان نہ چلاتی ہو بلکہ اگر گونگی ہو تو زیادہ بہتر ہے۔"

"بچوں کو بھی تو سنبھال سکتی ہو۔" آخری نکتہ صباحت نے یاد کروایا۔

"اور کسی بھی قسم کی ملازمت وغیرہ نہ کرتی ہو۔"

مجھے یہ بات اچانک ہی یاد آئی تھی۔ اب اگر ساس صاحبہ بھی ملازمت پیشہ ہوتیں تو ہمیں ان کے ہونے کا کیا فائدہ؟

"ہاں! مجھے ایک بات تو بتانا ذرا۔" خالہ کے تیور ذرا جارحانہ تھے۔ "تم لوگوں کو ساس ہی چاہیے نا؟ پہلے سوچ لو اچھی طرح یا پھر کام کرنے والی ماسی یا بچوں کو سنبھالنے والی آیا؟"

اتنی ساری خوبیاں بلکہ انوکھی خوبیاں سن کر یقیناً ان کے چودہ طبق روشن ہو چکے تھے۔

"اوہو خالہ! بتایا تو ہے' ساس ہی چاہیے' مگر ایسی نہیں کہ جو آکر ہمیں ہی دیوار کے ساتھ لگا دے۔"

طیبہ نے منہ بنا کر وضاحت کی۔

"ہاں! یہ تو تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے چلو پھر میں دیکھتی ہوں' ڈھونڈتی ہوں' کوئی ایسا ہی انوکھا پیس۔"

جاتے جاتے بھی وہ طنز کرنے سے باز نہیں آئی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو تلاش شروع تو ہوئی۔

☼ ☼ ☼

تین ماہ ہو چکے تھے ہمیں ساس تلاش کرتے ہوئے مگر ابھی تک کوئی ساس' سوری میرا مطلب ہے کہ

...ن ان شرائط پر پورا نہیں اتر رہی تھی۔ مگر ...وش ویسا کا ویسا ہی تھا۔

"توبہ! اس کی آنکھیں دیکھی تھیں؟" میں ...ور کرتے ہی طیبہ نے تبصرہ کرنا شروع کر دیا

"...عیار اور مکار لگ رہی تھی۔"

"...انداز تو ہمارا اس طرح لے رہی تھی کہ جیسے ...نہیں' وہ ہمیں دیکھنے آئی ہوئی ہے۔" یہ ...کا کہنا تھا۔

"...دیکھو ذرا' پہلی ہی ملاقات میں کیسے منہ پھاڑ کر ...ڈیڈی مانگ لیا؟ ہم شکل سے پاگل دکھتے ہیں کیا؟ ...محترمہ کا ابھی سے یہ حال ہے تو بعد میں تو اس ...ہمارے سر پر چڑھ کر ناچنا تھا۔" میں نے بھی اپنی ...اظہار کیا۔

"...اور کیا؟" ان دونوں نے ہمیشہ کی طرح میری ہاں ...ملانا ضروری سمجھا۔

...ہی راہداری عبور کر کے ہم لاؤنج میں داخل ...ڈیڈی کو وہاں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔ "کہیں ...نے ہمارے تبصرے سن تو نہیں لیے؟ ایک تو ...کی آواز بھی پھٹے ہوئے ڈھول کی طرح تھی۔ ...میں نے اپنے تاثرات کو نارمل کرتے ہوئے ...

"ارے ڈیڈی! آپ اس وقت گھر میں؟ خیریت تو ...ہے؟"

"ہاں بالکل خیریت ہی ہے۔۔۔ ایسے ہی آج دل چاہا ...ذرا جلدی گھر چلا جاؤں۔" ان کا لہجہ اور تاثرات ...نارمل تھے' سو میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا ...کیا۔

"اچھا یہ بتاؤ' تمہاری ساس تلاش مہم کہاں تک ...پہنچی؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے پوچھا "...کوئی امید بھی ہے ملنے کی یا۔۔۔؟"

...انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تھا اور یہ پہلی ...بار تھا جب انہوں نے اس سارے معاملے میں ذرا ...دلچسپی لی تھی۔ مجھے تھوڑی حیرت ہوئی تھی۔

"ارے ڈیڈی! ملے گی' ضرور ملے گی۔۔۔ ہم آپ کے لیے چاند سی دلہن ڈھونڈ رہے ہیں ناں!" میں نے ڈیڈی کو تسلی دی۔

"ارے اس عمر میں چاند سی دلہن کی کیا ضرورت جب خود میرے سر پر چاند نمودار ہونے لگا ہے۔" انہوں نے جھینپ کر کہا۔

"ارے رے۔۔۔ ڈیڈی! یہ اس عمر سے کیا مطلب ہے آپ کا؟ آپ ابھی بھی بہت ینگ اور اسمارٹ لگتے ہیں۔" طیبہ فوراً بولی اور اس کا کہنا کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ مگر ڈیڈی اپنا خیال نہیں رکھتے تھے اور خیال رکھنے والی کوئی تھی نہیں' حالانکہ اگر وہ اپنی ڈریسنگ پر ذرا سا دھیان دیتے تو کم از کم اپنے بیٹوں کے بڑے بھائی ہی لگتے تھے۔

"ارے بھئی لگتا ہوں نا۔۔۔ ہوں تو نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

آج کافی عرصے بعد اماں کی طرف چکر لگا تو اماں پھر وہی قصہ لے کر بیٹھ گئیں۔ وہی میری عقل پہ ماتم۔ بغیر میری کوئی بات سنے کہے جا رہی تھیں۔

"اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارنا اسی کو کہتے ہیں چچ چچ ۔۔۔ ہائے پتا نہیں اس لڑکی کی عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے (اشارہ میری طرف تھا) ارے کبھی سنا ہے کہ کسی نے اس طرح کیا ہو' ہیں؟ (وہی سو دفعہ کا دہرایا ہوا اماں کا ان دنوں کا فیورٹ ترین جملہ) پتا نہیں یہ خناس کیسے گھسا تمہارے دماغ میں۔"

"اماں! پہلے میری بات تو سن لیں۔" اماں ایک لمحے کے لیے چپ ہوئیں تو میں نے پھر صفائی دینے کی کوشش کی۔

"ہم کوئی کلہاڑی ولہاڑی نہیں مار رہے بلکہ۔۔۔"

بس میں اتنا ہی کہہ سکی تھی' اماں پھر شروع ہو گئی تھیں۔

"اے ہٹو پرے۔۔۔ کلہاڑی نہیں مار رہی ہو نہہ! تو اور کیا کر رہی ہو؟"

اب کے میں اماں کے چپ ہونے کے ساتھ ہی بول پڑی ورنہ موقع نہ ملتا۔

"اماں دیکھیں! ڈیڈی نے اپنے سب بیٹوں کی شادی کروی ہے تو۔۔۔"

وہ بھی میری ہی اماں تھیں' پھر بول پڑیں۔

"تو؟ اس کا کیا مطلب ہوا کہ ان کی اپنی بھی شادی کروی جائے اب؟"

"اوہو! اماں خدا کے لیے۔۔۔ پہلے سن تو لیں' میں کہہ کیا رہی ہوں۔" میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور اب چھلکنے کو بے تاب تھا۔

"کوئی سننے والی بات ہو تو سنو ناں!"

"اف!" میں نے مدد طلب نگاہوں سے صباحت کی طرف دیکھا۔

"اماں پلیز! ایک دفعہ آپ باجی کی پوری بات سن لیں' پھر جو مرضی کہہ لیجیے گا۔"

صباحت کے کہنے پر اماں نے بمشکل چپ ہو کر میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں "چلو کرو بکواس" میں نے بے اختیار گہرا سانس لیا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ اماں۔۔۔" میں دیکھ رہی تھی کہ اماں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر ضبط کر گئیں۔

"کہنے کو تو ڈیڈی نے بیٹوں کی شادیاں کردی ہیں مگر اب ان کے بیٹوں کو ہر وقت یہی خیال ستاتا ہے کہ ڈیڈی اکیلے ہیں۔ کہیں بھی آنے جانے کا پروگرام بن جائے تو یہ کہہ کر کینسل کروا دیتے ہیں کہ ڈیڈی اکیلے ہوں گے۔ ڈیڈی نہ ہو گئے کوئی بچے ہو گئے۔۔۔ ڈیڈی کو ذرا سا نزلہ بھی ہو جائے تو اس کا الزام بھی ہمارے سر آتا ہے کہ ہم نے خیال نہیں رکھا' پھر پرہیزی کھانے الگ بناؤ' وقت بے وقت چائے بناؤ' ان کے کپڑوں کا خیال' ان کے روم کی صفائی۔"

"اور عمران کو تو ذرا سی بھی گرد نظر آجائے ڈیڈی کے روم میں تو اتنی انسلٹ کر دیتے ہیں کہ توبہ۔" صباحت نے اپنا دکھڑا رویا۔

"ہوں" اماں اب سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"اپنی تو کوئی زندگی ہی نہیں ہے' تینوں بیٹوں کی ہر بات ڈیڈی سے شروع ہوتی ہے اور ڈیڈی پر ہی ختم۔"

"تو اس کا حل یہ نکالا ہے تم لوگوں نے کہ ان کی شادی کروی جائے؟"

"جی!" میں نے فوراً سر ہلایا کہ شکر ہے اماں کے طعنے تو بند ہوئے مگر۔

"ہوں۔۔۔ یعنی یک نہ شد دو شد۔۔۔ ایک کے بجائے دو' دو کو سنبھالنا پڑ جائے۔۔۔ تف ہے تم پر فرحت!"

اماں کو میرا آئیڈیا بالکل بھی سمجھ میں نہیں آیا تھا لہٰذا میرا منہ لٹک گیا اور مجھے یوں دیکھ کر صباحت بھی منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

"ناں! مجھے یہ بتاؤ۔" کچھ دیر کے توقف کے بعد اماں کو کچھ یاد آیا جیسے۔۔۔ "اگر آنے والی سچ مچ والی ساس بن گئی تو؟ ہر چیز پر قبضہ کر لیا تو' سر پکڑ کر روؤ گی۔"

اور اماں کی اس بات پہ مجھے یاد آیا کہ پلان کا ایک اہم پوائنٹ تو میں نے بتایا ہی نہیں اماں کو۔

"اوہو اماں! ایسا ویسا کچھ نہیں ہو گا۔ دراصل اسی وجہ سے تو اتنی دیر ہو رہی ہے کہ ہمیں ہماری مرضی کی ساس نہیں مل رہی۔"

"ہیں۔۔۔ مرضی کی ساس؟ کوئی آرڈر پر تیار کروائی ہے؟" اماں نے حیرت سے باری باری ہم دونوں کی شکلیں دیکھیں۔

"بالکل' ہماری مرضی کی خوبیوں کی مالک۔" پھر میں نے اماں کو اپنی متوقع ساس کی ساری خوبیاں گنوائیں تو اماں کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

"تو یہ بات ہے۔" اب وہ خوش تھیں۔ "اگر ایسی ہی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں پھوٹی۔"

اماں نے جب یہ جملہ کہا تو میرا دل چاہا کہ اپنا سر دیوار سے دے ماروں۔

✡ ✡ ✡

آج پھر ہم لوگ خالہ کے ساتھ ایک "ساس" دیکھنے آئی تھیں۔

گھر تو تقریباً ہماری مرضی کا تھا۔ جس کے در و دیوار سے غربت ٹپک اور سلیقہ چھلک رہا تھا۔ "لڑکی" کی چھ بہنیں تھیں جن میں وہ سب سے بڑی تھی اور وہی روایتی کہانی تھی کہ بڑی بہن نے چھوٹی بہنوں کے لیے اپنی خوشیوں کی قربانی دی تھی۔ باپ تو کافی عرصہ پہلے فوت ہو گیا تھا اور ماں بھی کچھ عرصہ ہوا وفات پا چکی تھی۔ سو اب لڑکی کے آگے پیچھے واقعی کوئی نہیں تھا۔ اس وقت بیٹھک نما کمرے میں ہم چاروں کے ساتھ لڑکی کی دو بہنیں اور ایک رشتے کی خالہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ تینوں کی ہی شکلیں واجبی سی تھیں۔ وہ تینوں ہمارے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ لڑکی کی خالہ تو لڑکی کی قربانیوں کی کہانیاں سنا سنا کر تھک ہی نہیں رہی تھیں۔

اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ چلو دیر سے ہی سہی' کم از کم ہمیں اپنی مرضی کی ساس ملنے کی امید تو ہوئی تھی۔

میں نے سو کا نوٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ آج ہی بات پکی کر کے جاؤں گی۔

"ارے بہن! لڑکی کو تو بلوائیں!" خالہ نے لڑکی کی خالہ سے کہا تو وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

"بس بہن! چھوٹی بہنوں کے لیے اس نے خود کو قربان کر دیا۔ باقی سب کی تو بات طے ہے بلکہ تین کی تو شادیاں بھی کر چکی ہے اب اگر اللہ نے چاہا تو اس کا بھی مناسب کوئی جوڑ مل ہی جائے گا۔ پہلے تو پھر بھی ماں کا آسرا تھا' اب تو وہ بھی نہیں رہا اور اب اکیلی لڑکیاں کیسے رہ سکتی ہیں؟" پھر انہوں نے دروازے کی طرف رخ کیا۔

"ارے ثمینہ۔۔۔ بیٹا! اب آ بھی جاؤ۔" دروازے کا پردہ ہٹا اور وہ اندر داخل ہوئی اور خالہ سمیت ہم سب کے منہ حقیقتاً کھل گئے۔

"تو۔۔۔" طیبہ کے منہ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ پتا ہی نہ چلا کہ میں نے جو بسکٹ چائے میں ڈبویا تھا مکمل طور پر چائے میں غرق ہو چکا تھا۔ صباحت کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

"ارے' یہ سب سے چھوٹی ہے تہمینہ!" لڑکی کی خالہ نے ہماری شکلیں دیکھ کر ہماری غلط فہمی دور کی۔

"اس کی بات بھی طے ہے۔" انہوں نے ہماری تسلی کروائی۔ وہ لڑکی سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئی۔ کم بخت اتنی حسین تھی کہ میری نظریں اس پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ بہرحال ہماری سانسیں بحال ہوئی تھیں کچھ۔ "توبہ! یہ لڑکی تو فتنہ تھی چلتا پھرتا۔" میری نظریں نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار اس کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اتنے میں ایک دفعہ پھر پردہ ہٹا اور ایک اور گریس فل سی لڑکی اندر داخل ہوئی جو پہلی والی ہی کی طرح حسین تھی مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"یہ ہے ثمینہ!" لڑکی کی خالہ کی اس صدا نے مجھے اس لڑکی کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ حیرت کی زیادتی کی وجہ سے ہم تینوں کی آنکھیں پھٹنے کے قریب تھیں۔

"یہ' یہ ثمینہ تھی۔۔۔؟ اف!" میں نے جھرجھری لی۔

یہ میری ساس کہاں سے لگتی ہے؟ توبہ توبہ! الٹا مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں خود اس وقت اس کی ساس لگ رہی ہوں۔ بے چاری غربت کی چکی میں پس رہی تھی تو اتنی حسین تھی اور اگر اس کی شادی ڈیڈی سے ہو جاتی تو۔" میں نے اپنا سر جھٹکا اور مٹھی میں دبائے ہوئے پیسے دوبارہ خاموشی سے پرس میں ڈال لیے اور اس کے بعد ہم وہاں تھوڑی ہی دیر رکے تھے۔

البتہ واپسی پر ہم تینوں نے خالہ کی حسب توفیق کلاس لی۔

"حد ہے خالہ! میں نے پہلی بات ہی یہی کہی تھی آپ سے۔۔۔ مگر آپ توبہ!"

"ارے مجھے کیا پتا تھا' میں نے اس کی درمیان والی چار بہنوں کو دیکھ رکھا تھا' مجھے کیا پتا تھا کہ یہ دونوں بڑی اور چھوٹی کس پر پڑی ہیں۔" خالہ کو ہم نے گیٹ پر ہی فارغ کر دیا تھا۔ بعد میں بھی ہم تینوں یہی ڈسکشن کرتے رہے تھے۔

"توبہ توبہ۔۔۔ خالہ کا دماغ بھی نا بالکل کام نہیں کرتا۔

اسے دیکھ کر تو خود مجھے اس پر سے نظر ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔ اگر ڈیڈی کی دلہن بن کے آجاتی تو ہم سب کی تو چھٹی ہو جانی تھی۔"

"اور کیا! سادگی میں اتنا حسن تھا تو....."

☼ ☼ ☼

اس دن کافی دنوں بعد ہم سب مل کر بیٹھے تھے۔ طیبہ چائے بنا کر لائی تھی' جس سے اس وقت ہم سب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ البتہ ڈیڈی اس وقت گھر پر نہیں تھے' اچانک ہی عاصم بولے۔

"ہاں بھئی! کیا بنا تم لوگوں کی مہم کا؟ کوئی سرگرمی نظر نہیں آ رہی کافی دنوں سے۔ بس چند دنوں کا شوق تھا؟"

"شوق چند دنوں کا تو نہیں تھا' مگر ہمیں کوئی پسند ہی نہیں آئی ـــ اور کوئی ایسی ویسی عورت ہم لوگ لانا نہیں چاہ رہی تھیں' جو گھر کا ماحول ہی خراب کر دے۔ سو فی الحال یہ چیپٹر ہی کلوز کر دیا ہے۔" میں نے تفصیل سے جواب دیا۔

"اور ویسے بھی اب ڈیڈی کافی سوشل ہو گئے ہیں۔ گھر میں کم ہی رہتے ہیں۔ خود پر توجہ دیتے ہیں' اس لیے میرا نہیں خیال کہ اب انہیں شادی کی ضرورت ہے۔" طیبہ نے کہا تو میں نے سوچا کہ واقعی ڈیڈی اب کچھ بدل رہے تھے اور یہ صرف میں نے ہی محسوس نہیں کیا تھا۔

"ہوں! چلو تم لوگوں نے کافی سیر سپاٹے کر لیے اس بہانے۔" عبید نے طیبہ کو چھیڑا۔

"ہاں! اور لڑکی دیکھنے کے بہانے خوب خاطر مدارات بھی کروائیں۔" عمران نے لقمہ دیا۔

"ویسے فرحت! اگر واقعی تمہیں کوئی پسند آجاتی تو تم ڈیڈی کی شادی کروا دیتیں؟" عاصم نے سنجیدگی سے پوچھا تو ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا گئی مگر پھر فوراً" ہی خود کو سنبھال لیا۔

"اور نہیں تو کیا؟ اتنے مہینوں کی خواری آپ کو مذاق لگ رہی تھی؟" میں نے اپنے لہجے میں خفگی کا تاثر پیدا کیا۔

"ہوں!" عاصم کچھ سوچنے لگے۔

"ہائے! پھر اس عمر میں ہماری بھی نئی ممی آتیں۔" عمران نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔

"ویسے بھابھی! تلاش بند نہ کیجیے گا۔ کیا پتا آپ ہماری نئی ممی مل ہی جائیں۔" اور پھر اسی طرح کی باتوں میں بات آئی گئی ہو گئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

☼ ☼ ☼

"آج چھٹی کے دن آپ کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے عاصم سے پوچھا جو اپنی تیاری کو فائنل ٹچ دے رہے تھے۔

"بس ایک ضروری کام آن پڑا ہے' شام تک آجاؤں گا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے تو مجھے ان کی مسکراہٹ بڑی پراسرار سی لگی۔

کام وغیرہ نمٹا کر ہم تینوں لاؤنج میں بیٹھیں تو پتا چلا کہ عمران اور عبید بھی کسی ضروری کام کے سلسلے میں گھر سے باہر ہیں اور ڈیڈی تو اب اکثر ہی جاتے رہتے تھے۔

"میری توبہ! اگر اب ڈیڈی کی شادی کا ذکر بھی کروں۔ بس کافی ہو گیا' اب یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہی رہے تو اچھا ہے۔ اگر سچ مچ کوئی ایسی ویسی آگئی تو....." میں نے جھرجھری لی۔

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ خوامخواہ کوئی نئی بلا نہ سر پڑ جائے۔" طیبہ نے کہا۔

"ویسے کتنا عجیب زمانہ آگیا ہے ناں۔ بیٹوں کی مائیں چاند لینے نکلتی ہیں تو انہیں چاند دکھائی ہی نہیں دیتے اور جنہیں چاند نہیں چاہیے ہوتے' انہیں ہر سمت میں چاند ہی نظر آتے ہیں۔ شاید اپنی اپنی نظر کی بات ہے۔" میں نے فلسفہ جھاڑا مگر واقعی مجھے ثمینہ کی صورت نہیں بھول رہی تھی' جو گدڑی کا لعل تھی۔

"بھابھی! شاید عبداللہ رو رہا ہے۔" طیبہ نے کہا تو میں فوراً" اپنے کمرے کی طرف بھاگی' جہاں میں عبداللہ کو سوتا چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ واقعی حلق پھاڑ کر رو رہا تھا۔ میں نے فوراً" اسے اٹھا کر تھپکنا شروع کیا تو دوبارہ سو گیا۔

میں احتیاط سے اسے لٹا کر باہر آگئی۔ باہر کا تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔

وہ چاروں باپ بیٹے واپس آ چکے تھے اور اکیلے نہیں ان کے ساتھ ایک اور وجود بھی تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کا گھونگھٹ نکالے ہوئے یقیناً".....

"آئیے فرحت بیگم!" عاصم نے کہا تو مجھے لگا جیسے میں نیند سے جاگی ہوں۔

"ان سے ملیے! یہ ہیں ہمارے ڈیڈی کی دلہن۔" عاصم نے کہا۔

"اور ہماری نئی ممی۔" عمران چہکا۔

"کہو' کیسا لگا سرپرائز!" میں کچھ بولنے کے قابل ہوتی تو بولتی ناں۔

"میں نے سوچا' اتنی معصوم سی خواہش ہے ہماری بیوی کی اور اتنی اچھی اور پرخلوص بھی' سو میں نے سوچا کیوں نہ اس کو پورا کیا جائے۔ لہٰذا میں نے رشتے کروانے والی خالہ سے رابطہ کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب طے ہو گیا۔ نکاح سادگی سے ہوا ہے' البتہ ولیمہ دھوم دھام سے ہو گا۔ آخر سب کو پتا تو چلے کہ ہمارے ڈیڈی کی دلہن آئی ہیں۔"

"اور پتا ہے بھابھی! نئی ممی میں ساری کوالٹیز ہیں جو آپ چاہتی تھیں۔" عمران کے کہنے پر میرے دماغ کو جیسے جھٹکا سا لگا۔

"کک..... کیا؟" بمشکل میرے منہ سے نکل پایا۔

"آپ کو معلوم ہے' ممی نے ایم بی اے کیا ہوا ہے۔" اور مجھے میرے ہی الفاظ کی بازگشت سنائی دی۔

(ممی تعلیم یافتہ ہوں) (جاہل تو بالکل بھی نہ ہو)

"اور اب وہ ہمارے ساتھ ہی آفس جایا کریں گی۔"

(کسی بھی قسم کی ملازمت نہ کرتی ہو)

ہمارے ساتھ ساتھ طیبہ اور صباحت بھی بت بنی کھڑی تھیں۔

"اور ڈیڈی! وہ بات بتا دوں؟" عبید نے شرارت سے کہا۔

"نالائقو! کچھ تو لحاظ کر لو۔" ڈیڈی پہلی دفعہ بولے تھے۔

"نہیں نہیں میں بتاتا ہوں۔ ممی ڈیڈی کی یونیورسٹی فیلو تھیں اور....." عمران نے بات ادھوری چھوڑی۔

"اوہوں۔" ڈیڈی نے اسے گھورا تھا۔

"ڈیڈی کا فرسٹ لو بھی۔" عمران نہ بھی بتاتا تو ڈیڈی کے چہرے سے ہی پتا چل رہا تھا۔ چلو جی یعنی ڈیڈی ہی کی عمر کی تھی۔ اماں کی بات مجھے یاد آگئی کہ نہ شد دو شد۔

"ممی! اب تو گھونگھٹ اٹھالیں۔ اپنی بہوؤں سے تعارف حاصل کریں۔" عاصم نے کہا۔ "ویسے ڈیڈی! آپ کا کپل بڑا پرفیکٹ ہے۔"

اتنے میں ممی صاحبہ نے گھونگھٹ اٹھالیا اور مجھے لگا کہ زمین اور آسمان گھوم رہے ہیں۔ میں نے قریبی دیوار کا سہارا لیا۔

"ثمینہ!" یہ تو کہیں سے بھی ہماری ساس اور ڈیڈی کی عمر کی نہ لگتی تھی' مگر اب تو جو ہونا تھا' ہو چکا۔

اماں سچ ہی کہتی تھیں' میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ہی پاؤں پہ کلہاڑی ماری تھی۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی راج دھانی کسی اور کو سونپ دی تھی۔ طیبہ اور صباحت کو تو زیادہ فرق نہیں پڑنے والا تھا کیونکہ ان کی حیثیت پہلے ہی محکوموں سی تھی' البتہ میں..... میری حیثیت اب یقیناً" بدل چکی تھی۔ حکمران سے محکوم ـــ اور یہ سب میری عاقبت نااندیشی کا ہی نتیجہ تھی۔

مکمل ناول

حویلی کی گہماگہمی اپنے عروج پر تھی۔ والان میں بچھی دریوں پر لڑکیاں' بالیاں جمع ہو کر زور و شور سے ڈھولک بجارہی تھیں۔ وقفہ وقفہ سے ان کی ہنسی کی آواز گونجتی تالیوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب سا سماں باندھ دیتی۔
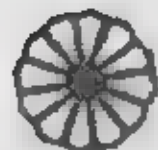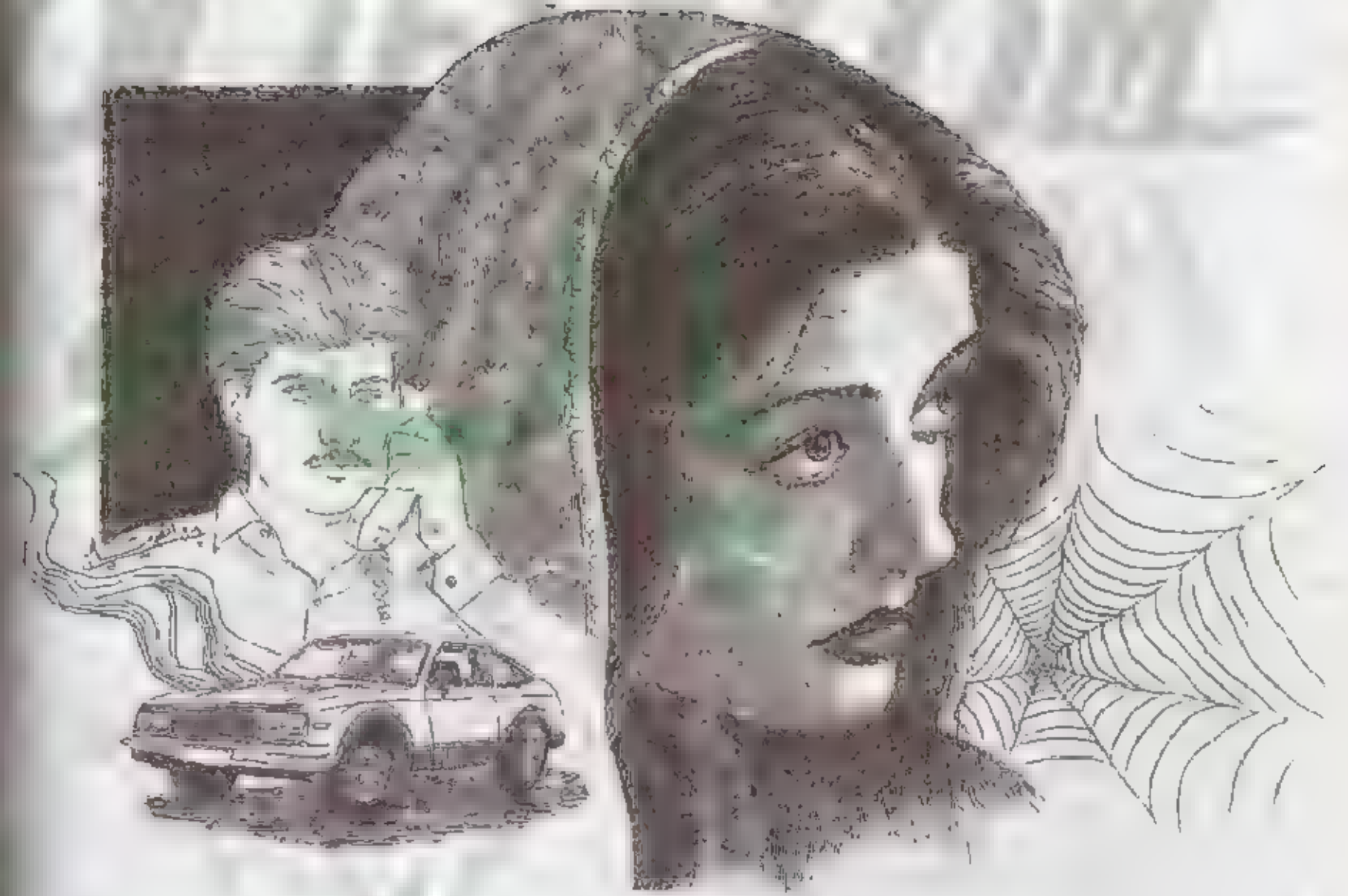
بڑی اماں اپنے جھولے میں بیٹھی یہ سب بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی بڑی نند ثریا بیگم سے بھی محو گفتگو تھیں' جبکہ پھوپھو الماس اپنی ہم عمر خواتین کے ساتھ والان کے درمیان میں بچھی دری پر بیٹھی بری کے جوڑے ٹانکنے اور سنبھالنے میں دل و جان سے مگن تھیں' آمنہ اور چچی زہرہ کچن میں پکتے مختلف پکوانوں کی نگرانی کرنے میں مصروف تھیں۔ میٹھے چاول اور پلا مچھلی کی سوندھی خوشبو پورے والان میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے میں کبھی کبھی مردانے سے آنے والے تیز گانوں اور سیٹیوں کی آواز سب کی توجہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی اپنی طرف

مبذول ضرور کروالیتی‘ لیکن جلد ہی خواتین ان کی آوازوں کو نظر انداز کرکے اپنی اپنی خوش گپیوں میں مشغول ہوجاتیں۔

حویلی کی یہ رونق ابراہیم گمسی کے بڑے بیٹے اور جانشین علی شیر کی بدولت تھی جس کی آج رسم مہندی تھی۔ علی شیر نہ صرف ابراہیم گمسی کا بے حد لاڈلا بیٹا تھا‘ بلکہ اس حویلی میں منعقد ہونے والی یہ پہلی شادی کی تقریب تھی۔ اس لیے خاندان کا ہر فرد بے حد خوش تھا اور سب ہی اپنی اس خوشی کا اظہار بڑھ چڑھ کر کررہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ تقریباً ہفتہ بھر سے ہی دور پار کے تمام رشتہ دار حویلی میں جمع تھے اور خوب رونق لگی ہوئی تھی‘ لیکن —— جانے کیوں خوش نما کا دھیان مردانے سے آنے والی ناچ گانے کی آوازوں میں ہی لگا ہوا تھا‘ اس سے رہا نہ گیا اور اس نے سورٹھ کا بازو کھینچ کر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

”سورٹھ۔!“ خوشی نے دھیمے سے پکارا‘ گانا گاتی سورٹھ نے رک کر اس کی جانب دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ بات کرتے ہوئے۔ سورٹھ نے تیزی سے تالیاں بجانے کا عمل بھی جاری رکھا۔

”آؤ‘ تھوڑی دیر کے لیے اوپر چھت پر چلیں۔“

”کیوں؟“ سورٹھ کے تالیاں بجاتے ہاتھ پل بھر کو تھمے اور اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

”دیکھ کر آتے ہیں‘ مردانے میں کیا ہورہا ہے۔“

”تو اس میں دیکھنے کے لیے چھت پر جانے کی کیا ضرورت ہے‘ سب کو پتا ہے کہ وہاں ناچنے والیاں آئی ہوئی ہیں اور ویسے بھی چھت سے دوسری طرف نہیں دیکھا جاسکتا۔“ سورٹھ نے بے پروائی سے جواب دے کر گانے میں شامل ہونے کی کوشش کی۔

”تمہیں نہیں آنا تو بے شک مت آؤ‘ لیکن میں تو چھت پر جارہی ہوں۔“ خوشی کہہ کر باہر کی جانب چل دی۔ اسے یقین تھا کہ سورٹھ اس کے پیچھے ضرور آئے گی اور ایسا ہی ہوا‘ ابھی وہ دالان کے دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ سورٹھ آگئی۔

”رک جاؤ خوشی! میں بھی چل رہی ہوں۔“ وہ خفگی سے کہتے ہوئے چل دی۔

”لیکن ایک بات بتادوں‘ تمہارا چھت پر جانا بالکل بے کار ہے‘ کیونکہ چھت کی اونچی اونچی دیواروں سے حویلی کے اس پار دیکھنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔“ خوشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف کندھے اچکاتے ہوئے آگے کی جانب بڑھ گئی‘ سیڑھیوں پر مکمل تاریکی کا راج تھا۔ دونوں نہایت خاموشی سے سیڑھیاں طے کرکے اوپر کھلی چھت پر آگئیں‘ جہاں موجود بڑی بڑی دیوہیکل دیواروں نے خوشی کو یک دم ہی مایوسی سے دوچار کردیا۔ اس سے قبل اتنے سالوں میں اس نے کبھی ان دیواروں کی بلندی کو جانچا ہی نہ تھا۔ آج غور کیا تو اندازہ ہوا کہ حقیقت میں اس بلندی سے اس پار دیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔

”خوامخواہ اتنی خواری کی بھلا ان دیواروں سے اس پار بھی کچھ دیکھا جاسکتا ہے۔ چلو آؤ واپس چلیں۔“

سورٹھ سیڑھیوں کی جانب واپس چل دی‘ کھلی چھت پر ناچ گانے کی آواز کے ساتھ ساتھ گھنگھروؤں کی جھنکار اور تالیوں کا شور بھی کافی تیز سنائی دے رہے تھے‘ ایسے میں جب کوئی من چلا فائرنگ شروع کرتا تو شور کی آواز مزید بڑھ جاتی‘ خوشی کچھ دیر تو کھڑی دیکھتی رہی‘ لیکن جب دیکھا کہ کامیابی مشکل ہے تو نیچے جاتی سورٹھ کے پیچھے بھاگی اور آواز دی۔

”رک جاؤ‘ میں بھی آرہی ہوں۔“ ابھی وہ دو ہی سیڑھیاں اتری ہوں گی کہ اچانک تیز گانوں کی آواز [illegible] ہوگئی اور ساتھ ہی فائرنگ کی تیز آواز سے پوری چھت دہل گئی۔

”یہ کیا ہوا؟“ یک دم ہی خوشی نے گھبرا کر سورٹھ کا ہاتھ تھام لیا۔

”کچھ نہیں ہوا‘ کسی ناچنے والی کے پیچھے کوئی [illegible] ہوگیا ہوگا۔ یہ تو حویلی والوں کا عام معمول ہے‘ چھوڑو‘ آؤ نیچے چلیں۔“ سورٹھ اس کا ہاتھ تھامے [illegible] تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی‘ لیکن جیسے ہی وہ دونوں بڑا آنگن عبور کرکے دالان کے قریب پہنچیں اندر سے آنے والی تیز آوازیں سن کر وہیں تھم گئیں۔

☆ ☆ ☆

”بند کرو‘ سب شور شرابا۔“ اچانک ہی ابراہیم گمسی‘ ان کے بھائی یاور گمسی اور علی شیر کے ساتھ چند اور مرد جن میں خوشی کا ماموں اور بڑے تایا کا بیٹا علی نامی بھی شامل تھے۔ اندر داخل ہوئے‘ ان کی غصیلی آواز سنتے ہی لڑکیوں نے گھبرا کر ڈھولک کی تھاپ روک دی اور یک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اندر جاؤ تم سب۔“ خوشی کے ماموں اللہ بخش نے لڑکیوں کی جانب دیکھ کر حکم دیا اور صرف ایک لمحہ لگا‘ سارا دالان لڑکیوں سے خالی ہوگیا‘ اب وہاں صرف چند خواتین کے سوا کوئی نہ تھا۔ لگتا ہی نہ تھا کہ چند لمحے قبل یہاں زندگی جاگ رہی تھی۔ پورے دالان پر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔

”ابراہیم پتر! کیا بات ہے‘ خیریت تو ہے؟“ اماں بی نے انجانے اندیشوں میں گھرتے ہوئے سوال کیا‘ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ایسے وقت میں جب تمام عورتیں حویلی میں اکٹھی ہوں‘ مرد کبھی بھی بنا اطلاع کیے اس طرف نہ آتے تھے اور آج ایک ساتھ اتنے مردوں کا زنان خانہ میں داخلہ کسی انہونی کی نشان دہی کررہا تھا۔

”خوشی کہاں ہے؟“ ابراہیم گمسی نے ایک نظر اپنی [illegible] پر ڈالی اور پھر دالان کے داخلی دروازے کے قریب [illegible] آمنہ سے سوال کیا۔ قبرستان کے اس سناٹے میں ابھرنے والی ابراہیم کی آواز نے آمنہ کے دل کو اندر تک چیر کر رکھ دیا۔

”الٰہی خیر کرنا۔ میری معصوم بچی کی حفاظت کرنا۔“ [illegible] نے لرزتے دل سے بے ساختہ دعا کی‘ کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ خوشی سے کوئی خطا سرزد ہوگئی ہے اور [illegible] سنتے ہی دروازے کے باہر کھڑی خوشی اور سورٹھ [illegible] ہوگئیں۔

”کیوں خیر تو ہے ابراہیم؟ کیا‘ کیا ہے خوشی نے‘ تم لوگ بتاتے کیوں نہیں ہو؟“

اماں بی نے ایک نظر گم صم کھڑی آمنہ پر ڈالی اور اپنے بھاری بھر کم وجود کو سنبھال کر بمشکل جھولے سے اٹھ کھڑی ہونے کی کوشش کی‘ قریب کھڑی وسائی نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں اٹھنے میں مدد دینا چاہی کہ اچانک ہی علی شیر کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ غصہ سے دھاڑا۔

”تو یہاں کیوں کھڑی ہے؟ سنا نہیں تھا کہ سب لڑکیاں اندر جائیں۔“

وسائی جو شاید بڑی اماں کو پانی دینے کے لیے آئی تھی‘ علی شیر کی گرج دار آواز سنتے ہی کانپ اٹھی اور اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گر گیا۔ پیتل کے گلاس کے فرش سے ٹکرانے کی آواز آمنہ کے خوابیدہ اعصاب پر ہتھوڑا بن کر برسی۔ وسائی خوف زدہ ہو کر اندر کی جانب بھاگی‘ بڑی اماں کانپتے جسم کے ساتھ اپنے بیٹے ابراہیم گمسی کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

”بتاتا کیوں نہیں ابراہیم! کیا‘ کیا ہے خوشی نے؟“

”اماں سائیں! خوشی کہاں ہے؟ اسے یہاں بلاؤ۔“ ابراہیم کے چہرے پر پتھروں جیسی سختی تھی۔

"پتا نہیں ابھی تو یہیں تھی۔ اندر ہی ہوگی۔" کسی انجانے اندیشے سے کانپتے دل کے ساتھ بمشکل آمنہ کے منہ سے نکلا اور اس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔

اور باہر کھڑی خوشی کو یقین ہو گیا کہ روز حشر آچکا ہے اور اب بنا حساب کتاب دیے اس کی گلوخلاصی ناممکن ہے' اس نے ایک نظر سورٹھ پر ڈالی جو دیوار سے ہی لگی تھر تھر کانپ رہی تھی اور آہستہ آہستہ چلتی دالان کے دروازے سے اندر داخل ہوئی' لیکن اپنے سامنے کھڑے افراد کے تیور دیکھ کر اس کے قدموں نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

"وہ رہی خوشی؟" اس پر نظر پڑتے ہی پھوپھی الماس تیزی سے آگے بڑھیں اور اسے بازو سے تھام کر اپنے بھائی کے سامنے لا کھڑا کیا' ابراہیم مگسی کا کانپتا وجود ان کے غیض و غضب کو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے لب بھینچے اسے تکتے رہے۔

"جنید عباسی کو جانتی ہو؟"

علی شیر نے خوشی کے جھکے ہوئے سر پر ایک قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا' جبکہ اس سوال نے کمرے میں موجود تمام خواتین کے جسموں سے گویا جان ہی نکال دی' خوشی کے لیے اب کسی بھی بات سے انکار کرنا ناممکن تھا۔

"ہاں!" اس کے کپکپاتے لبوں سے ہاں کا لفظ سنتے ہی علی شیر نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا' خوشی منہ کے بل فرش پر جا گری۔ اس کے ہونٹ کے کنارے سے خون کی باریک لکیر نکلی' خون کا ذائقہ اس کا حلق کو تر کر گیا۔

"دیکھا بابا سائیں! اس بے غیرت کو' یہ صلہ دیا ہے اس نے ہمارے لاڈ پیار کا' آج پوری برادری کے سامنے ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

علی شیر نے اسے بالوں سے پکڑ کر زمین سے اٹھایا اور سیدھا کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

اب کسی عورت میں اتنی جرات نہ تھی کہ آگے بڑھ کر خوشی کو اس ظالم کے قہر سے بچانے کی کوشش کرتیں۔ سب کی سب اپنی جگہ پتھر کے مجسمے بن کر رہ گئیں۔

"بس بابا سائیں! اب کسی سوال و جواب کی ضرورت نہیں ہے' اسے مار کر اسی حویلی میں گاڑ دیں تاکہ سب کو عبرت حاصل ہو کہ بے غیرتی اور بے شرمی کا انجام کیا ہوتا ہے۔" کافی دیر سے خاموش تماشائی کی مانند کھڑا فلک شیر آگے بڑھا اور اپنے باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے نفرت بھری نگاہ بہن پر ڈالی' جبکہ علی شیر کے ہاتھوں کی گرفت اس کے بالوں پر مزید سخت ہو گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے' اس کا دوپٹہ زمین پر گر گیا۔ وہ آج زندگی میں پہلی بار اپنے خاندان کے اتنے مردوں کے سامنے ننگے سر کھڑی تھی' جس کا احساس وہاں کسی کو نہ تھا۔

"خدا کے لیے کچھ ہمیں بھی تو پتا لگے کہ ہوا کیا ہے؟"

بالآخر بڑی اماں اپنی برداشت کھو بیٹھیں اور آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کو جھنجوڑ ڈالا۔

"یہ دیکھیں یہ کیا ہے؟" ابراہیم نے جواب دینے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پکڑا کاغذ بڑی اماں کے سامنے کر دیا۔

"یہ نکاح نامہ ہے آپ کی اس لاڈلی پوتی کا۔"

یا ور مگسی کے الفاظ تھے یا کوئی بم' آمنہ کو ایسا محسوس ہوا' جیسے زلزلہ آگیا ہو' پورے حویلی کے در و دیوار لفظ نکاح نامہ سے لرز اٹھے۔

"ہائے میرے اللہ سائیں!" بڑی اماں دہل اٹھیں "یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے رکھے زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان کی ٹانگوں سے جان نکل گئی' ان کا پورا جسم کپکپا اٹھا۔

"سچ کہہ رہا ہوں' ابھی باہر جنید عباسی اپنے باپ بھائیوں کے ساتھ آیا تھا' ان کا مطالبہ تھا کہ خوشی کو ان کے حوالے کیا جائے' پولیس اور مجسٹریٹ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ علی شیر کے ساتھ ساتھ خوشی کی بھی رخصتی چاہتے تھے۔"

ابراہیم نے پھنکارتی ہوئی آواز میں ساری بات کی وضاحت کی۔

"وہ تو الیس پی ساتھ تھا' ورنہ ایک کو بھی زندہ واپس نہ جانے دیتا۔"

علی شیر نے غصہ سے دھاڑتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی خوشی کے بالوں کو جھٹکا دے کر اس کی گردن کمر تک لگا دی' تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

"سجاول۔۔۔ سجاول!" ابراہیم نے دھاڑتے ہوئے پکارا اور اگلے ہی پل باہر کھڑا سجاول بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"حاضر سائیں۔" وہ نظریں جھکائے ابراہیم مگسی کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"یہ بی بی کو لے جا کر پچھلی کوٹھڑی میں ڈالو' پہلے ذرا ہم اس جنید کو دیکھ لیں۔ پولیس لے کر ہمارے احاطے میں آنے کی جرات کی ہے آج اس نے۔ پھر اس کو دیکھیں گے۔" یہ کہہ کر ابراہیم باہر نکل گئے۔

"بھاگی۔۔۔ بھاگی!" علی شیر دھاڑا اور کانپتی ہوئی بھاگی اندر داخل ہوئی۔

"سجاول کے ساتھ جاؤ اور اسے لے کر جا کر کوٹھڑی میں چھوڑ آؤ۔" اس نے خوشی کو دھکا دیتے ہوئے بھاگی کو حکم دیا۔ بھاگی نے تیزی سے آگے بڑھ کر خوشی کو تھام لیا اور وہ تقریباً" گھسٹتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل مفلوج ہو چلی تھی' جبکہ اس کے پیچھے رہ جانے والوں کو یقین ہو چلا تھا کہ آج کے بعد وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکیں گے' کیونکہ یہی اس حویلی کی روایت رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کال کوٹھڑی میں جانے اسے کتنے دن بیت چکے تھے۔ اب تو وہ دنوں کا حساب کتاب بھی بھول گئی تھی۔ بھاگی تینوں ٹائم کھانے کی ٹرے اندر سرکا جاتی جو شروع شروع میں تو یوں ہی رکھی رہتی' کیونکہ اس کا دل ہی نہ چاہتا تھا کچھ کھانے کو' لیکن آہستہ آہستہ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا اور تھوڑا بہت کھانے لگی۔ اسے حیرت تھی کہ وہ اب تک زندہ کیسے ہے؟ کیونکہ اپنے خاندان کی روایتوں سے وہ بخوبی واقف تھی' بہرحال اتنا تو وہ جان چکی تھی کہ اس کی موجودہ زندگی جنید عباسی کی مرہون منت ہے' ضرور اس کی پولیس رپورٹ کی بنا پر حویلی والے اسے زندہ رکھنے پر مجبور تھے' کیونکہ وہ خوشی پر یہ واضح کر چکا تھا کہ وہ اس کی رخصتی کے لیے پہلے کورٹ میں کیس کرے گا' پھر حویلی آئے گا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے مناسب حالات کے انتظار میں زندہ رکھا گیا تھا۔ ورنہ اب تک تو اسے مار کر حویلی کے کسی اندھے کنویں میں ڈال دیا جاتا اور باہر کسی کو پتا بھی نہ چلتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اب اسے انتظار تھا آنے والے وقت کا' کیونکہ وہ جان نہ پا رہی تھی کہ وقت کا فیصلہ کیا ہوگا' لیکن اتنا ضرور تھا کہ ہر آنے والا دن اس کی مایوسی میں اضافہ کا سبب بن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جلدی جلدی ناشتا کر لو' بالاج آرہا ہے' تمہیں کالج چھوڑ دے گا۔"

امی نے کچن کی جانب جاتے ہوئے پلوشہ کو ہدایت کی' جبکہ بالاج کے ساتھ کالج جانے کا سنتے ہی پلوشہ کا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا۔

"اُفوہ امی! آپ سے کس نے کہا تھا کہ اس سے کہیں کہ مجھے کالج چھوڑ آئے۔ میں خود ہی پبلک ٹرانسپورٹ سے چلی جاتی۔ آخر دنیا کی لڑکیاں جاتی ہیں۔ اب آدھا گھنٹہ اس کا سڑا ہوا منہ دیکھوں۔" اس نے کوفت زدہ ہو کر جواب دیا' لیکن اپنی ماں کے خوف سے آخری جملہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا تھا۔

"بری بات ہے پلوشہ' لوہ تم سے بڑا ہے۔"

امی نے کچن کے دروازے پر رک کر تنبیہی نگاہوں سے اسے گھورا۔

"اب بڑے ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ بندہ ہر وقت انگارے ہی چباتا رہے۔"

"چلو جلدی باہر آؤ میں گاڑی نکال رہا ہوں۔"

اس سے قبل کہ وہ مزید تبصرہ کرتی' لاؤنج کے دروازے پر بالاج کا سنجیدہ چہرہ نظر آیا' جسے دیکھتے ہی پلوشہ کا سانس حلق میں اٹک گیا۔ اس نے جلدی جلدی سلائس حلق سے اتارا اور چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر اپنا بیگ اٹھا کر باہر کی جانب دوڑ لگادی' بالاج گاڑی باہر نکال چکا تھا۔ ٹراؤزر کے ساتھ موجود جوگرز اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ کچھ دیر قبل ہی واک سے واپس آیا ہے اور یقیناً" امی جو پلوشہ کی وین کے نہ آنے کے سبب پریشان تھیں۔ انہیں بالاج کی شکل میں اپنی پریشانی کا حل نظر آگیا۔ سارے راستے وہ خاموشی سے باہر دیکھتی رہی اور بالاج بھی بنا کچھ کہے ڈرائیو کرتا رہا' یہاں تک کہ گاڑی اس کے کالج کی بلند و بالا عمارت کے سامنے جارک گئی۔

"واپس وین میں آؤ گی یا میں لینے آؤں؟" اس کے دروازہ کھول کر باہر نکلنے سے قبل ہی بالاج نے پوچھ لیا' اس نے ایک نظر بالاج کی جانب دیکھا جو اسی کو دیکھ رہا تھا' "میں کیا پوچھ رہا ہوں' واپس کیسے آؤ گی؟"

"وین میں۔" اس نے باہر نکل کر جواب دیا۔

"ایک منٹ' بات سنو میری۔" اسے پیچھے سے بالاج کی آواز سنائی دی۔

"اللہ خیر کرے۔ اب جانے کیا ہوگیا؟" وہ دل ہی دل میں گھبرائی ہوئی واپس پلٹی۔

"یہ تم کالج چادر اوڑھ کر کیوں نہیں آتیں؟" جس بات کا خدشہ تھا وہ سامنے آہی گئی۔ اب اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

"میں نے چچی جان سے بھی کہا تھا اور تم سے بھی کئی بار کہا ہے' لیکن جانے کیوں تم پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ بہرحال اگر اب میں نے تمہیں بنا چادر کالج آتے دیکھا تو یاد رکھنا' وہ دن تمہارا کالج کا آخری دن ہوگا۔"

اس نے غصہ سے کہتے ہوئے پلوشہ کے خفت زدہ سرخ ہوتے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے گاڑی نکالتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی پلوشہ کی جان میں جان آئی اور وہ جلدی جلدی سے کالج کا گیٹ عبور کرکے اندر داخل ہوگئی۔

☼ ☼ ☼
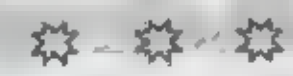
وہ آج تک بالاج کے رویہ کو نہ سمجھ پائی تھی' وہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے قدرے مختلف طبیعت کا حامل تھا۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا اور اگر تھا بھی تو وہ اسے گھر تک نہ لایا تھا۔ پلوشہ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا' کبھی اسے رات گئے تک گھر سے باہر نہ دیکھا تھا۔ گھر میں بھی اس کا رویہ سب کے ساتھ بہت ہی نپا تلا ہوتا۔ وہ پلوشہ کا تایا زاد تھا۔ پلوشہ کے ابو رحمان احمد تین بھائی تھے۔ سب سے چھوٹے وسیم احمد جو ڈاکٹر تھے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سعودی عرب کے شہر دمام میں تھے' جبکہ رحمان صاحب سے بڑے بھائی اوپر والے فلور میں ہی رہتے تھے' ان کے دو ہی بچے تھے' بڑا بالاج اور پھر نمرہ جس کی شادی میٹرک کے فوراً" بعد ہی ہوگئی تھی اور اب وہ دو سالہ بیٹے ارحم کی ماں تھی۔ بالاج کا رویہ اپنی بہن سے بھی بہت سخت ہوتا اور اسی بات پر پلوشہ ہمیشہ حیران ہوتی' کیونکہ اس کے دونوں چھوٹے بھائی اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ایسے میں نمرہ اسے بے چاری سی لگتی جس کی پیدائش کے فوراً" بعد تائی جی کا انتقال ہوگیا۔ اس کی پرورش بھی پلوشہ کی امی نے ہی کی' ذرا سا ہوش سنبھالتے ہی بالاج نے اس پر کڑی نگرانی شروع کردی تھی۔ اسے کبھی کوئی دوست بنانے کی اجازت نہ تھی' وہ شروع سے ہی عبایا پہنتی تھی' حالانکہ وہ پڑھائی کی شوقین تھی' پھر بھی اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ مل سکی اور اس مسئلہ پر ہمیشہ بالاج نے تایا جی کا ہی ساتھ دیا' یہاں تک کہ کبھی رحمان صاحب نے بھی انہیں سمجھانے کی کوشش نہ کی۔

کبھی کبھی تو پلوشہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ تایا جی اور بالاج کسی خوف کا شکار ہیں اور یہ خوف ہی ہے جو نمرہ کی سخت نگرانی کا سبب ہے اور وہ خوف کیا تھا' جس نے تایا جی اور بالاج کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ آج

...پلوشہ نہ جان پائی تھی' لیکن اسے اتنا احساس ضرور تھا کہ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے' جس کا علم صرف ... اور نمرہ کو نہیں ہے باقی سب جانتے ہیں یا ... لگتا ہے' نمرہ بھی جانتی ہو' بہرحال نمرہ کی موجودگی میں بالاج کا دھیان اس کی طرف تھا تو ضرور' لیکن اتنا ... تھا جتنا نمرہ کی شادی کے بعد ہوگیا تھا۔ یقیناً" اگر اس کا بس چلتا تو وہ پلوشہ کو کبھی بھی کالج پڑھنے کی اجازت نہ دیتا۔ وہ تو رحمان صاحب کی وجہ سے خاموش رہا جو چاہتے تھے کہ پلوشہ اعلا تعلیم حاصل کرے۔

وہ ہمیشہ کالج وین سے آتی جاتی' اسے کبھی بھی پبلک ٹرانسپورٹ میں اکیلے سفر کی اجازت نہ تھی' یہاں تک کہ وہ اکیلی کبھی اپنی خالہ یا ماموں کے گھر بھی ایک رات نہ رہی تھی۔ وہ جب بھی ان کے گھر جاتی ہمیشہ اپنی امی کے ساتھ ہی جاتی اور پھر ان ہی کے ساتھ واپس آجاتی' یہاں تک کہ وہ اپنی کسی دوست کے گھر بھی نہ جاتی تھی' کیونکہ اس بات کی اسے اجازت نہ تھی۔ چونکہ وہ خود کسی کے گھر نہ جاتی تھی۔ اس لیے کبھی کوئی لڑکی بھی اس کے گھر نہ آتی تھی' یہی وجہ تھی کہ وہ شروع سے ہی نمرہ کے زیادہ قریب رہی۔

نمرہ اس سے تقریباً" ڈیڑھ سال بڑی ہونے کے باعث اس سے اسکول میں بھی ایک سال سینئر تھی۔ اس سب کے باوجود ان دونوں کی دوستی مثالی تھی۔ نمرہ کا شوہر حماد بھی ایک اچھا انسان تھا۔ وہ اپنی امی کے ساتھ اکثر اوقات ہی نمرہ سے ملنے جاتی تھی اور وہاں بھی اسے رات رکنے کی اجازت نہ تھی۔ اپنے گھر میں ہر سہولت میسر ہونے کے باوجود گھر والوں کی یہ احتیاط اور رویہ ہمیشہ اس کی سمجھ سے بالاتر رہا۔ کبھی کبھی تو اسے یہ سب کچھ بہت پراسرار سا لگتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب بالاج کی نگرانی اس پر کڑی ہوتی۔ ایسے میں اسے خوامخواہ ہی الجھن ہونے لگتی اور اس کا دل اسے بغاوت پر اکساتا' یہی وجہ تھی کہ آج وہ جان بوجھ کر چادر کے بغیر کالج آئی تھی۔ اور اس کا مقصد محض بالاج کو تنگ کرنا تھا' جس میں وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ہوگئی تھی' لیکن اب پچھتا رہی تھی' کیونکہ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ بالاج بہت غصہ میں واپس گیا ہے اور یقیناً" واپسی میں اسے ایک تفتیشی عدالت کا سامنا کرنا پڑے گا' جس میں بالاج کے ساتھ اس کی امی بھی شامل ہوں گی۔ بہرحال اب تو جو ہونا تھا ہوچکا' کیونکہ گیا وقت واپس نہیں آتا۔

"اے اللہ مجھ پر رحم کرنا' میں اس کھڑوس شخص کے ساتھ کیسے زندگی گزاروں گی؟"

ان ہی پریشان کن سوچوں میں گھری وہ اپنی کلاس کی جانب چل دی۔

☼ ☼ ☼

اسے دو دن سے بخار تھا' یہی وجہ تھی کہ اس نے کھانا بالکل بھی نہ کھایا تھا' کھانے کی ٹرے جوں کی توں واپس جارہی تھی۔ مایوسی نے اسے بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ کال کوٹھڑی اس کی قبر میں تبدیل ہونے والی ہے' اس جیسی نفیس طبیعت کی حامل لڑکی کو آج کئی دن ہوگئے تھے لباس تبدیل کیے ہوئے' یہاں تک کہ اس نے منہ بھی نہ دھویا تھا۔ سر میں کنگھا کرنا تو دور کی بات اس وقت اگر کوئی اسے اس حال میں دیکھ لیتا تو یقین ہی نہ کرتا کہ یہ خوشنما ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ہمت جواب دیتی جارہی تھی۔ ہر نیا دن اسے خاموش موت کی جانب دھکیل رہا تھا اور آج تو ویسے بھی صبح سے ہی اس کی طبیعت خراب تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی بھی نہ ہوپارہی تھی اور ایسے میں جب وہ مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ڈوبی بستر پر لیٹی سسکیاں لے رہی تھی کہ بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یقیناً" بھاگی آئی ہوگی۔ کھانا رکھنے' مجھے اس سے کہنا چاہیے کہ میرے لیے کوئی میڈیسن ہی لے آئے' شاید کسی کے دل میں رحم آجائے اور مجھے بخار کی کوئی دوا ہی نصیب ہوجائے۔ یہ ہی سوچ کر اس نے اپنے ٹوٹے بدن کے ساتھ بمشکل کروٹ لی اور باہر دروازے کی جانب دیکھا اور ملگجی روشنی میں اندر داخل ہونے والی شخصیت پر جیسے ہی اس کی نظر پڑی۔

"بڑی اماں! آپ۔۔۔" خوشی کے مارے وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

"ہاں میری بچی! یہ تو نے کیسا ظلم کیا اپنی ذات کے ساتھ۔ ہم تو تجھے بہت سمجھ دار سمجھتے تھے ہمیں کیا پتا تھا کہ تو یہ بدنامی اور رسوائی کا طوق اپنے ساتھ ساتھ ہمارے گلوں میں بھی ڈال دے گی۔"

بڑی اماں نے اس کی چارپائی پر بیٹھ کر بڑے ہی تاسف سے کہا۔ بڑی اماں کے سرد رویہ نے اس کی خوشی کو پل بھر میں کافور کر دیا اور اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔

"دیکھ خوشی! تو اچھی طرح جانتی تھی' زریاب کسی تیرا منگیتر تھا' تو اس کی ٹھیکرے کی منگ تھی' پھر تو نے ایسا بے حیائی والا کام کیوں کیا؟ کیوں اپنے دشمنوں کے ساتھ مل کر ہماری عزت کو سربازار رسوا کیا۔ ہمارے سروں میں خاک ڈالی' بول خوشی! تو نے کیوں ایسا کیا' کیا تیری جوانی اتنی منہ زور ہو گئی تھی کہ تجھے اپنے پرائے کا احساس بھی بھول گیا۔ کیا تو اس حویلی کی روایات سے واقف نہ تھی جو تیرے قدم بہک گئے۔"

بڑی اماں مسلسل اسے لتاڑ رہی تھیں اور اور جواب میں وہ کچھ بھی بول نہ پا رہی تھی' آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

"تو نے ہمیں خوب سزا دی اس لاڈ پیار کی جو ہم نے تجھ سے کیا۔ تیرے اس ایک غلط قدم نے حویلی کی ساری لڑکیوں پر کھلنے والے تعلیم کے دروازے بند کر دیے' پر تجھے کیا! تو نے تو اپنی مرضی پوری کر لی نا۔" بڑی اماں کے لہجہ میں قہر و غضب بول رہا تھا۔

"بڑی اماں! مجھے معاف کر دیں' پلیز بابا سائیں سے کہیں' صرف ایک دفعہ آ کر میری بات سن لیں' خدا کے لیے بڑی اماں!"

اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ بلک بلک کر رو پڑی۔ اس کا ذہن جس جذباتی توڑ پھوڑ کا شکار تھا' اس کی بنا پر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اگر آج بڑی اماں یہاں سے واپس چلی گئیں تو دوبارہ شاید کسی اپنے کا چہرہ اسے دیکھنا نصیب نہ ہو۔

"میں نے تجھے کیا معاف کرنا ہے' تو' تو جانتی ہے میرے اختیار میں کچھ نہیں' ہاں اگر تو اپنے باپ اور بھائیوں کی بات مان لے تو شاید تیری جان بخشی ہو جائے' دیکھ خوشی! اگر تو اس زندان سے زندہ سلامت نکلنا چاہتی ہے تو وہی کر جو تیرے وارث تجھ سے چاہتے ہیں۔"

"وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں بڑی اماں؟"

"اگر جنید عباسی سے طلاق حاصل کرنے کی صورت میں مجھے میری پچھلی زندگی واپس مل جائے تو بھی مجھے منظور ہے' یقیناً اس سے زیادہ میرے باپ' بھائیوں کا مطالبہ اور کیا ہو گا۔" وہ دل ہی دل میں جنید عباسی سے طلاق کے لیے خود کو راضی کر چکی تھی۔

"یہ تو میں نہیں جانتی۔ بہرحال ابراہیم کا کہنا ہے کہ اگر تو ان کی بات مان لے تو بہت جلد رہائی تیرا مقدر بن سکتی ہے۔"

"میں ان کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں بڑی اماں! بس مجھے یہاں سے باہر نکالیں۔" اس نے بے اختیار بڑی اماں کے ہاتھ تھام لیے۔ انہوں نے خوشی کو گلے لگا لیا۔

"نہ رو خوشی!" بڑی اماں نے اپنا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

"دیکھ خوشی! میری بات دھیان سے سن۔" انہوں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"تجھے آج رات کسی بھی وقت شہر جانا ہو گا۔ میری بچی تو نہیں جانتی جنید عباسی نے ہمیں کتنا ستایا ہوا ہے' وہ رات کو بھی مجسٹریٹ اور پولیس کے ساتھ حویلی آیا تھا۔ تجھے بازیاب کروانے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے تجھے قتل کر دیا ہے۔ اس نے تیرے قتل کا مقدمہ تیرے باپ کے خلاف درج کروا دیا ہے۔ وہ تو حویلی کی تلاشی کے وارنٹ بھی لایا تھا' لیکن ایسے برے وقت میں تیرے باپ کے تعلقات کام آ گئے اور اوپر سے آنے والے فون نے پولیس کو واپس جانے پر مجبور کر دیا' لیکن ہمیں یقین ہے' وہ بدبخت پھر آئے گا۔ پہلے ہی اس لڑکے نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا'

ہمارے مرد تھانے' کچہریوں کے چکر لگا رہے ہیں' کل بھی تیرے بھائی علی شیر کی پیشی ہے۔ اسی لیے وہ شہر گیا ہوا ہے' اس کے دائر کیے ہوئے مقدموں نے ہماری پشتوں کی عزت کو مٹی میں رول دیا ہے۔ آج اگر وہ حکومت کے اعلا عہدے پر پہنچ گیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہ ہوا کہ شریفوں کی پگڑیاں اچھالتا پھرے اور ان کے گریبان پر ہاتھ ڈالے' لیکن کیا کریں ہم تو مجبور ہیں' خود اپنی اولاد کے ہاتھوں جن کی ناعاقبت اندیشی نے یہ خاک ہمارے سروں پر ڈالی۔"

بڑی اماں اتنے سارے انکشافات کرتے ہوئے ایک آہ سرد بھر کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ان کے انکشافات نے خوشی کو حیرت سے دوچار کر دیا' اس میں زندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔

"جنید عباسی میری تلاش میں سرگرداں ہے' وہ مجھے بھولا نہیں۔"

یہ خیال ہی اس کے لیے روح آفریں تھا' اس خیال کے ساتھ ہی جنید کا دلکش سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے لہرا کر اسے تقویت بھرا احساس بخش گیا' وہ تنہا نہ تھی' بلکہ اس اندھیری شاہراہ پر جنید اس کا منتظر کھڑا تھا۔

"بس اب تو شہر جا اور جس طرح تیرے باپ' بھائی کہیں ویسا ہی کر۔ کورٹ جا کر وہی بیان دینا جو تجھ سے کہا جائے' کیونکہ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے' ورنہ تو جانتی ہے کہ اتنا خون خرابہ ہو گا کہ دھرتی لہو سے لالو لال ہو جائے گی' اچھا اب میں چلتی ہوں۔ تھوڑا بہت سامان تیاری پکڑ' بھاگی تیرے ساتھ ہی جائے گی۔"

بڑی اماں نے سرد مہری سے کہتے ہوئے اسے رنگین خیالات سے کھینچ کر حقیقت کے تپتے صحرا میں لا پھینکا اور فوراً ہی خاموشی سے باہر نکل گئیں' یہ جانے بغیر کہ وہ کس حال میں بیٹھی ہے۔ اس کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ وہ دو دن سے بھوکی تھی' لیکن بڑی اماں نے ایک بار بھی اس سے اس کا حال نہ پوچھا تھا اور صرف اپنا فیصلہ سنا کر اسے عمل درآمد کا حکم دے کر چلی گئی تھیں' اپنے گھر والوں کی اس قدر سنگ دلی اور بے حسی نے اس کے نازک دل کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ ٹوٹ کر بکھر گئی۔

"اے میرے اللہ پاک میری مدد فرما!"

وہ اللہ سے یہ دعا کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کا دل اپنے گھر والوں سے یک دم ہی اچاٹ ہو گیا اور دل میں بھری ان کی محبت کی جگہ نفرت نے لے لی' کیا انسان اتنے بھی ظالم ہو سکتے ہیں کہ اپنی انا' خودداری اور ظاہری جاہ و جلال کے لیے اپنے پیاروں کو قربان کر دیں۔

اس سوچ کے دل میں آتے ہی اس کا اعتماد دنیا کے تمام رشتوں سے اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔۔۔"

پلوشہ نے سر اٹھا کر دیکھا' سامنے نہایت ہی خوب صورت اور طرح دار لڑکی کھڑی تھی۔

"میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں تمہارے پاس؟"

"وائے ناٹ۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا' لڑکی دھپ سے اس کے سامنے ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔

"مجھے صبرینہ کہتے ہیں اور تم؟" لڑکی نے اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر تعارف کروایا۔

"پلوشہ احمد۔۔۔" پلوشہ کو جانے کیوں پہلی ہی نظر میں وہ لڑکی اچھی لگی تھی' ورنہ عام طور پر وہ کسی سے زیادہ گھلنے ملنے کی عادی نہ تھی۔

"اوہ تمہارا نام بھی تمہاری ہی طرح خوب صورت ہے۔"

صبرینہ نے مسلسل چیونگم چباتے ہوئے تبصرہ کیا' جبکہ پلوشہ صرف مسکرا دی۔

"یہ تمہارے لیے۔" اس نے اپنے یونیفارم کی جیب سے چیونگم نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔

"تھینک یو۔"

"کیا مصیبت ہے یار! کینٹین میں اتنا رش ہے کہ۔۔۔"

تیزی سے بولتی ہوئی ورشہ کی زبان کو بریک لگ

گیا، جیسے ہی اس کی نگاہ پلوشہ کے قریب بیٹھی سبرینہ پر پڑی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ پوچھتی سبرینہ خود ہی بول پڑی۔

"ہیلو آئی ایم سبرینہ۔" اور اپنا ہاتھ وریشہ کی جانب بڑھا دیا۔ "ابھی کچھ دن قبل ہی میرے والد کا ٹرانسفر یہاں ہوا ہے، اس لیے آپ کے کالج میں نئی ہوں اور چاہوں گی کہ آپ دونوں مجھ سے دوستی کر لیں، اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو۔" اس نے مکمل وضاحت پیش کی۔

"نہیں یار! اس میں اعتراض والی کیا بات ہے؟"

پلوشہ کے جواب نے وریشہ کو حیرت زدہ کر دیا، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پلوشہ دوستی کے معاملے میں خاصی محتاط طبیعت کی مالک تھی اور کسی بھی لڑکی سے کم ہی دوستی کرتی تھی، اس کی اور وریشہ کی دوستی تو اسکول کے زمانے سے تھی۔ دونوں کے گھر بھی ایک ہی محلے میں تھے، جس کی بنا پر ان کی گھریلو واقفیت بھی تھی، وریشہ، بالاج احمد اور پلوشہ کے درمیان موجود رشتہ سے بھی واقف تھی اور اسے ہمیشہ یہ بات اچھی لگتی تھی کہ گھر میں اتنی پابندیوں کے باوجود بالاج نے کبھی ان دونوں کی دوستی پر اعتراض نہ کیا تھا، یہاں تک کہ اگر کبھی پلوشہ کو اس سے کوئی کام ہوتا تو بالاج بخوشی اس کے ساتھ وریشہ کے گھر بھی آ جاتا، حالانکہ باہر ہی کھڑا رہتا اور پلوشہ جلدی جلدی کام لے کر چلی جاتی، ویسے بھی ان دونوں کے گھر کا ماحول بھی تقریباً ایک ہی جیسا تھا جس کی بنا پر انہیں کبھی کوئی مسئلہ پیش نہ آیا تھا، لیکن ان کے درمیان بیٹھی الٹرا ماڈرن سی سبرینہ ان دونوں سے بالکل بھی میچ نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ کولڈ ڈرنک تم لے لو، میں اور لے آتی ہوں۔"

وریشہ نے ایک کولڈ ڈرنک پلوشہ کو پکڑا کر دوسری سبرینہ کی جانب بڑھائی۔

"نہیں سوری یار! میں کولڈ ڈرنک نہیں پیوں گی، میرا گلا خراب ہے۔ بس تمہارے ساتھ سموسے شیئر کر لوں گی! تم بیٹھ جاؤ۔"

وہ بڑے مزے سے سامنے رکھی پلیٹ سے سموسہ اٹھا کر کھانے لگی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہی نہ ہو رہا تھا کہ ان کی اس لڑکی سے پہلی ملاقات ہے، "یقیناً" وہ ایک پر اعتماد اور خاصی فرینک سی لڑکی تھی۔ اس کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے وریشہ نے دل ہی دل میں یہ اعتراف کیا۔

☼ ☼ ☼

نمرہ کی طبیعت پچھلے کچھ دنوں سے خراب تھی۔ لہٰذا حماد بھائی کی درخواست پر امی "تقریباً" روزانہ ہی دوپہر کے بعد اس کے گھر چلی جاتی تھیں اور رات واپسی میں حماد بھائی گھر چھوڑ جاتے۔ نمرہ کی ساس تو تھیں نہیں، دونوں نندیں بھی دوسرے شہر میں رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ گھر میں کام والی کے ہونے کے باوجود اسے اور ارحم کو دیکھنے کے لیے امی کو روز ہی جانا پڑتا، لیکن آج چونکہ اتوار تھا اور صبح سے ہی شبو کے ساتھ مل کر امی نے کپڑے دھونے کی مشین لگائی ہوئی تھی، اور ابھی کچن کا کام بھی باقی تھا، ایسے میں حماد بھائی کے فون نے امی کو بوکھلا دیا، نمرہ کی طبیعت زیادہ خراب تھی آخر بہت سوچ کر وہ پلوشہ کی جانب آئیں، جو مشین سے کپڑے نکال نکال کر شبو کو دے رہی تھی۔

"تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں بالاج کا پتا کرتی ہوں۔ تمہیں نمرہ کے گھر چھوڑ آئے۔ اس کی اپنی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے اور ارحم بھی بہت تنگ کر رہا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں، تاکہ بالاج کو دیکھیں کہ وہ گھر پہ ہے یا نہیں، جبکہ پلوشہ کا دل نمرہ اور ارحم سے ملنے کے تصور سے ہی کھل اٹھا۔

"یہ باقی کپڑے مشین سے تم خود نکال لو۔"

شبو کو کہہ کر اس نے قریب ہی رکھے تولیہ سے ہاتھ صاف کیے اور اندر کمرے کی جانب چل دی اور تقریباً پندرہ منٹ میں ہی تیار ہو کر وہ باہر آ چکی تھی۔ اس نے جلدی سے کچن کی کیبنٹ کھول کر بسکٹ کے کچھ ڈبے اور چپس کے پیکٹ شاپر میں ڈالے، پھر فریج میں رکھا

ہوا ابتہاج کا چاکلیٹ کا پیکٹ بھی نکال لیا۔

"خیر ہے۔ ابتہاج اور لے آئے گا۔" ویسے بھی وہ تینوں بہن بھائی ارحم سے بے حد محبت کرتے تھے۔ سارا سامان شاپر میں ڈال کر وہ جیسے ہی باہر نکلی نظر اوپر سے آتے بالاج پر پڑ گئی۔ بلیک کرتے شلوار میں وہ کہنیوں تک آستینیں فولڈ کیے بے حد سنجیدہ چہرے کے ساتھ بھی نظر لگ جانے کی حد تک اچھا لگ رہا تھا۔

"تیار ہو گئی ہو تو آ جاؤ۔" پلوشہ سے کہتے ہوئے وہ لاؤنج کے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

"ایک منٹ ٹھہرو بیٹا!" امی بالاج کو روک کر تیزی سے کچن کی جانب بڑھ گئیں، اس نے سامنے صوفہ پر رکھی کالی چادر اٹھا کر اوڑھ لی۔

"یہ لے جاؤ، اس میں نمرہ کے لیے سوپ ہے اور میں نے کھانا بھی پیک کر دیا ہے۔"

انہوں نے اسے ہدایت کی، لیکن اس کے آگے بڑھنے سے قبل ہی بالاج نے ان کے ہاتھ سے شاپر تھام لیا اور باہر کی جانب چل دیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی ہوئی باہر کھڑی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

"تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟" بالاج نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی سوال کیا۔

"جی اچھی جا رہی ہے۔" وہ آہستہ سے جواب دے کر باہر دیکھنے لگی۔

"اگر کبھی پڑھائی کے سلسلے میں کوئی مدد چاہیے ہو تو مجھے بتا دینا۔ میں یونیورسٹی سے آ کر گھر ہی ہوتا ہوں۔"

"جی اچھا۔" اور پھر سارے راستے ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ "تقریباً" بیس منٹ بعد ہی نمرہ کا گھر آ گیا۔ بالاج نے گاڑی سے باہر نکل کر گیٹ کی بیل بجائی۔ وہ خاموشی سے گیٹ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ نمرہ کی کل وقتی ملازمہ ناہید نے کھولا۔ وہ پلوشہ کو دیکھتے ہی کھل اٹھی۔

"شکر ہے باجی آپ آ گئیں۔ ارحم نے تو رو رو کر پورا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے۔" پلوشہ بنا جواب دیے اندر داخل ہو گئی۔ بالاج سارا سامان ناہید کو تھما کر باہر سے ہی چلا گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ نمرہ اور اس کے گھر کی حالت دیکھ کر حیران و پریشان ہی رہ گئی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ یہ گھر نمرہ جیسی نفاست پسند لڑکی کا ہے۔ ارحم الگ گندہ میلا پھر رہا تھا۔ اسے یہاں آ کر پتا چلا کہ نمرہ پریگننٹ تھی اور اس کی بے حد کمزوری کے باعث ڈاکٹرز نے اسے مکمل بیڈ ریسٹ بتایا تھا ایک تو کم عمری کی شادی اور پھر جلدی جلدی ہونے والی پریگننسی نے اس کی حالت ابتر کر رکھی تھی، اسے اپنی اس چھوٹی سی کزن پر یک دم ہی ڈھیروں ڈھیر پیار آ گیا، جہاں نمرہ اور ارحم اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے وہاں حماد بھائی بھی مطمئن ہو گئے، پھر جلد ہی اس نے ناہید کے ساتھ مل کر سارا گھر سمیٹ دیا، ارحم کو نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنا دیے اور فارغ ہو کر اس کے ساتھ کمپیوٹر گیم کھیلنے لگ گئی، سارا دن کیسے گزرا، اسے پتا ہی نہ چلا، وہ تو جب مغرب کے وقت بالاج اسے لینے آیا تو اندازہ ہوا کہ رات ہو چلی ہے۔ نمرہ اور حماد نے بہت کوشش کی کہ وہ رات ان کے گھر رہ جائے، کیونکہ کل کالج کی چھٹی تھی، لیکن بالاج نے سنتے ہی فی الفور انکار کر دیا، جبکہ ارحم اس کے جانے کا سن کر پھر سے رونے لگا تھا۔

"کل میں صبح ہی چچی جان کو تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا۔" بالاج نے نمرہ کے بار بار ضد کرنے پر اسے حتمی انداز اختیار کرتے ہوئے سمجھایا۔

"چلو اب جلدی کرو، دیر ہو رہی ہے۔" نمرہ کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ وہ پلوشہ سے مخاطب ہوا جو نمرہ کے قریب ہی کھڑی دعا کر رہی تھی کہ بالاج مان جائے اور وہ ایک رات ارحم کے ساتھ گزار لے، کیونکہ اسے نمرہ اور ارحم کو دیکھ کر ترس آ رہا تھا، لیکن بالاج کے باہر نکلتے ہی وہ بھی سب سے مل کر مرے مرے قدموں سے باہر جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی، اسے حیرت تھی کہ سگی بہن کو اس حال میں دیکھ کر بھی یہ شخص کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھا اور پھر واپسی کا سارا راستہ اسی سوچ میں کٹ گیا کہ وہ بالاج جیسے سخت

مزاج اور انتہاپسند شخص کے ساتھ ساری زندگی کیسے گزارے گی۔

"میں تو شاید مرہی جاؤں گی' یہ تو مجھے کہیں جانے ہی نہ دیا کرے گا۔ اس سوچ کے آتے ہی پلوشہ کو خود پر ترس آنے لگا۔

☼ ☼ ☼

چھ' سات گھنٹوں کے مسلسل سفر کے بعد جیپ رک چکی تھی اور رات کے سناٹے میں جیپ کے تیز ہارن کی آواز سن کر اندازہ ہورہا تھا کہ منزل آچکی ہے' سارے راستہ بخار کی شدت کے سبب وہ حالت غنودگی میں رہی تھی اس کا سر بھاگی کی گود میں تھا جو نہایت ہی عزت واحترام اور پیار و محبت سے اپنی مالکن کے سر کو دباتی آئی تھی۔ جیپ رکے ہوئے دو منٹ سے زیادہ وقت ہوچکا تھا' جب گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی سجاول کی آواز بھی سنائی دی۔

"چلو بی بی جی کو لے کر باہر آجاؤ۔" وہ یقیناً" بھاگی سے مخاطب تھا' بھاگی نے بنا کوئی جواب دیے اسے اٹھا کر بٹھایا' پھر اس کی چادر کو درست کرتے ہوئے پاؤں میں چپل پہنائی اور پھر اسے تھامتے ہوئے نیچے اتر گئی' اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور پاؤں زمین پر ٹک نہ رہے تھے۔ بھاگی کے سہارے تقریباً" گھسٹتی ہوئی وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی پہلی نگاہ سامنے کروفر کے ساتھ کھڑے بھائیوں پر پڑی۔ اس کے سگے بھائی علی شیر اور فلک شیر اس کے وجود سے قطعاً" بے نیاز کھڑے تھے۔ بالکل ایسے جیسے اپنے سامنے کھڑی اس بدحال لڑکی سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

"راستہ میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟" فلک شیر نے یہ سوال یقیناً" سجاول سے کیا تھا۔

"نہیں چھوٹے سائیں! ہم بڑی احتیاط سے یہاں تک آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ اور بھاگی! اسے اندر لے جاکر نہلا دھلا کر کپڑے تبدیل کرواؤ اور پھر کچھ کھانے کو دو۔"

"چھوٹے سائیں! بی بی سائیں کو بہت بخار ہے جی۔ یہ تو کئی دنوں سے کچھ بھی نہیں کھا رہیں۔" بالآخر بھاگی سے رہا نہ گیا اور وہ بول ہی پڑی۔

"ٹھیک ہے ابھی صندل آتی ہے۔ وہ اسے کوئی دوا دے دے گی۔ تم اسے لے جاؤ اندر۔"

وہی حقارت بھرا لہجہ اور وہ جو اپنے بھائیوں سے ہمدردی کی امید کررہی تھی' اس بے نیازی پر اندر تک ٹوٹ گئی' اس بے نیازی نے اس کی روح کو چھلنی کردیا وہ مردہ روح کے ساتھ ان کی جانب دیکھتی رہ گئی' علی شیر نے تو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اک نگاہ اس پر ڈالی بھی تھی جو بے شک قہر آلود تھی' لیکن فلک شیر نے تو یہ بھی نہ کیا وہ جو اس کا سب سے پیارا بھائی تھا۔ اتنی اجنبیت سے اس کے پاس سے گزرتا ہوا چلا گیا کہ خوشی کا دل دکھ سے بھر گیا۔

"اتنے شدید ردعمل سے تو بہتر تھا کہ یہ مجھے مار ہی دیتے۔ میں کم از کم ان سب کی اتنی نفرت کا شکار تو نہ بنتی۔ کاش میرے باپ بھائی ایک دفعہ مجھ سے کہتے کہ میں جنید عباسی سے طلاق لے لوں۔ میں تو وہ بھی کر گزرتی' لیکن یہ کیا انہوں نے تو مجھ زندہ درگور ہی کر ڈالا۔"

اس سوچ کے آتے ہی اس کے دل میں نفرت اور غصہ کی ایک نئی لہر ابھری تھی۔

"اے میرے پروردگار مجھے اپنے رحم و کرم کے صدقے ان ظالموں سے نجات دلا' بے شک میں نے جو کیا وہ غلط تھا' لیکن تو جانتا ہے میں گناہ گار نہیں ہوں' میرے مالک اگر میرے نصیب میں عبرت ناک موت لکھ دی گئی ہے تو بھی وہ موت مجھے ان ظالموں کے ہاتھوں سے نہ عطا کرنا۔"

دل ہی دل میں یہ دعا کرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور اسے سنبھالتے سنبھالتے بھاگی بھی اس کے ساتھ رو پڑی۔

☼ ☼ ☼

ثناء اللہ مگسی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔

سب سے بڑا احمد مگسی' پھر ابراہیم مگسی اور سب سے چھوٹا یاور مگسی' احمد مگسی اپنے دو بیٹے چھوڑ کر جوانی میں ہی دشمنی کی نذر ہوگیا تھا' جبکہ ابراہیم مگسی کی دو بیویوں سے ایک ہی بیٹی تھی خوشنما' جبکہ بیٹے پانچ تھے' جن میں سے تین بیٹے بالترتیب علی شیر' فلک شیر اور علی مہران شیر آمنہ کے بطن سے تھے اور دس سالہ امیر حمزہ اور آٹھ سالہ اسامہ دوسری بیوی ماہ زیب کے بطن سے تھے۔ یاور مگسی کی صرف دو ہی بیٹیاں تھیں۔ بارہ سالہ سکھاں اور دس سالہ ماروی جنہیں خوشنما کے اٹھائے گئے قدم کے بعد سزا کے طور پر اسکول سے اٹھا لیا گیا تھا اور ان پر تعلیم کے دروازے مکمل طور پر بند ہوگئے تھے۔ اس کے چچا یاور مگسی نے اپنے وارث کے لیے کچھ دن قبل دوسری شادی کی تھی' وہ سب ایک حویلی میں رہتے تھے جس میں سب کے علیحدہ علیحدہ پورشنز بنے ہوئے تھے' لیکن داخلی گیٹ اور کچن ایک ہی تھا' سب کا کھانا ایک ہی کچن میں تیار ہوتا اور بڑی اماں کے ساتھ مل کر کھایا جاتا' کھانے کے وقت سارا خاندان بڑی اماں کے ساتھ اکٹھا ہوکر کھانا کھاتا۔

خوشی کی بڑی پھوپھو کا نکاح اس وقت قرآن پاک سے کردیا گیا تھا' جب وہ پانچ سال کی تھی اس کے بعد اس نے اپنی پھوپھو کو کبھی بھی حویلی میں نہ دیکھا تھا' وہ حویلی کے پچھواڑے بنی کال کوٹھڑی میں تنہا قید تھیں' جہاں انہوں نے اپنی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تنہائی کا عذاب سہتے ہوئے اپنی جان' جاں آفریں کے سپرد کردی تھی جس کا احساس حویلی کے سخت گیر مردوں میں سے کسی کو بھی نہ ہوا تھا' یہاں تک کہ اس نے کبھی اپنی دادی' بڑی اماں کو بھی اپنی بیٹی کی یاد میں دکھی نہ دیکھا تھا' سوائے آمنہ کے کبھی اس نے اپنی پھوپھو کا ذکر کسی سے نہ سنا تھا' وہ حیران ہوتی تھی کہ یہ سب لوگ اتنے بے حس کیوں ہیں' جو اپنے سگوں کا دکھ بھی محسوس نہیں کرتے۔

چھوٹی پھوپھو الماس اپنے چچا کے گھر بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کے بیٹے زریاب کا رشتہ بچپن سے ہی خوشنما سے طے تھا' جبکہ بدلے میں سورٹھ اس کی ہونے والی بھابھی اور فلک شیر کی منگ تھی۔ حویلی کے رواج کے مطابق لڑکیوں کو پڑھنے کی اجازت نہ تھی' جبکہ خوشی تعلیم حاصل کرنے کی بے حد شوقین تھی۔ اس سلسلے میں زریاب اس کا مددگار ثابت ہوا' کیونکہ وہ حویلی کے دوسرے لوگوں سے مختلف تھا اور خود چاہتا تھا کہ اس کی بیوی تعلیم یافتہ ہو۔ اسی کے ایما پر گاؤں سے میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد خوشی نے قریبی قصبہ کے کالج سے انٹر کی تعلیم حاصل کی اور پھر زریاب کی خواہش پر قریبی شہر میں موجود یونیورسٹی میں ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں داخلہ لے لیا۔ زریاب اعلا تعلیم کے حصول کے لیے ابروڈ گیا ہوا تھا۔ لہٰذا خوشی کی شادی اس کی واپسی کے بعد متوقع تھی۔ زریاب کی چچازاد صندل علی شیر کی بیوی تھی' جس کی شادی کے موقع پر حویلی میں وہ ناخوش گوار واقعہ پیش آیا' جس نے خوشی کو حویلی والوں سے دور کردیا اور وہ اپنوں کی محبت کو ترستی رہ گئی۔ جنید عباسی خوشی کو یونیورسٹی میں ہی ملا تھا۔ پہلی بار ہی اسے دیکھ کر خوشی کے دل میں محبت کا دیا جل اٹھا تھا' لیکن چونکہ وہ اپنی خاندانی روایات سے واقف تھی' اس لیے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے اس سے بچنے کی کوشش کرتی رہی' لیکن کب تک رفتہ رفتہ اس کا دل بھی جنید کی محبت سے بھرتا چلا گیا۔ اور ان ہی محبت بھرے دنوں میں جب اس کا انگ انگ جنید کی محبت کی پھوار سے بھیگ چلا تھا اس پر انکشاف ہوا کہ جنید کا تعلق ان کے مخالف اور دشمن قبیلے سے تھا۔ یہ جان کر خوشی نے چاہا کہ وہ پیچھے ہٹ جائے' لیکن جنید نے ایسا نہ ہونے دیا' وہ سی ایس ایس کا امتحان پاس کرکے حکومت کے اعلا عہدے پر فائز ہوچکا تھا' وہ خوشی سے کسی طور بھی دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا اور پھر محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر بنا نتیجہ کی پروا کیے خوشی نے جنید سے نکاح کرلیا' کیونکہ جنید کا کہنا تھا کہ اس عمل کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جو ان دونوں کو ایک کرسکے۔

حویلی والے کبھی کسی طور پر جنید کو قبول نہیں کرسکتے تھے' اسی لیے وہ کہتا تھا کہ مناسب وقت کو

دیکھتے ہوئے وہ عدالت کے حکم کے مطابق خود حویلی آئے گا اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ اور اسے عزت سے رخصت کروا کر لے جائے گا۔ اور بس یہاں ہی وہ جذبات کے ہاتھوں مار کھا گیا' اسے حویلی والوں کی طاقت اور ظلم کی شدت کا اندازہ نہ تھا' اس کے تمام بہن بھائیوں کی پرورش شہر میں ہی ہوئی تھی' کیونکہ اس کی والدہ کا تعلق شہر سے تھا۔ اس کا باپ حمید عباسی خود بھی ایک پڑھا لکھا انسان تھا' یہ ہی وجہ تھی اس نے ہمیشہ اپنی اولاد کو اپنے خاندانی مسائل سے دور رکھا اور نہ صرف خاندانی مسائل بلکہ وہ اپنے گاؤں سے بھی دور رہے۔

اپنے گھر کے پرسکون ماحول کو دیکھتے ہوئے جنید نہیں جانتا تھا کہ بظاہر پڑھے لکھے یہ لوگ اپنی خاندانی روایات کے لیے سگے رشتوں کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور جیسے ہی اس کا ادراک جنید کو ہوا' بہت دیر ہو چکی تھی' خوشی کو حویلی سے غائب کروا دیا گیا تھا۔ جنید کا اثر و رسوخ بالکل کام نہ آرہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ خوشی کو مار کر حویلی میں ہی دفنا دیا گیا ہے' اسی خیال کے تحت اس نے کورٹ میں کیس دائر کر رکھا تھا۔ جہاں اس نے اپنا نکاح نامہ جمع کروا کر اپنی بیوی کی بازیابی کا مطالبہ کیا تھا' اس کی دائر کردہ درخواست کے مطابق عدالت نے علی شیر کو پابند کر دیا تھا کہ وہ جلد از جلد خوشی کو کورٹ میں پیش کر کے اس کا بیان قلمبند کروائے تاکہ عدالت کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو' اسی سبب اسے شہر لایا گیا تھا' اگر جنید یہ سب کچھ نہ کرتا تو یقیناً" خوشی کو پہلے ہی دن مار دیا جاتا' لیکن اس کا بھائی الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس لیے وہ لوگ اتنا بڑا اسکینڈل افورڈ نہ کر سکتے تھے۔ جس کی بنا پر خوشی کو چند دن کی زندگی دان دے دی گئی تھی۔

وہ جان چکی تھی کہ اس کی زندگی کی مہلت عدالت میں دیے جانے والے بیان تک محدود ہے جب وہ وہاں جا کر اپنے باپ بھائیوں کے حق میں بیان دے دے گی۔ اسی وقت اسے دی گئی مہلت زندگی اس کے پیاروں کے ہاتھوں ہی ختم کر دی جائے گی اور اب اپنی زندگی بچانے کے لیے جو کچھ کرنا تھا اسے اکیلی ہی کو کرنا تھا۔

☆ ☆ ☆

"تمہارے پاس موبائل نہیں ہے؟" سبرینہ نے اچانک ہی موبائل پر اپنی رنگ ٹون چیک کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"نہیں کیونکہ مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" پلوشہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ویل ڈن یار! آج کے اس جدید دور میں تم جیسی لڑکی کا پایا جانا ایک حیرت انگیز بات ہے۔"

وہ سمجھی نہیں کہ یہ تعریف تھی یا اس پر طنز کیا گیا ہے۔

"اور یہ تم کالج کس کے ساتھ آئی تھیں۔ تمہارا بھائی تھا کیا؟"

اپنے کام میں مصروف سبرینہ کا انداز قطعی سرسری سا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ سوال یقیناً" بالاج کے سلسلے میں کیا گیا ہے کیونکہ وہ آج اسے اور وریشہ کو کالج ڈراپ کر کے گیا تھا۔

"ہاں!" اس نے تھوڑا سا سوچا اور چاٹ کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا کیونکہ سبرینہ کے مزید کسی سوال سے بچنے کا واحد حل ایک ہاں تھی۔

"یار! بڑا ڈیشنگ بندہ تھا۔ میری اس سے بات ہی کروا دو۔ ذرا ہم بھی ایک دو ڈیٹ مار لیں تمہارے بھائی کے ساتھ۔" سبرینہ نے بے باک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جبکہ اس کی بات سن کر وریشہ کے کانوں کی لویں تک سرخ پڑ گئیں۔

"ڈونٹ وری یار! میں مذاق کر رہی ہوں سیریس مت ہو جانا۔"

پلوشہ کے کچھ بولنے سے قبل ہی اس نے خود ہی وضاحت بھی کر دی۔ "چلو جلدی آؤ اکنامکس کا پیریڈ شروع ہو گیا ہے' جانتی ہو اگر لیٹ ہو گئے تو مسز رضوی نے کلاس روم میں داخل نہیں ہونے دینا۔"

وریشہ جو کچھ دیر قبل ہی آئی تھی جانے کیا سوچ کر

اس نے پلوشہ کو بازو سے تھام کر کھڑا کر دیا جبکہ وہ جانتی تھی کہ ان کا یہ پیریڈ فری ہے کیونکہ آج مسز رضوی کالج ہی نہیں آئی تھیں پھر بھی بنا کچھ پوچھے خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔

"میرا تو یہ پیریڈ فری ہے۔ میں جمنازیم جا رہی ہوں۔ تم لوگوں کا اگر موڈ ہو تو فارغ ہو کر وہیں آجانا۔" گراؤنڈ کی سوکھی گھاس سے کھڑے ہوتے سبرینہ نے اپنے کپڑے جھاڑے اور بڑی لاپروائی سے کہتی ہوئی اپنا بیگ تھام کر جمنازیم کی سمت چل دی۔

مجھے تو یہ لڑکی بالکل پسند نہیں ہے۔ وریشہ نے بے لاگ تبصرہ کیا۔

"کیوں اچھی بھلی تو ہے۔ اتنی لونگ اور کیئرنگ جانے کیوں تم اس سے اتنا چڑتی ہو۔" پلوشہ کو اس کا تبصرہ پسند نہ آیا وریشہ نے ذرا کی ذرا رک کر پلوشہ کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جہاں چھائی ناگواری واضح طور پر محسوس کی جا سکتی تھی' ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ پلوشہ کا رویہ اس سے خاصا فارمل ہوتا جا رہا ہے' پہلے والی گرم جوشی ان کے درمیان سے تقریباً" مفقود ہو چکی تھی۔ اب وہ عام طور پر وریشہ کے بجائے سبرینہ کے ساتھ کو زیادہ اہمیت دینے لگی تھی بلکہ اکثر ہی وہ اور سبرینہ' وریشہ کو چھوڑ کر غائب ہو جاتیں یہاں تک کہ کینٹین جاتے ہوئے بھی اس سے پوچھنا گوارا نہ کرتیں۔

"سوچ لو جس دن بالاج بھائی نے اسے تمہارے ساتھ دیکھ لیا اس دن تمہاری خیر نہیں ہے۔" وریشہ نے دل ہی دل میں سبرینہ کے بے باک حلیے کا تصور کرتے ہوئے کہا۔

"سارا دن کالج میں کلاسز بنک کرتی ہے۔ ٹخنوں سے اونچی شلوار ہوتی ہے گریبان کے سارے بٹن بند کرنے کا اکثر ہی محترمہ کو ہوش نہیں ہوتا۔ سارا دن موبائل کا ہینڈز فری اس کے کان میں ہوتا ہے جانے ایسی چیپ لڑکی تمہاری چوائس کب سے ہو گئی' مجھے تو حیرت ہے۔ اور ہاں تم نے شاید نوٹ نہیں کیا' ہر روز ایک نئی گاڑی گیٹ پر اس کی منتظر ہوتی ہے' ایسے جیسے باپ کسی ریاست کا شہنشاہ ہو۔"

وریشہ نے اپنی کئی دنوں کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

"ایک تو تمہاری فطرت میں شک بہت ہے' بالکل بالاج کی طرح۔ تم شاید نہیں جانتیں۔ اس کا بھائی رینٹ اے کار کا بزنس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا گاڑیوں کا شوروم بھی ہے تو ظاہر ہے رنگ برنگی گاڑیاں تو اسے لینے آئیں گی ہی جس دن جو گاڑی فارغ ہوتی ہے ڈرائیور یا بھائی اسے پک کرنے آجاتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو بہرحال مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میرا کام تو صرف تمہیں سمجھانا تھا سو میں نے سمجھا دیا۔ اب آگے تمہاری مرضی ہے جو دل چاہے کرو۔"

وریشہ کا موڈ واضح طور پر خراب ہو چکا تھا۔ اب وہ بنا رکے آگے بڑھ گئی پلوشہ نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہ کی اور ایسا شاید اتنے سالوں میں ان کے درمیان پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی وجہ سے ایک دوسرے سے ناراض ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری وین نہیں آئی۔ آجاؤ میں تمہیں چھوڑ دوں۔"

"نہیں یار! میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔" سبرینہ کی اس آفر پر وہ یک دم ہی گھبرا اٹھی۔

"کیوں میرے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے۔ کم آن یار میں بھی تمہارے جیسی ایک لڑکی ہوں اور ویسے بھی وریشہ آج کالج نہیں آئی۔ تم اکیلی واپس کیسے جاؤ گی جبکہ تم تو شاید کبھی پبلک ٹرانسپورٹ سے گھر نہیں گئی ہو؟"

سبرینہ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن...." کچھ کہتے کہتے وہ رکی۔

"اچھا چلو۔ میں چلتی ہوں۔" پھر جانے کیا سوچ کر اس

نے ہامی بھرلی۔
"تھینک گاڈ جلدی آجاؤ ورنہ میرے بھائی نے تو مجھے زندہ ہی گاڑ دینا ہے۔ بے چارا اپنا کام کاج چھوڑ کر مجھے لینے آیا ہے کیونکہ آج ڈرائیور چھٹی پر ہے۔"
وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جلدی جلدی وضاحت دے رہی تھی جبکہ پلوشہ دل ہی دل میں دعا کررہی تھی کہ بالاج ابھی یونیورسٹی سے گھر نہ آیا ہو اور اسی دھیان میں وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔
"السلام علیکم!" یہ آواز یقیناً "صبورینہ" کے بھائی کی تھی۔
"وعلیکم السلام۔" وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوئی کیونکہ اسے بیٹھنے سے قبل سلام کرنا چاہیے تھا۔
"صبورینہ! تمہاری دوست گونگی ہے کیا؟"
وہ دونوں بہن بھائی آگے بیٹھے جانے کیا باتیں کیے جارہے تھے جبکہ اس کا دھیان مکمل طور پر اپنے گھر اور بالاج میں لگا ہوا تھا جب اچانک ہی صبورینہ کے بھائی کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور ایسا یقیناً "اسے سنانے کے لیے کیا گیا تھا۔
"نہیں یار! گونگی تو نہیں ہے لیکن بولتی ذرا کم ہے۔" صبورینہ نے گردن ترچھی کرکے اس کی جانب دیکھا "اور ویسے بھی میرا ہی قصور ہے۔ میں نے آپ دونوں کا تعارف تو کروایا ہی نہیں' یہ میری دوست ہے پلوشہ عباسی اور پلوشہ یہ میرے کزن ہیں شہروز' آج بھائی گھر نہیں تھے۔ اس لیے مجھے یہ لینے آئے ہیں۔"
"تمہاری دوست کو تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" شہروز نے سامنے والا آئینہ اس پر فوکس کرتے ہوئے کہا تو وہ یک دم ہی گھبرا اٹھی۔
"آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟" صبورینہ حیران تھی۔
"یار! تم سارا دن اس کا اتنا ذکر کرتی ہو کہ اگر تم نہ بھی بتاتیں تو بھی میں جان چکا تھا کہ شی از پلوشہ' لیکن اسے دیکھ کر میں حیران ضرور ہوا کہ یہ اتنے عرصہ سے تمہارے ساتھ ہے لیکن پھر بھی ابھی تک تم نے اسے اپنے جیسا نہ بنایا۔ حیرت ہے یار! یہ تو تم سے بالکل مختلف ہے۔"
"اس میں حیرت والی کیا بات ہے۔ یہ مجھے اسی طرح اچھی لگتی ہے۔ سادہ سادہ سی' سہمی ہوئی ہرنی جیسی۔" صبورینہ نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جبکہ وہ شرمندہ سی ہوگئی۔
"یہ اس طرف دائیں ہاتھ پر لے لیں۔" اس کی نگاہ اچانک ہی اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے روڈ پر پڑی اور پھر اگلے چند ہی لمحوں بعد وہ اپنے گھر کے گیٹ پر کھڑی تھی۔
"آجاؤ صبورینہ! اندر آؤ۔ میری امی سے مل لو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آفر کرنی پڑی۔
"نہیں یار! آج نہیں' آج شہروز کو دیر ہورہی ہے پھر کسی دن آؤں گی او کے۔ ٹیک کیئر یار۔ اللہ حافظ۔"
اس نے کھڑکی سے ہی ہاتھ ملایا اور جلدی جلدی وضاحت کی اور اگلے ہی پل گاڑی زن سے اڑ گئی۔
وہ گیٹ سے اندر داخل ہوگئی اور سامنے خالی پڑے پورچ کو دیکھ کر اس نے سکھ کا سانس لیا۔
"اس کا مطلب ہے' بالاج ابھی تک یونیورسٹی سے گھر نہیں آیا۔"

☼ ☼ ☼
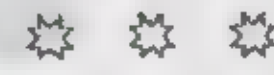
نہانے کے بعد بھاگی نے اسے بلیک کلر کا قیمتی شیفون کا سوٹ پہننے کے لیے دیا جسے دیکھ کر وہ حیران ضرور ہوئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ خاموشی سے کپڑے تبدیل کرلیے۔ بھاگی نے ہی اس کے بالوں میں اچھی طرح کنگھی کرکے انہیں سوکھنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا اور پھر حیرت انگیز طور پر اگلے تیس منٹ میں اس کا کمرا جوس اور پھلوں سے بھر گیا۔ لیڈی ڈاکٹر اس کا چیک اپ کرکے کچھ دوائیں بھی لکھ کردے گئی۔ وہ ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا کھا کر سوگئی شام تک اس کی طبیعت بہتر ہوچکی تھی۔ بھاگی اس کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ آج کافی عرصہ بعد وہ ایک صاف ستھرے ہوادار کمرے کے آرام دہ بستر پر تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ

پہلے سے کافی بہتر محسوس کررہی تھی۔ ابھی اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ داخلی دروازہ کھول کر صندل اندر داخل ہوئی دلہناپے کے نئے روپ کے ساتھ وہ خاصی نکھری نکھری سی لگ رہی تھی' جانے کیوں صندل کو اتنے عرصہ بعد اپنے سامنے دیکھ کر بھی خوشی کے دل میں محبت کا وہ احساس نہ جاگا جو گزرے دنوں کی یادگار ہوا کرتا تھا۔ ایک عجیب سی بے حسی نے اس کے پورے وجود کے گرد احاطہ کر رکھا تھا' کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر نے لے لی ہے۔ ان ہی پتھریلے تاثرات کے ساتھ چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ سیدھی ہو بیٹھی۔
"کیسی ہو خوشی؟" صندل اس کے قریب آتے آتے جھجک کر رک گئی شاید وقت نے ان کے درمیان ایک نامعلوم سا فاصلہ کھینچ دیا تھا۔
"ٹھیک ہوں۔" وہ دھیمے سے بولی' صندل اس کے قریب ہی بیڈ کی پائنتی پر بیٹھ گئی اور کئی خاموش لمحے بنا دستک دیے ان کے درمیان سے گزر گئے بالکل ایسے جیسے دو اجنبی شخص موضوع ڈھونڈ رہے ہوں۔ بات شروع کرنے کے لیے صندل بھابھی! آپ نے مجھ سے کوئی بات کرنی ہے؟" اس نے اپنے تئیں صندل کی مشکل کو آسان کردیا۔
"آں۔ ہاں۔" صندل ایک دم چونک سی گئی اور خالی خالی نظروں سے خوشی کی جانب دیکھا جو سوالیہ نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
"وہ ایسا ہے خوشی! اس ہفتہ زریاب پاکستان آرہا ہے۔"
یہ خبر یقیناً "اس کے لیے نئی تھی لیکن پھر بھی اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا بلکہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنے قریب بیٹھی صندل کی جانب تکتی رہی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ صندل آگے کیا کہنا چاہ رہی ہے۔
"دیکھو خوشی! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ جنید عباسی نے تمہاری بازیابی کے لیے تمہارے باپ بھائیوں پر مقدمہ دائر کررکھا ہے۔ حویلی میں دو تین دفعہ پولیس آچکی ہے اور اگلے ماہ ہمیں ہر حال میں تمہیں عدالت میں پیش کرنا ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ اس کی منکوحہ کو حویلی والوں نے قتل کردیا ہے۔" وہ ذرا سی ذرا سا سانس لینے کو رکی اور اک نگاہ خوشی کے سپاٹ چہرے پر ڈالی۔
"پھر۔۔۔؟" اس کی پل بھر کی خاموشی نے خوشی کو بے چین کردیا وہ جلد از جلد جاننا چاہتی تھی کہ اس ساری تمہید کا اصل مقصد کیا ہے۔
"وہ ایسا ہے کہ خوشی اگر تم چاہو تو سب کچھ پہلے جیسا ہوسکتا ہے۔"
"میں سمجھی نہیں' آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ صاف صاف بات کریں۔"
"تم کو زریاب گیلانی سے نکاح کرنا ہوگا۔" صندل نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی۔
"نکاح۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" صندل کی بات سنتے ہی اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا۔ "آپ اچھی طرح جانتی ہیں میرا نکاح جنید عباسی کے ساتھ ہوچکا ہے اور قانوناً "اور شرعاً" میں اس کی بیوی ہوں اور جب تک یہ نکاح ختم نہ ہوگا۔ میں دوسری شادی نہیں کرسکتی۔"
دکھ اور صدمہ سے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں پانی سا بھر آیا جسے دیکھ کر صندل کے دل کو کچھ ہوا ضرور لیکن وہ نظر انداز کرگئی کیونکہ یہ وقت جذباتی ہونے کا نہ تھا۔
"آہستہ بولو خوشی! باہر تمہارے دونوں بھائی موجود ہیں۔"
اس کی تیز آواز نے صندل کو خوف زدہ کردیا اور وہ جلدی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے خاموش کرواتے ہوئے بولی جبکہ اس کی نگاہیں مسلسل دروازے کی جانب لگی ہوئی تھیں۔
"میری بہن تم نہیں جانتیں' تم کس قدر مشکل میں گھر چکی ہو اور اس مشکل سے نکلنے کا واحد حل یہ ہی ہے کہ تم زریاب سے نکاح کرلو کیونکہ تمہارے باپ اور بھائیوں کی بات مان لینے میں ہی تمہارا بھلا ہے ورنہ تم نہیں جانتیں' یہ لوگ تمہارا کیا حشر کرنے والے ہیں۔" صندل کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے

لگے اور وہ خوف زدہ آواز میں خوشی کو سمجھانے لگی۔
"کچھ بھی ہو جائے بھابھی! میں نکاح پر نکاح نہیں کروں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"
"لیکن خوشی تمہارا بھائی کورٹ میں تحریری بیان جمع کروا چکا ہے۔ جس کے مطابق تم شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ ملک سے باہر ہو انہوں نے تمہارے اور جنید کے نکاح کو کورٹ میں چیلنج کر رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جنید کی طرف سے جمع کروایا گیا نکاح نامہ جعلی ہے اور تمہارا نکاح اس نکاح سے قبل زریاب نگمسی کے ساتھ ہو چکا تھا۔" اب صندل کے لیے تفصیل بتانا ناگزیر ہو چکا تھا۔ "اپنی عزت کو بچانے کے لیے اس سے بہتر راستہ ہمارے لیے کوئی نہ تھا۔"
"آپ کے نزدیک اہمیت صرف عزت کی ہے۔" دکھ سے اس کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی اور اس نے اپنا ہاتھ صندل کی گرفت سے چھڑوالیا۔
"شریعت کی کوئی اہمیت نہیں ہے آپ لوگوں کے نزدیک۔ آپ نہیں جانتیں، نکاح پر نکاح کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ کیوں نہیں ڈرتے بھابھی! آپ لوگ اللہ کے عذاب سے۔ ایسا نہ کریں "اس کی لاٹھی بے آواز ہے جب پڑتی ہے تو بڑے بڑے سورماؤں کو زمین نگل جاتی ہے بھابھی!"
وہ صندل کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے رو پڑی۔
"بس بابا بس۔ اب زیادہ ڈرامہ بازی نہ کرو۔ جو ہم نے کہا ہے۔ وہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا کیونکہ اسی میں تمہاری بہتری ہے ورنہ یاد رکھو۔ تمہیں مار کر تمہاری لاش کمرہ عدالت میں لے جاؤں گا' کاری کردوں گا تمہیں' تمہارے جیسی بدکردار بن کے ہونے سے تو اچھا ہے کہ تمہیں مار کر زمین میں گاڑ دیا جائے اور میں تو یقیناً" ایسا ہی کرتا اگر اس حرامی نے ہمارے اوپر کیس نہ کیا ہوتا۔ میں تو اسے ہی کب کا مار چکا ہوتا اگر اس نے اپنی جان کی حفاظت کے لیے کورٹ میں اسائنمنٹ نہ جمع کروائی ہوتی۔ چھوڑوں گا تو خیر اسے میں اب بھی نہیں۔ مار کر ہی سکھ کا سانس لوں گا۔"
جانے کمرے میں کب فلک شیر داخل ہوا تھا اس کی پھنکارتی ہوئی نفرت بھری آواز ہتھوڑے کی طرح خوشی کی سماعتوں پر برس رہی تھی اور وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی جبکہ صندل گھبراہٹ میں بیڈ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔
وہ خوشی کے قریب آیا اور بالوں سے پکڑ کر اسے گھسیٹ کر بیڈ سے اتار دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا اٹھی۔
"دل تو چاہتا ہے، تجھے آج ہی آگ لگا کر جلا ماروں بلکہ اس کمرے کو ہی تیری قبر بنا دوں لیکن کیا کروں۔"
اس نے خوشی کے بالوں کو چھوڑ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا وہ زمین پر گر گئی۔ اس کا سر بیڈ کے کنارے سے جا لگا' صندل اور بھاگی کے سامنے اپنی شدید توہین کا احساس اسے خون کے آنسو رلا گیا۔
"چلو بھابھی... !" اپنی ماں جائی پر ایک نفرت انگیز نگاہ ڈال کر وہ صندل سے مخاطب ہوا جو سر جھکائے وہیں کھڑی تھی کیونکہ وہ بھی اسی حویلی کی بیٹی تھی اور جانتی تھی کہ اس کی حیثیت بھی خوشی جیسی ہی ہے' یہ ہی وجہ ہے کہ اس نے آگے بڑھ کر فلک شیر کو روکنے کی کوشش نہ کی اور خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔
ان کے جاتے ہی بھاگی تیزی سے آگے بڑھی اور زمین پر پڑی خوشی کو اٹھایا۔ خوشی بھاگی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی' ایسے میں بھاگی بھی اپنی مالکن کے دکھ کو محسوس کر کے اس کے ساتھ رو دی۔

☆ ☆ ☆

زریاب پاکستان واپس آچکا تھا اور اسے حیرت تھی کہ کس طرح اس جیسا پڑھا لکھا اور فارن پلٹ شخص ایسا غیر شرعی کام کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو خوشی کو ایسا محسوس ہوتا کہ صرف جنید عباسی کو نیچا دکھانے کے لیے کیے جانے والے ایک عمل نے اس کے سارے خاندان کو یکجا کر دیا تھا ورنہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اس سارے قصہ کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا قصہ بھی ختم کر دیا جائے گا جب دل چاہے گا

اسے مار کر کسی اندھے گڑھے میں گاڑ دیا جائے گا۔ اگر میری موت ان کی غیرت کی سربلندی کے لیے ضروری ہے تو پھر اپنی زندگی کی بقا کے لیے آخری وقت تک کوشش کرنا بھی میرا انسانی حق ہے۔ میں اس طرح نہیں مروں گی ایک کتے کی موت۔ مجھے کوشش کرنا ہوگی۔ آخری وقت تک جب تک میری زندگی کی ایک سانس بھی باقی ہو۔
اور یہ ہی وہ فیصلہ تھا جس نے خوشی کے خوابیدہ ذہن کو ایک جھٹکے سے بیدار کر دیا اب اسے تلاش تھی ایک ایسی درز کی جہاں سے آنے والی روشنی کی ننھی سی کرن اس کی بقا کا پیغام لے کر آئے اور بالآخر اسے وہ درز مل ہی گئی۔

☆ ☆ ☆

جانے اس کا موبائل کب سے بج رہا تھا اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر یہاں وہاں ہاتھ مارتے ہوئے تکیے کے نیچے سے اپنا موبائل نکالا اور یس کا بٹن دبا کر کان سے لگا لیا۔
"ہیلو!" نیند میں ڈوبی اس کی آواز بڑی مشکل سے حلق سے نکلی۔ "عماد بات کر رہا ہوں۔"
"جانتی ہوں۔" عماد کی آواز سنتے ہی اس کی نیند اڑن چھو ہو گئی اس نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ شاکڈ رہ گئی۔
"او مائی گاڈ! باہر تو گہرا اندھیرا چھا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے' رات کافی سے زیادہ ہو چکی ہے' حیرت ہے آج مجھے مما نے جگایا بھی نہیں۔"
"میں بھی کافی دیر سے ٹرائی کر رہا ہوں' اور حیران تھا کہ تم دس بجے تک سو رہی ہو ورنہ یہ وقت تو تمہاری انجوائے منٹ کا ہوتا ہے۔ بہرحال یہ سب فالتو باتیں چھوڑو اور پہلے یہ بتاؤ میرے کام کا کیا ہوا!؟"
"ظاہر ہے۔ آج کل صرف تمہارے "کام" پر ہی کام کر رہی ہوں۔" ریا نے لفظ "کام" پر زور دیتے ہوئے کہا۔
"بس اب تھوڑا ہی وقت ہے۔ جلد ہی تمہاری مرضی کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔"
"اینی وے جو بھی ہے بس اب جلد از جلد میرا کام ہو جانا چاہیے تقریباً" چھ ماہ ہو گئے ہیں مجھے تمہیں ایڈوانس دیے ہوئے اور اب اس سے زیادہ انتظار کرنا میرے لیے تقریباً" ناممکن ہے۔"
"پلیز عماد! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے پیشے میں کسی طرح کی دھوکہ دہی شامل نہیں ہے آج اپنی فطرت کے برخلاف اگر میں کسی کو دھوکا دے رہی ہوں تو وجہ تمہیں سمجھ جانا چاہیے یقیناً" میں یہ سب پیسے کے لیے نہیں کر رہی بلکہ تمہاری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کر رہی ہوں۔"
"یہ الو بنانے کے لیے تمہیں میں ہی ملا ہوں میں تمہیں اور تمہاری محبت کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم جیسی عورتیں سوائے پیسے کے کسی کی نہیں ہوتیں یہ فون میں نے تمہاری رام کہانی سننے کے لیے نہیں کیا بلکہ اپنے کام کے لیے کیا ہے' جس کی منہ مانگی قیمت تم نے مجھ سے لی ہے لہٰذا اب تمہاری ذمہ داری ہے کہ میرا کام جلد از جلد ہو۔"
اور یہ کہہ کر ہی دوسری طرف لائن بے جان ہو گئی یقیناً" عماد نے فون بند کر دیا تھا' "الو کا پٹھا" زیر لب اسے گالی دیتے ہوئے ریا نے فون بیڈ پر پھینکا اور غصہ کی حالت میں باتھ روم کی جانب چل دی۔

☆ ☆ ☆

"سائیں! آپ کو بڑے سائیں نے یاد فرمایا ہے۔"
وہ جیسے ہی جیپ سے نیچے اترا' سامنے کھڑے اسمٰعیل نے اسے بابا جان کا پیغام پہنچا دیا' وہ پیغام سنتے ہی سمجھ گیا کہ اتنی رات کو باہر موجود اسمٰعیل شاید اسی کا منتظر تھا۔ سر سے اثبات کا اشارہ کر کے وہ دالان عبور کرتا ہوا اوطاق کے بند دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کا منتظر باپ یقیناً" اسی اوطاق میں موجود ہوگا اور دروازے کو خاموشی سے دھکیل کر اندر داخل ہوتے ہی اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی سامنے ہی لکڑی کی بڑی سی کرسی پر فلک

شیر نیم دراز تھا۔

"آؤ بابا آؤ۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

دروازہ کھلنے کی مدھم سی آواز سنتے ہی وہ یک دم سیدھا ہو بیٹھا۔ عماد نہایت خاموشی سے چلتا ہوا اپنے باپ کی کرسی کے پاس رکھے موڑھے پر جا بیٹھا۔ وہ بنا پوچھے جانتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے کیوں بلایا ہے، پھر بھی خاموش رہ کر اپنے باپ کے سوال کا منتظر تھا لیکن دوسری طرف جانے فلک شیر کن خیالوں میں گم ہو چکا تھا۔

"بابا جان! آپ نے مجھے بلایا تھا؟" کچھ دیر کے انتظار کے بعد عماد نے آہستہ سے اپنے باپ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہاں بچہ! تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہارا باپ کیوں بے سکون ہے۔ آج چھبیس سال ہو گئے ایک ایک لمحہ ایک ایک گھڑی میری اس بے سکونی کی گواہ ہے۔"

فلک شیر نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے عماد پر ایک نظر ڈالی جو نہایت توجہ سے اپنے باپ کی بات سن رہا تھا۔

"میری اس بے سکونی کا صرف ایک ہی حل ہے، جو تم جانتے ہو۔"

"جی بابا! میں آج بھی اسی سلسلے میں کراچی گیا تھا۔" اس نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

"یہ بات سنتے ہوئے آج مجھے پورا ایک سال ہو چکا ہے عماد! اب مجھے نتیجہ چاہیے جلد از جلد۔ اب مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو رہا ہے۔"

علی شیر کی آواز غصہ کی شدت سے یک دم ہی بلند ہو گئی۔

"میں اپنی موت سے قبل اپنا بدلہ چاہتا ہوں بالکل ویسا ہی بدلہ جیسا آج سے چھبیس سال پہلے عباسی خاندان نے ہمیں بے عزت کر کے کیا تھا۔ میں جب تک ان کی بے عزتی اور جگ ہنسائی نہ دیکھوں گا، سکون سے نہ مر سکوں گا اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتے ہو؟"

غصہ کے ساتھ ساتھ نفرت کی شدت نے فلک شیر کے سرخی مائل چہرے پر سیاہی پھیر دی تھی۔ اس کی آواز میں سانپ کی سی پھنکار شامل ہو گئی۔

"مجھے جلد از جلد وہ لڑکی چاہیے یا کچھ ایسا جس سے عباسی خاندان ساری دنیا میں ذلیل و خوار ہو جائے۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اس کے کھڑے ہوتے ہی عماد بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"بس بابا! اب آپ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

اپنے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ اسے تسلی دیتے ہوئے عماد نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب اسے اپنا اگلا قدم جلد ہی اٹھانا ہو گا اگر ربا نے اس کی مرضی کا رزلٹ اسے نہ دیا تو پھر اسے کوئی اور راستہ دیکھنا ہو گا لیکن جلد از جلد کیونکہ اب وہ مزید دیر کر کے اپنے باپ کی ناراضی مول نہیں لے سکتا تھا۔

"مجھے امید ہے کہ اگلی دفعہ جب میں تمہیں بلاؤں تو یقیناً" تمہاری کامیابی کی مبارک باد دینے کے لیے بلا یہ کہہ کر فلک شیر اوطاق سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"تو یہ کنفرم ہے کہ تم میرے گھر میلاد پر نہیں آرہیں۔" سبرینہ نے مایوسی سے سوال کیا۔

"نہیں یار! مجھے پتا ہے کہ مجھے اجازت نہیں ملے گی اس لیے میں پوچھ کر اپنے آپ کو ڈی گریڈ نہیں کرنا چاہتی۔"

"پھر بھی ایک دفعہ اپنی امی سے پوچھ کر تو دیکھ لو۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہے سبرینہ! میں اپنی امی کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ کبھی اجازت نہیں دیں گی اور پھر خوامخواہ کا انکار سن کر میری امید ٹوٹے میں ایسی کوئی امید باندھتی ہی نہیں ہوں۔" پلوشہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"حیرت ہے یار تم کس صدی میں زندہ ہو؟ اللہ جانے تمہارے گھر والے کس قسم کے لوگ ہیں جو تم پر اتنا اعتماد بھی نہیں کرتے کہ تم اپنی دوست کے گھر میلاد پر جا سکو۔" سبرینہ کو بے حد دکھ ہوا۔

"وہ میرے بڑے ہیں اور ہر معاملے کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں ہو سکتا ہے ان کے خیال میں میری اسی میں بہتری ہو۔" وہ بظاہر اطمینان سے بولی۔

"پتا نہیں اس طرح وہ تمہاری کون سی بہتری کر رہے ہیں۔ ہمارے گھر تو ہر سال یہ تقریب بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے بڑے بڑے نعت خواں آتے ہیں تم ایک دفعہ شریک ہو کر دیکھتیں تو کتنا مزا آتا ہے لیکن چلو چھوڑو جانے دو جیسی تمہاری مرضی۔"

سبرینہ نے گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے پلوشہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آئی۔ سامنے ہی اس کی گاڑی کھڑی تھی۔

"اوکے اللہ حافظ یار! میرا خیال ہے تم کچھ دیر باہر کھڑی ہو کر انتظار کر لو تمہاری وین بھی بس آنے ہی والی ہو گی۔"

اس کے گاڑی کی جانب بڑھتے ہی پلوشہ کی وین بھی سامنے آگئی اور وہ سبرینہ کو ہاتھ ہلاتی ہوئی اپنی وین میں سوار ہو گئی اور پھر سارے راستے وہ یہ ہی سوچتی آئی کہ کیا تھا جو اگر میں سبرینہ کے گھر میلاد میں شریک ہو سکتی؟ اسے یقین تھا کہ کبھی بھی اس کی امی اسے بالاج سے مشورہ لیے بغیر میلاد میں جانے کی اجازت نہ دیں گی اور بالاج یقیناً" منع کر دیتا یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

☼ ☼ ☼

آرزو ارمان چاہت مدعا کچھ نہیں
تھا بہت کچھ پاس لیکن اب رہا کچھ بھی نہیں
کیسی کیسی قیمتی چیزوں سے اٹھا ہے حجاب
دوستی دل جوئی ہمدردی وفا کچھ بھی نہیں

وہ ابھی ابھی نہا کر کپڑے تبدیل کر کے آئی تھی۔ اس نے نماز پڑھنے کے لیے اپنے دوپٹہ کو اچھی طرح سر پر لپیٹا ہی تھا کہ باہر کا دروازہ کھول کر صندل اندر داخل ہوئی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر خوشی کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ اس کا دل کسی انہونی کے احساس سے دھڑک اٹھا۔ وہ جانتی تھی کہ صندل کی آمد بے مقصد نہ تھی اور جلد ہی اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

"دیکھو خوشی! کل رات تمہارا اور میر زریاب عمسی کا نکاح ہے جس میں دو چار لوگ بابا سائیں کے جاننے والے بھی ہوں گے اور مجھے امید ہے کہ تم اپنے لیے اور ہمارے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کرو گی کیونکہ تمہاری وجہ سے ہم پہلے ہی بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں۔" صندل صرف کھڑے کھڑے اسے سمجھانے آئی تھی۔

"لیکن بھابھی! اگر عدالت میں ثبوت ہی پیش کرنا ہے۔ تو پھر باقاعدہ نکاح کی کیا ضرورت ہے؟ آپ پیپرز لے آئیں۔ میں سائن کر دوں گی۔" صندل کی بات سن کر وہ حیرت سے اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔

"نہیں۔ تمہارا میر زریاب کے ساتھ باقاعدہ نکاح ہو گا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی تمہارے پہلے نکاح کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ جو کچھ تم نے کیا صرف خاندان والوں کی بدنامی اور رسوائی کے لیے کیا اور اب تمہاری زندگی کی بقا کے لیے یہ نکاح بہت ضرور ہے تم شکر ادا کرو کہ میر زریاب تمہیں رکھنے کو تیار ہے وہ تمہارے پہلے نکاح کو جوانی کی ایک بھول سمجھ کر بھلانے پر بھی رضامند ہے۔ وہ تمہیں اپنا ساتھ لندن لے جائے گا کیونکہ اسی طرح تم اپنے بھائیوں کے قہر و غضب سے محفوظ رہ سکو گی۔"

صندل کے الفاظ تھے یا کوئی پگھلا ہوا سیسہ، خوشی کو محسوس ہوا کہ اگر وہ مزید سنتی رہی تو شاید اپنے حواس کھو بیٹھے گی۔ "پلیز بھابھی بس کر جائیں۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"ہاں خوشی! میں صرف وہ جانتی ہوں جو ہمارے خاندان کے مرد جانتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ جاننے کی نہ ہمیں اجازت ہے اور نہ ہی ضرورت۔"

"یا میرے اللہ! یہ سب لوگ کس قدر جاہل ہیں بغیر طلاق اور عدت کے میرا دوسرا نکاح کر رہے ہیں۔

اے میرے خدا تو گواہ رہنا اگر میں خود کو اس گناہ آلود زندگی سے محفوظ نہ رکھ سکی تو میری خودکشی کو حرام موت نہ سمجھنا میرے مالک اس مشکل گھڑی میں میری مدد فرما۔"

اس خیال کے دل میں آتے ہی خوشی کی اس نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جو اپنے خاندان اور رسم و رواج کے خلاف اس کے دل میں پنپ رہی تھی لیکن اس وقت زبان سے کچھ بھی کہنا بےکار تھا کیونکہ وہ اس کا انجام جانتی تھی ابھی۔ ایک دن قبل ہی اسے یہ سب فلک شیر سمجھا چکا تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھی کہ بھاگی اس کے لیے کھانا لے آئی۔ اپنی پیاری مالکن کو اس اجڑی ہوئی حالت میں دیکھ کر اس کا دل بھر آیا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

"خوشی بی بی! کپڑے نکال دوں بدل لیں۔"

"تم میرے کپڑوں کی فکر مت کرو بھاگی! اگر کر سکتی ہو تو میرا ایک کام کر دو۔"

آر یا پار یہ فیصلہ بہرحال اسے آج ہی کرنا تھا کیونکہ ہر گزرتا ہوا دن اسے موت کے قریب لے جا رہا تھا۔

"جی بی بی جی! بولیں۔" بھاگی باہر کے ادھ کھلے دروازے پر ایک نظر ڈال کر خوشی کے مزید قریب ہو گئی۔

"ایک کاغذ اور پین لا سکتی ہو؟" اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ بھاگی نے یک دم گھبرا کر کمرے کے بیرونی دروازے پر ایک نظر ڈالی لیکن آج شاید نکاح کے متوقع انتظامات کے سبب ان سب کا دھیان اس کمرے اور خوشی سے ہٹ چکا تھا۔

"میں کوشش کرتی ہوں۔"

"کوشش نہیں وعدہ۔" اس نے اپنے ہاتھ کی دوسری انگلی میں موجود انگوٹھی اتار کر بھاگی کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ بھاگی نے تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ انگوٹھی بیڈ پر گر گئی۔

"یہ کیا بی بی جی! آپ نے کیا مجھے اتنا ہی ذلیل سمجھ لیا ہے کہ میں آپ کے ایک ذرا سے کام کے لیے یہ انگوٹھی رکھ لوں گی۔" دکھ اس کے لہجہ میں بول رہا تھا۔

"آپ یقین جانیں میں اگر جان دے کر بھی آپ کے کسی کام آ سکوں تو یہ میرے لیے ایک اعزاز کی بات ہو گی۔ آپ فکر نہ کریں چھوٹی بی بی! میں ابھی پین اور کاغذ لے کر آتی ہوں۔"

اور پھر جلد ہی اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور جانے کہاں سے اپنے گریبان میں چھپا کر ایک پین اور کاغذ کا ٹکڑا لے آئی۔ خوشی کو یہ سب تھماتے ہوئے اس کے ہاتھ مسلسل خوف سے کانپ رہے تھے جبکہ خوشی بھی بے حد خوف زدہ تھی اس نے جلدی جلدی بنا وقت ضائع کیے کاغذ کے پرزے پر جنید کا نمبر لکھا اور پرچہ بھاگی کی جانب بڑھایا۔

"یہ ایک نمبر ہے تم اس پر فون کر کے صرف یہ بتا دو کہ میں زندہ ہوں اور جب آٹھ تاریخ کو میں عدالت میں پیشی کے لیے آؤں تو تمام انتظام کر کے آنا مجھے لے جانے کے لیے۔"

"ٹھیک ہے بی بی...!"

بھاگی نے کوئی بھی دوسرا سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر خوشی نے اعتبار کیا تھا اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا اب چاہے وہ اپنی جان سے جاتی لیکن مالکن کے اعتماد کو توڑنا کبھی گوارا نہ کرتی۔

☼ ☼ ☼

"یہ آج تم کس کی گاڑی میں گھر آئی ہو؟"

صبینہ کے ساتھ آتے ہوئے جس بات کا خدشہ کا شکار تھا وہ بالآخر سامنے آ ہی گیا نہ صرف بالاج گھر پر تھا بلکہ ستم بالائے ستم گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے برآمدے کی سیڑھی کے قریب ہی کھڑا تھا سیاہ ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس اس کا سرخ و سفید رنگ غصہ سے دہک رہا تھا اس کی تیز آواز سنتے ہی پلوشہ کانپ اٹھی اور اس کی آواز حلق میں ہی کہیں پھنس گئی جسے بمشکل اس نے برآمد کیا۔

"وہ میری دوست تھی۔"

"یہ تم نے ایسی دوستیں کہاں سے بنا لیں؟ جو ہر روز ایک نئی گاڑی میں تمہیں چھوڑنے آتی ہیں۔"

وہ سیڑھی سے اتر کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ "او میرے خدا یہ شخص کس قدر باخبر ہے اور میں آج تک یہ سمجھتی رہی کہ اسے میرے آنے جانے کا علم ہی نہیں ہے۔"

"اب کیا سوچ رہی ہو جو میں پوچھ رہا ہوں۔ اس کا جواب دو۔"

وہ غصہ سے دھاڑا اس کی دھاڑ نے پلوشہ کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ اسے لگا کہ وہ ابھی گر جائے گی وہ تو بھلا ہوا کہ بالاج کی تیز آواز سنتے ہی امی اندر سے باہر آ گئیں اور حیرت زدہ اپنی جگہ پر کھڑی ان دونوں کو تکنے لگیں۔

"تمہیں ہمیشہ منع کرتا ہوں۔ اجنبی لوگوں سے دوستیاں نہ کرو اور تم ہو کہ بغیر کسی سے پوچھے انجانے لوگوں کے ساتھ گاڑیوں میں گھوم رہی ہو۔" وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا اس کے مزید نزدیک آ گیا جبکہ خوف سے اس کی ٹانگیں لرز اٹھیں۔

"کیا ہوا بالاج خیریت تو ہے؟" بالآخر لبنیٰ سے نہ رہا گیا اور انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر بالاج کو بازو سے تھام لیا۔

"اسی سے پوچھ لیں یہ آپ کو زیادہ بہتر طور پر بتا سکے گی۔"

وہ اس پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتا ہوا باہر نکل گیا جبکہ وہ اپنی جگہ حیران و پریشان سی کھڑی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وین نہ آنے کی صورت میں اگر وہ صبینہ کے ساتھ گاڑی میں گھر آ ہی گئی تو اس میں کیا قیامت تھی بالاج کے ــــــ اتنا غصہ کرنے کی کوئی بھی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی اور ایسے میں جب لبنیٰ نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو وہ بلک بلک کر رو دی۔ اپنی ذات پر اس قدر بے اعتباری نے اس کے حساس دل کو دکھی کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور جانے کیسے بھاگی نے بارہ گھنٹے کے اندر اندر اس کا پیغام جنید تک پہنچا دیا۔

"اس سے کہنا کہ اپنا خیال رکھے۔" جنید کے اس جوابی پیغام نے اسے زندگی کی نوید سنا دی۔

"انہوں نے کہا ہے کہ میں چھ تاریخ کو انہیں پھر سے فون کروں، وہ آپ کے لیے کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔" بھاگی نے آہستہ آہستہ اسے بتایا اس تمام عرصہ میں وہ مسلسل ادھ کھلے دروازے سے باہر دیکھتی رہی۔

"ٹھیک ہے۔ تم فون کر لینا۔" خوشی نے سامنے لگے کیلنڈر پر ایک نظر ڈالی جہاں 29 کا ہندسہ چمک رہا تھا درمیان میں صرف نو دن تھے۔ نو دن بعد فیصلے کی گھڑی آنے والی تھی۔ زندگی یا موت کوئی ایک اس کے مقدر میں درج ہو جاتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ناکامی کی صورت میں صرف اور صرف موت ہی اس کا مقدر بننے والی تھی لیکن اب وہ ڈر خوف کی کیفیت سے نجات پا چکی تھی اور فیصلہ کر چکی تھی کہ عدالت میں صرف وہ بیان دے گی جس کا حکم اس کا دل دے گا اور جو سچ ہو گا۔ سچ کے علاوہ اسے کچھ نہ کہنا تھا اب اگر اسے انتظار تھا تو صرف جنید کے حکم کا کہ وہ اس سلسلے میں بھاگی کو کیا ہدایت دیتا ہے آج رات اس کا نکاح تھا ایک ایسا نکاح جس کی قانونی اور شرعی کوئی حیثیت نہ تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نکاح پر نکاح کا عمل قطعاً غیر اسلامی اور جاہلانہ طرز عمل ہے لیکن اس کے باوجود وہ مجبور تھی۔ اس مسئلے پر جتنا وہ احتجاج کر سکتی تھی کر چکی تھی اور اب مزید کوئی فائدہ نہ تھا، اسی لیے اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔

وہ جان چکی تھی کہ اگر آج اس کے بھائی پر جنید عباسی نے حبس بے جا اور اندیشہ قتل کا کیس دائر نہ کر رکھا ہوتا تو شاید آج وہ زندہ بھی نہ ہوتی۔ اس کی یہ زندگی محض کسی مصلحت کے تحت تھی پہلے پہل تو اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اگر زریاب اس سے شادی کے لیے تیار ہے تو کیوں یہ لوگ پہلے جنید عباسی سے طلاق اور پھر عدت کے بعد شادی کا سارا عمل قانونی اور شرعی طور پر انجام نہیں دیتے؟ لیکن آہستہ آہستہ وہ سمجھ گئی کہ اس کے بھائی نے جنید پر جعلی نکاح کا جوابی

کیس دائر کر رکھا ہے اب اگر وہ طلاق کا مطالبہ کرتے ہیں تو عدالت انہیں جھوٹا قرار دے دے گی اور ان کا مقصد محض اپنی عزت بچانا تھا اور جنید عباسی کو جھوٹا قرار دینا تھا اور اپنی اس جھوٹی شان و شوکت اور عزت کے لیے اسے بھینٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ نکاح نامہ پر تاریخ چھ ماہ قبل کی ڈالی گئی تھی۔ وکیل اور مولوی صاحب کی ملی بھگت اور پیسوں کے زور پر تمام عمل مکمل کرلیا گیا تھا۔ اب انتظار تھا صرف آٹھ تاریخ کا جس دن عدالت میں خوشی نے پیش ہو کر بیان دینا تھا کہ وہ جنید عباسی کو نہیں جانتی بلکہ زریاب اس کا شوہر ہے اور شاید جنید عباسی نے یہ جعلی نکاح نامہ اپنی کسی دشمنی کا انتقام لینے کے لیے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ فی الحال اپنے بھائیوں کی ہر بات خاموشی سے مانتی چلی جائے اور ایسا ہی وہ کر رہی تھی اور سب کچھ اس کے بھائیوں اور باپ کی مرضی کے مطابق ہوتا چلا گیا لیکن جب نکاح کے بعد اس نے رخصتی کا سنا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس قسم کی صورت حال سے بھی دوچار ہوا جا سکتا ہے اور اب اپنی عزت بچانے کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کرنا پڑتا' جائز تھا۔ بھاگی شام سے ہی اس کے ساتھ تھی جب وہ زریاب کے ساتھ رخصت کی گئی تو بھی بھاگی کو ہی اس کے ہمراہ کر دیا گیا جبکہ اس کے دونوں بھائی فلک شیر اور علی شیر نہایت ہی پتھریلے تاثرات کے ساتھ اس سے کچھ قدم کے فاصلے پر موجود رہے لیکن بالکل ایسے جیسے ان کا کوئی بھی رشتہ خوشی سے نہ ہو۔ انہوں نے زریاب سے گلے مل کر اپنی بہن پر ایک نظر بھی ڈالنا گوارا نہ کیا۔ وہ بھی نہایت خاموشی سے خود کو بمشکل سنبھالتی ہوئی بھاگی کا سہارا لیے باہر کاریڈور تک آگئی جہاں زریاب اپنی گاڑی کے ساتھ اسی کا منتظر تھا اور اس وقت جب وہ پچھلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونا چاہتی تھی اچانک ہی اسے اپنے عقب میں اپنے باپ ابراہیم مگسی کی آواز سنائی دی۔

"ایک منٹ رکو زریاب! مجھے خوشنما سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے خوشی ٹھٹک کر رک گئی اور اس نے اپنے قدم واپس موڑ لیے۔ آج اتنے ماہ بعد اپنے باپ کی آواز سن کر اس کا دل بھر آیا اسے لگا شاید اس کے باپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو' شاید وہ اپنی بیٹی سے وقت رخصت ملنے آیا ہو۔ وہ منتظر تھی۔ کب اس کا باپ آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھے اور وہ اس کے سینے سے لگ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے زریاب آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا جبکہ بھاگی بھی اسے دروازے کے قریب تنہا چھوڑ کر جیپ کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ رات کی تاریکی میں لان پر بنی روش پر وہ تنہا کھڑی تھی جب ابراہیم مگسی دھیرے دھیرے چلتا اس کے قریب آیا۔

"میں نے قسم کھائی تھی۔ اپنی زندگی میں کبھی تمہارا منہ دوبارہ نہ دیکھوں گا لیکن آج وقت کے ہاتھوں میں مجبور ہو گیا اور مجھے اپنی قسم توڑنی پڑی ورنہ تم جیسی حیا باختہ لڑکی کی شکل بھی شاید میں کبھی نہ دیکھتا۔ تم جیسی لڑکیاں جو چڑھتی جوانی کے جوش میں اپنے باپ بھائیوں کو دنیا کے سامنے ذلیل کرواتی ہیں' زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔"

وہ بغیر کسی تمہید کے بول رہا تھا۔ اس کے لہجہ کی سفاکی نے خوشی کے رگ و پے میں جھرجھری سی بھر دی اور ایک سرد لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔

"لیکن جانے کیوں میر زریاب تمہارے قتل کے فیصلے کے خلاف ہمارے سامنے آکھڑا ہوا اور ہمیں اس کی بات ماننی پڑی۔ وہ جیسا چاہے تمہارے ساتھ سلوک کرے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا اور تم بھی یہ بھول جانا کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں کیونکہ تمہارے جیسی لڑکی کو بیٹی کہتے ہوئے بھی ہمیں شرم آتی ہے اب جاؤ لیکن یاد رکھنا جب تک زندہ ہو' کبھی ہمیں اپنا منحوس چہرہ نہ دکھانا اور ہاں بابا زریاب۔۔۔"

اس سے بات کرتے کرتے ابراہیم مگسی نے اچانک ہی زریاب کو پکارا۔

"جی بابا سائیں!" وہ فوراً جیپ سے نیچے اتر کر اس کے باپ کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اس کا انداز نہایت ہی مودبانہ تھا۔

"بابا! جب تک یہ کیس چلے ٹھیک ہے۔ جب ختم ہو جائے تو جو تمہارا دل چاہے وہ سلوک اس لڑکی سے کرنا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ چاہو تو مار کر کہیں گاڑ دینا یا پھر گھر کے کسی کونے میں ڈال کر بھول جانا۔"

زریاب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولتا ہوا ابراہیم مگسی کا لہجہ اس نفرت کا غماز تھا جو اس کے دل میں خوشی کے لیے موجود تھی وہ بڑی مشکل سے اپنی لاش کو گھسیٹتی ہوئی زریاب کی ہمراہ — اس گھر تک پہنچی جو شاید زریاب نے حال ہی میں خریدا تھا وہاں اس کے استقبال کے لیے صرف پھوپھی الماس موجود تھیں لیکن بالکل ایسے جیسے اسے جانتی ہی نہ ہوں۔ ان کا رویہ اتنا حقارت آمیز تھا جیسے وہ کوئی ناپاک اور نجس چیز ہو جسے چھونے سے ان کے وجود کے گندا ہونے کا خدشہ ہو زریاب کے پیچھے پیچھے چلتی بھاگی کی ہمراہی میں اپنے کمرے تک آگئی جو بالکل سادہ سا تھا اور اتنے بڑے گھر کا حصہ ہی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کمرے کو دیکھتے ہی اسے اپنی اوقات سمجھ میں آگئی اور وہ جان گئی کہ زریاب کے نزدیک اس کی کیا حیثیت ہے۔

☼ ☼ ☼

آٹھ تاریخ آپہنچی۔ آج اسے عدالت میں پیش کا ہو کر اپنے باپ بھائیوں کے حق میں بیان دینا تھا۔ اس کا نکاح نامہ پچھلی پیشی میں ہی عدالت میں جمع کروا دیا گیا تھا۔ شادی میں شریک مختلف لوگ بھی بطور گواہ اپنا بیان ریکارڈ کروا چکے تھے۔ ہر شخص نے حلفیہ بیان دیا تھا کہ وہ خوشنما اور زریاب کی شادی میں شریک تھا۔ اس کی تصاویر ثبوت کے طور پر پیش کر دی گئی تھیں۔ جنید عباسی کا کیس پچاسی فیصد کمزور ہو چکا تھا اور اب مگسی خاندان کو یقین تھا کہ خوشی کا بیان اس کیس کے تابوت کی آخری کیل ثابت ہوگا۔ خوشی نے پچھلے نو دن ایک امید و بیم کی کیفیت میں گزارے تھے اس نے شکر ادا کیا تھا کہ زریاب خود ہی اس کے کمرے میں نہ آیا تھا ماسوائے ایک دن کے جب وہ صرف اسے یہ یقین دلانے آیا تھا کہ اگر وہ عدالت میں جنید عباسی کے خلاف بیان دے دے اور بتا دے کہ وہ اسے قطعاً نہیں جانتی اور اس نکاح سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے تو وہ اسے دل سے اپنی بیوی تسلیم کر لے گا۔

اور اس لمحہ خوشی نے اسے یقین دلایا کہ جنید اس کے ماضی کی ایک غلطی تھا جسے وہ وقت گزرنے کے ساتھ بھول چکی ہے اور اب جو کچھ ہے اس کے لیے میر زریاب ہی ہے۔

خوشی کی اس یقین دہانی کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ اسے اس گھر میں آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت مل گئی باوجود اس کے کہ وہ ان نو دنوں میں سوائے چند لمحوں کے اس کمرے سے باہر ہی نہ نکلی جہاں وہ اس شادی کے بعد مقیم تھی اور وہ چند لمحے جن میں اس نے کمرے سے باہر نکلنے کی غلطی کی تھی اسے اچھی طرح اس کی اوقات یاد دلا گئے تھے۔ اس کی سگی اور لاڈلی پھوپھی نے اسے دیکھ کر بڑے کروفر سے کہا تھا۔

"آج ابراہیم کی اپنی لڑکی نے اتنا گند ڈالا تو کسی کو نظر نہ آیا اگر خاندان کی کوئی اور لڑکی ہوتی تو کاری کر دی جاتی' یہاں تو باپ بھائیوں نے اپنے گھر کا گند اٹھا کر میرے معصوم بچے کی جھولی میں ڈال دیا' خیر کوئی بات نہیں ہم نے کون سا اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا ہے' کسی جھوٹا تو ویسے بھی میرے بیٹے نے کبھی زندگی میں نہیں کھایا۔ وہ تو ہمیشہ ستھری چیز کھانے کا عادی ہے۔ یہ منحوس کیس ختم ہو تو ہم بھی اسے جھاڑو پھیر کر باہر نکالیں اور میں اپنے بیٹے کی شادی کر کے اس کی زندگی خوشیوں سے بھر دوں۔"

بھاگی کمرے میں ہی اس کے لیے چائے' کھانا اور ضرورت کی ہر چیز لے آتی تھی جبکہ وہ ایک ایک دن گن کر آٹھ تاریخ کا انتظار کر رہی تھی۔ بھاگی کے ذریعے اسے جنید کا ایک اور پیغام مل چکا تھا اس نے کہا تھا کہ "وہ پیشی سے تقریباً" پندرہ یا بیس منٹ قبل کسی بہانے سے عدالت کے احاطے میں بنے واش روم

تک آجانا اس کے بعد جو ہوگا۔وہ ہمارا کام ہے تمہارا کام صرف باہر احاطے تک آنا ہے۔"

اس نے مزید کہا تھا کہ "عدالت میں دیے جانے والے کسی بھی بیان سے ان دونوں کو کوئی فائدہ ہونے والا نہ تھا کیونکہ اگر خوشی کمرۂ عدالت میں اپنے باپ بھائیوں کے خلاف کوئی بیان دے بھی دے اور عدالت اس بیان کی روشنی میں اسے جنید کے ساتھ جانے کی اجازت بھی بے شک دے دے تو بھی اس کے بھائی کبھی اسے زندہ سلامت باہر نکلنے نہ دیں گے۔" جنید کو سو فیصد یقین تھا کہ اسے پولیس کے پہرے میں بھی مار دیا جائے گا اور یقیناً "اس کا انتظام اس کے بھائی کر کے گئے تھے اور اپنے پچھلے دنوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ بڑی آسانی سے جنید کی بات پر یقین کر سکتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سو فیصد درست ہے اور اب اسے وہ ہی کرنا تھا جو جنید نے سمجھایا تھا۔

تقریباً "بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ کمرۂ عدالت میں داخل ہوئی کیونکہ ایک بجے کے قریب اس کی پیشی تھی۔اس کے ساتھ اس کے دونوں بھائیوں کے علاوہ زریاب' سجاول اور علی شیر کے باڈی گارڈ بھی تھے۔اندر صرف وہ بھائی زریاب' علی شیر اور فلک شیر گئے تھے جبکہ باقی لوگ باہر ہی رک گئے تھے۔

ان سب کے پاس بھاری تعداد میں اسلحہ موجود تھا لیکن وہاں کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سلسلے میں ان سے باز پرس کی جاسکتی۔وہ آگے کی نشستوں پر بھاگی کے ساتھ بیٹھی تھی جب اچانک ہی اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا اتنا کہ وہ درد سے بے حال سی ہوگئی ویسے ہی اسے پچھلے دو دن سے ڈائریا ہو گیا تھا۔

"مجھے باتھ روم جانا ہے۔" بالآخر تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے اپنے قریب بیٹھے میر زریاب سے کہا جس نے ایک نظر سامنے گھڑی پر ڈالی ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے جبکہ ابھی کمرے میں عدالت کا کوئی بھی آدمی موجود نہ تھا۔

"ٹھیک ہے آؤ۔" زریاب اٹھ کھڑا ہوا۔ زریاب ساتھ چل پڑے گا اسے یہ امید ہرگز نہ تھی' وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھاگی باہر دیکھو سجاول ہوگا۔اسے کہو تم دونوں کے ساتھ واش روم تک جائے۔"

جانے کیا سوچ کر زریاب نے بھاگی کو آواز دی۔ اس کی بات سنتے ہی خوشی نے اطمینان کا سانس لیا بھاگی جو کہ متوحش نگاہوں سے اس کی جانب تک رہی تھی۔زریاب کا حکم سنتے ہی تیزی سے باہر کی جانب لپکی۔

"زریاب! تم بھی ان کے ساتھ ہی جاؤ گے اور ذرا جلدی فارغ ہو کر واپس آؤ جج صاحب آگئے ہیں۔"

باہر نکلتے نکلتے اس نے علی شیر کی آواز سنی اور پھر زریاب بھی اس کے ساتھ ہی باہر برآمدے میں آگیا جہاں سجاول اپنے گارڈز کے ہمراہ کھڑا تھا ان دونوں کو آتا دیکھ کر وہ سب احتراماً "ایک جانب ہو گئے جیسے ہی وہ بھاگی اور زریاب کی ہمراہی میں احاطے کی جانب بڑھی' سجاول اپنے گارڈز کے ہمراہ خاموشی سے ان کے پیچھے چل دیا' وہ بے حد خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی تھی دل ہی دل میں مختلف قرآنی آیات کا ورد کرتی۔وہ اس مقام تک آگئی جہاں سامنے ہی بنے ہوئے احاطے میں واش روم تھے۔دائیں ہاتھ پر مردانہ جبکہ بائیں طرف زنانہ کا بورڈ آویزاں تھا اور ظاہر ہے کہ زنانہ واش روم میں چاہتے ہوئے بھی کوئی مرد اندر داخل نہ ہو سکتا تھا لہٰذا وہ صرف بھاگی کے ہمراہ دھڑکتے ہوئے دل سے اندر داخل ہوئی۔سجاول اور زریاب باتھ روم سے چند قدم کے فاصلے پر ہی رک گئے تھے۔اس تمام عرصہ میں ان دونوں نے بھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی تھی' اندر داخل ہو کر اس نے جیسے ہی بھاگی کی زرد رنگت دیکھی اسے احساس ہوا کہ وہ خوشی سے بھی زیادہ گھبرائی ہوئی ہے۔ آگے کیا ہونے والا تھا؟

یہ ان دونوں میں سے کوئی نہ جانتا تھا۔وہ تو صرف جنید کی ہدایت کے مطابق یہاں تک آگئی تھیں اور اب کسی انہونی کی منتظر تھیں جو انہیں اس ایک لمحہ کی قید سے آزادی دلاتی اور بالآخر اگلے ایک سیکنڈ میں ہی وہ انہونی وقوع پذیر ہوگئی جس کے انتظار نے انہیں

ماحب پر لٹکا رکھا تھا اچانک ہی داخل ہونے والے ...وں میں سب سے آگے جنید تھا جسے شاید اس نے ...نی کئی ماہ بعد دیکھا تھا۔وہ سب بھاگتے ہوئے اندر ...اخل ہوئے تھے' جنید کے ساتھ موجود دیگر تمام مرد ...لحہ سے لیس تھے۔

"جلدی نکلو باہر جلدی۔" جنید نے اندر داخل ...تے ہی اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔اس کی کالی چادر ...ر سے ڈھلک کر کندھوں پر آگئی وہ یکدم گھبرا گئی تھی۔

"میرے ساتھ بھاگی بھی جائے گی۔" جنید کے ...اتھ زندگی کا نیا سفر شروع کرنے سے قبل اسے بھاگی ...ی زندگی محفوظ کرنے کا کوئی دوسرا بہتر حل نظر نہ آیا ...تھا۔

جنید نے ایک نظر اجرک میں ملبوس سانولی سلونی ...ی بھاگی پر ڈالی جو سر جھکائے کھڑی تھی لیکن اس کے ...م کی کپکپاہٹ اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ ...وت کا خوف اسے اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ آجاؤ تم بھی۔" جنید کو ایک لمحہ لگا اور ...ملہ ہو گیا۔

...وہ اور بھاگی جیسے ہی جنید کی ہمراہی میں باہر نکلیں' ...امنے ہی میر زریاب اور سجاول جنید کے آدمیوں کے ...رنغے میں گھرے نظر آئے۔ان سب کا اسلحہ چھین لیا ...یا تھا اور اب وہ سب نہتے تھے۔

"میں ان دونوں کو لے کر نکل رہا ہوں تم دوسری ...یپ میں انہیں بھی اپنے ہمراہ لے آؤ۔جلدی کرو ایسا ...نہ ہو اندر خبر پہنچ جائے اور وہ لوگ باہر نکل آئیں ...جلدی کرو جلدی۔" جنید جلدی جلدی ہدایت دیتا ہوا ...یزی سے باہر کی جانب لپکا۔وہ جنید کے ساتھ تقریباً" ...اگ رہی تھی اتنے اسلحہ کے نرغہ میں دو لڑکیوں کو لے جاتے آدمیوں کے لیے خود بخود ہی راستہ بنتا چلا ...گیا۔

چند قدموں کے فاصلے پر ہی جیپ موجود تھی' وہ ...ب تیزی سے اندر داخل ہوئے اور جیپ ہوا سے ...باتیں کرتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی اور اس عدالت ...کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ اپنے پیچھے سب کچھ چھوڑ آئی۔اپنا خاندان اپنے سارے رشتے ناتے' عدالت میں کھڑے بظاہر غیرت مند اپنے بھائی جنہوں نے بغیر نکاح کے اپنی سگی بہن ایک نامحرم کے حوالے کر دی تھی اور میر زریاب جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بظاہر دنیا کے سامنے اس کا شوہر تھا یہ سب کچھ ایک خوف ناک بھولی بسری یاد کے طور پر دور کہیں رہ گیا۔

اگر کچھ اس کے ساتھ تھا تو وہ جنید عباسی اور برے وقت میں اس کا ساتھ دینے والی ایک معمولی ملازمہ بھاگی جو اسے آج اپنے ہر رشتہ سے زیادہ عزیز تھی۔ اسے افسوس تھا' کاش اس کے گھر والے قانونی طور پر جنید سے طلاق کے بعد اس کی دوسری شادی زریاب سے کرتے تو وہ کبھی یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتی بہرحال جو ہونا تھا ہو چکا اور اب گزرے وقت کو یاد کرنا بے کار تھا' وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے اس عمل کے بعد پیچھے کیا ہوا؟ لیکن جلد ہی اخبارات کے ذریعے اسے کافی کچھ پتا چل گیا۔زریاب اور سجاول جنہیں حفظ ماتقدم کے طور پر جنید کے آدمی ساتھ ہی لے آئے تھے۔اسی رات رہا کر دیے گئے کیونکہ ان کا اغوا اس منصوبے میں شامل نہ تھا۔اس کے جنید کے ساتھ فرار کی خبر نے اس کے بھائیوں کے ہوش اڑا دیے انہوں نے نہ صرف باہر نکل کر اندھا دھند فائرنگ کی بلکہ جنید کے وکیل کو بھی احاطہ عدالت میں بری طرح پیٹا جس کی بنا پر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور دو دن بعد ابراہیم مکسی کی کوششوں کے نتیجہ میں ان کی ضمانت ہوئی۔

خوشی نے ہر روز کے اخبار میں اپنا اور اپنے سے وابستہ رشتوں کا نام کئی بار پڑھا۔

عدالت سے اس کے فرار کی خبر خوب مرچ مسالہ لگا کر اخبارات میں پیش کی گئی یہاں تک کہ چند اخبارات نے تو حد ہی کر دی کہا گیا کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر تنسیخ نکاح کے بغیر فرار ہوئی ہے جس کی بنا پر اس پر شرعی دفعہ نافذ کی جائے وہ جب بھی کوئی نئی خبر پڑھتی اس کی نگاہوں میں اپنے باپ اور بھائیوں کے شرمسار چہرے آجاتے اور جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایک نامعلوم سا احساس جرم گھیر لیتا

کاش وہ محبت میں اتنی اندھی نہ ہوتی کہ آج اپنے ہی ہاتھوں اپنے باپ کی عزت کو روندنا نہ پڑتا لیکن شاید یہ تمام ذلت اس کے خاندان کا مقدر بن چکی تھی۔

جو بھی حقیقت یہ تھی کہ اب وہ حد سے زیادہ خوف زدہ رہنے لگی تھی حالانکہ اس کے حالات میں جنید کے گھر والوں نے بھرپور انداز سے اس کا ساتھ دیا تھا لیکن اس کے دن بدن بڑھتے ہوئے خوف نے جنید کو مجبور کردیا کہ وہ اسے لے کر پاکستان سے باہر چلا جائے۔

اپنے گاؤں سے انہوں نے بالکل واسطہ ختم کر رکھا تھا کیونکہ اسی میں ان سب کی بہتری تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بھائی اسے جان سے مارنے کا عہد کرچکے ہوں گے جس کے مطابق وہ اپنا یہ عہد ہر حال میں پورا کریں گے چاہے انہیں اس کے لیے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔

بھائی کی شادی کردی گئی تھی۔ وہ ملتان اپنے شوہر کے ساتھ مقیم تھی جو جنید کی زمینوں پر ہی کام کرتا تھا۔ شروع شروع کا کچھ عرصہ وہ خوف زدہ رہی لیکن جلد ہی جنید کی محبت اور بچوں کی پیدائش نے اسے سب کچھ بھلا دیا لیکن شاید جنید کبھی کچھ نہ بھول سکا۔ اس نے ہمیشہ خوشی اور اپنے بچوں کو بہت زیادہ احتیاط سے رکھا۔ اسے ہمیشہ یہ خدشہ رہا کہ کہیں خوشی کے بھائی زندگی کے کسی موڑ پر اس سے ٹکرا نہ جائیں اور اس ٹکراؤ کا نقصان اس کی اولاد کو نہ ہو اور اس کی طبیعت کی یہ انتہاپسندی اور دل کا خوف خود بخود اس کی اولاد میں بھی منتقل ہوگیا گزرتے وقت کے ساتھ جنید نے اپنی اولاد خاص طور پر اپنے بیٹے کو بھی سب کچھ بتادیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بے خبری کے سبب انہیں کوئی نقصان پہنچے۔

بہرحال وقت کبھی نہ رکنے والی چیز ہے اور ہمیشہ ہر حال میں گزر ہی جاتا ہے۔ خوشی کی موت کے ساتھ ہی محبت کا وہ سفر جو گمسی حویلی سے شروع ہوا تھا اپنے اختتام کو پہنچا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو پلوشہ! اب میں تمہارا انکار نہیں سنوں گی۔ تمہیں ہر حال میں میری سالگرہ کا فنکشن اٹینڈ کرنا ہی ہوگا۔" مبرینہ نے حتمی طور پر اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"لیکن بینی..."

"نو لیکن ویکن بس آج اور ابھی فیصلہ کرو ہاں یا ناں اگر ہاں تو ٹھیک ہے اور اگر تمہارا فیصلہ ناں ہے تو پھر سوری۔ میری اور تمہاری دوستی کا یہ سفر بھی یہیں ختم ہوجائے گا کیونکہ اب میں مزید کسی ایسی لڑکی سے دوستی کی متحمل نہیں ہوسکتی جو خود اور اس کے گھر والے مجھے قابل بھروسہ نہ سمجھتے ہوں۔"

وہ ذرا کی ذرا سانس لینے کو رکی۔

"ٹولی ویری فرینک یار! اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں کوئی خراب لڑکی ہوں جس کی بنا پر تم مجھے اپنے گھر والوں سے متعارف کرواتے ہوئے گھبرا رہی ہو یا شاید تمہارے گھر والے تمہاری اور میری دوستی کو پسند نہیں کرتے تو ایز یو وش اپنی اور میری دوستی کے چیپٹر کو یہیں کلوز کردو۔"

جانے کیوں آج اسے خوامخواہ ہی پلوشہ سے انکار سن کر غصہ سا آگیا ورنہ وہ ہمیشہ اس کی مجبوری کو باآسانی سمجھ جایا کرتی تھی اور اب پلوشہ کے لیے بھی انکار کی مزید گنجائش باقی نہ بچی تھی اسی بنا پر کچھ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے یار! کیوں ناراض ہوتی ہو، یہ بتاؤ پارٹی کا ٹائم کیا ہے؟"

بالآخر وہ ہار مان ہی گئی کیونکہ اپنے گھر والوں کی فضول سی ضد کے سبب وہ اپنی اتنی اچھی دوست کو ناراض نہ کرسکتی تھی۔

"پارٹی تو لیٹ نائٹ تک چلے گی لیکن میں تمہیں زیادہ دیر تک نہیں روکوں گی۔" پلوشہ اس کی رضامندی سے خوش ہوگئی۔ اور وہ جلدی جلدی اپنا پروگرام ترتیب دیتے ہوئے بولی۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"بھئی دیکھو کیا کرتے ہیں۔ کل کالج میں فن ڈے ہے۔ تم گھر والوں کو بتا کر آنا... کہ لیٹ آؤ گی بلکہ ہم صبح کالج سے بھائی کے ساتھ گھر چلے جائیں گے۔ میں شام میں برتھ ڈے کا کیک کاٹنے کے بعد جلد ہی تمہیں کالج واپس چھوڑ دوں گی پھر تمہاری وین کے آنے تک تمہیں واپس کالج چھوڑ دوں گی۔ اس طرح تمہارے گھر والوں کو بھی علم نہ ہوگا اور میری برتھ ڈے پر ہونے والی تمہاری کمی بھی پوری ہوجائے گی۔"

"چلو ٹھیک ہے یہ زیادہ صحیح رہے گا۔" وہ باآسانی مان گئی کیونکہ اسے اس تمام عمل میں کوئی قباحت نظر نہ آرہی تھی۔

"گڈ یار! تم نے تو آج میرا دل خوش کردیا۔" مبرینہ خوشی سے چلا اٹھی "تم جان نہیں سکتیں تمہارے اس اقرار نے مجھے کتنا مان دیا ہے۔ شکریہ میری اچھی دوست اس بھروسہ کا جو تم نے مجھ پر کیا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بینی! لیکن خیال رہے یہ بات کالج میں کسی کو پتا نہ چلے کیونکہ ایسا نہ ہو کہ ورشہ کے ذریعے یہ خبر میرے گھر تک پہنچ جائے۔" وہ خدشہ ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا ہوا تم نے خود ہی کہہ دیا ورنہ میں تو تمہیں خود منع کرنے والی تھی کہ اس بات کا ذکر کالج میں کسی سے نہ کرنا ویسے بھی کل کالج میں فن فیئر ہے۔ آل ریڈی تم نے گھر کے کپڑوں میں ہی آنا ہے لہٰذا تمہارے میرے ساتھ جانے کا علم کسی کو بھی نہ ہوگا ٹھیک ہے نا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" وہ مزید مطمئن ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

ساری رات اس کے ذہن پر مبرینہ ہی سوار رہی اس کے گھر جانے کی خوشی کے ساتھ ساتھ ایک انجانے سے خوف نے بھی اسے گھیرے رکھا۔

اگر جو بالاج یا امی کو پتا چل گیا کہ میں کالج سے کہیں اور بھی گئی تو کیا ہوگا؟ وہ مبرینہ کی چار دن کی دوستی کی خاطر اپنے گھر والوں کی محبت، پیار اور اعتماد کو دھوکا دینے چلی تھی جس کا احساس اسے ابھی نہ تھا اس نے رات ہی چپکے چپکے اپنا سوٹ استری کرکے ہینگ کردیا تھا۔ میچنگ کی جیولری اپنے ہینڈ بیگ میں چھپا کر رکھ لی تھی تاکہ کالج جاکر پہن سکے، صبح جلدی جلدی اٹھ کر وہ خوب اچھی طرح تیار ہوئی لیکن جیسے ہی وہ ناشتہ کے لیے کچن میں داخل ہوئی امی کی تنقیدی نگاہوں سے نہ بچ سکی۔

"پنی لپ اسٹک ہلکی کرو اور یہ تم فن فیئر میں جارہی ہو یا کسی فیشن شو میں شرکت کے لیے۔ کیا ضرورت تھی اتنا بھاری سوٹ پہننے کی، جاؤ جاکر کوئی کاٹن کا سوٹ پہنو۔"

حالانکہ وہ وین آنے سے تقریباً پندرہ منٹ قبل ہی باہر آئی تھی تاکہ جلدی جلدی میں امی کی نگاہوں کی زد سے بچ سکے لیکن ایسا ناممکن تھا۔ پلوشہ نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا اور دوسری نظر اپنے سیاہ جارجٹ کے کڑھائی والے سوٹ پر ڈالی جو اتنا بھی قیمتی اور بھاری نہ تھا جتنا لبنیٰ نے جتادیا تھا لیکن اس کا ارادہ اس لباس کو تبدیل کرنے کا نہ تھا۔ اسی لیے خاموشی سے ناشتا کرنے کے لیے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت لبنیٰ کو کوئی جواب بھی نہ دینا چاہتی تھی، کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اگر اس کی امی غصہ میں آگئیں تو شاید آج وہ فن فیئر کے لیے گھر سے ہی نہ نکل سکے۔

"ارے تم نے ابھی تک کپڑے تبدیل نہیں کیے؟"

چائے لے کر کچن سے واپس آتی لبنیٰ کی نظر جیسے ہی پلوشہ پر پڑی غصہ سے ان کی بھنویں تن گئیں اور انہوں نے سخت لہجہ میں اسے مخاطب کیا۔

"جی امی! جارہی ہوں کپڑے تبدیل کرنے۔"

اس کی مری مری آواز حلق سے برآمد ہوئی، کیونکہ اب ناگزیر تھا۔ اسی لیے وہ خاموشی سے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی کہ اچانک ہی قدرت کو اس پر رحم آگیا اور باہر تیز ہارن کی آواز سنائی دی، جسے سنتے ہی اس نے ایک بے بس سی نگاہ لبنیٰ کے سخت چہرے پر ڈالی۔ بات لبنیٰ کی سمجھ میں بھی آہی گئی۔ بالاج پچھلے دو دن سے

اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اب جو اگر وین چلی جاتی تو لازماً پلوشہ کو کالج سے چھٹی کرنا پڑتی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ فن فیئر نہیں شریک نہ ہو سکتی تھی اور فن فیئر میں شرکت کی جو خوشی اس لمحہ انہیں پلوشہ کے چہرے پر نظر آ رہی تھی' وہ اسے خراب نہ کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے ہی مجبور ہو گئیں۔

"چلو ٹھیک ہے' آج تو چلی جاؤ' لیکن آئندہ احتیاط کرنا اور دوپٹہ اپنے سر پر اوڑھو۔"

اس کے گیٹ سے باہر نکلنے تک پیچھے سے لمبی کی نصیحت آمیز آواز اسے سنائی دیتی رہی' جسے سن کر نظر انداز کر کے وہ وین میں سوار ہو گئی اور سارا راستہ اپنی دوست کے گھر گزارے جانے والے ایک بہترین دن کا تصور لے کر وہ کالج گیٹ کے سامنے اتر گئی جیسے ہی وہ گیٹ پار کر کے اندر داخل ہوئی' پہلی ہی نگاہ سامنے کھڑی سبرینہ پر پڑی جو غالباً" گھر کے عام سے کپڑوں میں ہی ملبوس تھی۔ ٹراؤزر کے ساتھ ٹی شرٹ اور دوپٹہ ندارد دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"شکر ہے خدا کا' تم آ گئیں' چلو آجاؤ جلدی کرو' چلیں۔"

اس کے لہجہ میں چھلکتی بے تحاشا خوشی پلوشہ کو حیران سا کر گئی۔

"ارے اتنی صبح صبح' کچھ دیر صبر تو کرو' ہم پہلے تھوڑا سا فن فیئر تو انجوائے کر لیں' پھر چلتے ہیں۔"

جانے کیوں سبرینہ کے لہجے نے پلوشہ کو خائف سا کر دیا اور وہ یک دم ہی پریشان سی ہو اٹھی۔ اسے احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ غلط کرنے جا رہی ہے۔

"نہیں یار! میں تو سچ میں ناشتا بھی نہیں کر کے آئی۔ پلیز چلو بہت بھوک لگی ہے۔"

سبرینہ نے لجاجت سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور چند لمحے پہلے دل میں پیدا ہونے والا احساس بھی خود بخود معدوم ہو گیا۔ وہ دونوں کالج گیٹ سے باہر آ گئیں' جہاں سبرینہ کی گاڑی ڈرائیور سمیت موجود تھی۔

گاڑی میں بیٹھنے سے قبل ایک بار تو پلوشہ کا دل چاہا کہ وہ سبرینہ کے ساتھ اس کے گھر نہ جائے۔ جانے کیوں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ سبرینہ گاڑی میں بیٹھتے ہی اپنے سیل کے ہیڈ فون کانوں میں لگا کر آس پاس سے بے خبر ہو چکی تھی اور پھر اسی خاموشی میں سبرینہ کے گھر کا فاصلہ طے ہو گیا اور اگلے دس' پندرہ منٹ تک وہ اس کے گھر پہنچ چکی تھی' داخلی دروازے سے اندر لاؤنج میں داخل ہوئی اور سامنے نظر آنے والے قیمتی فرنیچر اور آرائشی سامان نے اسے گنگ سا کر دیا۔

"مما آ گئی ہیں؟" سبرینہ نے کچن میں داخل ہو کر غالباً" اندر موجود کسی ملازمہ سے سوال کیا' جبکہ وہ وہیں لاؤنج میں ہی کھڑی تھی۔

"جی بی بی جی! ابھی ابھی آئی ہیں اور اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔" ملازمہ کی جوابی وضاحت اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"جسٹ آ منٹ پلوشہ! تم یہاں بیٹھو' میں مام سے مل کر آؤں' دراصل آج ہی دبئی سے واپس آئی ہیں۔"

کچن سے عجلت میں نکل کر اسے صوفہ پر بٹھا کر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی' وہ سارے لاؤنج کا تفصیلی جائزہ ہی لے رہی تھی کہ سبرینہ واپس آ گئی۔

اس کے ساتھ اس کی مام بھی تھیں' بے حد اسٹائلش کندھوں پر آتے گولڈن بال' سلیولیس ٹاپ اور کیپری کے ساتھ وہ کہیں سے بھی ایک جواں سال بیٹی کی ماں نظر نہ آ رہی تھیں' انہیں اس قدر ویل ڈریسڈ دیکھ کر یکدم پلوشہ کے ذہن میں اپنی سادہ سی گھریلو حلیے والی ماں کا تصور آ گیا' اف خدایا کس قدر فرق ہے میری امی اور سبرینہ کی مام میں۔

"مام! میٹ ہر' شی از مائی بیسٹ فرینڈ پلوشہ۔"

"السلام علیکم۔۔۔!" جائزہ لیتی لیتی وہ یک دم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے بیٹھو بیٹی۔ میں تو صرف تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ دراصل میری بیٹی تمہارے حسن کی بہت شیدائی ہے۔"

تعریف کا عجیب سا انداز سب کچھ نارمل ہوتے ہوئے بھی پلوشہ کے ذہن کو الجھا سا گیا۔ جانے کیوں ان کے بولنے سے زیادہ دیکھنے کا انداز پلوشہ کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔

"سبرینہ! تمہاری دوست تو واقعی بہت ہی پیاری ہے' بس ذرا سی سیدھی ہے' ورنہ آج اپنے حسن کے زور پر دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچا رہی ہوتی۔"

وہ اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ذرا سا ہنس کر بولیں' جبکہ پلوشہ کا چہرہ ان کی تعریف سے سرخ سا پڑ گیا۔

"اوکے ریا بیٹا! انجوائے یور سیلف' میں اب آرام کروں گی۔" اوپر جاتے جاتے ہاتھ میں پکڑا سگار اپنے لائٹر سے جلا کر انہوں نے ہونٹوں سے لگا لیا۔

اور ہاں ریا! ملازمہ کو لنچ کے لیے بتا دینا۔"

"اوکے مام۔۔۔"

"تمہاری امی سگریٹ پیتی ہیں؟" وہ قدرے حیران تھی' کیونکہ ان کی فیملی میں مردوں کی بھی سگریٹ نوشی پسند نہ کی جاتی تھی۔

"ہاں کیوں؟" اس کے سوال نے سبرینہ کو حیران سا کر دیا اور اس نے کندھے اچکاتے ہوئے دریافت کیا۔

"بس۔ ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔"

"چلو آؤ میرے کمرے میں چلیں' شہناز میرے کمرے میں جوس کے دو گلاس لے آؤ' پھر اچھا سا ناشتا بنا دینا۔"

پلوشہ سے کہتے ہوئے ساتھ ہی اس نے ملازمہ کو بھی ہدایت دی اور آگے کی جانب چل دی' پلوشہ بھی اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لی' سبرینہ کا کمرا بھی باقی گھر کی طرح بے حد خوب صورت تھا' ابھی وہ کمرے کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ ملازمہ جوس لے کر آ گئی جو اس نے کمرے میں موجود ٹیبل پر رکھ دیے اور خاموشی سے واپس پلٹ گئی' وہ بڑی سمٹی سی بیڈ کے کونے پر ٹک گئی' جبکہ سبرینہ نے اپنا ہوم تھیٹر آن کر دیا۔ اتنی بڑی اسکرین شاید نہیں بلکہ یقیناً" اس نے آج زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ سبرینہ نے جوس کا گلاس اسے تھما دیا۔ بے حد خوب صورت کرسٹل کے بلوریں گلاس سے گھونٹ گھونٹ جوس اس کے حلق میں اترنے لگا۔ سبرینہ جانے الماری کھولے کیا نکال رہی تھی۔

"تم ذرا بیٹھو' میں ملازمہ کو ناشتا اور لنچ کا کہہ آؤں۔ ریلیکس ہو کر بیٹھو یار۔ اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟"

وہ تیزی سے باہر جاتے جاتے واپس پلٹی۔

"ذرا اپنا دوپٹہ دے دینا' یہ وقت میرے دادا کے واک سے واپس آنے کا ہے' اگر انہوں نے مجھے اس حلیہ میں دیکھ لیا ناتو نہ پوچھو میرا کیا حشر ہو گا۔"

اس نے خاموشی سے اپنا دوپٹہ اتار کر اسے تھما دیا اور خود ریلیکس سی ہو کر بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر قریب رکھا ریموٹ اٹھا لیا اور مختلف چینل سرچ کرنے لگی' جانے سبرینہ کو گئے کتنا وقت ہو گیا تھا' اسے ٹی وی دیکھتے ہوئے احساس ہی نہ ہوا' لیکن اتنا ضرور ہوا کہ کمرے کے پرسکون ماحول میں اسے نیند سی آنے لگی' جانے کیوں اس کی آنکھیں بند سی ہو رہی تھیں جنہیں وہ بمشکل کھول رہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی' غالباً" سبرینہ واپس آئی تھی' وہ اسی بے فکری سے ٹی وی اسکرین کی جانب دیکھتے ہوئے بے فکری سے لیٹی رہی۔

"سبرینہ کہاں ہے؟" اچانک ہی کانوں سے ٹکرانے والی مردانہ آواز سن کر وہ کرنٹ کھا کر پلٹی' ادھر ادھر ہاتھ مارا' یاد آیا دوپٹہ تو سبرینہ لے گئی' وہ یک دم شرمندہ ہو گئی' کیونکہ سامنے دکھائی دینے والا مرد صرف ایک ٹراؤزر میں ملبوس تھا اور واش روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"دراصل میرے واش روم میں گرم پانی نہیں آ رہا تھا' اسی لیے ریا کا واش روم استعمال کرنا پڑا۔" وہ قدرے وضاحت سے بولا۔

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی' اسے غنودگی کا زوردار جھٹکا سا لگا اور اس کے گرنے سے قبل ہی سامنے کھڑے اجنبی مرد نے اسے تھام لیا۔

"آر یو اوکے۔" وہ اس پر جھکا ہوا دریافت کر رہا تھا' پلوشہ نے چاہا کہ خود کو چھڑوائے لیکن اس کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔

"لگتا ہے تمہاری طبیعت خراب ہے۔"

اسے خود سے قریب کرتے ہوئے وہ کان میں بولا پلوشہ کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اس نے چاہا کہ وہ دھکا دے کر اس اجنبی کو خود سے دور کر دے' لیکن جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس انجان مرد کے جسم سے آتی بھینی بھینی کلون کی خوشبو نے اسے مدہوش کر دیا ہے۔

"پلیز مجھے چھوڑ دو۔" خود کو چھڑانے کے لیے ناکام سی مزاحمت کرتے ہوئے وہ مدھم سی آواز میں بولی۔

"چھوڑ دیتا ہوں یار! لیکن ایک بات ہے تم جو کوئی بھی ہو ہو قیامت کی ہو۔"

وہ اسے خود سے قریب کرتا ہوا بولا۔

"میرا خیال ہے تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے تم یہاں لیٹو میں ربا کو بلا کر لاتا ہوں۔" اسے ساتھ ساتھ لگائے وہ بیڈ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ چکراتے سر کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر جانے کیوں بھاری بھاری ہو رہا نیند بری طرح اس پر غلبہ پا چکی تھی' شاید میرا بلڈ پریشر لو ہو رہا ہے یا پھر رات کی بے آرامی۔ اس سے زیادہ وہ نہ سوچ سکی' کیونکہ اس کا ذہن سن ہو چکا تھا۔

"پلوشہ۔۔۔ پلوشہ۔" وہ بارش میں بھیگ رہی تھی اور ٹھنڈک بری طرح اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی' جب اسے محسوس ہوا کوئی اسے پکار رہا ہے' ایسے میں اچانک ہی بجلی کی تیز چمک سے وہ گھبرا اٹھی اور ایک تیز چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی' پہلے تو اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے پھر جیسے ہی اس کا ذہن بیدار ہوا آہستہ آہستہ اسے سب کچھ یاد آ گیا' وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے پاس ہی سبرینہ بیٹھی تھی پانی کا پیالا لے کر جو شاید اسے ہوش میں لانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اسے کپکپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

"شکر ہے' تمہیں ہوش آ گیا' ورنہ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔"

سبرینہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کا سر ابھی بھی بھاری تھا۔

"کیا ٹائم ہوا ہے؟" بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

"تین بجے ہیں۔" "شکر خدا کا میں سمجھی شام ہو چکی ہے' خود کو سنبھال کر وہ جلدی سے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا بے ترتیب لباس درست کیا' جانے کیوں اس کا دل بھاری ہو رہا تھا اسے خود بخود رونا آ رہا تھا۔

"سبرینہ پلیز۔ مجھے جلدی گھر جانا ہے' کیونکہ میں اپنے گھر کالج کے مینا بازار کا کہہ کر آئی ہوں' اگر مجھے مزید دیر ہو گئی اور میری تلاش میں کوئی کالج تک آ گیا تو بہت مشکل ہو گی۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سبرینہ کو مخاطب کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے یار! لیکن میرا خیال ہے' تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' میں تمہیں خود ڈرائیور کے ساتھ جا کر چھوڑ آتی ہوں' اپنی امی سے کہہ دینا کہ کالج میں تمہاری طبیعت خراب ہو گئی تھی' پہلے ذرا منہ دھو کر فریش ہو جاؤ' اور کھانا کھا لو۔"

"سبرینہ!" باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے وہ یک دم پلٹ آئی۔

"بولو۔"

"کچھ نہیں۔" جانے کیا سوچ کر اس اجنبی مرد سے متعلق کوئی بھی سوال پلوشہ کی نوک زبان پر آ کر واپس پلٹ گیا۔ یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ جوس پیتے ہی اس کا ذہن اتنا بوجھل کیوں ہو گیا تھا؟

"میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔" اپنی جانب منتظر نگاہوں سے تکتی سبرینہ سے کہتے ہوئے وہ تیزی سے واش روم میں گھس گئی اور پھر واپس آتے ہوئے تمام راستہ اس کا دماغ الجھا رہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس بات کو کس طرح سبرینہ سے ڈسکس کرے۔ آج اسے احساس ہوا کہ اپنے گھر والوں کے علم میں لائے بغیر اٹھایا جانے والا چھوٹا سا قدم بھی کتنا خطرناک ہو سکتا ہے' وہ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ کوئی

ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو اسے بدنامی کے عمیق گڑھے میں گرا دیتا' وہ اپنی عزت و ناموس کے محفوظ رہ جانے پر اللہ کی شکر گزار تھی۔ لیکن نہیں جانتی تھی کہ گھر والوں کو دیا جانے والا یہ چھوٹا سا دھوکہ جو بظاہر بے ضرر تھا' آگے جا کر اس کے لیے کتنے بڑے بڑے مسائل کو جنم دینے والا ہے۔

☆ ☆ ☆

جانے کیا بات تھی' پلوشہ کا وہم تھا یا واقعی حقیقت تھی' اسے سبرینہ کا رویہ پہلے سے خاصا تبدیل لگ رہا تھا' پہلے والی گرم جوشی اور محبت تقریباً مفقود ہو چکی تھی۔ اس دن کے بعد سے وہ پلوشہ کو جب کالج میں ملی تو خاصی نارمل سی تھی' پلوشہ کو لگتا کہ وہ جان بوجھ کر اسے اگنور کر رہی ہے' لیکن یوں؟ وہ ایسا ری ایکٹ کیوں کر رہی ہے؟ بغیر کسی وجہ کے اور یہ ہی بات پلوشہ کے ذہن کو الجھا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سبرینہ سے پوچھے' لیکن اسے موقع ہی نہ مل رہا تھا یا شاید سبرینہ جان بوجھ کر اسے موقع فراہم نہ کر رہی تھی۔

اس دن بھی وہ فری پیریڈ میں سیڑھیوں پر بیٹھی ان ہی سوچوں میں گم تھی' جب سبرینہ بڑی خاموشی سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی' کانوں میں ہیڈ فون ڈالے بڑی بے فکری سے چیونگم چباتی ہوئی۔ آج کئی دنوں بعد سبرینہ کو یوں اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر پلوشہ کو حیرت تو ضرور ہوئی' مگر کچھ بولی نہیں بلکہ خاموشی سے اپنی سوچوں میں الجھی رہی۔

"عماد تم سے ملنا چاہتا ہے۔" بغیر کسی تمہید کے وہ اچانک پلوشہ سے مخاطب ہوئی۔

"کون عماد؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"اب اتنی بھی بھولی نہ بنو تم' اچھی طرح جانتی ہو کہ عماد کون ہے۔"

الفاظ تھے یا زہریلے ناگ جو پلوشہ کو خود کو ڈستے ہوئے محسوس ہوئے' سبرینہ کا انداز تخاطب اس کی سوچ سے بالکل بالاتر تھا۔ اس کا ذلت آمیز خشک رویہ پلوشہ کو حیران کر رہا تھا۔

"یقین جانو' میں بالکل بھی کسی عماد کو نہیں جانتی۔" اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ بمشکل بولی' اس کی آواز حلق میں ہی کہیں پھنس سی رہی تھی۔

"تو پھر یہ کیا ہے؟" اگلے ہی پل سبرینہ نے اپنا آئی فون اس کے سامنے کر دیا۔ سامنے ہی اسکرین پر نظر آنے والی تصویر نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیے اور اسے بے ساختہ سبرینہ کے گھر جانے والا اپنا پہلا اور آخری دن یاد آ گیا' ساتھ وہ اجنبی بھی جسے سبرینہ عماد کے نام سے پکار رہی تھی' وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اس ایک پل کو جب وہ پلوشہ کے قریب تھا۔ اس طرح موبائل کی اسکرین پر منتقل کیا جائے گا اور پھر یاد آیا' اسکول میں لکھا جانے والا موبائل فون کے نقصانات پر مضمون لیکن یہ تو۔۔۔

آگے اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا وضاحت دے۔

"دیکھو یار! مجھے نہیں پتا کہ تمہارا اور عماد کا کیا سین ہے؟ اب بات صرف اتنی ہے کہ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔" سبرینہ کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ پلوشہ کو زمین میں گاڑ رہا تھا' جانے وہ کیا سمجھ رہی تھی۔

"سبرینہ! میرا یقین کرو۔ جو تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"چلو' میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہی' سمجھنا تو تمہیں ہے' اگر تم عماد سے نہ ملیں تو ایس ایم ایس کے ذریعے وہ یہ تصویر نہ صرف بالاج بلکہ تمہارے دیگر رشتہ داروں کو بھی بھیج دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے سارے خاندان کو جانتا ہے' وہ تمہاری تصویریں بنا کر بھی سب کو پوسٹ کر سکتا ہے' تم نہیں جانتیں۔ وہ بہت کچھ کر سکتا ہے' بہتر یہ ہے کہ تم ایک دفعہ اس سے مل لو' دیکھو وہ تم سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ تم سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ ایک دوست ہونے کے ناتے یہ میرا تمہیں مشورہ ہے' باقی آگے جو تم بہتر سمجھو۔" بات کرتے کرتے سبرینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "وہ یہاں

اپنے فیصلے سے تم مجھے ایک ہفتہ تک آگاہ کر دینا ورنہ دوسری صورت میں ذمہ دار تم خود ہوگی۔"

کندھے پر بیگ ڈالے وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی، یہ جانے بغیر کہ پیچھے رہ جانے والی ہستی کس حال میں ہے۔ یقیناً "سبرینہ جیسے لوگوں کو سوائے اپنی ذات کے دنیا میں کسی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ پلوشہ کو آج احساس ہوا کہ ماں کے علم میں لائے بغیر اٹھایا جانے والا ایک چھوٹا سا قدم، کبھی کبھی کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ سبرینہ اس کے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ کر سکتی ہے، اب آگے کیا ہوگا؟ اس سوچ نے ہی اس کے دماغ کو ماؤف کر دیا، وہ اپنی تمام ہمت کو مجتمع کر کے بمشکل وہاں سے اٹھی اور پھر کس طرح گھر تک پہنچی اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ گھر کے کھلے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اسے تحفظ کے احساس نے اپنے حصار میں لے لیا، تھکی تھکی سی چال چلتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر گر سی گئی۔

"اسے کیا ہوا ہے؟" فریج سے کچھ نکالتی ہوئی لبنیٰ کی نگاہ جیسے ہی پلوشہ پر پڑی انہوں نے حیرت سے سوچا، بلکہ پلوشہ ان کے پاس سے ایسے گزری جیسے نیند کے عالم میں ہو۔ انہوں نے فریج کا دروازہ جلدی سے بند کیا اور پلوشہ کے پیچھے ہی کمرے میں آ گئیں۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" نڈھال سی پڑی پلوشہ کو دیکھتے ہی وہ وحشت زدہ ہو گئیں، جوان بیٹی کی ماں تھیں، ایک دم ہی دل میں بے بنیاد اندیشے سر ابھارنے لگے، ایسے اندیشے جن سے وہ خود بھی گھبرا اٹھیں۔

"پلوشہ! کیا بات ہے؟" وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے بستر پر آ گئیں اور جیسے ہی اسے کندھے سے تھام کر سیدھا کرنا چاہا، وہ تڑپ کر ماں کے گلے لگ گئی اور لگی بلک بلک کر رونے، اسے روتا دیکھ کر لبنیٰ بیگم بدحواس سی ہو گئیں۔

"مجھے بتاؤ، پلوشہ! کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں امی!" بمشکل آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔ راستے میں بہت بڑا ایکسیڈنٹ دیکھا تھا، اسی لیے دل بھر آیا۔"

بروقت پلوشہ کے ذہن میں آنے والے بہانے نے لبنیٰ کو دکھا تھا۔

"میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ جانے کیا بات ہے۔" اسے خود سے دور کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں "ہاتھ منہ دھو کر باہر آؤ۔ کھانا کھاؤ۔"

اسے ہدایت دے کر وہ باہر نکل گئیں اور پھر اگلا پورا ہفتہ وہ کالج ہی نہ گئی، کالج جانے کا خیال آتے ہی اس کا دل کانپ اٹھتا، لبنیٰ بیگم اس کے کالج نہ جانے کو ایکسیڈنٹ کا خوف سمجھتے ہوئے خاموش تھیں، جبکہ پلوشہ کو کبھی کبھی بالاج کا رویہ سہارا دیتا اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کھوجتی ہوئی نگاہوں سے پلوشہ کو تکتا ہے، حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ نہ صرف آج کل نیچے زیادہ آنے لگا تھا، بلکہ پلوشہ کی پڑھائی اور روزمرہ کے امور سے متعلق گفتگو بھی کرنے لگا تھا۔

اب وہ مزید چھٹیاں بھی نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ امتحان سر پر تھے۔

وہ عشاء کی نماز پڑھ کر کمرے میں آئی تو امی نے آواز دے کر پکارا کہ اس کی کسی دوست کا فون آیا ہے اور بغیر نام کے ہی وہ سمجھ گئی کہ فون کس کا ہوگا اور پھر ہیلو کہتے ہی اس کے بدترین اندیشے کی تصدیق ہو گئی، دوسری طرف سبرینہ تھی۔

"کہاں غائب ہو تم؟" بغیر کسی سلام دعا کے ایک سپاٹ اور خشک لہجہ پلوشہ کے کانوں سے ٹکرایا۔ کافی دیر تو وہ بول ہی نہ سکی۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" مری مری آواز بمشکل اس کے حلق سے نکلی۔

"اوہو! اچھا۔ اب کیسی ہو؟ بہرحال یہ بتاؤ کالج کب آ رہی ہو؟"

پہلے سوال کا جواب جانے بغیر ہی وہ اپنے مطلب کی بات پر آ گئی، وہ خاموش رہ گئی۔

"دیکھو میری بات سنو، وہ تم سے صرف ملنا چاہتا ہے اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، وہ تمہاری ساری تصویریں ڈیلیٹ کر دے گا، بشرطیکہ تم ایک بار اس سے مل کر درخواست کرو۔"

"میں شاید کل آ جاؤں۔" وہ مرے مرے لہجے میں بولی، سبرینہ نے فون بند کر دیا۔ جبکہ کتنی دیر تک ریسیور اپنے ہاتھ میں تھامے پلوشہ ساکت سی کھڑی رہی۔

"کس کا فون تھا؟" عقب سے آنے والی بالاج کی آواز سن کر وہ ایک دم کانپ سی گئی، لرزتے ہاتھوں سے ریسیور رکھ کر پلٹی۔

"فون کس کا تھا؟" وہ بالکل اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"دوست کا۔" مزید کوئی سوال سنے بغیر وہ تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر وہ کمرے میں آ گئی اور وہ ساری رات اس نے ایک عجیب سی کیفیت میں گزاری۔ جانے کیوں ایک انجانے خوف نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اسے پتا تھا، کچھ ہونے والا ہے، ایسا کچھ جو اسے تباہ و برباد کر دے گا۔ وہ اپنی اس کیفیت کو کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی، وہ بے وقوف لڑکی اپنوں کے شدید رد عمل سے سہمی ہوئی تھی، لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ ماں سے زیادہ اولاد اور وہ بھی بیٹی کا کوئی غم گسار نہیں ہو سکتا۔ وہ ساری رات اس نے سوتے جاگتے گزار دی۔ صبح تیار ہو کر جیسے ہی ناشتا کرنے ڈائننگ ٹیبل پر پہنچی سامنے ہی اخبار پڑھتے بالاج کو دیکھتے ہی خون مزید خشک ہو گیا۔ یہ اتنی صبح صبح یہ کیا کر رہا ہے۔ سوچا ضرور لیکن زبان سے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے کرسی کھینچ کر ناشتے کے لیے بیٹھ گئی، لیکن اس تمام عرصہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ بظاہر اخبار پڑھتا بالاج مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ ہے، پہلے ہی اس کا ناشتا کرنے کا دل نہ چاہ رہا تھا، اب اس نئے احساس نے اس کی بھوک کو بالکل ہی ختم کر دیا، دو تین لقمے لینے کے بعد اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیا بات ہے بیٹا! ناشتا نہیں کر رہیں؟" چائے کا گھونٹ لیتے رحمان صاحب نے بڑے ہی پیار سے مخاطب کیا۔

"ویسے ہی ابو! دل نہیں چاہ رہا، کینٹین سے کچھ کھا لوں گی۔" آہستہ سے کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا سی گئی، جس پر صبح کی افراتفری میں کسی نے دھیان ہی نہ دیا۔ اسی دم باہر سے آتی وین کے ہارن کی آواز سنتے ہی اس نے بیگ اٹھایا اور خاموشی سے باہر کی جانب چل دی۔

"ٹھہرو۔" لاؤنج کا دروازہ کھولتے ہی پیچھے سے آتی بالاج کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے "یا اللہ خیر۔" دروازہ کے ہینڈل پر رکھا اس کا ہاتھ کانپ سا گیا اور وہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھ سکی۔

"چلو! میں تمہیں چھوڑ آؤں؟" اس کے پاس سے کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور وہ مرے مرے قدموں سے اس کے پیچھے چل دی اور پھر سارے راستہ وہ یہ ہی دعا کرتی آئی کہ سبرینہ اسے کالج سے باہر نہ مل جائے، ورنہ یقیناً "آج اس کی خیر نہ تھی۔

ان ہی سوچوں میں گھری جانے کب کالج آیا اسے پتا ہی نہ چلا۔

"واپسی میں لینے آ جاؤں؟" بالاج کی آواز نے اسے سوچوں کی دنیا سے باہر کھینچ نکالا۔

"نہیں۔ میں وین میں ہی آ جاؤں گی۔" آہستہ سے جواب دے کر وہ گاڑی کا دروازہ بند کرتی باہر نکل گئی اور کالج گیٹ سے اندر داخل ہونے تک اسے اپنی پشت پر بالاج کی نگاہیں محسوس ہوتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

"بابا! میں شام تک حویلی پہنچ جاؤں گا اور وہ میرے ساتھ ہی ہوگی۔"

فون پر رابطہ ہوتے ہی عماد نے فلک شیر کو اطلاع دی۔

"نہیں۔ تمہیں اس کو یہاں نہیں لانا۔"

فلک شیر کے جواب نے عماد کو حیران کر دیا، کیونکہ سب کچھ پہلے سے پروگرام کے مطابق طے تھا، پھر اچانک اس تبدیلی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی، لیکن پھر بھی وہ کوئی سوال کر کے اپنے بابا کے غیض و غضب کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے بہتری اسی میں تھی

کہ خاموشی سے ان کی اگلی ہدایت سنی جائے۔

"جی بابا!" وہ جانتا تھا کہ یہ دو الفاظ ہی اس کے انا پرست باپ کو پسند ہیں۔

"تم نکاح کرکے اس لڑکی کو گھر بھیج دینا' باقی حساب کتاب اس کے گھر آکر میں خود جنید رضا عباسی سے لوں گا۔ اپنا چھبیس سالہ پرانا حساب بالکل اسی طرح بابا! جس طرح اس نے ہم سے لیا تھا' میں بھی اسے اس کے شہر میں ہی ذلیل کروں گا' ساری دنیا کے سامنے پولیس لے کر جاؤں گا میں بھی اس کے گھر' عماد جس طرح وہ تیری پھوپھی کو لینے پولیس لے کر آیا تھا۔"

اور عماد اپنے باپ سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ پھوپھی نے تو جو کچھ کیا اپنی رضا سے کیا تھا' لیکن جو ہم آج اس لڑکی کے ساتھ کرنے جارہے ہیں' وہ بے خبر تو اس سے انجان ہے' لیکن اپنی روایتوں اور بدلہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک پڑھے لکھے شخص کی زبان بھی گنگ تھی اور اس وقت اس کا مقصد صرف اور صرف آج سے سالوں پہلے جنید رضا عباسی کے عمل کا بدلہ تھا جو ہر حال میں اس کے خاندان کو بھگتنا تھا' بدلہ جو لیتے تو بظاہر مرد ہیں' لیکن اس کی زد میں ہمیشہ عورت آتی ہے۔ مردوں کے اس معاشرے میں ایک عورت کو پھر سے رسوا ہونا تھا۔ اس کی اگر غلطی تھی تو صرف اتنی کہ اس نے دوستی پر اندھا اعتبار کرکے اپنے گھر والوں کو بے اعتبار کیا۔

"یہ تمہارا گھر تو نہیں ہے؟" سامنے نظر آنے والے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل کے پاس ہی گاڑی رکتے دیکھ کر بے ساختہ پلوشہ کے منہ سے نکلا۔

"ہاں... تمہیں عماد نے ملنے کے لیے یہاں ہی بلایا ہے؟"

"لیکن تم نے تو کہا تھا..." وہ ہراساں ہوگئی۔

"ہاں ڈیر! میں نے کہا تھا کہ وہ تم سے میرے گھر ملے گا' لیکن جانے کیوں رات اس نے اپنا پروگرام تبدیل کردیا۔" دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"گاڑی پارکنگ میں مت لگانا' میں ابھی واپس آرہی ہوں۔" ڈرائیور کو ہدایت دے کر وہ آگے کی جانب چل دی اور مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ بھی قدم گنتی اس کے ساتھ ہولی۔

"اگر آج میرے گھر کے کسی فرد نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو یقیناً" مجھے زندہ دفن کردیا جائے گا۔" یہ سوچتے ہوئے بھی وہ دل ہی دل میں دعا کررہی تھی۔

"کاش مجھے یہاں بالاج مل جائے' بے شک وہ مجھے جان سے ماردے' لیکن میں اس اذیت سے تو بچ جاؤں گی' اے میرے خدا میری عزت کو محفوظ رکھنا۔" بے خیالی میں سبرینہ کے ساتھ چلتی ہوئی وہ ایک روم کے سامنے رک گئی' جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"تم جاؤ اندر' واپسی میں تمہیں عماد چھوڑ دے گا۔"

"پلیز سبرینہ!" آخری بار التجا۔

"دیکھو پلوشہ! ایک بار اس کی بات سن لو' اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ صرف ایک بار تم سے مل کر وہ تمہاری ساری تصویریں موبائل سے ڈیلیٹ کردے گا اور پھر تمہیں کبھی تنگ نہیں کرے گا۔" وہ پلوشہ کا ہاتھ تھامے اسے یقین دہانی کروارہی تھی' لیکن جانے کیوں اسے یقین نہ آرہا تھا' یہ کمرا اسے ایک پنجرا لگ رہا تھا' جہاں قید ہونے کے بعد وہ کبھی باہر نہ نکل پاتی اور پھر شاید یہ قید تنہائی اس کا مقدر بننے والی تھی۔

"ادکم آن یار! جو بات کرنی ہے اندر آکر کرو۔" دروازہ میں یقیناً" عماد تھا جو اس کا منتظر تھا۔

"بس عماد! میں چلتی ہوں' تمہارا کام ہوگیا۔ میری رقم میرے اکاؤنٹ میں آج ہی آجانی چاہیے۔" سبرینہ تیزی سے آگے بڑھ گئی' پلوشہ کو ایک نئی حقیقت سے روشناس کرواکر۔ "تو یہ سب کچھ پیسے کے لیے کیا گیا تھا۔"

سبرینہ سے نفرت کے شدید احساس نے اسے گھیر لیا۔

"آجاؤ پلوشہ! یہاں بیٹھو' مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

وہ جو جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ عماد کے الفاظ پر

وہ چونک اٹھی اور خاموشی سے اس کی جانب دیکھنے لگی جو نہایت سنجیدگی سے ہاتھ باندھے اس کی جانب متوجہ تھا۔

"میں نہیں بیٹھ رہی' تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ سب کیوں کیا؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ کیوں بلوایا مجھے اس طرح یہاں اس ہوٹل میں؟"

عماد کے رویہ نے اسے حوصلہ بخشا' یقیناً" بات کچھ اور تھی' جو وہ سمجھ رہی تھی' وہ نہ تھا' اس خیال کے آتے ہی وہ لگاتار سوال کر بیٹھی۔

"تم نے کچھ نہیں بگاڑا' تم تو صرف سزا بھگتنے والی ہو اس عمل کی جو تمہارے خاندان والوں نے چھبیس سال پہلے کیا تھا' ہمیں رسوا کرکے۔"

"میرے خاندان نے؟" وہ حیرت زدہ سی تھی۔

"ہاں پلوشہ! تمہارے تایا جنید عباسی نے ہمیں چھبیس سال پہلے جو ذلتیں بخشی تھیں' آج اس کا حساب برابر ہوگا۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں کہوں گا' صرف تمہیں مجھ سے نکاح کرنا ہوگا' پھر میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔" اطمینان سے یہ سب کہتا وہ پلوشہ کو پاگل لگا۔

"واٹ ڈو یو مین! تم پاگل ہوگیا؟" وہ چلا اٹھی۔ "نکاح کا مطلب سمجھتے ہو؟ اور میں تم سے نکاح کیوں کروں' کمال ہے' تم نے نکاح کو کوئی کھیل سمجھ رکھا ہے؟"

"چلاؤ مت' مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' میں الریڈی شادی شدہ ہوں۔" ایک اور انکشاف۔

"یہ سب تو میں اپنے بابا جان کے کہنے پر کررہا ہوں' میرا یقین کرو' نکاح کے بعد میں تمہیں بنا ہاتھ لگائے گھر چھوڑ آؤں گا' بالکل ویسے جیسے تمہارے تایا نے میری پھپھی کے ساتھ کیا تھا۔" استہزائیہ لہجہ۔

"اور پھر حویلی والوں کے ساتھ تمہیں رخصت کروانے آؤں گا۔" وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے قریب آگیا۔ "مجھے صرف اپنی پھوپھو خوشنما کا بدلہ لینا ہے۔"

"خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔" بالاج کے تصور نے اسے رلا دیا اور وہ ہاتھ باندھ کر عماد کے سامنے کھڑی ہوگئی' آنسو اس کے چہرے کو بھگو گئے۔ اسے آج پتا چلا کہ اس کے گھر والے اتنے محتاط کیوں تھے' کاش یہ سب داستان اسے پہلے پتا ہوتی تو وہ بھی اتنی ہی محتاط ہوتی' لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ وقت تو گزر گیا اور گزرا وقت شاید کبھی واپس نہیں آتا۔

"پلیز عماد! مجھے جانے دو۔ میرا تو اس قصہ میں کوئی قصور نہیں ہے۔"

"قصور ہے پلوشہ! تمہارا قصور ہے' تم اس خاندان کی عزت ہو جس کو ہم نے مٹی میں ملانا ہے۔"

بے بسی عماد کے لہجہ میں در آئی' اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی اچانک دروازے پر ہونے والی دستک سے دونوں ہی چونک اٹھے۔

"یقیناً" سجاول قاضی صاحب کو لے کر آیا ہوگا' تم واش روم میں جاکر منہ ہاتھ دھولو۔" اسے ہدایت دیتا وہ

تیزی سے دروازہ کی جانب بڑھا اور بے فکری سے لاک کھول دیا' دروازہ کھلتے ہی کسی نے عماد کو دھکا دیا اور کچھ افراد تیزی سے کمرے میں داخل ہو گئے جن میں سے ایک یقیناً" بالاج تھا' جسے دیکھتے ہی پلوشہ کے جسم میں بجلی سے بھر گئی۔

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

آخری احساس اس کے ذہن میں جاگا اور پھر شاید وہ بے ہوش ہو گئی' اس کا شدید نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور پورے ایک ہفتہ بعد جب وہ ہوش میں آئی تو شرمندگی کے شدید احساس میں گھری ہوئی تھی' وہ خود کو کسی سے بات کرنے کے قابل نہ پاتی تھی۔

ہوش میں آتے ہی اس کے ذہن میں بہت سے سوالات نے سر ابھارا' جن میں سب سے قابل ذکر سوال تو یہ تھا کہ بالاج اس تک کس طرح پہنچا؟ پھر وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کی نانی خوشنما کے بارے میں جو کچھ عماد نے بتایا کیا وہ درست تھا؟ لیکن وہ خود کو اس کے قابل نہ پاتی تھی کہ کسی سے کچھ پوچھتی' وہ تو صرف یہ ہی سوچ سوچ کر شرمندہ تھی کہ عماد کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں اپنے موجود ہونے کا کیا جواز اپنے گھر والوں کو پیش کرے گی؟ وہ اس وقت سے ڈر رہی تھی جب یہ سوال اس سے کیا جائے گا؟ اسے سب سے زیادہ فکر بالاج کی تھی' جس دن سے وہ ہوش میں آئی تھی بالاج اس سے ملا ہی نہ تھا' وہ نیچے آتا ضرور تھا' اس کی آواز کسی نہ کسی وقت اس کے کان میں پڑ جاتی تھی' لیکن ابھی وہ پلوشہ کے سامنے نہیں آیا۔

☼ ☼ ☼

اس دن غالباً" اتوار کا دن تھا' صبح سے ہی نمرہ آئی ہوئی تھی' دو دفعہ وہ اس کے کمرے سے چکر لگا کر گئی تھی' لیکن وہ جان بوجھ کر سوتی بن گئی' لیکن جب وہ تیسری دفعہ اس کے لیے ناشتا لے کر آئی تو پلوشہ خود پر سے اختیار کھو بیٹھی اور بے ساختہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی' نمرہ نہایت پیار سے اس کی پشت سہلاتی رہی۔

"میں بہت بری ہوں نمرہ! میں نے تم سب کو دھوکا دیا۔ کاش میں مر جاتی۔"

"پاگل ہو گئی ہو کیا جو فضول بول رہی ہو' شکر کرو تمہیں اللہ تعالیٰ نے کسی بڑے نقصان اور ہمیں بدنامی سے بچا لیا' یہ سوچو اگر اس دن وہاں بالاج بھائی نہ جاتے تو کیا ہوتا۔"

نمرہ اسے خاموش کرواتے ہوئے دھیرے دھیرے سمجھا رہی تھی۔

"لیکن بالاج وہاں کیسے پہنچا؟" یہ سوال خود بخود اس کی زبان پر آ ہی گیا' صبرینہ کی مدد سے وہ عماد سے محبت کرنے لگی تھی' اس نے عماد سے اپنی چاہت کا اظہار کیا تو عماد نے اس کو اس کی اوقات یاد دلائی اور کہا ایک لڑکی جو پیسے سے خریدی جا سکتی ہے' جس کا دین ایمان پیسہ ہے۔ اس کی محبت مذاق کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ اس کے لہجے میں اتنی حقارت تھی کہ صبرینہ نفرت اور انتقام میں پاگل ہو گئی۔ اس نے عماد سے بدلہ لینے کے لیے عین وقت پر بالاج سے رابطہ کر کے اسے سب کچھ بتا دیا۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا' اللہ کا شکر کرو کہ تم بحفاظت گھر آ گئیں۔ اور تم اب یہ تو جان ہی چکی ہو گی کہ عماد کون ہے؟ تو سمجھ لو یہ سب کچھ میرے ننھیال والوں کا کارنامہ ہے۔ وہ نفرت' بدلہ کی آگ جس میں وہ پچھلے چھبیس سالوں سے جل رہے ہیں۔ لیکن شکر کرو وہ اپنے اس گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بہر حال اس سب کے باوجود بالاج نے بدنامی سے بچنے کے لیے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ اور پھر عماد نے تو بالاج سے معافی بھی مانگ لی۔ اور تمہیں پتا ہے' آج میں یہاں کیوں آئی ہوں؟"

بات کرتے کرتے رک کر اس نے ایک نظر پلوشہ کے ستے ہوئے چہرے پر ڈالی جس پر کھنڈی زردی نمرہ کے حساس دل کو دکھا دیا اور پلوشہ کو اپنی جانب سوالیہ نگاہوں سے تکتا پا کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"رات بابا کا فون آیا تھا' وہ چاہتے ہیں کہ اب جلد از جلد تمہاری اور بالاج کی شادی ہو جائے۔"

"پلیز نمرہ! تم تایا جی کو منع کرو' مجھے بالاج سے شادی نہیں کرنی۔"

نمرہ کی بات ختم ہوتے ہی وہ ایک دم تیز آواز میں بول اٹھی۔ اس کی بات سنتے ہی نمرہ گھبرا سی گئی۔

"کیا کہہ رہی ہو تم پلو' تم ہوش میں تو ہو۔" اسے یقین ہی نہ آیا کہ یہ الفاظ پلوشہ کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔

"ہاں نمرہ! میں سچ کہہ رہی ہوں' میں بالاج سے شادی کر کے ساری زندگی اس کی نفرت کا نشانہ نہیں بن سکتی۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اٹھی۔

"میں جانتی ہوں' بالاج مجھے کبھی بھی پسند نہ کرتا تھا اور اب' اب تو شاید کبھی بھی نہیں' اب تو میں اس کے قابل رہی بھی نہیں ہوں۔"

"تم سے کس نے کہا کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتا؟" یہ آواز یقیناً" بالاج کی تھی جسے سنتے ہی پلوشہ کو کرنٹ سا لگا' اس نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا' نمرہ جانے کب کی جا چکی تھی' اب عین اس کے سامنے بالاج کھڑا تھا' سینے پر دونوں ہاتھ باندھے نہایت سنجیدگی سے اس کی جانب سوالیہ انداز سے تکتا ہوا۔

"میں... وہ..." اس کی آواز حلق میں پھنس سی گئی۔

"دیکھو پلوشہ! ڈرو مت' جو تمہارے دل میں ہے کہہ دو' میں بالکل برا نہ مانوں گا۔" وہ اپنی بات کہتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"تمہیں اپنی پسند اور ناپسند کا اختیار ہے' اگر تم مجھے پسند نہیں کرتیں تو صاف صاف کہہ دو' یقین جانو' میں دل برا نہ مانوں گا اور جہاں تم کہو گی وہیں تمہاری شادی کرانے میں تمہاری مدد کروں گا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے؟" وہ اس الزام پر تڑپ اٹھی۔ "میں تو صرف آپ کی وجہ سے..."

"کیا میری وجہ سے؟ کھل کر کہو' تم سے کس نے کہا میں تمہیں پسند نہیں کرتا۔"

"کسی نے نہیں۔" وہ کمزور لہجہ میں بولی۔ "لیکن اس سب کے بعد بھی آپ کیسے مجھ سے شادی کر سکتے ہیں؟"

دل کی بات لبوں پر آ ہی گئی۔

"میری بات غور سے سنو پلوشہ! میں کوئی فلمی ہیرو نہیں ہوں' جو تمام برائیوں سمیت ہیروئن کو گلے لگا لوں گا۔ میں بھی ایک عام سا روایتی مرد ہوں اور ہمیشہ یہ ہی چاہتا ہوں کہ وہ شخصیت جو مجھ سے منسوب ہو با کردار اور خالص ہو' معذرت کے ساتھ اگر مجھے تمہاری بے گناہی کا یقین نہ ہوتا تو میں شاید کبھی بھی تم سے شادی نہ کرتا' وہ تو میں شروع سے ہی تم پر نظر رکھے ہوئے تھا اور پھر صبرینہ نے بھی مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم ایک جال میں پھنس گئی ہو اور اس جال سے تمہیں نکالنا میری ذمہ داری تھا' جسے میں نے نہایت احتیاط سے پورا کیا' اگر چاہتا تو عماد کو اغوا کے جرم میں جیل بھی کروا سکتا تھا' لیکن میں نے ایسا نہیں کیا' وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ میرا کزن تھا' وجہ یہ تھی کہ تم میرا سب کچھ ہو اور اگر میں اس دن ایسا کرتا تو یقیناً" تمہارا نام بھی اخباروں میں اچھالا جاتا اور وہی سب کچھ — میرا ماموں چاہتا تھا' میں نے تمہاری عزت کی خاطر سب کو معاف کر دیا اور عماد کو بھی خاموشی سے وہاں سے جانے دیا۔"

بالاج نے دھیرے دھیرے اسے سب بتا دیا۔ "اب تم بتاؤ' کیا میں واقعی تمہیں برا لگتا ہوں؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"نہیں نہیں۔" پلوشہ بے ساختہ بولی "یہ میں نے کب کہا ہے؟" بالاج بے اختیار ہنس پڑا تو اس نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔

آمنہ ریاض

ستارۂ شام

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے' جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹتا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے' جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزو فرینیا کی مریض ہے' جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ نفیس کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی' ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیہہ العباس طبعتاً "سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے' جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔"

پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ 'تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ 'تنوی کا منگیتر ہے' وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شبیہہ العباس 'ثروت دانیال کی اولاد ہے' جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بدمزاج اور غصیلا بنا دیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال 'ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد 'زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً" ماوی کا ٹکراؤ شبیہہ سے ہوتا ہے جس سے ماوی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں' لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً" ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہو تی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ 'ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں' جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

[illegible] فیضان [illegible] ثروت نے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند [illegible] اور فیضان ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک [illegible] اس لیے ثمینہ' ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر 'نمرہ اور [illegible] کی بے انصافی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے' وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد 'بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو' رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے' لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمد 'جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت 'دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آکر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن 'ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ 'ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس 'ماوی کے رشتے دار ہیں اور یہ کہ ماوی کے باپ 'رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ 'ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

ثمینہ نے بتایا۔ رجب کے مرنے کے بعد جنت بی بی نے ان کے سامنے رجب کی وصیت رکھ دی۔ جس میں انہوں نے اپنی ساری جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی۔ وہ ساری جائیداد اٹھارہ برس کی عمر ہونے کے بعد رجب کی بیٹی یعنی ماوی کو منتقل ہونا تھی۔ یہ تو حقیقت تھی کہ وصیت جعلی تھی لیکن ثمینہ کے اس وقت حالات ایسے نہ تھے کہ وہ جنت کو چیلنج کر سکتیں۔ وہ خاموشی سے حویلی چھوڑ کر اپنے بھائی فیاض کے ساتھ گئیں۔

بعد میں ایک دن جنت بی بی ثمینہ سے ملنے آئی اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اس کے بڑے بیٹے سے شادی کر لیں۔ جو ذہنی معذور تھا۔ ثمینہ نے انکار کر دیا۔ تب جنت نے بتایا کہ وہ رجب کی ساری جائیداد اپنے نام کرا چکی ہے۔ ساتھ اس نے انکشاف کیا کہ رجب کو اس نے زہر دے کر مارا ہے۔

ثمینہ نے کہا کہ ماوی آرٹ نیشنل ہے۔ جنت اس کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔ ایمبیسی حرکت میں آجائے گی۔

ثمینہ نے ماوی سے کہا' وہ اس کی شادی جلال سے طے کر چکی ہیں۔ اسے جلال سے نکاح کرنا ہوگا تاکہ حویلی جا سکے۔ انہوں نے کہا اپنا مقصد حاصل ہونے کے بعد ماوی جلال سے خلع لے لے تاکہ شہروز سے شادی کر سکے۔ شہروز کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماوی نے انکار کیا تو ثمینہ نے خواب آور گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی۔

۲۰
بیسویں قسط

ماوی محاورتاً" نہیں حقیقتاً" اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی' جس کے چہرے پر خوب صورتی کے ساتھ ساتھ نوعمری کی ملاحت اور دلکشی اتنی تھی کہ یہ سوچنا بھی محال تھا کہ وہ کسی دور میں اس کی ماں پر ظلم و ستم ڈھاتی رہی ہوگی۔

پھر اس نے بے ساختہ سر جھٹک کر اس خیال سے پیچھا چھڑایا' یہ تو انتہائی احمقانہ خیال تھا کہ یہ کم عمر لڑکی اس کی ماں کی ساس ہو سکتی ہے۔

"شاید کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو رہی ہے۔" اس نے شائستگی سے تمہید باندھی۔ "مجھے جنت بی بی سے ملنا ہے' جو اس حویلی کی مالکن اور رولاور حسین بھٹی ——— کی بیوہ ہیں۔"

"اوہ...!" تنوی بے ساختہ مسکرائی۔ "آپ کو بی جان سے ملنا ہے اور میں سمجھی' آپ مجھ سے ملنے آئی ہیں۔"

"بی جان؟" ماوی نے چونک کر بغور اس کا چہرہ دیکھا' اگر یہ لڑکی اپنی ماں کا پرتو تھی تو فیضان ماما نے غلط دل نہیں ہارا تھا۔ ماوی نے بے اختیار سوچا تھا۔

"جی ہاں... جنت بی بی میری نانی ہیں' لیکن حویلی میں چونکہ کوئی انہیں نام سے مخاطب نہیں کرتا' اس لیے ملازماؤں نے یہی سمجھا کہ آپ میرے متعلق ہی پوچھ رہی ہیں' بائی دا وے... کیا میں آپ کا تعارف حاصل کر سکتی ہوں۔" تنوی نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں... اپنا تعارف کروانے ہی آئی ہوں میں۔" ماوی نے مسکرا کر کہا تھا' لیکن اس کے لہجے میں ایسا کچھ تھا جسے طنز کا نام دیا جا سکے۔

"میں ہادی رجب علی ہوں اور آئرلینڈ سے آئی ہوں' مختصر تعارف تو یہی ہے۔ اگر آپ کی نانی جان سے ملاقات ہوجائے تو باقی کا تفصیلی تعارف وہی کروادیں گی اور سچ بات ہے' مجھے اس بات کی خوشی بھی زیادہ ہوگی کہ وہی مجھے حویلی میں متعارف کروائیں۔"

"لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ کی ملاقات ان سے نہیں ہوسکے گی۔" تنوی نے شائستگی سے کہا۔ "بی جان میڈیکل چیک اپ کے سلسلے میں انگلینڈ گئی ہوئی ہیں' ایک یا دو ہفتوں کے بعد ان کی واپسی متوقع ہے۔"

"اوہ...!" ہادی کو بے ساختہ خوشی ہوئی' جنت بی بی کی حویلی میں غیر موجودگی ایک ایسا پلس پوائنٹ تھا جسے وہ بڑی سہولت سے اپنے حق میں استعمال کرسکتی تھی۔

"حویلی میں کوئی تو بڑا موجود ہوگا' میرا مطلب ہے جنت بی بی کا کوئی بیٹا یا بیٹی؟"

"مستقیم ماموں موجود تو ہیں' لیکن وہ بھی اس وقت زمینوں کی طرف نکلے ہوئے ہیں' اگر آپ انتظار کرسکیں تو..."

"ضرور... میں انتظار ہی کرلیتی ہوں۔" ہادی نے تیزی سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے' میں آپ کے لیے گیسٹ روم کھلوادیتی ہوں۔" تنوی نے کہا' پھر ملازمہ سے مخاطب ہوئی۔

"کلثوم! پیچھے والا گیسٹ روم کھلوادو اور بی بی کا سامان وہاں رکھوادو۔"

"آپ کھانا کھائیں گی یا چائے پینا پسند کریں گی؟" اس نے ہادی سے پوچھا تھا۔

"کافی کے ساتھ اگر کچھ اسنیکس مل جائیں تو کیا ہی اچھی بات ہو۔" ہادی عادت سے مجبور تھی' فوراً بے تکلفی سے بولی تنوی مسکرادی۔

"ٹھیک ہے' آپ گیسٹ روم میں آرام کیجیے۔ میں کافی اور اسنیکس بھجوادیتی ہوں' تب تک ماموں جان بھی آجائیں گے۔"

ہادی اثبات میں سرہلا کر ملازمہ کے پیچھے چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہادی نے بہ نظر غائر کمرے کا جائزہ لیا' اچھا تھا۔ ویسا ہی جیسا اتنی بڑی اور پرشکوہ حویلی کا گیسٹ روم ہوسکتا ہے۔ شاہانہ اور آرام دہ۔

اس نے سرہلا کر پسندیدگی کا اظہار کیا' ملازمہ اس کا سامان رکھ کر جاچکی تھی۔ ہادی نے پہلے کھڑکیوں کے پردے ہٹائے' پھر بیڈ پر نیم دراز ہوکر آگے کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگی۔ لیکن کچھ بھی ترتیب دینا یا طے کرنا قبل ازوقت ہوتا' کیونکہ جب تک حویلی کے مکینوں سے اس کی ملاقات نہ ہوجاتی' کسی بھی نتیجے پر پہنچنا ازحد مشکل تھا۔ لیکن یہ چند روز جب تک جنت بی بی واپس نہ آجاتیں اس حویلی کی بنیادوں میں جھانکنے میں بے حد معاون ثابت ہوسکتے تھے۔

معاً اسے ممی سے بات کرنے کا خیال آیا' ابھی اس نے بیگ سے سیل فون نکالا ہی تھا کہ دروازے پر دستک دے کر ملازمہ اندر داخل ہوئی۔

"بڑی جلدی آگئیں بھئی تم تو۔" ہادی نے سیل فون سائیڈ پر رکھتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ کلثوم نے ٹرالی بیڈ کے قریب رکھ دی۔

"بی بی! آپ کیا لیں گی؟"

ہادی نے ٹرالی پر تفصیلی نظر ڈالی' پھر اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مجھے جو چاہیے ہوگا' میں لے لوں گی' تم جاؤ۔" ملازمہ ادب سے سرہلا کر پلٹی' پھر جاتے جاتے رکی۔

"بی بی! آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجادیجے گا۔"

"ہوں... اچھا سنو۔" ہادی نے کچھ خیال آنے پر اسے پکارا۔ "یہ مستقیم بھٹی صاحب جب زمینوں پر جاتے ہیں تو کب تک واپس آجاتے ہیں۔ میرا مطلب ہے' اندازاً" کتنے گھنٹے لگتے ہیں۔"

"کیا کہہ سکتی ہوں بی بی! مالک لوگ ہیں' اپنی مرضی سے جاتے' اپنی مرضی سے واپس آتے ہیں۔" کلثوم نے جواب دیا۔

"اچھا اس وقت مالکوں میں سے حویلی میں کون کون موجود ہے؟ میرا مطلب ہے مستقیم صاحب کے بھائی وغیرہ؟"

"بی بی! بڑی بیگمیں تو آج شہر گئی ہوئی ہیں' چھوٹی بیبیوں میں تنوی بی بی اور حرم باجی موجود ہیں۔"

"اور مستقیم صاحب کی بیوی؟"

"جی۔ وہ تو حویلی میں نہیں رہتیں۔"

"اچھا... لیکن کیوں؟"

"ہم ملازم لوگ ہیں بی بی! جتنا معلوم تھا اتنا بتادیا' اس سے زیادہ بولنے کی نہ ہمیں اجازت ہے' نہ کوئی خبر۔"

"اچھا ٹھیک ہے' تم جاؤ۔" ہادی کو فوراً" ہی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ کم سے کم کسی ملازمہ کو اسے شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے اور اس طرح کرید کرید کر سوالات پوچھنا ضرور اسے شک میں ڈال سکتا تھا۔

"لیکن جیسے ہی مستقیم صاحب تشریف لائیں' انہیں میری آمد کی اطلاع ضرور دے دینا۔" وہ تاکید کرتی ٹرالی کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

ایک' دو' تین' چار...

پورے چار گھنٹے گزر چکے تھے' لیکن مستقیم بھٹی کا کچھ پتا نہ تھا۔ اب تو ہادی بھی یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بری طرح تھک چکی تھی' اسے کئی بار خیال آیا کہ اسے گیسٹ روم سے نکل کر ذرا حویلی میں گھوم پھر لینا چاہیے۔ یہاں کسی مثبت پذیرائی کی تو اسے ہرگز توقع نہ تھی تو کیا فرق پڑتا اگر وہ حویلی والوں کی اجازت کے بغیر یہاں ذرا تانک

جھانک کر لیتی۔

یوں بھی اسے کئی سوچیں درپیش تھیں، مثلاً" جنت بی بی سے پہلے اس کے بیٹے مادی کو دیکھ کر کس طرح کے رد عمل کا اظہار کریں گے؟ کیا اسے دھکے مار کر حویلی سے نکال دیا جائے گا یا کچھ روز رہنے کی اجازت دے دی جائے گی؟

ابھی وہ یہی سب سوچ رہی تھی کہ ثمینہ کی کال آ گئی۔

"کم سے کم اپنی خیریت کا ایک ایس ایم ایس ہی کر دیتیں مادی۔"

ثمینہ نے فون پر اس کی آواز سنتے ہی بے چینی سے کہا تھا، مادی بے ساختہ زور سے ہنس دی۔

"آپ کا بھی جواب نہیں ہے ممی! خود ہی اٹھا کر یہاں بھیج دیا جہاں آپ کو اچھی طرح معلوم ہے، میرے ساتھ کسی بھی قسم کا سلوک ہو سکتا ہے اور اب فکر مند بھی ہو رہی ہیں۔"

"ماؤں کے دل ایسے ہی ہوتے ہیں جب تک اولاد کی خیریت نہ جان لیں پر سکون نہیں ہوتے۔" ثمینہ نے متانت سے کہا۔ مادی تلخی سے مسکرا دی۔

"نہیں ممی! ماؤں کے دل ایسے نہیں ہوتے۔" اس نے دل میں سوچا اور سر جھٹک کر انہیں تازہ ترین رپورٹ سے آگاہ کرنے لگی۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ جنت بی بی حویلی میں موجود نہیں ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں تمہیں حویلی والوں سے گھلنے ملنے کا موقع مل جائے گا۔" پوری بات سننے کے بعد ثمینہ نے کہا تھا۔

"حویلی والوں سے گھلنے ملنے کا موقع تب ملے گا۔ جب مجھے یہاں رہنے دیا جائے گا اور میری چھٹی حس کہہ رہی ہے ممی! کہ مجھے دھکے مار کر یہاں سے نکال دیا جائے گا۔"

ثمینہ [illegible] چپ سی ہو گئیں۔

"نہیں [illegible] حویلی میں قیام کرنا ہے مادی! اچھی امید رکھو، نتیجہ بھی اچھا ہی ملے گا اور میری بات مانو۔ گیسٹ روم سے نکل کر ذرا باقی حویلی کا جائزہ لو، تمہارے ہاتھ کوئی نہ کوئی پوائنٹ ضرور لگے گا۔" ثمینہ نے اسے تاکید کی تھی۔

"یہ تو کوئی ویڈیو گیم ہو گئی کہ پوری حویلی کا راؤنڈ لگا کر سراغ اکٹھے کروں۔" مادی نے فون بند کرتے ہوئے باآواز بلند سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

انیبا ابھی سو کر اٹھی تھی کہ اس کے فون کی بیل بجنے لگی۔ موبائل اٹھا کر دیکھا۔ ولید کا نام جگمگا رہا تھا۔

"کیا تکلیف ہے تمہیں؟" انیبا نے اسے چڑایا۔ "ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے خود آ کر بات نہیں کر سکتے جو فون کر رہے ہو۔"

"ایک ہی گھر سے کیا مراد ہے؟ میں تو معیز کے گھر بیٹھا ہوا ہوں۔" ولید نے کہا۔

"معیز کے گھر کیا کر رہے ہو؟" انیبا نے اچنبھے سے پوچھا۔

"یار! گھر میں بیٹھا بور ہو رہا تھا، سوچا معیز کی طرف آ کر ذرا کمبائن اسٹڈی ہی کر لوں۔"

"اچھا فون کیوں کیا ہے؟"

"میں اپنی یو ایس بی گھر بھول آیا ہوں، تم ذرا میرے کمرے میں جاؤ، رائٹ سائیڈ والی الماری کے سیکنڈ شیلف پر پڑی ہو گی۔ میں معیز کے ڈرائیور کو بھیج رہا ہوں، تم یو ایس بی اسے دے دینا۔"

"اچھا ٹھیک ہے، تم ایسا کرو، معیز کے ڈرائیور کے ہاتھ ایک زنگر برگر بھی بھجوا دو۔ میں زنگر وصول کر کے یو ایس بی دوں گی۔"

"وہ کس خوشی میں؟"

"میں اپنے کمرے سے نکل کر تمہارے کمرے میں جاؤں گی، پھر وہاں یو ایس بی جیسی چھوٹی سی چیز تلاش کروں گی، اچھا خاصا ٹائم لگے گا اور میری انرجی بھی ویسٹ ہو گی۔ زنگر کھا کر کچھ تو حساب کتاب برابر کروں۔" انیبا نے مزے سے کہا تھا۔

"ایک تو تم اتنی بدصورت ہو کہ کسی اینگل (زاویے) سے مجھ جیسے ہینڈسم لڑکے کی اکلوتی بہن نہیں لگتیں، پھر جتنی بدصورت ہو اس سے کہیں زیادہ بھوکی ندیدی ہو کہ ہر وقت کھانے پینے کے خواب دیکھتی رہتی ہو، میں سوچتا ہوں انو! تم اسی طرح ٹھونس ٹھونس کر کھاتی رہیں تو ایک دن پھٹ جاؤ گی۔"

ولید نے فوراً "تصویر کا منفی رخ" اسے دکھایا۔ وہ چڑنے کی بجائے مزے سے بولی۔

"اس بات کی تم فکر نہ کرو، بس زنگر بھیجو۔ ایسا نہ ہو تمہاری قیمتی یو ایس بی تمہاری الماری سے ایسی غائب ہو کہ دوبارہ ملے ہی نہیں۔" انداز صاف دھمکانے والا تھا۔

ولید نے چڑنے کے باوجود پسپائی اختیار کر لی۔

"مرو تم۔۔۔ بھیجتا ہوں زنگر۔۔۔ اللہ کرے، ہضم ہی نہ ہو۔"

انیبا نے ہنستے ہوئے فون بند کیا اور اٹھ کر اس کے کمرے میں آ گئی گو کہ ولی اور ولید کا کمرا مشترکہ تھا، لیکن الماریاں ان دونوں کے جھگڑوں کی وجہ سے ممی نے الگ الگ کر دی تھیں۔

انیبا نے پہلے میوزک سسٹم آن کیا، پھر ولید کی الماری کھول کر یو ایس بی تلاش کرنے لگی۔ یو ایس بی تلاش کرنے میں اسے زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ پہلے کیبنٹ میں بالکل سامنے ہی پڑی تھی۔ انیبا اپنی جھونک میں جوں ہی یو ایس بی اٹھا کر پلٹنے لگی بے دھیانی میں اس کا ہاتھ لگنے سے قریب رکھا پیکٹ گر گیا۔ انیبا نے قدرے جھنجلا کر پیکٹ اٹھانا چاہا تو پیکٹ کے کھلے منہ سے ایک چھوٹا سا بکس نیچے گرا۔ انیبا کی آنکھوں میں الجھن سمٹ آئی تھی، اس نے بکس اٹھا کر کھولا۔ آنکھوں میں پھیلی الجھن بڑھ گئی تھی، کیونکہ اس کے اندر چند سگریٹ اور ایک اسٹائلش سا لائٹر پڑا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلے ایک گھنٹہ مزید انتظار کرنے کے بعد مادی گیسٹ روم سے باہر آ گئی، اعتماد اس کے اندر بہت تھا، مگر لیکن وہ تھوڑی سی جھجک محسوس کر رہی تھی، پھر بھی وہ اطمینان اور بے تکلفی سے چہل قدمی کرتی ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ حویلی کیا تھی، پورا محل ہی تھا۔ خوب صورت اونچی اونچی چھتیں منقش دریچے اور شہتیر، سجی ہوئی دیواریں۔۔۔ مادی جس ماحول کی پروردہ تھی، وہاں ایسے عالی شان گھر دیکھنے کو نہیں ملتے۔ وہ یہاں کی امارت دیکھ کر اچھی خاصی متاثر ہو رہی تھی۔ (مرعوب نہیں۔)

لیکن ایک بات جو اس نے محسوس کی، وہ یہ تھی کہ یہاں عجیب طرح کی ویرانی محسوس ہوتی تھی، گو کہ ملازم بھی چلتے پھرتے کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ مگر پھر بھی ایسا لگتا جیسے در و دیوار سے عجیب سی مردنی لپٹی ہوئی ہو۔

مادی مزے سے آزادانہ یہاں وہاں گھومتی رہی، یکایک اسے عجیب سا احساس ہوا اور وہ یہ کہ اس راہ داری سے غالباً "وہ تیسری مرتبہ گزر رہی تھی۔ یہ خیال آتے ہی بے اختیار اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اتنی بڑی حویلی تھی اور وہ حویلی کی بھول بھلیوں میں یقیناً "گم ہو چکی تھی۔

اس نے دوبارہ اسی راستے پر چلنا شروع کیا' مگر مزید تین چکر لگا لینے کے باوجود اسے گیسٹ روم تک رسائی حاصل نہ ہو سکی۔ تھک ہار کر وہ راہ داری سے منسلک برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر کھلے سے صحن میں آگئی۔ صحن پر جھکے ہوئے آسمان کی نیلاہٹوں میں شام کی سیاہیاں گھلنا شروع ہو چکی تھیں۔ حویلی کا یہ حصہ باقی حصے سے قدرے الگ تھلگ تھا' سرخ اینٹوں کا فرش تھا' بالکل درمیان میں پختہ اینٹوں کا کنواں تھا اور صحن کے دائیں طرف گولائی کے رخ پر کچھ کمرے بنے ہوئے تھے۔ کمروں کے دروازے پرانی وضع کے اور چھوٹے تھے۔ کنویں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت تھا اور درخت سے چند قدم دور ہاتھ والا نلکا تھا' جس کے پاس چند برتن پڑے ہوئے تھے۔

کمرے گو کہ صحن کے رخ پر تھے۔ مگر ان کے دروازوں کو دیکھ کر عجیب سی ویرانی کا احساس ابھرتا تھا۔ ماوی کسی عجیب سے احساس کے ساتھ ان بند دروازوں کی طرف دیکھتی کنویں تک آگئی اور کنویں کی منڈیر پر ہتھیلیاں جما کر کنویں کے اندر جھانکا' کنویں کا دہانہ اگرچہ کھلا ہوا تھا' لیکن روشنی کی لکیریں چند فٹ نیچے جا کر تاریکی میں مدغم ہو جاتی تھیں۔

ابھی اس تاریکی میں ڈوبے منظر نے ماوی کے دل پر ہیبت پھیلانا ہی شروع کی تھی کہ معاً" کسی چیز کے زور سے گرنے کی آواز سنائی دی۔ ماوی اپنی جھونک میں تھی' اس غیر متوقع دھماکے پر بری طرح گھبرا کر سیدھی ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے گردن موڑ کر ان کمروں کی طرف دیکھا' کیونکہ آواز اسی طرف سے آئی تھی اور یہ دیکھ کر اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ ایک کمرے کے سامنے بے حد معمولی لباس میں ملبوس ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ بری طرح حواس باختہ دکھائی دیتا تھا اور اس کے ہاتھوں سے برتنوں کی ٹرے بھی چھوٹ کر گر چکی تھی۔ یہ شور ان ہی برتنوں کے گرنے سے ابھرا تھا۔ ماوی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے پلٹ کر جھٹ پٹ دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور چابی گریبان میں اڑس لی۔ پھر سرعت سے جھک کر یہاں وہاں لڑھکے برتن اٹھا کر ٹرے میں رکھے اور تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے پاس آئی۔

"آ..... آپ کون ہیں جی؟" اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کمال ہے بھئی! اتنی زور سے برتن گرا کر ڈرا تم نے مجھے دیا ہے اور ہوائیاں بھی تمہارے اپنے چہرے پر اڑ رہی ہیں۔" ماوی نے اپنے مخصوص انداز میں لتاڑا تھا' وہ بے چاری پہلے ہی گھبرائی ہوئی تھی' اس انداز اور لہجے پر مزید گھبرا گئی۔

"معاف کر دیں بی بی! وہ میں آپ کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔" اس نے گھبراہٹ زدہ لہجے میں کہا تھا۔

"کیا میں اتنی ڈراؤنی ہوں۔" ماوی نے صدمے سے چور لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بی بی! وہ میں تو جی....." وہ بے چاری بری طرح بوکھلا گئی۔

ماوی ہنس دی۔

"ٹھیک ہے بھئی۔ اس میں اتنا گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں ہے' میں سمجھ گئی تم اچانک مجھے سامنے دیکھ کر ڈر گئی تھیں۔"

وہ زور زور سے اثبات میں سر ہلانے لگی۔ یہی بہت تھا کہ یہ شکل اور حلیے سے مالکوں کی مہمان دکھائی دینے والی بی بی اس کی بات سمجھ گئی تھی۔

"اچھا سنو..... میں گیسٹ روم میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ ایسے ہی باہر نکلی تھی تو راستہ بھول کر اس طرف آگئی۔ تم مجھے گیسٹ روم تک پہنچا دو گی؟"

"اچھا اچھا....." وہ سر پر ہاتھ مار کر خوش ہوئی۔

"میں بھی کہوں' آپ اس طرف کس طرح آگئیں۔ اس طرف تو کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔ رستہ

بھول کر ہی آئی ہوں گی۔"

"کیوں بھئی۔ یہ کیا علاقہ غیر ہے جو یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔" ماوی نے تعجب سے ادھر ادھر دیکھا۔ "اور اگر کسی کو ادھر آنے کی اجازت نہیں ہے تو تم یہاں کیسے آگئیں؟"

"وہ جی میں..... میں تو....." وہ از سر نو سٹپٹائی پھر سنبھل کر بولی۔ "میں آپ کو گیسٹ روم تک پہنچا دیتی ہوں۔"

صاف لگ رہا تھا کہ وہ ماوی کے سوال کو ٹال رہی ہے۔ ماوی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک گہری نظر اس لڑکی پر اور دوسری نظر ان بند دروازوں پر ڈالی جن پر پھیلی ہوئی پر اسراریت اسے ابہام میں مبتلا کر رہی تھی۔

تین چار مختصر اور طویل راہداریاں عبور کرنے کے بعد اس لڑکی نے ماوی کو گیسٹ روم کے دروازے تک پہنچا دیا۔ ماوی نے پلٹ کر اس کا نام دریافت کرنا چاہا تو وہ گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح آن کی آن میں غائب ہو چکی تھی۔

"عجیب لڑکی ہے۔" ماوی نے تعجب سے سوچا تھا۔

✵ ✵ ✵

ولید بڑے خوش گوار موڈ کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تھا۔ وہ انگلی پر کی چین گھما رہا تھا اور کوئی ہٹ نمبر بھی گنگنا رہا تھا۔ لیکن لاؤنج میں قدم رکھتے ہی وہ بری طرح ٹھٹکا۔ انبہا لاؤنج میں چکر پہ چکر لگا رہی تھی اور پریشانی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟... فرش کس خوشی میں گھس رہی ہو... اچھا اچھا سمجھ گیا' لگتا ہے میری بددعا اثر کر گئی ہے... زنگر ہضم نہیں ہوا ناں؟"

انبہا نے رک کر گہری نظروں سے اسے دیکھا پھر میز سے سگریٹ کی ڈبیا اٹھا کر اس کے سامنے کر دی۔

"یہ کیا ہے؟"

"سگریٹ ہے... اف! تم اسموکنگ کرنے لگی ہو' تمہیں شرم نہیں آتی۔" ولید کا انداز سنجیدہ لیکن آنکھوں سے شرارت جھانکتی تھی۔ انبہا کے تلووں سے لگی تو سر پر جا کر بجھی۔

"شرم مجھے نہیں تمہیں آنا چاہیے کیونکہ یہ سگریٹ مجھے تمہاری الماری سے ملے ہیں۔" انبہا نے خاصے طنز اور غصے بھرے لہجے میں کہا۔

"اوہ..." ولید ایک آن میں سب سمجھ گیا۔

"دھت تیرے کی..... میں کیسے بھول گیا کہ یہ سوغات الماری میں رکھی ہوئی ہے۔" اس نے دل ہی دل میں خود کو کوسا۔

"اس میں شرم کی کیا بات ہے' الماری میں سگریٹ پڑے ہونے کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں ہوتا کہ میں پینے بھی لگا ہوں۔" اگلے ہی پل اس نے بات سنبھالی۔ "یہ معیز کی ہے' ہم یو۔ ایس۔ بی کے ساتھ ہی بھجوا دیتیں۔"

"ہاں تاکہ تم لوگ معیز کے گھر بیٹھ کر سگریٹ پینے کا شوق پورا کرتے۔ میں بھی سوچ رہی تھی' یہ یکایک کمبائن اسٹڈی کا بخار کیسے چڑھ گیا۔"

"توبہ' توبہ... اتنا شک..." ولید نے مذاق اڑانے والے انداز میں کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"مجھے باتوں میں مت ٹالو ولید۔" انبہا نے پہلے سے زیادہ سنجیدگی سے کہا تھا۔ "مجھے سچ سچ بتاؤ' کیا تم اسموکنگ کرنے لگے ہو؟"

"نہیں یار..." ولید نے زور دے کر کہا لیکن لہجہ کمزور تھا۔
"جھوٹ سراسر جھوٹ۔" انیبا نے صدمے سے کہا۔
"تمہیں کیسے پتا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" ولید چڑ گیا تھا۔
"کیونکہ سچ نظریں چرا کر نہیں بولا جاتا۔"
"ایک تو تم اور تمہارے فلسفے۔" ولید جھنجلا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔
"تمہیں اچھی طرح پتا ہے ولید! کہ ہماری فیملی کس کرائسز سے گزر رہی ہے۔ ممی یہاں نہیں ہیں۔ ڈیڈی ہر چیز ہر بات سے لاتعلق ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایسے میں تمہاری حرکتیں..." وہ ابھی یہاں تک ہی پہنچی تھی کہ ولید نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ جھپٹ لیے۔
"کون سی حرکتیں؟" ولید کا انداز بے حد پرطیش تھا۔ انیبا چپ سی رہ گئی۔ "میں بتا چکا ہوں۔ یہ سگریٹ میرے نہیں معیز کے ہیں۔ اس نے رکھوائے تھے میرے پاس۔ واپس دینا یاد نہیں رہا اور تم ہو کہ تلقین شاہ بن کے نصیحتیں کرنے لگی ہو..."
اس نے اشتعال بھرے انداز میں کہا اور زور زور سے پیر پٹختا اپنے کمرے میں چلا گیا' صرف یہی نہیں زوردار طریقے سے دروازہ بھی بند کیا۔
انیبا وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی کیونکہ وہ جانتی تھی۔ ولید جھوٹ بول رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

"ہادی رجب علی!" مستقیم بھٹی نے اس نام پر بری طرح چونکتے ہوئے زیر لب دہرایا تھا۔ ان کا گارڈ موبائل پر حویلی کے کل وقتی ملازم خادم نواز سے بات کر رہا تھا۔
مستقیم بھٹی نے ہاتھ بڑھا کر موبائل فون اس سے لے لیا۔
"بولو خادم نواز!" ان کی بھاری آواز لینڈ کروزر کے خنک ماحول میں گونجی تھی۔
"چوہدری صاحب! کوئی لڑکی آئی ہے۔ اپنا نام ہادی رجب علی بتاتی ہے کہتی ہے' آئرلینڈ سے آئی ہوں۔ بڑی چوہدرائن سے ملنا چاہتی تھی پھر بولی آپ سے ملاقات کرے گی... ہمارے لیے کیا حکم ہے چوہدری صاحب!"
"تم اسے حویلی میں ٹھہراؤ اور بولو ہمارا انتظار کرے... جب تک ہم واپس نہ آجائیں اسے واپس جانے نہیں دینا۔" مستقیم بھٹی نے ہدایت جاری کر کے فون گارڈ کو پکڑا دیا۔
"ڈرائیور! فارم ہاؤس کی طرف گاڑی موڑ لو۔ شبیہہ صاحب کو پک کر کے حویلی جانا ہے..."
"صاحب! بارانی زمین..." ڈرائیور نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں... وہ پھر کبھی۔" مستقیم بھٹی نے مختصراً کہا اور بند شیشے سے باہر بھاگتے دوڑتے مناظر دیکھنے لگے۔ ان کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں بکھری تھیں۔ کتنے عرصے بعد یہ مانوس نام سماعت سے ٹکرایا تھا۔ متعجب ہو جانا عین فطری تھا۔
"رجب علی... کیا نام تھا رجب علی کی بیٹی کا؟... اور کیا یہ واقعی رجب علی کی بیٹی ہے یا کوئی اور... اور اگر واقعی اس کا تعلق رجب علی سے ہے تو اچانک کہاں سے آگئی۔"
انہیں کئی سوچیں درپیش تھیں اور پیشانی پر ان گنت لکیروں کا جال بچھا تھا۔

☼ ☼ ☼

دور آسمان پر ایک ستارہ ابھر رہا تھا۔

فیضان کی نظریں اس ابھرتے نکتے سے چپک کر رہ گئیں۔ پھر جب آسمان بالکل تاریک ہو گیا اور چمک دار نکتے ہر جگہ دکھائی دینے لگے تو انہوں نے جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا۔ معمولی سی رگڑ سے ننھا سا شعلہ ابھرا اور سگریٹ سلگا کر اپنی موت آپ مر گیا۔
فیضان نے ایک کے بعد دوسرا سگریٹ سلگایا پھر تیسرا... بالآخر اکتا گئے اور چوتھا سگریٹ یونہی ایش ٹرے میں مسل دیا۔ انہیں کوئی سوچ لاحق تھی عجیب سی بے چینی جیسے کچھ کھو دیا ہو' کوئی چیز گنوا دی ہو۔
حالانکہ ان کی زندگی میں ایسا تھا ہی کیا۔ جسے کھو دینے کے بعد ایسی بے چینی لاحق ہوتی۔
بعض اوقات کسی چیز کے حصول کے لیے انسان ساری زندگی جدوجہد کرتا رہتا ہے اور جب وہ چیز مل جاتی ہے تو انسان سوچتا ہے' یہ تو کوئی چیز ہی نہیں تھی جس کے لیے اتنی محنت کی اور بعض اوقات کسی چیز کو انسان ایک نظر میں رد کر دیتا ہے اور انجام کار اسے پتا چلتا ہے۔ یہی تو زندگی کا حاصل تھا۔
انسانوں اور چیزوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے بعض اوقات انسان' دوسرے انسانوں کو چیزوں کی طرح رد کر دیتا ہے۔ انہوں نے انیبا کے ساتھ یہی کیا تھا۔
اور اب انہیں پچھتاوے ستانے لگے تھے۔ یہ نہیں کہ دل اس کا نام لیوا تھا بس یہ تھا کہ ضمیر کی چبھن معذرت کے چند بول ادا کر دینے کے باوجود کم نہ ہوتی تھی۔ وہ سادہ و معصوم سی لڑکی تھی۔
اس کی سادگی کو تو وہ پہلی ملاقات میں ہی بھانپ چکے تھے جب وہ جھکی نظروں کے ساتھ اپنے لان کے متعلق ان سے استفسار کر رہی تھی۔ پھر اس کے جھجک آمیز انداز اور آخر کار اظہار کے وہ چند لفظ جن پر فیضان اتنی بری طرح رد عمل ظاہر کر چکے تھے کہ کوئی خود آگاہ لڑکی ہوتی تو پلٹ کر ان کی شکل دیکھنا تو دور کی بات ہے' آواز سننا بھی گوارا نہ کرتی۔
لیکن وہ انیبا تھی شاید عام لڑکیوں سے مختلف اور بہت خاص۔ تب ہی تو دل پلٹ پلٹ کر اس کی طرف جا رہا تھا اور فیضان کو اس صورت حال نے پریشان کر دیا تھا۔
کتنے سالوں میں انہوں نے اپنے اردگرد جو بے حسی کی چار دیواری کھڑی کی تھی' اس کی بنیادیں کمزور پڑنے لگی تھیں۔ ان کا پریشان ہونا کچھ ایسا معمولی امر بھی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کو پتا ہے حرم آپا! باہر بی جان سے ملنے کوئی لڑکی آئی ہے۔" اپنے اور حرم کے مشترکہ کمرے میں واپس آکر تنوی نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا تھا۔
حرم نے ذرا کی ذرا کتاب سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔
"تو اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے۔ بی جان سے پہلی بار ملنے تو کوئی نہیں آیا۔ ان کے مہمان تو آتے رہتے ہیں۔"
"ہاں۔ حیرانی کی بات تو کوئی نہیں ہے لیکن مجھے لگتا ہے' میں نے اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔" تنوی پرسوچ انداز میں کہہ رہی تھی۔ حرم نے اس کی بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ وہ بری طرح کتاب میں منہمک تھی۔
تنوی آڑی ترچھی بیڈ پر لیٹ کر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ چہرے پر سوچ کر پرچھائیاں بڑی واضح تھیں۔
"پتا ہے حرم آپا! میں ہمیشہ سے اس لڑکی کی طرح بننا چاہتی تھی لیکن' لیکن میں جانتی ہوں میں کبھی ایسی نہیں

بن سکتی۔۔۔ اتنی بولڈ۔ اتنی پراعتماد۔" بڑی دیر بعد تنوی نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ اس کا لہجہ حسرت آمیز تھا۔

حرم نے گردن موڑ کر قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔

"کون لڑکی؟"

"وہی جو بی جان سے ملنے آئی ہے۔"

"اچھا اچھا۔۔۔" حرم کو یک دم یاد آیا کہ وہ ابھی کچھ دیر پہلے آگاہ کر چکی ہے۔ "لیکن اس لڑکی میں کیا خاص بات ہے کہ تم اس جیسی بننا چاہتی ہو۔"

"وہ پر اعتماد ہے آپا! آپ اسے دیکھیں گی تو آپ کو پتا چلے گا۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کر سکتی ہے۔ کسی بھی طرح کے نامساعد حالات آجائیں' وہ گھبرائے گی نہیں' حرم آپا! میں اتنی کانفیڈنٹ کیوں نہیں ہوں۔" اس کا انداز ابھی بھی حسرت لیے ہوئے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب اس حسرت میں جھنجلاہٹ کا اضافہ بھی ہو گیا تھا۔

"تم بھی کانفیڈنٹ ہو تنوی!" حرم نے اسے بہلایا تو وہ مزید چڑ گئی۔

"آپ مجھے بچوں کی طرح نہ بہلائیں۔ بچی نہیں رہی میں۔ اب بڑی ہو گئی ہوں۔"

"اچھا اماں بی!" حرم ہنس دی۔ "یہ بتاؤ۔ وہ لڑکی واپس چلی گئی؟"

"نہیں۔ میں نے اس کا سامان گیسٹ روم میں رکھوا دیا ہے۔"

"ارے! تم پاگل ہو گیا؟ جب بی جان (جنت بیگم) ہی یہاں نہیں ہیں تو اسے ٹھہرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ مستقیم ماموں سے ملنا چاہ رہی تھی۔ بتا رہی تھی کہ آئرلینڈ سے آئی ہے۔ میں نے سوچا' ضرور کوئی خاص ملاقاتی ہو گی ورنہ اتنی دور سے کوئی مہمان بنا اطلاع دیے تو نہیں آسکتا۔ اسی لیے میں نے اسے گیسٹ روم میں ٹھہرا دیا کہ جب تک ماموں نہیں آجاتے' وہ آرام کرے۔" تنوی نے تفصیل سے بتایا۔

"ہوں!" حرم نے پر سوچ انداز میں کہا۔ "ایسا کرو۔۔۔ ویسے تو خادم (ملازم) بڑے ابا کو مہمان کی آمد کے متعلق آگاہ کر چکا ہو گا لیکن تم بھی ایک بار انہیں فون کر دو۔۔۔ زمینوں پر جب جاتے ہیں تو واپسی کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور پھر آج تو شبیہہ بھی ان کے ساتھ ہے۔ کیا خبر رات کو واپسی کا ارادہ ہی نہ ہو۔"

تنوی حرم کے منہ سے شبیہہ کا حوالہ سن کر چونک گئی۔

"شبیہہ بھائی کب آئے؟"

"وہ تو کل سے آیا ہوا ہے۔ تمہیں نہیں پتا؟" حرم نے بتا کر پوچھا۔ تنوی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ حرم شرارت سے ہنس دی۔

"اتنی بے خبری بھی اچھی نہیں ہوتی جانم! تھوڑی باخبر رہا کرو خصوصاً "شبیہہ العباس کے معاملے میں۔"

تنوی جھینپ سی گئی۔

"اب کوئی ایسا ضروری بھی نہیں کہ خبریں رکھوں۔"

اس نے قدرے بن کر کہا تھا۔ حرم پھر ہنس دی۔

"اچھا چھوڑو اس بات کو۔ بڑے ابا کو فون کر دو اور اگر وہ ریسیو نہ کریں تو شبیہہ کے نمبر پر کر دینا۔ وہ دل سے زیادہ قریب رکھتا ہے اپنا سیل فون۔" تنوی نے حرم کا سیل فون اٹھا کر مستقیم ماموں کا نمبر ملایا۔ دل میں خواہش سی جاگی تھی کہ وہ فون ریسیو نہ کریں اور اس ستم گر کی آواز سننے کو مل جائے۔ لیکن اف کچھ خواہشات کس طرح پوری ہو جاتی ہیں کہ دل خوشی سے بے قابو ہی ہونے لگتا ہے۔

مستقیم ماموں کے نمبر پر کال تو اٹینڈ ہوئی لیکن آواز شبیہہ العباس کی تھی۔ تنوی کے دل میں بے ساختہ خوشی جاگی۔

"ہیلو۔۔۔ حرم! بولو بھی یا کال ملا کر سو گئی ہو۔" وہ مستقل ہیلو ہیلو کرتے رہنے کے بعد اکتا کر بولا تھا۔

"وہ۔۔۔ حرم آپا نہیں ہیں' میں بول رہی ہوں۔" تنوی نے جلدی سے کہا تھا۔

"میں کون؟۔۔۔ تمہارا کوئی نام بھی ہے یا نہیں؟" حسب عادت چڑ کر پوچھا گیا۔ بے چاری تنوی اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ عبیر کہتی تھی جن سے دل کا تعلق ہو' وہ تو خاموشی تک پہچان لیتے ہیں گو کہ اس وقت تنوی کو یہ بات بڑی افسانوی سی لگی تھی اور اسے اس بات پر یقین بھی نہیں آیا تھا لیکن اب دل چاہ رہا تھا کہ کاش عبیر کی کہی بات سچ ہو لیکن تف ہے بھئی ایسی افسانویت و رومانویت پہ۔۔۔ وہ تو آواز سن کر بھی نہ پہچانا۔ خاموشی رہتی تو خاک پہچانتا۔

"تنوی بول رہی ہوں۔ مستقیم ماموں کو بتا دیں۔ حویلی میں ان کے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ جلد از جلد حویلی پہنچ جائیں۔" اس نے بددلی سے کہہ کر فون بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر پھر سے چھت کو گھورنے لگی۔

☆ ☆ ☆

مادی تھک ہار کر ایک بار پھر گیسٹ روم سے باہر آگئی تھی۔

برآمدے سے آگے حویلی کا مرکزی باغ تھا۔ دور دور تک پھیلی ہوئی گھاس جو ابتدائی رات کے منظر میں کاہی مائل دکھائی دیتی تھی بڑے بڑے درخت جو بھوتوں کی طرح تنے کھڑے تھے۔ ہر طرف نامانوس سے اندھیرے کا راج تھا۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد کوئی بھلا منظر تلاش کرنے لگی۔

خدا معلوم کیا وجہ تھی کہ اتنی بڑی حویلی کی لائٹیں بھی ابھی تک نہیں جلائی گئی تھیں۔

وہ یہی سب سوچ رہی تھی کہ معاً "پھاٹک کے اس طرف تیز روشنیاں چمک اٹھیں۔ چوکیدار اور گارڈ پھرتی سے پھاٹک کھولنے لگے۔ لینڈ کروزر فراٹے بھرتی اندر آگئی تھی۔

مادی بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دل اچانک کچھ عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ تھوڑی سی بے چینی' ذرا سی گھبراہٹ اور شاید ایکسائٹمنٹ۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس سمت میں بڑھنے لگی۔

ملازم نے بڑھ کر پچھلی طرف کے دروازے کھول دیے تھے۔ سفید رنگ کے لباس میں ملبوس مستقیم بھٹی اس کے سامنے تھے۔ لمبے چوڑے مضبوط کاٹھی اور بہترین شخصیت کے مالک۔

مادی کی نظروں میں پسندیدگی ابھری تھی اسی وقت برآمدے اور لان کی آرائشی لائٹیں جل اٹھی تھیں۔ مستقیم بھٹی نے ملازم کی بات سنتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ مادی تیز قدموں سے چلتی جلد از جلد ان تک پہنچنا چاہتی تھی لیکن اسی پل اس نے گاڑی کے متوازی سمت سے شبیہہ العباس کو آتے دیکھا تھا۔ مادی کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ کیا ضروری تھا کہ پہلے ہی روز اس سڑیل سے ٹکراؤ ہوتا؟

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عہدِ وفا

ناولٹ

سونیا نوید

اسمارہ اور رعنا بہنیں ہیں۔ رعنا کی اکلوتی بیٹی عرشی اسمارہ کے اکلوتے بیٹے حذیفہ سے محبت کرتی ہے لیکن حذیفہ اسے صرف اچھی دوست سمجھتا ہے۔ حذیفہ لمز میں زیر تعلیم ہے۔ وہاں اس کی ملاقات جویریہ سے ہوتی ہے۔ ڈری سہمی جویریہ کا کوئی دوست نہیں ہے۔ ایک بار حذیفہ اس کی مدد کرتا ہے۔

حذیفہ پارک میں جاتا ہے تو وہاں اس کو جویریہ اور اس کے والد ملتے ہیں۔ حذیفہ ان سے بات کرتا ہے۔ جویریہ کے والد ندیم بہت خوش اخلاق اور اچھے انسان ہیں۔

کالج ڈرامے میں جویریہ کو ایک چھوٹا سا رول ملتا ہے لیکن عین وقت پر وہ اسٹیج پر جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ حذیفہ اس حرکت پر اسے ملامت کرتا ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس نے ناظرین میں اپنی ماں کو بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ حذیفہ کو اپنی ماں کے بارے میں بتاتی ہے۔

جویریہ کی ماں ایک بڑی زمین دار فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔ جویریہ کے نانا نے ان کی شادی اپنے دوست کے یتیم بیٹے سے کر دی جس کو انہوں نے پالا تھا۔ جویریہ کی ماں نے اس شادی کو قبول نہیں کیا۔ اور طلاق لے کر دوسری شادی کر لی۔ جویریہ اپنی نانی کی وفات پر ماں سے ملنے گئی تو انہوں نے جویریہ کو نہ صرف بیٹی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا بلکہ برا بھلا بھی کہا۔ وہاں موجود جویریہ کے کزنز نے بھی باپ کے حوالے سے اس کا مذاق اڑایا۔ جویریہ کے دل پر یہ ذلت نقش ہو گئی۔

حذیفہ کے والد دانش کام کے سلسلے میں لندن جا رہے تھے، اسمارہ بھی ان کے ساتھ چلی گئیں۔

دوسری قسط

جویریہ نے المونیم کی چھوٹی سی پتیلی میں دو کپ پانی ڈال کر اسے آگ پر رکھا اور دوسری طرف چھوٹی سی ٹرے میں ترتیب کے ساتھ کپ اور پرچ وغیرہ سجانے لگی۔

چائے کے برتن لگا کر اس نے کچن کیبنٹ میں سے بسکٹ کا ڈبہ نکال کر کھولا اور بسکٹ پلیٹ میں سجا دیے۔

چائے کے برتنوں کے ساتھ بسکٹوں کی پلیٹ کا اضافہ کر دینے کے بعد بھی جویریہ کی کچھ خاص تسلی نہیں ہوئی۔ پر مجبوری یہ تھی کہ گھر میں اس وقت کچھ اور موجود نہیں تھا اور گھر آئے مہمان کے سامنے خالی چائے لے کر جانا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

جب وہ گھر پر ہوا کرتی تھی تو تب گھر میں دو چار ایسی اشیا ضرور موجود ہوتی تھیں جو کسی مہمان کے اچانک آجانے پر تواضع کے لیے سامنے رکھی جاسکیں۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کے گھر اچانک آجانے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔

جویریہ کے لاہور جانے کے بعد ندیم صاحب کھانے پینے کے معاملے میں حد سے زیادہ لاپرواہ ہو گئے تھے حالانکہ انہوں نے اسے ہاسٹل بھیجنے سے پہلے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا خیال رکھیں گے پر جویریہ کو نہیں لگتا تھا کہ انہوں نے اپنا وعدہ نبھایا تھا۔ جب وہ چھٹیوں میں گھر آئی تو باورچی خانے میں ہر چیز کی عدم دستیابی سے پریشان ہو گئی۔ پتی' چینی' چاول حتیٰ کہ نمک مرچ جیسی اشیا کی بوتلوں میں بھی برائے نام ذخیرہ باقی رہ گیا تھا۔

"ڈبوں کے خالی ہونے سے بڑا اس بات کا کیا ثبوت ہو گا کہ میں سب کچھ پکا تا رہا ہوں اور کھا تا رہا ہوں۔" ندیم صاحب نے جویریہ کے تفتیشی سوالوں کے جواب میں کہا۔

وہ بہت اچھا کھانا پکانا جانتے تھے۔ باورچی خانے کی ذمہ داری جویریہ نے محض چار پانچ سال قبل ہی اپنے سر لی تھی۔ اس سے پہلے ندیم صاحب خود ہی سارے کام سرانجام دیا کرتے تھے۔

"پکانے اور کھانے والے لوگ ڈبوں کو دوبارہ بھرتے ہیں۔ ایسے ہی خالی نہیں چھوڑ دیتے۔"

جویریہ خفا ہونے لگی اور وہ اس کی استحقاق بھری ڈانٹ کھا کر ہنستے رہے۔

ضرورت کی کافی چیزیں تو جویریہ پاس کی دکان سے جا کر لے آئی تھی پھر بھی کافی کچھ باقی رہ گیا تھا۔

پانی کو ابال آنے لگا۔ جویریہ نے جلدی سے اس میں پتی ڈالی۔ ندیم صاحب کسی بھی طرح کی چائے بغیر اعتراض کے پی لیا کرتے تھے۔ مگر ان کے ساتھ اس وقت جو مختار چچا بیٹھے تھے چائے سمیت ہر چیز میں مین میخ نکالنے کے عادی تھے۔ چائے کا پانی پتی ڈالے بنا ذرا سا بھی زیادہ پک جاتا تو ان کو چائے کڑوی لگنے لگتی تھی۔

مختار چچا سے جویریہ وغیرہ کی کوئی رشتہ داری نہیں تھی پھر بھی وہ ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مشکل وقت میں اس مختصر سے خاندان کا بہت ساتھ دیا تھا۔

دودھ ابل کر پتیلی سے باہر آنے لگا۔ جویریہ نے جلدی سے اسے چولہے پر سے اتار کر دودھ دانی میں انڈیلا اور اسے بھی چائے والے تھرموس کے ساتھ رکھ دیا پھر ٹرے ہاتھوں میں اٹھا کر اندر کمرے کی طرف چل پڑی جہاں اس کے بابا اور مختار چچا بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پھر آپ نے کیا سوچا ندیم صاحب؟" مختار نے بستر پر تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھے ندیم صاحب سے پوچھا۔

چند ہفتوں میں ندیم صاحب کا جسم سکڑ کر آدھا رہ گیا تھا۔ کھال اور ہڈی کے درمیان گوشت کی تہہ دن بدن کم ہوتی جارہی تھی۔ کمزوری تو پہلے ہی تھی پر اب ماس ہڈیوں پر یوں کھنچ گیا تھا کہ انسان سے زیادہ استخوانی ڈھانچہ لگنے لگے تھے۔

"یہ ناممکن ہے۔" انہوں نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

"دیکھیں جی۔ میں ذرا کھرا بندہ ہوں' دوٹوک بات کرنے والا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو جتاؤں لیکن اب نوبت یہاں تک آگئی ہے تو ایسے ہی سہی۔ آپ کی حالت پچھلے کئی مہینوں سے سنورنے کے بجائے بگڑتی جارہی ہے۔ آپ کے ہسپتال کے چکروں اور ٹیسٹوں پر اٹھنے والی رقم میں نے کئی بار اپنی جیب سے خرچ کی۔"

"تم فکر مت کرو۔ تمہاری رقم لوٹائے بغیر میں مروں گا نہیں۔" ندیم صاحب نے مختار کی بات کاٹتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔

"میں نے آپ سے رقم کب مانگی ہے جی۔" مختار نے ایک دم سے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم پیسوں کے بدلے جو چیز مانگ رہے ہو' وہ میں تمہیں نہیں دے سکتا۔" ندیم صاحب بولے۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو آخر اعتراض کس بات پر ہے؟" مختار نے جھنجلا کر کہا۔

"کچھ تو خدا کا خوف کرو مختار! میں اپنی بیٹی کا ہاتھ کیسے تمہارے ہاتھ میں دے دوں اور کچھ نہیں تو اپنی اور اس کی عمر کا فرق ہی دیکھو۔" ندیم صاحب تڑپ کر بولے۔

"میری عمر کو کیا ہوا ہے۔" مختار بگڑ کر بولا۔ "بس ذرا بال وقت سے پہلے سفید ہو گئے ہیں۔"

مختار نے سر کے ان حصوں پر ہاتھ پھیرا جہاں پر ابھی کچھ بال موجود تھے۔

"اور اگر عمر کا تھوڑا بہت فرق ہے بھی تو کیا ہوا۔ آپ کو اس بات سے غرض ہونی چاہیے کہ آپ کی بیٹی کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔ دیکھیں جی! آپ پچھلے کئی سال سے مجھے جانتے ہیں۔ میرا سارا کام دھندا ابھی آپ کے سامنے ہے۔ اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک کمائی ہے میری۔ آپ کی بیٹی کو پہننے اوڑھنے کی کوئی کمی نہیں ہونے دوں گا اور کیا چاہیے آپ کو۔"

"بس کرو مختار۔ میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔" ندیم صاحب نے تھکے لہجے میں کہا۔ ویسے بھی جویریہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ اس کی شادی کا فی الحال سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"یہ پڑھائی کا اچھا بہانا بنایا ہوا ہے آپ نے۔" مختار ناراضی سے بولا۔ "خوامخواہ ہی اتنی دور کالج میں پڑھنے بھجوا دیا اسے۔ لڑکی ذات ہے۔ اتنا پڑھ کر کرے گی کیا اور پھر جو حالات ہیں اس میں کیا خبر وہ اپنی پڑھائی مکمل بھی کر سکے گی یا نہیں۔" مختار نے سفاکی سے کہا تو ندیم صاحب پہلو بدل کر رہ گئے۔

"اللہ مالک ہے۔" انہوں نے امید کے ساتھ کہا۔

"اللہ تو مالک ہے ہی جی۔ پر وسیلہ تو وہ انسانوں کو ہی بناتا ہے نا اور اگر میں وسیلہ بن کر آپ کی بیٹی کو سہارا دینے کو تیار ہوں تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے۔" مختار یوں بات کر رہا تھا جیسے ندیم صاحب ملک دوام کا رخت سفر باندھ کر بیٹھے ہوں۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو مختار خاموش ہو گیا۔

جویریہ نے اندر آکر ٹرے چھوٹی سی تپائی پر رکھی اور کپوں میں چائے انڈیلنے لگی۔

ندیم صاحب نے جویریہ کی طرف دیکھا۔

سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرہ بہت کم سن دکھ رہا تھا۔ وہ بالکل اپنی ماں کا عکس تھی۔ فرق تھا تو صرف یہ کہ جویریہ کے چہرے پر معصومیت تھی جبکہ الماس کے چہرے پر ہمیشہ رعونت نے ڈیرے ڈالے رکھے۔

اس طرح سر جھکا کر چائے بناتی ہوئی وہ اپنی عمر سے بھی کہیں کم لگ رہی تھی اور ابھی اس کی عمر بھی کیا تھی۔ فقط انیس سال اور یہ مختار کم از کم پچاس کے پیٹے میں ضرور تھا۔

جویریہ ایک ایسی ان چھوئی اور ادھ کھلی کلی کی مانند تھی جس پر ہر نیا دن نئی بہار اور نیا نکھار لے کر آرہا تھا'

وہ کیسے اپنی اس انمول متاع حیات کو مختار جیسے آدمی کے حوالے کرسکتے تھے؟

بات صرف عمروں کے فرق کی نہیں تھی۔ مختار ایک بدنیت اور موقع پرست انسان تھا جو اپنے ذرا سے فائدے کے لیے کسی کا بڑے سے بڑا نقصان کردینے سے بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ اس کی پہلی دو بیویاں اللہ کو پیاری ہوچکی تھیں۔ سارا محلہ اس بات کا گواہ تھا کہ جب تک وہ دونوں زندہ رہیں اس شخص نے اپنے ناروا سلوک سے ان کی زندگیاں اجیرن کیے رکھیں۔

جس رقم کو تلوار بنا کر مختار نے ندیم صاحب کے سر پر ٹانگ رکھا تھا' وہ کوئی بہت بڑی رقم نہیں تھی۔ چند ایک ضروری نوعیت کے ٹیسٹوں کے لیے فوری طور پر رقم کا بندوبست نہ کرپانے پر انہیں مختار سے مدد لینے کی ضرورت پیش آگئی۔ بلکہ سچ تو یہ تھا کہ ان کی مجبوری جان کر مختار رقم خود ان کے ہاتھوں میں زبردستی تھما گیا تھا تب وہ اس کی اس مہربانی کے پیچھے چھپے مقصد کو نہیں سمجھ سکے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ مختار کی نیت خراب ہوچکی تھی۔ رقم کا صرف بہانہ تھا۔

یہ ندیم صاحب کی بدقسمتی تھی کہ وہ عمر کے اس حصے میں آکر مختار جیسے شخص کے مقروض ہوگئے۔ بس یہی ایک ذلت سہنی رہ گئی تھی۔ باقی سب مصیبتیں تو وہ جھیل ہی چکے تھے۔ اب تو یہ ڈر لگنے لگا تھا کہ یہ بیماری جان کے ساتھ بچی کھچی عزت بھی کہیں سمیٹ کر نہ لے جائے۔

"اچھا ندیم صاحب' میں اب چلتا ہوں۔ شام کو پھر آؤں گا۔ آپ میری بات پر ایک بار پھر غور فرمائیے گا۔" مختار چائے کی خالی پیالی میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

ندیم صاحب سیدھے ہو کر لیٹ گئے اور آنکھیں موند لیں۔

پچھلے کچھ دنوں میں ندیم صاحب کی صحت بہت تیزی کے ساتھ گری تھی اور اس کی وجہ یہی پیچھا نہ چھوڑنے والی پریشانیاں اور تفکرات تھے۔

ڈاکٹر ان سے کہتے تھے کہ وہ خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کریں پر اب وہ ڈاکٹروں کو کیسے سمجھاتے کہ وہ باپ کیسے پرسکون رہ سکتا ہے جس کی اکلوتی اولاد کا مستقبل غیر محفوظ ہو۔ جس کی زندگی میں ہی مختار جیسے بھیڑیے اس کی بیٹی پر نظر رکھ کر بیٹھے ہوں' وہ اس کے مرنے کے بعد کیا کریں گے۔ وہ چاہ کر بھی اس حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتے تھے کہ اگر انہیں کچھ ہوگیا تو ان کے بعد جویریہ اس دنیا میں بالکل تنہا اور بے یارو مددگار رہ جائے گی۔

وہ جانتے تھے کہ وہ ضرورت سے زیادہ منفی انداز میں سوچنے لگے ہیں پر وہ کیا کرتے۔ یہ بیماری ان کی صحت کے ساتھ ان کے مستقبل کی خوش آئند امیدوں کو بھی کھائے جارہی تھی۔

بعض اوقات شدید مایوسی کے عالم میں ندیم صاحب کو لگتا کہ انہیں مختار کا مطالبہ مان لینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ مختار جویریہ کے حق میں اچھا ہی ثابت ہو۔ لیکن شدید مایوسی کے ان لمحات میں بھی ان کی چھٹی حس انہیں خبردار کرتی تھی کہ مختار جیسے شخص کی بات مان لینا جویریہ کو کنوئیں سے نکال کر کھائی میں دھکیل دینے کے مترادف ہوگا۔

جویریہ کو تو ابھی تک اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ جسے وہ مختار چچا کہہ کر بلاتی ہے وہ اس کے سر کا تاج بننے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

ندیم صاحب نے بند آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے سر میں اٹھنے والی ٹیسوں کو دبانے کی کوشش کی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھیں۔ بعض اوقات ان کے سر کا درد اتنا زیادہ بڑھ جاتا تھا کہ برداشت سے باہر ہوجاتا۔

"جویریہ بیٹا! دیکھنا' دروازے پر کون آیا ہے۔" دروازے پر بجنے والی گھنٹی کی آواز نے ندیم صاحب کی پریشان کن سوچوں میں دخل اندازی کرتے ہوئے انہیں آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔

"جی اچھا۔" چائے کے خالی برتنوں کی ٹرے لے کر جاتی جویریہ نے جواب دیا۔

جویریہ کے ٹرے کچن سلیب پر رکھنے تک گھنٹی دوبار بج چکی تھی۔ وہ تیز قدم اٹھاتی بیرونی دروازے تک آئی اور اسے جھٹکے کے ساتھ کھولا۔

اور پھر حیرت سے اپنی جگہ بت بن گئی۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گی؟" حذیفہ نے مسکرا کر جویریہ سے کہا' جو ابھی تک دروازے کے بیچ حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔

"جویریہ! کون ہے باہر؟" اندر کمرے سے ندیم صاحب کی آواز سنائی دی۔

"انکل! میں ہوں۔ حذیفہ' لیکن آپ کی بیٹی مجھے اندر نہیں آنے دے رہی۔"

جویریہ کے بجائے حذیفہ نے اونچی آواز میں جواب دیا تو جویریہ سٹپٹا کر پیچھے ہٹی۔

"السلام علیکم انکل!"

جویریہ کی رہنمائی کا انتظار کیے بنا ہی حذیفہ ندیم صاحب کی آواز کا پیچھا کرتے ہوئے ان کے کمرے تک پہنچ گیا۔

"میں نے سنا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اب کیسے ہیں آپ؟" حذیفہ نے ندیم صاحب کے بستر کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ندیم صاحب بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اپنے پوچھے گئے سوال کا شاعرانہ جواب سن کر حذیفہ ہنسنے لگا۔

"میرا خیال تھا کہ یہ شعر محبوباؤں کے لیے مخصوص ہے' مجھے نہیں پتا تھا کہ گھر آئے مہمانوں کی بھی اس سے تواضع کی جاسکتی ہے۔" حذیفہ نے کہا۔

"مہمان کسی محبوبہ سے کم نہیں ہوتے۔ سارا دن اس انتظار میں ہی گزر جاتا ہے کہ کوئی تو آئے جس سے دو باتیں کرکے اپنا جی بہلا لیا جائے۔"

ندیم صاحب نے حسرت سے کہا تو حذیفہ کو احساس ہوا کہ بیمار شخص کی زندگی بھی کتنی محدود ہوجاتی ہے۔

ندیم صاحب کی صحت بے شک ان گزرے چند دنوں میں تیزی کے ساتھ گری تھی مگر اس نے ان کی خوش مزاجی پر فرق نہیں ڈالا تھا۔ مختار ورانچ جن پریشان کن سوچوں کے ساتھ انہیں تھوڑی دیر پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ حذیفہ کے آنے پر وہ انہیں وقتی طور پر پس پشت ڈالنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

"برخوردار! اپنی سناؤ' تم یہاں کیسے؟" انہوں نے حذیفہ سے پوچھا۔

"کچھ دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کا پروگرام بنایا تھا۔ راستے میں راولپنڈی سے گزرا تو سوچا آپ سے ملتا جاؤں۔"

"اچھا کیا۔" ندیم صاحب نے سر ہلا کر کہا۔ "اور تمہارے باقی دوست کہاں ہیں؟"

"وہ سب اسلام آباد پہنچ چکے ہیں۔ مجھے لاہور سے نکلنے میں ذرا دیر ہوگئی۔ اس لیے اب ان سب سے وہیں ملوں گا۔ اسلام آباد سے آگے' پھر ان شاء اللہ کل روانگی ہوگی۔"

حذیفہ نے اپنے پروگرام کی تفصیل سے آگاہ کیا۔
"جویریہ بیٹا! کچھ چائے ٹھنڈا وغیرہ تو لے کر آؤ۔"
"نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔" حذیفہ جلدی سے بولا۔
"کیوں ضرورت نہیں؟" ندیم صاحب نے اسے گھور کر دیکھا۔
"ٹھنڈے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا اور چائے میں زیادہ پیتا نہیں ہوں۔" حذیفہ نے کہا۔
"ٹھیک ہے! پھر ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اس کا تو وقت بھی ہو رہا ہے۔" ندیم صاحب نے کہا۔
"ارے نہیں انکل!" حذیفہ نے منع کرنا چاہا۔
"کیوں؟ کیا کھانا بھی نہیں کھاتے ہو؟" ندیم صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا تو حذیفہ ان کے انداز پر ہنس پڑا۔
"کھانا تو کھاتا ہوں۔ لیکن پلیز آپ لوگ تکلف مت کیجیے۔ مجھے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ میں بس اب نکلوں گا۔"
"جہاں اتنی دیر ہو چکی ہے' وہاں تھوڑی اور سہی ــ اور رہی بات تکلف کی تو وہ ہم نہیں کر رہے ہو۔ ہم تو جو خود کھائیں گے' وہی تمہارے سامنے بھی رکھ دیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری روکھی سوکھی تمہیں پسند نہ آئے۔" ندیم صاحب نے جان بوجھ کر نفسیاتی داؤ کھیلا۔
حذیفہ ان کی چالاکی سمجھ کر مسکرانے لگا۔
"اس کے بعد غالباً" مجھے یہ کہنا چاہیے کہ آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ لوگوں کے ساتھ شریک طعام ہونا تو میرے لیے باعث فخر ہوگا۔"
"تو پھر اب تک کہا کیوں نہیں صاحبزادے!" ندیم صاحب بھی موڈ میں آئے ہوئے تھے۔
"جاؤ بھئی جویریہ! فٹافٹ کھانے کا بندوبست کرو۔ آج حذیفہ ہمارے ساتھ کھانا کھائے گا۔"
ندیم صاحب نے حذیفہ کو مزید احتجاج کا موقع دیے بغیر قطعی لہجے میں کہا۔
"جی بابا!"
جویریہ نے حذیفہ کی طرف دیکھا جو ندیم صاحب کے فیصلے کے آگے بے بس سا ہو گیا تھا' پھر ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر کچن میں چلی آئی۔
ندیم صاحب کے لیے سوپ بنانے کے لیے جویریہ نے تھوڑی دیر پہلے ہی محلے کے ایک بچے کو پیسے دے کر چکن منگوایا تھا جو ابھی تک پلاسٹک کی تھیلی میں بند کچن کی سلیب پر پڑا تھا۔
گھر میں کھانے والے صرف جویریہ اور ندیم صاحب ہی تھے۔ ایک چکن ان دونوں کی ضرورت سے زیادہ ہوتا تھا۔ اسی لیے جویریہ اسے دھو کر الگ الگ حصوں میں بانٹ کر رکھ لیتی' پھر حسب ضرورت ایک ایک حصہ نکال کر پکا لیا کرتی تھی۔
اب چونکہ حذیفہ بھی تھا اس لیے جویریہ کو چکن کے حصے بخرے کرنا مناسب نہیں لگا۔ صرف دو بوٹیاں الگ کر کے کم مرچ اور برائے نام گھی کے ساتھ ندیم صاحب کے لیے چڑھا دیں۔ باقی چکن کے لیے وہ ٹماٹر اور ہری مرچیں کاٹ کر کڑاہی کا مسالا تیار کرنے لگی۔ جویریہ نے صبح کریلے چھیل کر رکھے تھے۔ چکن کے ساتھ دوسری ڈش کے طور پر اس نے وہی پکا لینے کا سوچا اور ان کو نمک سے مل کر دھونے لگی۔
ندیم صاحب نے کسی قسم کا تکلف نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر گھر آئے مہمان کی حسب حیثیت تواضع نہ کرنا جویریہ کے میزبانی کے اصولوں کے خلاف تھا۔
کمرے سے وقتاً" فوقتاً" ہنسی کی آواز سنائی دے جاتی۔ حذیفہ کی سنگت میں ندیم صاحب کا اچھا وقت کٹ رہا تھا۔
حذیفہ میں یہ خوبی تھی کہ وہ مقابل کو بور نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسی کی اس خوبی کا اندازہ تو جویریہ کو ان دو ڈھائی گھنٹوں کے دوران ہی ہو گیا تھا' جو حذیفہ نے ان لوگوں کے ساتھ باغ جناح میں گزارے تھے۔
پتا نہیں حذیفہ کی زندگی میں ان دونوں باپ بیٹی کے ساتھ گزرے وقت کی کیا اہمیت تھی مگر جویریہ ایک

[...]لی دوپہر میں گزارے ہوئے وہ ڈھائی گھنٹے کبھی نہیں [...]ل سکتی تھی' جن کے دوران اس نے اپنے بابا کو تمام [...] و تردد بھلا کر کھل کر ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اس پاپ [...] ہنستے دیکھا تھا' جس سے وہ بے تحاشا پیار کرتی تھی' [...] پیار کرنے کے باوجود انہیں وہ دینے سے قاصر تھی [...] ڈھائی گھنٹوں کی قلیل سی مدت میں حذیفہ نے [...]نہیں دیا۔
[...] اور وہ تھی اچھی کمپنی اور دلچسپ گفتگو۔
جویریہ ایک اچھی بیٹی بن کر ندیم صاحب کا خیال [رکھ] سکتی تھی مگر ایک اچھی سامع' ایک اچھی دوست [بن] کر ان کی دلچسپیاں نہیں بانٹ سکتی تھی۔ جویریہ کو اکیلے پال پوس کر بڑا کرتے ہوئے ماں اور باپ کی دوہری [ذمہ] داریوں کو انہوں نے اتنی سنجیدگی سے نبھایا کہ وہ ایک مشفق اور حساس باپ تو بننے میں کامیاب ہو گئے [مگ]ر کبھی جویریہ کے دوست نہ بن سکے۔ جویریہ اور ان کے درمیان بے پناہ محبت ہونے کے باوجود ایک روایتی [فا]صلہ ہمیشہ برقرار رہا۔
جویریہ نے دھلے ہوئے کریلوں کے ایک طرف چیرا [لگا] کر انہیں اندر سے خالی کیا۔ وہ ان چیرا لگے کریلوں [می]ں باریک کٹی پیاز' سوکھا دھنیا اور انار دانے کا نمک مرچ ملا ہوا آمیزہ احتیاط سے بھر رہی تھی' جب حذیفہ بھی کچن میں چلا آیا۔
"کھانا بس تھوڑی دیر میں تیار ہو جاتا ہے۔ آپ [ت]ب تک بابا کے پاس بیٹھیے۔" اس نے حذیفہ سے کہا۔
جلدی جلدی ہاتھ چلا کر جویریہ نے تھوڑی دیر میں کافی کام نپٹا لیا تھا۔
"تمہارے بابا کے پاس کوئی ملنے والے آئے ہیں جو [مج]ھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اس لیے میں اٹھ کر باہر چلا آیا۔"
حذیفہ نے بتایا تو جویریہ کو ہنسی آگئی۔
"وہ مختار چچا ہیں۔ ہمارے برابر والے گھر میں رہتے ہیں۔ اکثر بابا کا حال پوچھنے آجاتے ہیں۔ آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے بھی یہاں سے ہو کر گئے تھے۔"
جویریہ نے بتایا۔
مختار کے آنے پر بیرونی دروازہ اسی نے جا کر کھولا تھا۔
مختار کے اتنی جلدی واپس آنے کی وجہ گلی میں کھڑی وہ چمکتی ہوئی گاڑی تھی' جس کو اس نے کھڑکی سے سر نکال کر اتفاقاً" ہی دیکھ لیا تھا۔
گلی میں کھیلتے بچوں سے تھوڑی سی پوچھ گچھ کرنے پر اسے آسانی سے پتا چل گیا کہ اس گاڑی کو یہاں لے کر آنے والا اس وقت ندیم صاحب کے گھر کے اندر موجود ہے۔
انہی ندیم صاحب کے گھر کے اندر جن کے پوری دنیا میں اپنے سوا کوئی اور ہمدرد و غم گسار نہ ہونے کا یقین وہ صرف ان کو ہی نہیں خود کو بھی دلا چکا تھا۔
اس انجان شخص کی موجودگی سے متعلق جو ان گنت سوالات مختار کے ذہن میں کلبلانے لگے تھے' ان کے جوابات کے لیے وہ شام تک کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے فوراً" دوڑا چلا آیا۔
جویریہ نے چولہے پر رکھی پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر اندر جھانکا۔ چکن کڑاہی کی اشتہا انگیز خوشبو بھاپ کے ساتھ نکل کر پورے کچن میں پھیل گئی۔
حذیفہ جویریہ کے پھرتی سے چلتے ہاتھوں کو دیکھنے لگا' جو اب مسالا بھرے کریلوں پر دھاگے لپیٹ کر انہیں تلنے کی تیاری کر رہی تھی۔
"یہ کیا ہے؟"
جویریہ نے ندیم صاحب والی ہانڈی کا ڈھکن اٹھایا تو اس کے اندر نظر آنے والے بے رنگ سے سالن کی شکل دیکھ کر حذیفہ نے پوچھا۔
"یہ بابا کا پرہیزی کھانا ہے۔ الگ سے بنایا ہے۔" جویریہ نے بتایا۔ "دراصل بابا کا دل کرتا ہے چٹ پٹی چیزیں کھانے کو لیکن وہ ان کے لیے نقصان دہ ہیں' پھر بھی وہ بہت چالاک ہیں۔ بہانے بنا کر کچھ نہ کچھ کھا ہی لیتے ہیں۔ آپ کو بھی کھانے پر اصرار کر کے ضرور اسی لیے روکا ہوگا تاکہ میں مہمان کا لحاظ کر کے زیادہ روک

ٹوک نہ کرسکوں، لیکن یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ وہ آپ کی آڑ میں یہ سب کھاپی لیں گے۔"

"تم تو سچ مچ کی ہٹلر ہو۔ کھانے دینا ناں اگر ان کا جی چاہتا ہے۔" حذیفہ نے کہا۔

"نہیں! اس میں چکنائی بہت ہے۔ بس تھوڑا سا چکھا دوں گی۔" جویریہ نے مسکراتے ہوئے اتنی رعایت کردی۔

"مسکرایا کرو۔ اچھی لگتی ہو۔" حذیفہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے جویریہ کی طرف گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا تو وہ جھینپ گئی۔

"مسالا بھرے کریلے پسند ہیں؟" جویریہ نے اپنے سرخ ہوتے گالوں پر سے حذیفہ کا دھیان ہٹانے کے لیے موضوع بدلا۔

"سب کچھ کھالیتا ہوں۔" حذیفہ نے کہا۔ وہ ابھی بھی جویریہ کو دیکھ رہا تھا۔

حذیفہ نے محسوس کیا کہ لنز کے مقابلے میں جویریہ اپنے گھر میں کہیں زیادہ پراعتماد تھی۔ اس کی گفتگو میں وہ جھجک یا ہچکچاہٹ نہیں تھی، جو عموماً" وہاں پر ہوا کرتی تھی۔ شاید ایک مخلوط تعلیمی ادارے میں وہ بات چیت اور میل جول کے معاملے میں زیادہ محتاط رہا کرتی تھی۔

جویریہ نے چولہے کی آنچ دھیمی کرتے ہوئے حذیفہ کی طرف دیکھا جو اچانک ہی خاموش ہوگیا تھا۔ اس کے ماتھے پر آئے بل بتا رہے تھے کہ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔

جویریہ سوجی کا گرم گرم حلوہ کڑاہی سے نکال کر کانچ کی ڈش میں ڈال رہی تھی جب ندیم صاحب کے کمرے سے آتی مدھم آوازوں میں یکدم اضافہ ہوا۔ جیسے کوئی اچانک جھگڑنے لگا ہو۔

جویریہ کا رنگ فق ہوگیا۔

وہ آدھا انڈیلا حلوہ پیالے میں اور باقی آدھا کڑاہی میں چھوڑ کر اندر بھاگی۔

جس وقت وہ اور حذیفہ کمرے کے اندر داخل ہوئے اس وقت ندیم صاحب اپنے بستر کے ایک طرف کو ڈھلکے پڑے تھے۔ ان کا چہرہ اس طرح سفید ہو رہا تھا جیسے کسی نے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

"بابا!" جویریہ چلا کر ان کی طرف بڑھی۔

"جویریہ! پیچھے ہٹو، انہیں سانس لینے دو۔" حذیفہ نے ندیم صاحب کا اکھڑا تنفس دیکھتے ہوئے ان سے لپٹی جویریہ کو پکڑ کر پیچھے کیا۔

ندیم صاحب کو بولنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ ان کا جویریہ کے سر پر تسلی دینے کے لیے رکھا ہوا ہاتھ اس کے پیچھے ہٹ جانے کے باوجود ہوا میں اسی جگہ پر ابھی تک جھٹکے کھا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ندیم صاحب کے جسم کا ان کے ذہن سے رابطہ منقطع ہوگیا ہو۔

"میرا خیال ہے، ہمیں انہیں فوراً" ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔ یہاں پاس میں کوئی ہسپتال ہے کیا؟" حذیفہ نے ندیم صاحب کی حالت دیکھتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔

دل کے امراض کے متعلق حذیفہ کا تجربہ صفر اور معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں اور جویریہ کی بدحواسی دیکھ کر نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ایسی حالت میں ندیم صاحب کی کوئی بھی مدد کرپائے گی۔

"یہاں قریب ہی ایک ہسپتال ہے جہاں بابا چیک اپ کے لیے جاتے ہیں مگر ٹیکسی منگوانے میں ٹائم لگے گا۔" جویریہ نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"ٹیکسی کی ضرورت نہیں۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔ تم ساتھ چلو۔ راستہ بتاتی جانا۔" حذیفہ نے ندیم صاحب کو سہارا دے کر کھڑا کیا۔

ندیم صاحب کو کمرے سے باہر لے جاتے وقت لمحہ بھر کے لیے حذیفہ کی نظر دروازے کے پاس خاموش کھڑے اس کرخت صورت شخص کی طرف گئی، جسے جویریہ مختار چچا کہہ کر بلاتی تھی اور جو انہیں مشکوک نظروں سے باہر جاتا دیکھ رہا تھا، مگر ندیم صاحب کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر احتیاط سے لٹانے اور جویریہ سے ہسپتال کا راستہ سمجھنے کے دوران حذیفہ اسے بالکل بھول گیا۔

☆ ☆ ☆

سامنے دیوار گیر اسکرین پر چلتی سلائیڈ ایک دم سے تبدیل ہوئی تو دانش نے اپنا ہاتھ غیر ارادی طور پر آنکھوں کے آگے کرلیا۔

اب تک کے بتائے جانے والے اعداد و شمار کو ظاہر کرتی ہوئی پائی چارٹ سے سجی اس سلائیڈ کے تیز رنگ دانش کی آنکھوں میں ایک دم سے چبھے تھے۔

آج صبح سے ہی دانش کا سر بھاری تھا جو اس وقت تک ٹھیک ٹھاک قسم کے سر درد میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اس درد کی وجہ سے انہیں مدھم کی ہوئی روشنی والے اس کمرے میں چلتی پریزنٹیشن پر دھیان دینے میں بھی دقت پیش آرہی تھی۔

دانش نے کوٹ کی آستین پیچھے کرتے ہوئے کلائی بندھی گھڑی پر نظر ڈالی، جس کے مطابق شام کے پانچ بج رہے تھے۔

دانش کے اندازے کے مطابق ابھی آدھے گھنٹے کی پریزنٹیشن اور باقی تھی۔ اس کے بعد اہم نکات پر تھوڑی سی بحث، سوال جواب، کچھ نہیں تو کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ اور درکار تھا اس میٹنگ کو برخواست ہونے میں۔

بات صرف سر درد کی نہیں تھی۔ دانش کو اس وقت اپنا پورا جسم ہی ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک تھکن سی تھی جو سارے وجود پر حاوی ہوئے جارہی تھی اور یہ تھکن آج سے نہیں پچھلے کئی دنوں سے ان کے جسم و جاں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس تھکاوٹ کا احساس تو انہیں ہیتھرو ایئرپورٹ پر اترتے ہی ہوگیا تھا پر تب انہوں نے اسے سفر کی تھکن کے کھاتے میں ڈال کر زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

اسمارہ تو سارا راستہ سوتی ہوئی آئی تھیں۔ انہیں کبھی جہاز میں نیند ہی نہیں آئی۔ سفر کے دوران بھی اپنا کام کرتے رہے اور یہاں آنے کے بعد بھی مسلسل بھاگ دوڑ جاری رہی۔ آرام کا وقت ہی نہیں ملا۔

پر یہ بھاگ دوڑ تو وہ تیس سال کی عمر سے کر رہے تھے۔ اسی طرح بنا آرام کیے، بنا رکے۔

سارا مسئلہ یہی تھا کہ اب ان کی عمر تیس سال کی نہیں رہی تھی۔

شاید اسمارہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ انہیں اب ریٹائر ہو جانا چاہیے تھا۔ دانش نے گردن کے پیچھے ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچا، جہاں پٹھوں میں شدید دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔

دانش نے کرسی پر پہلو بدلا تو درد کی ایک تیز لہر پورے جسم میں سے گزرتی ہوئی گئی۔ ایک لمحے کو دانش کا جی چاہا کہ یہ میٹنگ چھوڑ کر اٹھ جائیں۔ ان کی گاڑی باہر پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔ صرف دس منٹ میں وہ واپس اپنے ہوٹل پہنچ سکتے تھے۔

دانش جب بھی یہاں آتے، اپنی آمد و رفت کے لیے کیب سروس یا کرائے کی گاڑی استعمال کرتے۔ انہیں لندن میں چلنے والی زیر زمین ٹرینوں میں بھاگ دوڑ کر اترنا چڑھنا زیادہ پسند نہیں تھا۔

زیر زمین چلنے والی ٹرینوں کا ایک جال تھا جو لندن شہر میں بچھا تھا۔ یہ ٹرینیں ہر چند منٹ کے وقفے سے ہزاروں لوگوں کو اپنے شکم میں سموئے ان زمین دوز راستوں پر مستقل مزاجی سے سفر کرتی تھیں۔ لندن کا پورا شہر بیک وقت ایک سے زائد سطحوں پر آباد تھا۔ ایک زمین کے اوپر اور باقی زمین کے نیچے۔ سب سطحیں مصروف، سب انتہائی گنجان۔ حذیفہ کو زیر زمین ٹرینوں میں سفر کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔

دانش نے اپنی زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ اپنی محنت سے ناممکن کو ممکن بنایا تھا، لیکن دانش کو سب سے زیادہ خوشی اور ناز خداوند کریم کے اس عطیہ پر تھا جو انہیں حذیفہ کی صورت میں ملا تھا۔

ان کے کتنے ہی دوستوں اور جاننے والوں کو یہ شکایت تھی کہ اپنی تمام عمر سود و زیاں کے حساب کتاب میں گزار دینے کے بعد جب وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے سرمائے کی طرف نظر ڈالتے تو انہیں

اپنی زندگی خسارے میں نظر آتی کیونکہ ان کی اولادیں ان ماں باپ کو احترام و محبت دینے کی روادار نہیں تھیں جن کی بدولت وہ زندگی کے اس اونچے مقام پر موجود تھیں۔

پر حذیفہ ایسا نہیں تھا۔

یہ سچ تھا کہ انہوں نے حذیفہ کی تربیت میں کبھی غفلت نہیں برتی تھی۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس کی رہنمائی کی تھی مگر حذیفہ قدرتی طور پر بھی بے حد منکسر مزاج تھا۔

نہ اس کی ذات میں اپنی حیثیت کا گھمنڈ تھا' نہ دل و دماغ میں اپنی شخصیت کا غرور اور اس کی یہی خصوصیت اسے منفرد بناتی تھی۔ اس کے قدم مضبوطی کے ساتھ اپنی سرزمین سے جڑے تھے۔

کچھ عرصے پہلے تک دانش اور اسمارہ کا خیال تھا کہ حذیفہ کا یہیں کسی اچھی یونیورسٹی میں داخلہ کروا دیا جائے۔ پر جب حذیفہ کے ایڈمشن لینے کا وقت آیا تو اسمارہ کو گردے کی تکلیف ہوگئی اور حذیفہ نے انہیں چھوڑ کر کہیں بھی جانے سے صاف انکار کر دیا۔

"مام! ہمارے ملک میں بھی بہت اچھی یونیورسٹیز ہیں اور ان کی پڑھائی بھی بہت اعلا پائے کی ہے۔" اسمارہ کے اصرار کرنے پر حذیفہ نے کہا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے' پر باہر کی ڈگری کی ویلیو زیادہ ہوتی ہے بیٹا۔" اسمارہ بولیں۔

"کس کی نظر میں؟" حذیفہ نے ان سے سوال کیا۔

"دنیا کی نظر میں۔"

"دنیا میرے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ میں ان کی سوچ کے مطابق اپنی زندگی گزارنے لگ پڑوں۔" حذیفہ نے کہا۔

"آپ ہی سمجھائیے اسے۔ آخر اس کے کیریر کا سوال ہے۔" اس کے ضدی لہجے پر اسمارہ نے مدد کے لیے دانش کی طرف دیکھا۔

"کہہ تو وہ بھی غلط نہیں رہا۔" دانش نے خلاف توقع حذیفہ کی طرف داری کی۔

حذیفہ کے یہاں رہنے سے دانش کو بھی یہ تسلی رہتی کہ اسمارہ کی اچانک طبیعت خراب ہونے کی صورت میں ان کے یا حذیفہ میں سے کوئی ایک تو اسمارہ کے پاس یقیناً" موجود ہوگا۔

حذیفہ ان کا دایاں ہاتھ تھا' ان کا جانشین۔

ان کے بعد اس وسیع و عریض پیمانے پر پھیلے بزنس کو سنبھالنا حذیفہ کی ذمہ داری تھی۔ اب وہ یہ کام باہر کی ڈگری لے کر کرتا یا اس کے بغیر' اس سے واقعی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"اب وقت آگیا ہے کہ حذیفہ کے حصے کی ذمہ داریاں اسے سونپ دی جائیں۔" دانش نے سوچا۔

انہوں نے طے کر لیا کہ پاکستان واپس جا کر پہلا کام یہی کریں گے۔ پریزنٹیشن ختم ہو چکی تھی۔ مدھم کی ہوئی روشنیاں ایک بار پھر سے تیز کر دی گئی تھیں۔

دانش کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنا دھیان ماضی سے ہٹا کر ایک بار پھر وہاں لے آئے جہاں اس پریزنٹیشن میں بتائے جانے والے نکات پر بحث شروع ہونے جا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اپنے ہاتھوں میں پیپر کپ سنبھالے ہوئے حذیفہ لمبی سی راہداری پار کر کے ویٹنگ روم تک آیا' جہاں جویریہ صوفے پر آڑی ترچھی ہو کر سو رہی تھی۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں سمیٹ کر صوفے کے اوپر رکھی ہوئی تھیں اور اس کا سر صوفے کی پشت پر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔

نیند میں بھی اس کے چہرے پر پریشانی رقم تھی۔ حذیفہ نے ساری رات اسے اسی پریشانی کے ہاتھوں بے چین دیکھا تھا۔ تمام رات اس نے اسی ویٹنگ روم کے کونے میں جائے نماز پر نفل پڑھتے تو کبھی اسی صوفے پر بیٹھ کر انگلیوں پر درود و آیات کا ورد کرتے گزاری تھی۔

تب ہی جویریہ کی پلکوں میں جنبش کے آثار پیدا ہوئے اور اس نے اپنی بند آنکھوں کو آہستہ سے کھولا شاید اسے نیند میں بھی خود پر کسی کی نگاہوں کے ارتکاز

کی خبر ہو گئی تھی۔

"کینٹین ابھی کھلی ہے اور تو کچھ خاص نہیں تھا بال بس یہ چائے اور بسکٹ ملے ہیں۔ فی الحال انہی سے گزارا کرنا پڑے گا۔" حذیفہ نے اس کے پاس آتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" جویریہ نے بسکٹ لینے سے انکار کر دیا۔

"یہ میں بھوک مٹانے کے لیے نہیں بلکہ اس لیے لے کر آیا ہوں کیونکہ تمہیں کچھ کھانے کی ضرورت ہے۔ تم نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔"

حذیفہ نے دو تین قسم کے بسکٹ کے پیک زبردستی جویریہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا اور اپنا چائے کا کپ لے کر جویریہ کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

کھایا تو حذیفہ نے بھی کچھ نہیں تھا۔ جویریہ کو چائے اور بسکٹ دے کر اسے چکن کڑاہی' سوجی کا حلوہ اور مسالا بھرے کریلے یاد آگئے جو حذیفہ کی ضیافت کے لیے فٹافٹ تیار کیے گئے تھے اور جن کو کھانا ان میں سے کسی کو بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

جویریہ نے بسکٹ کا ذرا سا کونا کترا۔ غذا کا پہلا دانہ پیٹ میں گیا تو اسے احساس ہوا کہ اسے کتنی بھوک لگی ہوئی تھی۔

"آپ کو تو آج اپنے دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے نکلنا تھا۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جویریہ کو اچانک یاد آیا۔

بھوک مٹنے کے ساتھ وہ باقی حسیات اور سوچیں بھی لوٹ آئیں جو پریشانی کے باعث اب تک ذہن سے محو تھیں۔

"میں نے انہیں کل رات ہی فون کر کے بتا دیا تھا کہ میں نہیں آپاؤں گا۔" حذیفہ نے بتایا۔

"پھر کیا کہا انہوں نے؟"

"کہنا کیا تھا۔ بول بال کر چپ ہو گئے۔ فون پر اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔ باقی کسر جب ملیں گے' تب جھگڑا کر کے نکالیں گے۔"

حذیفہ نے کہا پھر جویریہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"تم فکر مت کرو۔ میرے دوست ہیں۔ ان سے میں خود نبٹ لوں گا۔"

حذیفہ نے یہ کہہ کر کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی اور ٹانگیں سیدھی کر کے سامنے پھیلا لیں۔

وہ بھی رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور بے آرام رہا تھا۔

سفید چکنی دیواروں والے اس ویٹنگ روم میں سارے سنگل صوفے رکھے ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کرسی نما صوفے پر جویریہ نے سکڑ سمٹ کر تھوڑی دیر کے لیے اونگھ لیا تھا مگر حذیفہ چھ فٹ کے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ یہ بھی نہیں کر سکا تھا۔

جویریہ کو اس کا تھکا چہرہ دیکھ کر شرمندگی ہونے لگی۔ وہ ان لوگوں کی وجہ سے یہاں موجود تھا۔ ندیم صاحب کو مناسب طبی امداد مل جانے کے بعد وہ جانا چاہتا تو جا سکتا تھا' مگر وہ نہیں گیا۔

اس نے ایک نظر ندیم صاحب کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر روتی بلکتی ہوئی جویریہ پر ڈالی..... اور پھر وہیں رک گیا۔

وہ رک گیا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جویریہ ڈر رہی ہے ندیم صاحب کی طبیعت کے بگڑنے اور ہسپتال میں رات گزارنے کے خیال سے۔

اور سب سے بڑھ کر وہ ڈر رہی تھی' ایسا کچھ بھی ہو جانے کے خیال سے جسے وہ اکیلے ہینڈل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔

وہ تو ذرا ذرا سی بات پر ہاتھ پیر پھلا لینے والی لڑکی تھی اور یہ تو بہت بڑے بڑے خوف تھے جو رات بھر اس کی جان کو گھیرے میں لیے رہتے۔

پھر بھلا حذیفہ ان سب کے بیچ اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔

ہسپتال کے اندر صبح کی مخصوص روٹین شروع ہو چکی تھی۔ رات دبے پاؤں چلنے والی نرسوں کی جگہ تازہ دم چست آواز والی نرسوں نے سنبھال لی تھی۔ خاکروب بالٹیاں ڈنڈے لیے فرش کو رگڑ کر صاف کرنے میں لگے تھے اور ہاتھوں میں دھلی چادروں کا ڈھیر پکڑے ڈاکٹروں کی آمد سے پہلے پہلے مریضوں کے

بستر اور تکیوں کے غلاف تبدیل کرنے کے لیے آیا ئیں یہاں سے وہاں دوڑی پھر رہی تھیں۔

رات کے سناٹے کے بعد سارا ماحول جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا تھا۔ صبح کی روشنی میں توہمات کے وہ سائے بھی مدھم ہو گئے جو رات کے اندھیرے میں جویریہ کو اپنے چاروں طرف پھیلے نظر آرہے تھے۔

نئی صبح نئی امید اور نئے حوصلے کو اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ دوسری بہت ساری باتوں کے ساتھ جویریہ کو اب اپنے رات والے بچکانہ رویے پر بھی شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

"سوری! میں رات کو بہت گھبرا گئی تھی۔" اس نے اپنا رات کا رونا دھونا یاد کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو تمہاری پرانی عادت ہے۔" حذیفہ نے اپنی مسکراہٹ دبائی۔

"کیا اسی لیے بابا مجھے کچھ نہیں بتاتے؟ اپنی تکلیف میرے ساتھ شیئر نہیں کرتے؟" جویریہ نے اپنی سوالیہ نظریں اچانک حذیفہ پر گاڑتے ہوئے بے چارگی سے پوچھا تو وہ سٹپٹا گیا۔

جس ماحول کو وہ ارادتاً "ہلکا پھلکا رکھنے کی کوشش کر رہا تھا' وہ ایک بار پھر سے بوجھل ہونے لگا۔

"تمہیں خوامخواہ وہم ہو رہا ہے۔ کوئی تم سے کچھ نہیں چھپاتا۔"

"نہیں۔" جویریہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں جانتی ہوں کہ بابا مجھ سے حقیقت چھپاتے ہیں۔ جیسے میں کوئی چھوٹی بچی ہوں جو ان کی باتوں سے بہل جاؤں گی۔ جیسے مجھے بابا کے دن بہ دن گھٹتے وزن' بڑھتی کمزوری کا احساس نہیں ہو رہا۔ اگر واقعی سب کچھ ان کے کہنے کے مطابق ٹھیک ہے اور وہ بہتر محسوس کرنے لگے ہیں تو پھر یہ بہتری مجھے کیوں نظر نہیں آرہی؟ میں نے جب بھی ڈاکٹروں سے اس بارے میں سوال کیا' مجھے نئی دریافت ہونے والی ادویات اور علاج کے جدید طریقوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے تو صرف یہ جاننا ہے کہ میرے بابا کی حالت آخر کیوں خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔"

آواز کے ساتھ اب جویریہ کی آنکھیں بھی بھرنے لگیں۔ اتنے عرصے کی فرسٹریشن تھی' جواب نکل کر باہر آرہی تھی۔

حذیفہ کو اس کی باتوں سے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ پچھلے چند مہینوں کے دوران کتنی ٹینشن کا شکار رہی ہو گی۔

یہ سچ تھا کہ ندیم صاحب کو دل کا مرض لاحق تھا مگر یہاں ہسپتال وہ اپنے دل کے ہاتھوں نہیں' بلکہ دماغ کی شریان پھٹ جانے کے سبب پہنچے تھے۔ دل کی تکلیف کے ساتھ خدا جانے اس بیماری کو بھی ندیم صاحب کب سے اپنے اندر پال رہے تھے۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کے اچانک پھٹ جانے کی وجہ شدید ذہنی دباؤ یا پریشانی بھی ہو سکتی تھی۔

جویریہ سب تفصیلات نہیں جانتی تھی حالانکہ اس کا حق تھا جاننے کا۔ وہ ندیم صاحب کی بیٹی تھی لیکن اس کی رات والی حالت کو دیکھ کر حذیفہ اسے کچھ بھی بتا نہیں پایا۔

حذیفہ نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

"انکل اب کافی بہتر ہیں۔ میں تھوڑی دیر پہلے انہیں دیکھ کر آیا ہوں۔" اس نے جویریہ کو تسلی دی۔

جویریہ نے حذیفہ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کرسی پر سر جھکائے خاموشی سے بیٹھی تھی۔ حذیفہ نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور تھکن اب اس کے اعصاب پر حاوی ہونے لگی تھی۔

"اگر میرے بابا کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گی۔"

برابر والے صوفے سے آنے والی آواز پر حذیفہ کی آنکھیں ایک جھٹکے کے ساتھ کھلیں۔

جویریہ کا سارا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

اس لڑکی کو یہ خوف بھی ہو گا کہ وہ واحد رشتہ جس پر وہ ساری زندگی انحصار کرتی آئی ہے' اس سے چھن گیا تو کیا ہو گا۔ محب کی بہت پہلے کہی بات حذیفہ کے ذہن میں اچانک گونجی۔

"کچھ نہیں ہو گا تمہارے بابا کو۔ وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔" بے چینی کو دباتے اسے سرزنش کی۔

"انہیں ٹھیک ہونا پڑے گا ورنہ میرے جینے کا بھی کوئی مقصد نہیں رہے گا۔" جویریہ روتے ہوئے بولی۔ "میں نے آج تک اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کیا' صرف اپنے بابا کے لیے کیا' پوری دنیا میں صرف ایک وہی ہیں جو مجھے آگے بڑھتا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ میری کامیابیوں پر فخر کرتے ہیں۔ ورنہ جویریہ ندیم جیسی لڑکی جیے یا مرے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔" جویریہ نے تلخی کے ساتھ کہا۔

حذیفہ جانتا تھا کہ یہ بات وہ اپنی ماں کے بارے میں کہہ رہی ہے۔ اس ماں کے بارے میں جس کے نام کا ورق اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ دینے کے باوجود وہ اس ورق پر لکھے لفظوں کی کڑواہٹ کو آج تک نہیں بھلا پائی تھی۔

"اگر میں کہوں کہ مجھے فرق پڑتا ہے تو؟" حذیفہ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

جویریہ ایک دم سے سن رہ گئی۔

"م میں سمجھی نہیں۔" اس نے ہکلا کر کہا۔

"سارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ تمہیں ابھی تک کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔"

حذیفہ سر ہلا کر اس کی عقل پر جیسے ماتم کرتے ہوئے بولا۔ "فی الحال تم بس اتنا جان لو کہ تمہارے بابا کے علاوہ دنیا میں کوئی اور بھی ہے جس کے لیے تم بہت زیادہ اہمیت اختیار کر چکی ہو۔"

حذیفہ کے اس اعتراف کے بعد نہ سمجھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

جویریہ کو اپنے گال بے تحاشا گرم ہوتے محسوس ہوئے۔

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں..... جس طرح تم نے ہمارا ساتھ دیا کوئی اور ہوتا تو شاید ہی دے پاتا۔"

اپنے بیڈ پر تکیوں سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ندیم صاحب نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ کمزوری کی وجہ سے انہیں بات کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

"آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں انکل!" حذیفہ بولا۔ "اس میں شکریہ ادا کرنے والی کیا بات ہے۔ یہ تو میرا فرض تھا۔"

ندیم صاحب کی طبیعت اب پہلے کی نسبت بہتر تھی۔ پھر بھی زیادہ بات چیت کرنے یا ذہن پر زور ڈالنے سے سر بھاری اور بوجھل ہو جاتا تھا۔

ہسپتال سے انہیں فی الحال چھٹی نہیں ملی تھی۔ ڈاکٹر انہیں مزید ایک آدھ دن انڈر آبزرویشن رکھنا چاہتے تھے۔

"تم لیفٹ ہینڈڈ ہو؟" ندیم صاحب نے حذیفہ کو الٹے ہاتھ میں چھری پکڑ کر سیب کاٹتے دیکھ کر پوچھا۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"حیرت ہے۔" اس کے سر ہلا کر اقرار کرنے پر ندیم صاحب بولے۔

"میرے لیفٹ ہینڈڈ ہونے پر آپ کو حیرت ہے؟" حذیفہ نے کہا۔

"نہیں! حیرت اس بات پر ہے کہ میں نے آج سے پہلے کبھی اس چیز پر غور کیوں نہیں کیا۔ ویسے سنا ہے کہ لیفٹ ہینڈڈ بہت ذہین ہوتے ہیں۔"

"اور اب ملنے کے بعد کیا خیال ہے آپ کا؟" حذیفہ نے پوچھا۔

"اب..... اس نظریے کی تصدیق بھی ہو گئی۔" ندیم صاحب دھیمے سے مسکرائے پھر تھوڑا ٹھہر کر بولے۔

"تم صرف ذہین ہی نہیں بلکہ ایک بہت اچھے انسان بھی ہو۔" ندیم صاحب کے منہ سے اپنی تعریف سن کر حذیفہ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"اچھا تو میں ہمیشہ سے ہی ہوں۔ بس آپ کو اب پتا چلا ہے۔"

"پتا تو مجھے اسی روز چل گیا تھا جس روز تم سے پہلی

بار ملاقات ہوئی تھی۔" ندیم صاحب نے کہا۔

"گڈ۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کو لوگوں کی پہچان ہے۔" حذیفہ نے ہنس کر کہا۔

"تم سے ایک سوال کروں حذیفہ!" انہوں نے اچانک حذیفہ کی طرف دیکھا "تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" حذیفہ نے ان سے نظریں ملاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

اس سوال کا جواب دینے کے لیے وہ بہت پہلے سے تیار تھا۔ ندیم صاحب کچھ دیر اسی طرح جانچتی نظروں سے حذیفہ کو دیکھتے رہے' پھر بولے۔

"مجھے لگتا ہے کہ کسی بیٹی کے باپ کو اتنا کم فہم نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی نوجوان اس سے آکر کہے کہ وہ محض ملنے یا خیریت دریافت کرنے آیا ہے اور باپ اس پر یقین کرلے۔"

"آپ بالکل بھی کم فہم نہیں ہیں۔" حذیفہ نے آہستہ سے کہا۔

ندیم صاحب چپ ہو گئے۔ حذیفہ کو عجیب سا احساس ہوا ان کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار نمودار ہوئے تھے۔

"کیا ہوا انکل؟" حذیفہ تیزی کے ساتھ ان کے قریب آیا۔ وہ کوئی جواب نہ دے پائے۔

"میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتا ہوں۔" حذیفہ ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ درد میرے جسم میں نہیں' میری روح کے اندر ہے بیٹا! اور اس کو دفع کرنے کی کوئی دوا ان ڈاکٹروں کے پاس نہیں ہے۔" ندیم صاحب نے ہولے سے جواب دیا۔

"اتنی مایوسی کی باتیں مت سوچیے۔ آپ ان شاءاللہ جلد ٹھیک ہو جائیں۔" حذیفہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کے علاوہ ان سے کیا کہے مگر ندیم صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔

"کل تک میں بھی اپنی حالت اور تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے خود کو یہی یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پر میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو گا۔ تم اسے مایوسی کہو یا حقیقت پسندی لیکن میں اب اس بات سے نظریں نہیں چرا سکتا کہ میرا وقت آچکا ہے۔"

"انکل پلیز......"

"مجھے اپنی بات مکمل کرلینے دو حذیفہ! میں نے بہت مشکل سے تم سے بات کرنے کے لیے ہمت جمع کی ہے...... جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ کہنے کا شاید مجھے اس کے بعد موقع نہ مل سکے۔" ندیم صاحب نے منت بھرے لہجے میں کہا تو حذیفہ چپ ہو گیا۔

"تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ جویریہ کی ماں حیات ہے۔ بہت عرصہ پہلے ہمارے درمیان علیحدگی ہو گئی تھی۔" ندیم صاحب نے بتانا چاہا۔

"میں جانتا ہوں۔ جویریہ مجھے ان کے بارے میں بتا چکی ہے۔" حذیفہ نے آہستہ سے کہا تو ندیم صاحب نے چونک کر اسے دیکھا' پھر کہنے لگے۔

"جویریہ اپنی ماں کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرتی۔ یہاں تک کہ مجھ سے بھی نہیں۔ یہ وہ قصہ ہے جسے وہ برسوں سے اپنے اندر دفن کیے بیٹھی ہے۔ وہ اس کی تکلیف سے اندر ہی اندر گھلتی ہے مگر اسے اپنی زبان پر آنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

ندیم صاحب سانس لینے کے لیے رکے۔

"ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ نہایت تیز رفتار دور میں نہایت تیز رفتار زندگیاں گزار رہے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا' سستانے کا وقت ہی کسی کے پاس نہیں ہے۔ مگر میں جس مقام پر آکر رکا ہوں' وہاں سے آگے کا راستہ غیر یقینی ہے۔ اس مقام پر مجھے اپنی گزری زندگی پر نظر ڈالنے کا ایک موقع ملا ہے میں نے اپنی زندگی میں بہت سی غلطیاں کی ہیں۔ سب سے بڑی غلطی حق کی لڑائی میں دستبردار ہونے کی تھی۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے لڑنا چاہیے تھا۔ اپنے لیے نہ سہی' اپنی بیٹی کے حق کے لیے پر میں نہیں لڑا۔ کیونکہ تب مجھے لگتا تھا کہ جو چیز نصیب میں نہ ہو' اسے زبردستی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

مگر میں غلط تھا۔

کسی چیز کا ملنا یا نہ ملنا واقعی نصیب کے کھیل ہیں۔ مگر کسی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا بزدلی ہے...... اور زندگی کے اس مقام پر آکر مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے نہایت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ میں ایک بزدل انسان ہوں۔ زندگی کے اس موڑ پر میں خود سے سرزد ہوئی غلطیوں کو اب پلٹ کر دیکھ تو سکتا ہوں مگر افسوس کہ انہیں سدھار نہیں سکتا۔ جویریہ میری بیٹی ہے اور اسے بھی میری طرح اپنے حق کے لیے لڑنا نہیں آتا۔ اسی لیے میں چاہتا تھا کہ جو محرومیاں زندگی بھر میرا مقدر بنی رہیں' وہ میری بیٹی کے حصے میں نہ آئیں۔ وہ اپنی محنت اور قابلیت سے ہر وہ مقام حاصل کرے جو میرے حوالے سے اسے کبھی نہیں مل سکتا۔ پر اب لگتا ہے کہ یہ سب ہوتا دیکھنے کا موقع مجھے نہیں مل سکے گا۔"

ندیم صاحب نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔ حذیفہ چپ چاپ انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس وقت حذیفہ کو ندیم صاحب کے پیچھے کھڑکی میں لٹکتے زرد پردوں کی پیلاہٹ ان کی رنگت سے میل کھاتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اگر مجھے تھوڑی سی بھی امید ہوتی کہ اس کی ماں کے دل میں یا اس کے گھر میں جویریہ کے لیے تھوڑی سی بھی جگہ ہے تو میں جویریہ کی مرضی کی پرواہ کیے بغیر الماس سے رابطہ ضرور کرتا لیکن مجھے ایسی کوئی امید بھی نہیں...... اور میں اپنی بیٹی کو اس دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر مرنا نہیں چاہتا اور تم حذیفہ...... تم اس بوجھ کو ہلکا کرنے میں میری مدد کر سکتے ہو۔"

ندیم صاحب نے حذیفہ کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے ملتجی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" حذیفہ حیران ہو کر بولا۔

"تم جویریہ سے شادی کرلو...... ابھی میرے سامنے' تاکہ میں سکون سے مر سکوں۔"

یہ یقیناً" ان کی مایوسی کی انتہا تھی۔

"تم اچھے خاندان کے لڑکے ہو اور میں جانتا ہوں کہ اچھے خاندانوں میں رشتے اس طرح نہیں جوڑے جاتے۔ اسے میری خود غرضی سمجھ لو یا پھر کچھ اور...... بعض اوقات زندگی میں ایسی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے جب عقل' سمجھ' تجربہ سب انسان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے میں فقط ایک دل ہی رہ جاتا ہے رہنمائی کے لیے...... اور میرا دل کہتا ہے کہ تم میری بیٹی کی حفاظت کر سکو گے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں تم سے جو مانگ رہا ہوں' وہ کوئی معمولی چیز نہیں اس لیے اگر تم انکار کر دو گے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ صرف یہ گزارش کروں گا کہ آئندہ زندگی میں کبھی بھی جب اس قصے کو یاد کرو تو ایک بے بس اور پریشان باپ کی مجبوری میں کی گئی درخواست کے طور پر یاد کر کے درگزر کر دینا۔"

ندیم صاحب نے آنکھیں جیسے تھک کر موند لیں یا پھر شاید حذیفہ سے اس نمی کو چھپانا مقصود تھا جو ان کی پلکوں پر آکر ٹھہر گئی تھی۔

حذیفہ نے ندیم صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا جو ایک لاچار باپ کا چہرہ تھا جس کی آنکھوں کے گرد پڑے گہرے حلقے ان کے فکر و تردد کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"میں تیار ہوں۔"

☼ ☼ ☼

وہ اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جویریہ کے لیے اپنے دل میں پنپنے والے جذبات کے بارے میں حذیفہ کو کبھی کوئی کنفیوژن نہیں تھی۔ وہ ایسا لڑکا نہیں تھا جو محض وقت گزاری یا تفریح کے لیے کسی بھی لڑکی میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جویریہ سے شادی کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ اسے پہلے اپنی تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔ تب مام اور ڈیڈ

کو اپنی پسند سے آگاہ کر کے معاشرے کے رسم و رواج کے مطابق جویریہ کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا تھا۔
حذیفہ کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔
کیا اسے بھی یہی لگنے لگا تھا کہ ندیم صاحب کے پاس اب مہلت نہیں رہی؟ کیا وہ بھی ان ہی کی طرح قنوطیت کے آہنی شکنجے میں جکڑا گیا تھا جو اس طرح جویریہ سے شادی کے لیے رضامند ہو گیا۔
"نہیں! ایسا ہرگز نہیں تھا۔" حذیفہ نے اپنے "آناً فاناً" کیے فیصلے کے پیچھے چھپی وجوہات کا تجزیہ کرتے ہوئے سوچا۔
اس کی وجہ دراصل دل میں اچانک ابھرنے والا یہ احساس تھا کہ اگر اس نے اس وقت اقرار نہ کیا تو وہ جویریہ کو ہمیشہ کے لیے کھو دے گا۔
یہ احساس کہاں سے آیا اور کیوں آیا؟ اس کی وضاحت وہ کسی اور کو تو کیا خود کو بھی نہیں دے سکتا تھا۔
بس وہ اتنا جانتا تھا کہ یہ ایک ایسا احساس تھا جو عقل و خرد کے تمام اصولوں کو رد کرتے ہوئے اچانک دل میں جاگتا ہے اور اپنی منوا کر رہتا ہے۔
"شاید ندیم صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے۔ بعض اوقات تمام تجربے، عقل اور سمجھ کو پس پشت ڈال کر دل کی مان لینے میں ہی بھلائی ہوتی ہے۔"
حذیفہ نے باہر احاطے میں ——— بھاگتے لڑکوں کو غائب دماغی سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ پھر اس نے گہرا سانس لے کر جیب سے موبائل نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔
"ہیلو ڈیڈ! مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" حذیفہ نے فون پر دانش سے کہا۔

☼ ☼ ☼

صبح سے موسم خاصا سرد ہو رہا تھا۔
اسمارہ نے گرم شال کو اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹا۔ انہیں ویسے بھی سردی زیادہ لگتی تھی۔
انہیں دانش کا انتظار تھا۔ دانش کو آنے میں اکثر دیر ہو جایا کرتی تھی۔ گلہ اس لیے نہیں کر سکتی تھیں کیونکہ دانش نے اپنی اس مصروفیت کے بارے میں انہیں یہاں آنے سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ کام اسی طرح جنونی انداز میں کیا کرتے تھے۔
کھڑکی سے باہر آسمان سلیٹی رنگ کے بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ محکمہ موسمیات کے مطابق آج بارش کا امکان تھا۔
تھوڑی ہی دیر میں وہ برسات بھی شروع ہو گئی جس کی محکمہ موسمیات والوں نے پیش گوئی کی تھی۔
اسمارہ کو اب پریشانی ہونے لگی۔
اگر ایسی برسات پاکستان کے پہاڑوں میں بھی شروع ہو گئی تو لینڈ سلائیڈنگ ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اگر آنے جانے کے راستے بند ہو گئے تو حذیفہ اور اس کے دوست کئی دن تک شمالی علاقہ جات میں پھنسے رہ سکتے تھے۔
دانش کا سوچتے سوچتے اسمارہ کو حذیفہ کی فکر نے آ گھیرا۔
حالانکہ حذیفہ کے اس ٹرپ کا انہیں بہت پہلے سے پتا تھا اور تب انہیں اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ پھر آج بلاوجہ ہی ان کا دل کیوں گھبرائے جا رہا تھا۔
اس وقت اسمارہ کے پاس رکھے فون کی گھنٹی بجی۔
دانش کو کام کے دوران بار بار فون کر کے ڈسٹرب کرنا اسمارہ کو پسند نہیں تھا۔ دیر سویر ہونے کا امکان ہوتا تو دانش خود ہی فون کر کے اطلاع دے دیا کرتے تھے یہ یقیناً ان ہی کا فون تھا۔ اسمارہ نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔
"ہیلو!"
دوسری جانب دانش نہیں کوئی اور تھا اور جو کچھ اس نے کہا، اسے سن کر اسمارہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

☼ ☼ ☼

پھر سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ جویریہ کو ٹھیک سے

سمجھنے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔
قاضی کے علاوہ محلے کے چیدہ چیدہ افراد کو بطور گواہ حذیفہ جا کر کب اور کیسے لے کر آیا، یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ اس کا کام بس سر جھکا کر دھندلائی آنکھوں سے نکاح نامے پر دستخط کرنا تھا۔ ضبط کے بندھن اس وقت ٹوٹے جب ندیم صاحب نے پاس بلا کر اسے سینے سے لگایا۔
وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
ندیم صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ کر ان کے چہرے کو تر کر رہے تھے۔
"بس کرو جویریہ! اپنے بابا کو اب آرام کرنے دو۔" روتی ہوئی جویریہ کو اپنے کندھے پر ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔
یہ حذیفہ کے ساتھ جڑے نئے تعلق کا احساس تھا یا کچھ اور کہ اس کے چھوتے ہی وہ بجائے پیچھے ہٹنے کے ندیم صاحب کے سینے میں اور زیادہ سمٹ گئی۔
"اسے تھوڑی دیر میرے پاس رہنے دو۔ میرے سر سے آج بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔"
ندیم صاحب نے جویریہ کے سر کو پیار سے سہلاتے ہوئے کہا تو حذیفہ خاموش ہو گیا۔ وہ رات ان کی زندگی کی آخری رات ثابت ہوئی۔ شاید وہ جویریہ ہی کی خاطر اپنے رب سے مہلت مانگ کر جی رہے تھے۔ اس کی فکر سر سے اترتے ہی انہوں نے اپنا آپ بخوشی فرشتہ اجل کے حوالے کر دیا۔
جویریہ کے لیے وہ صبح قیامت کی صبح تھی۔
ندیم صاحب کی بیماری ان کی گرتی صحت، ہر چیز کو سمجھنے کے باوجود کہ اس بیماری کا اختتام موت پر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

جویریہ نے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس کمرے میں قدم رکھا جو کبھی ندیم صاحب کا ہوا کرتا تھا۔
حذیفہ کے آنے سے پہلے اسے بہت سے کام نپٹانے تھے اور اس میں سب سے مشکل اور ضروری کام سامان کی پیکنگ کا تھا۔
حذیفہ نے اس سے کہا تھا کہ اپنے مام ڈیڈ کے واپس لوٹتے ہی وہ اسے لاہور لے جائے گا۔ اس لیے سب تیاری مکمل ہونی چاہیے۔
بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔
جویریہ نے دیکھا تو حذیفہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔
"چائے لاؤں؟" جویریہ نے پوچھا۔
"نہیں ایک گلاس پانی پلا دو۔" وہ ہاتھ میں پکڑی گاڑی کی چابیاں صوفے کے برابر رکھی لکڑی کی گول میز پر پھینکتا ہوا بولا۔
"ٹھہرو۔" جویریہ پانی لینے کے لیے مڑنے لگی تو حذیفہ نے اچانک ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ پھر جویریہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اونچا کرتے ہوئے اس کی سوجی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔
"تم روئی تھیں؟" اس نے پوچھا۔
"بابا یاد آ رہے تھے۔" جویریہ نے رندھی آواز میں اعتراف کیا۔
وہ کچھ دیر جویریہ کی طرف نہایت غور سے دیکھتا رہا پھر نہایت آہستگی کے ساتھ جویریہ کو خود سے قریب کرتے ہوئے اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔
جانے یہ تسلی دینے کا انداز تھا یا ہمت بڑھانے کا، مگر جویریہ کو نہ پیروں کے نیچے بچھی زمین یاد رہی نہ سر پر تنا آسمان۔ وہ کتنی دیر حذیفہ کی بانہوں کے حلقے میں دم سادھے اس کے سینے کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی رہی۔ یہاں تک کہ حذیفہ نے ہی اس کے ماتھے پر دھیرے سے بوسہ دیتے ہوئے اس کو خود سے الگ کیا۔
کچن میں جا کر وہ کتنی دیر اپنے دھک دھک کرتے دل کی دھڑکنوں کو قابو کرنے کی کوشش کرتی رہی۔
جب وہ پانی لے کر واپس آئی تو حذیفہ صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا جویریہ نے پانی کے گلاس کے

ساتھ حذیفہ کا موبائل بھی پکڑا دیا۔

"یہ بابا کے کمرے میں پڑا تھا۔" جویریہ نے بتایا۔

حذیفہ نے پانی پیتے ہوئے موبائل کے الرٹس دیکھنے شروع کیے۔ پچھلے چار دن سے کچھ ایسی بھاگ دوڑ رہی تھی کہ اسے اپنا موبائل یاد ہی نہیں تھا۔

کچھ دوستوں کے میسج' کچھ اسمارہ کی کالز۔ اس کے بعد ایک لمبی لسٹ تھی میسجز اور فون کالز کی جو تقریباً" ساری عرشی کے موبائل سے کی گئی تھیں۔ کہیں کہیں اس میں رعنا کے نمبر بھی شامل تھے۔

عرشی تو خیر ایک شہر میں ہوتے ہوئے بھی دن میں کئی میسجز اور کالز کیا کرتی تھی پر یہ رعنا کے نمبر؟ حذیفہ کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں ابھریں۔

موبائل پر میسج اور کال الرٹس کے علاوہ کونے میں بنا ننھا سا بیٹری کا نشان جھپک جھپک کر چار دن کے فاقے کی دہائیاں دے رہا تھا۔

حذیفہ کی سب سے پہلی ترجیح لندن کال کرنا تھی۔ نکاح والے دن کے بعد سے دانش سے دوبارہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ابھی اس کی انگلیاں پہلا بٹن بھی نہیں دبا پائی تھیں کہ ہاتھ میں پکڑا موبائل یکدم تھرا اٹھا۔

اسکرین پر جگمگاتا ہوا عرشی کا نام اس کی طرف سے آنے والی کال کی اطلاع دینے لگا۔

"ہیلو!" حذیفہ نے فون کان سے لگایا۔

"تھینک گاڈ! تم نے فون تو اٹھایا۔ تم ہو کہاں؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہم کتنے پریشان ہیں۔ پہلے ہم سمجھے کہ پہاڑی علاقے میں ہونے کی وجہ سے سگنل نہیں مل رہا۔ پر کل مظہر لوگ اسلام آباد پہنچے تو انہوں نے بتایا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ سرے سے گئے ہی نہیں۔ تم آخر ہو کہاں؟ تمہیں فون کر کے انگلیاں دکھ گئیں۔ تم فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟"

عرشی اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر بے تکان بولے چلی گئی۔

"لاؤ! مجھے دو۔" حذیفہ کو فون پر رعنا کی آواز سنائی دی۔

"ہیلو حذیفہ!" رعنا نے عرشی سے فون غالباً" چھین کر لیا تھا۔

"تم کہاں ہو بیٹا! ہم تو سخت پریشان ہو گئے تھے۔ فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے تم؟"

انہوں نے بھی شدید پریشانی کے عالم میں وہی جملہ دہرایا جو عرشی کہہ رہی تھی۔

"ریلیکس خالہ! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے رعنا کو تسلی دی۔ "آپ بتائیے' اتنے فون کیوں کر رہی تھیں؟"

اس کے سوال پر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"حذیفہ! تم.... تم فوراً" واپس آجاؤ۔"

رعنا جب بولیں تو انہوں نے حذیفہ کے سوال کا جواب دینے کی بجائے یہ فرمائش کر دی۔ حذیفہ کو فون پر رعنا کی آواز بھاری بھاری سی لگی۔

"کوئی مسئلہ ہو گیا ہے کیا؟" اس نے حیرت سے استفسار کیا۔

"نہیں' کوئی مسئلہ نہیں۔" رعنا نے جلدی سے کہا تو وہ چونک گیا۔

"خالہ! بات کیا ہے؟ مام تو ٹھیک ہیں نا؟ کہاں ہیں وہ؟"

حذیفہ کا پہلا دھیان اسمارہ کی طرف ہی گیا۔ ہزار طرح کے وسوسے اسے پریشان کرنے لگے۔

"ہاں! وہ ٹھیک ہے۔ وہ ابھی وہیں لندن میں ہے۔ بس! تم جلدی سے واپس آجاؤ۔" وہ بولیں۔

"خالہ! فار گاڈ سیک مجھے بتائیے! آخر ہوا کیا ہے؟"

حذیفہ کی چھٹی حس اسے کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہی تھی۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی اور پھر رعنا کی سسکی سنائی دی۔

"ہیلو!" عرشی نے رعنا کے ہاتھ سے فون پکڑ کر کہا۔

"عرشی! کیا ہوا ہے؟" اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

"سوری حذیفہ! بٹ انکل از نو مور۔" (سوری حذیفہ! انکل اب نہیں رہے)

عرشی نے جواب میں اس سے کہا۔

ساتھ ہی موبائل کی بیٹری مکمل ڈسچارج ہو گئی۔

جویریہ الماری سے کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھ رہی تھی جب اسے کچھ گر کر ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی کے ساتھ باہر آئی۔

شیشے کا گلاس حذیفہ کے قدموں میں ٹوٹا پڑا تھا۔ کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے سارے کمرے میں یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے تھے۔

جویریہ نے حذیفہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا اور وہ پتھرائی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

جویریہ کو کچھ غلط' بلکہ بہت غلط ہونے کا احساس ہوا۔

"کیا ہوا؟" جویریہ نے سہمے دل کے ساتھ پوچھا۔

اس کی آواز پر حذیفہ نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اسے جانتا تک نہ ہو۔

ان چند خوفناک لمحوں کے دوران جویریہ کو اپنے جسم سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

آخر کار حذیفہ کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق واپس آئی۔

"جویریہ! میرے ڈیڈ.... میرے ڈیڈ اس دنیا میں نہیں رہے۔" جویریہ دھپ سے پیچھے رکھے صوفے پر گر گئی۔ ٹانگیں واقعی بے جان ہو گئیں۔

"وہ گزر بھی گئے اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔" حذیفہ دہشت زدہ ہو کر بول رہا تھا۔

"او گاڈ! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو بالکل ٹھیک تھے۔"

حذیفہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گراتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ وہ ان کا موازنہ ندیم صاحب کے ساتھ کر رہا تھا۔

ایک طرف ندیم صاحب بیمار' شکستہ حال اور زندگی سے مایوس اور دوسری طرف اس کے ڈیڈ۔ مستقبل سے پرامید' آنے والے دنوں کے لیے ڈھیروں پلان بنانے والے چاق و چوبند انسان۔

دونوں کو ہی موت اپنے ساتھ لے گئی۔

فرق صرف اتنا تھا کہ ندیم صاحب کی موت دروازے پر دستک دے کر' انہیں اطلاع دے کر آئی تھی جبکہ دانش کی بنا بتائے۔ اچانک صوفے پر اپنا بے جان وجود لیے بیٹھی جویریہ اس بیٹے کو اذیت سے گزرتا دیکھ رہی تھی جسے اپنے باپ کی وفات کی خبر اس لیے بروقت نہ مل سکی کیونکہ وہ اس کے باپ کی آخری رسومات نبھانے میں مصروف تھا۔ وہ ایسے وقت پر اپنے پیاروں' اپنے گھر والوں کے پاس نہ پہنچ سکا جب اس کی ان کو سب سے زیادہ ضرورت تھی کیونکہ وہ ندیم صاحب کی سونپی ہوئی ذمہ داریوں کو نبھا رہا تھا۔

پتا نہیں حذیفہ کا دھیان اس نکتے کی طرف گیا تھا یا نہیں لیکن جویریہ کو یہ خیال تا حیات احساس جرم میں مبتلا رکھنے کے لیے کافی تھا۔

"مجھے جانا ہو گا۔" حذیفہ نے بالآخر اپنا سر اٹھا کر کہا۔ "مام ابھی تک وہیں پر ہیں اور ڈیڈ کی ڈ... ڈیڈ.... مجھے ان کو جا کر لانا ہو گا۔"

وہ ڈیڈ باڈی کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اپنے باپ کے لیے یہ لفظ استعمال کرنے پر وہ خود کو آمادہ نہیں کر پایا۔

وہ اتنا ٹوٹا ہوا' بکھرا ہوا لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھی جویریہ سے اس کی بات پر سر ہلانے کے علاوہ کچھ کہا نہیں گیا۔

☆ ☆ ☆

اسمارہ کو ایئرپورٹ سے باہر آتا دیکھ کر رعنا کے دل کو دھکا لگا۔

یہ وہ اسمارہ نہیں تھیں جو دس دن قبل یہاں سے لندن روانہ ہوئی تھیں۔ حذیفہ کا بازو تھامے ہوئے وہ انتہائی ہراساں اور خوف زدہ کیفیت میں باہر آ رہی تھیں۔

صرف دس دن میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

اسمارہ سے گلے ملنے کے بعد انہوں نے حذیفہ کی طرف دیکھا۔

وہ چپ تھا۔ بہت چپ۔

یہ وہی لڑکا تھا جو اگر خاموش ہوتا تو اس کی آنکھیں بولا کرتی تھیں۔ آج ان آنکھوں کے پاس بھی کہنے کو

کچھ نہیں تھا۔

سارے الفاظ اس پل ہی ختم ہو گئے تھے جس پل ان آنکھوں نے دانش کے زندگی سے عاری وجود کا نظارہ کیا تھا۔

"خالہ! آپ مام کو گھر لے جائیں' میں بعد میں آتا ہوں۔"

حذیفہ نے اسمارہ کو رعنا کے حوالے کرتے ہوئے کہا اور خود واپس مڑ گیا۔

اپنی ماں کو وہ ایرپورٹ سے باہر لے آیا تھا۔ اب باپ کو لینے جا رہا تھا۔ وہ باپ' جو اپنے پیروں پر چل کر گیا تھا اور تابوت میں لوٹ کر آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دانش اپنے حلقہ احباب میں ایک نہایت مقبول اور ہردلعزیز شخصیت تھے۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا کئی دن تک صبح سے شام تک تانتا بندھا رہا۔

رشتہ دار' دوست احباب' آفس کا اسٹاف' فیکٹری کے ورکر' کون تھا جو دانش کی اچانک موت پر افسوس کا اظہار کرنے نہیں آیا۔

حیرت انگیز طور پر یہ ساری آمد و رفت اسمارہ کو اپنے تنہا اور اکیلے رہ جانے کا احساس اور بھی شدت سے دلاتی۔

دانش اور ان کا ساتھ برسوں پر محیط تھا۔ اب انہیں نئے سرے سے ایک ایسے شخص کے بنا اپنی زندگی گزارنے کی عادت ڈالنا تھی جو پچھلے ستائیس سال سے ان کی زندگی کے ہر لمحے میں شامل رہا تھا۔

باقی سب تکلیفیں اور پریشانیاں ایک طرف لیکن اسمارہ شدید ڈپریشن کا شکار ہونے لگیں۔ اتنے بڑے گھر میں وہ اب اکیلی رہنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اس اکیلے پن کو دور کرنے کا بہترین حل رعنا اور اسمارہ نے مل کر نکالا۔

"یہ آپ لوگ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں عرشی سے شادی نہیں کر سکتا۔" دونوں بہنوں کی توقع کے خلاف حذیفہ نے اس تجویز کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

"مگر کیوں؟ آخر کوئی تو وجہ ہو گی انکار کی۔" یہ ر... تھیں۔

اور پھر انکار کی جو وجہ حذیفہ نے بیان کی وہ رعنا اور اسمارہ کی جان نکال دینے کے لیے کافی تھی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اسمارہ نے شدید شاک کے عالم میں کہا۔ رعنا بھی اس انکشاف پر انگشت بدنداں تھیں۔

"تم مذاق تو نہیں کر رہے؟"

حذیفہ ان کے ساتھ ایسا بھونڈا مذاق نہیں کر سکتا۔ یہ رعنا بہت اچھی طرح سے جانتی تھیں' پھر بھی انہوں نے بہت امید کے ساتھ پوچھا' پر حذیفہ نے نفی میں سر ہلا کر ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ تم ہمیں بتائے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔" اسمارہ بے یقینی کے عالم میں بولیں۔

"یہ ہو چکا ہے مام! ڈیڈ کو پتا تھا۔ انہیں شاید آپ کو بتانے کا موقع نہیں ملا۔"

حذیفہ نے افسردگی سے کہا تو اسمارہ ایک دم ڈھے گئیں۔

"میرے ڈیڈ میرے بیسٹ فرینڈ ہیں۔ تم دیکھنا' مام کو ضرور کنوینس کر لیں گے۔"

صرف چند دن قبل حذیفہ نے یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ جویریہ سے کہی تھی۔

"وہ ناراض تو نہیں ہیں نا؟" ہر لڑکی کی طرح جویریہ کے دل میں بھی بہت سے خدشات تھے۔

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔" حذیفہ نے ذرا رک کر کہا۔ "جب میں نے ان سے بات کی تو وہ تھوڑا سا مایوس ضرور ہوئے تھے۔ لیکن خود کو ان کی جگہ پر رکھ کر دیکھو! ان کا اکلوتا بیٹا ان کی غیر موجودگی میں ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہے جسے وہ جانتے نہیں' کبھی ملے تک نہیں' تو ان کی یہ مایوسی بھی سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جانتی ہو' انہوں نے کیا کہا۔ انہوں نے کہا کہ انہیں مجھ پر پورا بھروسا ہے اور انہیں یقین ہے کہ میں نے جس بھی لڑکی کا انتخاب کیا ہو گا' وہ یقیناً' لاکھوں میں ایک ہو گی۔ ان کی تمہارے بابا سے بھی فون پر بات ہوئی ہے۔ وہ ساری صورتحال سمجھ گئے ہیں۔ اب صرف مام کا مسئلہ ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ ڈیڈ انہیں بھی منا لیں گے۔"

حذیفہ نے جویریہ کو یقین دلایا تھا۔

پر اب... اب ڈیڈ ہی نہیں رہے تھے۔

اور دانش کی مدد کے بغیر اسمارہ کو راضی کرنا حذیفہ کو دنیا کا سب سے مشکل کام لگنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

حذیفہ کے انکار کے بعد گھر میں سرد جنگ کا آغاز ہو گیا جس میں اکیلا حذیفہ ایک طرف اور باقی سب دوسری طرف تھے۔

اس کی بات کو سمجھنا تو درکنار کوئی اس کی بات سننے کو بھی تیار نہ تھا۔

صرف عرشی تھی جو خبر ملتے ہی دوڑی چلی آئی۔

"حذیفہ! تم نے اتنا بڑا فیصلہ کرتے وقت میرے بارے میں ایک بار بھی نہیں سوچا؟" اس کی شکایت بھری آنکھوں میں ڈھیروں گلے تھے۔

"عرشی! میں نے تمہارے بارے میں کبھی اس طرح سے نہیں سوچا۔" حذیفہ اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ عرشی بھی اس معاملے میں رعنا و اسمارہ کی ہم خیال ہو گی۔

"تو اب سوچ لو۔" عرشی گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"اب؟" حذیفہ نے حیرت سے عرشی کو دیکھا۔

"اب یہ کیسے ممکن ہے؟ میں کسی اور سے شادی کر چکا ہوں۔" اس نے کہا تو عرشی کو اپنے ارمانوں کی دنیا ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتی نظر آئی۔ ساری عمر اپنی ہر آرزو کو زبان سے ادا ہونے سے قبل ہی پورا ہوتا دیکھنے والی عرشی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کے حصول میں وہ ناکام رہ جائے گی۔

☼ ☼ ☼

عرشی بی بی کو "دورہ" پڑنے کی اطلاع رعنا کو ان کے بیڈ روم میں ملازمہ نے آ کر دی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟" وہ بھنا کر بولیں۔

پھر ملازمہ کی خوف زدہ شکل دیکھ کر رعنا کو احساس ہوا کہ ایک ادنیٰ نوکرانی اتنی بڑی بات کہنے کی گستاخی بے وجہ نہیں کر سکتی۔

رعنا دوڑتی ہوئی عرشی کے کمرے میں پہنچیں جہاں وہ کارنس' میزوں اور سائیڈ ٹیبلوں پر سجی بیش قیمت اشیا کو دیواروں اور فرش پر مار مار کر چکنا چور کر رہی تھی۔

جب اس کا دل ہی ثابت نہیں رہا تو باقی چیزوں کی کیا حیثیت تھی؟ جی چاہ رہا تھا پوری دنیا کو تہس نہس کر دے۔

"بس کرو عرشی!" رعنا نے قریب آتے ہوئے اس کو بازوؤں سے جکڑ کر پکڑ لیا۔

عرشی نے ایک سیکنڈ اپنے آپ کو رعنا کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی' پھر بے دم ہو کر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

یوں بھی اب کمرے میں توڑنے لائق کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ عرشی کے ارمانوں سمیت سب کرچی کرچی ہو چکا تھا۔

"اس نے مجھے ریجیکٹ کر دیا ممی!" عرشی نیم دیوانگی کے عالم میں بولی۔ "اس نے کہا کہ اس نے میرے بارے میں کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں جبکہ میں نے تو ساری زندگی اس کے علاوہ کسی کے بارے میں نہیں سوچا' پھر وہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟"

عرشی ایک دم سے زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کو تھامے کھڑی رعنا کو اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے اسے چھوڑنا پڑا۔

"میں نے اپنی آنے والی زندگی کے کسی بھی لمحے' کسی بھی پل کے بارے میں جب بھی سوچا' ہمیشہ اسے ہی اپنے ساتھ تصور کیا۔ اپنے خیالوں تک میں کسی اور کو اس کی جگہ لینے کی اجازت نہیں دی۔ پھر اس نے میری جگہ اتنے آرام سے کسی اور کے حوالے کیسے کر دی؟"

عرشی نے سر اٹھا کر رعنا سے پوچھا تو وہ بے بسی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ اس کے سوال کا رعنا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس وقت ماربل کے فرش پر بیٹھ کر روتی ہوئی عرشی انہیں سچ مچ پاگل لگی۔

"بس کرو عرشی! خدا کے لیے اب بس کرو۔"

اس کا رونا رعنا کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ عرشی کا ہر آنسو رعنا کو اپنے دل پر گرتا محسوس ہو رہا تھا۔

انہوں نے عرشی کو کھینچ کھانچ کر فرش سے اٹھایا اور بستر پر لٹا کر چادر اوڑھا دی۔

عرشی کسی چھوٹے بچے کی طرح چادر میں چھپ کر لیٹ گئی۔ اتنی تابع داری عرشی نے آج سے پہلے کبھی نہیں دکھائی تھی۔ رعنا کو اس کی اس فرماں برداری سے خوف آنے لگا۔ یہ عرشی کے نارمل ہونے کی نشانی نہیں تھی۔

اس ساری تخریبی کاروائی کے بعد عرشی ذہنی اور جسمانی طور پر نڈھال ہو چکی تھی۔

"میں حذیفہ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔" چادر کے نیچے سے عرشی نیم غنودگی میں بڑبڑائی تو رعنا سن رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"اسمارہ! یہ کیا تماشا ہے۔ سمجھاؤ اپنے بیٹے کو۔" رعنا نے بگڑ کر کہا۔

"میں سمجھا سمجھا کر تھک گئی ہوں آپا! پر وہ نہیں مان رہا۔ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔" اسمارہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

رعنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ عرشی کا پاگل پن رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کر کے اس مسئلے کا حل نکالنا چاہتی تھیں مگر کریں تو کیا کریں؟

گو کہ رعنا نے اس موضوع پر کبھی بات نہیں کی تھی مگر عرشی کا جوڑ حذیفہ کے ساتھ بنے گا' اس بارے میں انہوں نے سوچا ضرور تھا اور اسمارہ رعنا کے مشوروں سے بہت کم انحراف کیا کرتی تھیں۔

وہ عمر میں رعنا سے چھوٹی تھیں۔ ساری عمر رعنا کے زیر اثر رہیں۔ رعنا کی شادی بھی ان سے کہیں پہلے ہوئی تھی۔ رعنا نے بچپن' لڑکپن اور پھر جوانی کے ایام کے اپنے تجربات و مشاہدات سے ہمیشہ اسمارہ کو مستفید کیا۔ صرف ایک جگہ اسمارہ کو رعنا پر فوقیت حاصل ہوئی اور وہ یہ کہ جہاں حذیفہ شادی کے سال بھر بعد ہی اسمارہ اور دانش کی زندگیوں کو پر رونق بنانے چلا آیا وہاں رعنا کی گود اپنی شادی کے دس برس گزر جانے کے بعد بھی خالی ہی تھی۔ اسی لیے جب ان گنت منتوں اور مرادوں کے بعد عرشی دنیا میں آئی تو رعنا اور ان کے مرحوم شوہر نے اسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا۔ عرشی کو بگاڑنے اور اسے ضدی بنانے میں اسی بے جا لاڈ پیار کا ہاتھ تھا۔

لیکن حذیفہ عرشی کو ہینڈل کر لیتا تھا یا یوں کہنا چاہیے کہ عرشی اگر کسی کی بات ماننے کا تکلف کر لیتی تھی تو وہ بس حذیفہ تھا۔ شاید اس چیز کو دیکھتے ہوئے رعنا کے دل میں عرشی اور حذیفہ کو ایک بندھن میں جوڑنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔

بات اگر صرف رعنا کے دل میں پیدا ہونے والے خیال تک محدود ہوتی تو شاید رعنا موجودہ صورت حال پر سمجھوتا کر بھی لیتیں' پر اب سوال عرشی کی جنونی پسندیدگی کا بھی تھا اور رعنا کسی صورت اپنی لاڈلی بیٹی کی سب سے بڑی خواہش کو کسی گمنام لڑکی کا مقدر بننے کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں۔ دوسری طرف اسمارہ کے لیے بھی وہ لڑکی قابل قبول نہ تھی۔

جس لڑکی کے حسب نسب' شکل و صورت' عمر و عادات' کسی چیز کا بھی انہیں پتا نہیں تھا' اسے حذیفہ کی بیوی اور اپنی بہو کے طور پر تسلیم کر لینا اسمارہ کے لیے بہت مشکل تھا۔

ایک ماں کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا تو اسمارہ کی سوچ بھی غلط نہیں تھی۔

"مجھے حذیفہ سے ایسی امید نہ تھی۔" اسمارہ نے دکھ کے ساتھ کہا۔

"غلطی ہماری ہے۔ ہمیں غیر رسمی طور پر ہی سہی

مگر عرشی اور حذیفہ کے رشتے کو پہلے پکا کر لینا چاہیے تھا۔ خوامخواہ بچوں کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ حذیفہ کے علم میں پہلے سے یہ بات ہوتی تو اس کا دھیان ادھر ادھر نہ بھٹکتا۔" رعنا نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"پر اب کیا کریں؟" اسمارہ فکر مندی سے بولیں۔

"کچھ تو کرنا ہو گا۔" رعنا ابھی تک سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

اس وقت سر جوڑ کر بیٹھی دونوں بہنوں نے اس ان دیکھی' انجان لڑکی سے بے تحاشا نفرت محسوس کی جو ان کے نہ چاہنے کے باوجود زبردستی ان کی زندگیوں کا حصہ بننے چلی آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جس سرد جنگ کا آغاز جویریہ کے ذکر کے ساتھ گھر میں شروع ہوا تھا وہ اب تک جاری تھی۔ دونوں فریقین اپنے اپنے موقف پر بدستور ڈٹے ہوئے تھے۔ حذیفہ کے لیے اس جنگ کو جیتنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تو کوئی اس کے قدم نہیں روک سکتا تھا۔

اور وہ آگے بڑھ بھی جاتا۔ اگر مخالفین کی صف میں اس کی اپنی ماں سب سے آگے نہ کھڑی ہوتی۔

حذیفہ اپنی فتح کا مینار اپنی ماں کے ارمانوں کے ملبے پر تعمیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

کئی دن مصالحت کی کوششوں میں گزار دینے کے بعد حذیفہ کو یہ قبول کرنا پڑا کہ مفاہمت کی امید میں مزید وقت ضائع کرنا بے کار ہے۔

اس نے اسمارہ سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

حذیفہ جب اسمارہ کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ بستر پر نیم دراز ہتھیلی پر رکھی گولیاں پانی کے ساتھ نگل رہی تھیں۔

"امینہ! مجھ سے کوئی ملنے آئے تو کہہ دینا میں آرام کر رہی ہوں۔ مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔"

انہوں نے خالی گلاس پاس کھڑی ملازمہ کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ امینہ گلاس لے کر کمرے سے باہر چلی گئی مگر حذیفہ وہیں کھڑا رہا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ یہ ہدایت خاص طور پر اسے سنانے کے لیے ہی دی گئی تھی۔

"مام!" اس نے بستر کے قریب آتے ہوئے اسمارہ کو پکارا۔

"ابھی نہیں حذیفہ! پھر کسی وقت بات کریں گے۔" اسمارہ نے چادر اوپر کھینچتے ہوئے تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

"کبھی نہ کبھی تو بات کرنی ہی ہے مام! تو پھر ابھی کیوں نہیں۔"

حذیفہ دیوار کے ساتھ رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"مام! میں جویریہ کو گھر لے کر آنا چاہتا ہوں۔"

اسمارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اسی طرح آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹی رہیں۔

"مجھ سے اجازت لے رہے ہو یا مجھے بتا رہے ہو؟"

جب حذیفہ کو لگنے لگا کہ وہ جواب دیں گی ہی نہیں تب انہوں نے اچانک آنکھوں پر سے بازو ہٹاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" حذیفہ نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں' پھر بولیں۔

"مجھے لگتا ہے کہ تم اتنے بڑے ہو چکے ہو کہ سارے فیصلے اپنی مرضی سے کرنے لگو اور اب مجھے تم سے کسی بھی قسم کی توقعات وابستہ نہ کرنے کی عادت ڈال لینی چاہیے کیونکہ نہ تو تمہیں میرے مشوروں کی اب ضرورت ہے نہ ہی میری اجازت کی فکر۔" اسمارہ نے کہا۔

"اگر ایسی بات ہوتی تو جویریہ بہت پہلے اس گھر میں آ چکی ہوتی۔ آپ کا کہا اب بھی میرے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

"تو میرے کہنے پر اس قصے کو ختم نہیں کر سکتے کیا؟" اسمارہ نے ایک دم سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

حذیفہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار دکھائی

لیے۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔ میں بہت زیادہ انوالو ہو چکا ہوں۔ اس مقام پر آ چکا ہوں جہاں سے پلٹنا ناممکن ہوتا ہے۔“ حذیفہ نے کہا۔

”تو پھر میرے پاس بیٹھ کر اپنا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟ جاؤ! جا کر لے آؤ اسے۔ لیکن مجھ سے اسے خوش آمدید کہنے کی امید مت رکھنا۔“

انتہائی سرد لہجے میں کہتے ہوئے وہ پھر سے چادر اوڑھ کر لیٹ گئیں۔

حذیفہ کو احساس ہوا کہ اس کے اور اس کی ماں کے درمیان ایسی خلیج حائل ہو چکی ہے جسے پاٹنا مشکل ہے۔

اس نے بے چارگی سے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ وہ اس معاملے کو سلجھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ لوگ جو چاہتے تھے، وہ حذیفہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جویریہ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

حذیفہ پلنگ کے پاس کھڑا ہو کر کچھ دیر اسمارہ کو دیکھتا رہا مگر لیٹی ہوئی اسمارہ کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ شاید وہ واقعی سو چکی تھیں۔

پھر وہ چپ چاپ دروازے کی طرف مڑ گیا۔

اسمارہ نے حذیفہ کے اٹھ کر جانے کی آواز سنی پر انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اس کے جانے کے بعد انہوں نے ایک بار پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

پر نیند اسمارہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☼ ☼ ☼

جویریہ نے میز پر رکھے شاپروں میں سے ڈبل روٹی، انڈے وغیرہ نکالے جو وہ شام میں پاس کی دکان سے لے کر آئی تھی۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ اسی طرح دو چار دن کا ہی سامان لا کر گزارا کر رہی تھی کیونکہ اسے نہیں پتا تھا کہ یہاں اس کے پڑاؤ کی اور کتنی مدت باقی ہے۔ سب حذیفہ پر منحصر تھا۔ وہ جب لینے آ جاتا جویریہ ساتھ چل پڑتی۔

حذیفہ کے جانے کے بعد سے جویریہ سارے گھر میں بولائی بولائی سی پھرتی تھی۔ جاتے وقت حذیفہ جلد واپس آنے کا وعدہ نہ کر گیا ہوتا تو اس کا یہاں رہنا مشکل ہوتا۔

لیکن جلد آنے کے وعدے کے باوجود حذیفہ نے ابھی تک آنے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی اور خود سے پوچھنے میں جویریہ کو جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اپنے مرحوم باپ کے چھوڑے اثاثوں اور اپنی بیمار ماں کو سنبھالنے میں وہ کتنا مصروف ہو گا جو آنے کا وقت نہیں نکال پا رہا۔

یہی سوچ کر جویریہ ہر بار دل میں اٹھنے والے سوالوں کو دل میں ہی دبا لیتی تھی۔

جویریہ نے کچن میں جاتے ہوئے میز پر رکھے فون کی طرف حسرت سے دیکھا جو صبح سے ڈیڈ پڑا تھا۔ اس کے اور حذیفہ کے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ بھی وقتی طور پر بند تھا۔

اس نے سوچا، وہ جلد ہی موبائل فون لے لے گی۔ یہ کتنا ضروری ہے اسے پہلی بار احساس ہوا تھا۔

گرمی کا زور بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر آنے والا دن پہلے سے زیادہ تپش اپنے ساتھ لے کر آتا تھا۔ پچھلے سات آٹھ دنوں سے اس قدر حبس تھا کہ سانس لینا بھی دشوار لگنے لگا تھا درخت اور پودے اتنے ساکت تھے کہ جاندار، پھلنے پھولنے والی چیز کے بجائے کسی بے جان تصویر کا حصہ لگنے لگے تھے، جس میں رنگ تو ہوں مگر حرکت کی طاقت نہ ہو۔

پر آج شام کے وقت کہیں سے بہت سارے بادل آسمان پر ٹولیوں کی شکل میں نمودار ہوئے اور پیاسی دھرتی کے سیراب ہونے کی کچھ امید دکھائی دی۔

جویریہ اشیا کو ان کی مخصوص جگہوں پر سمیٹ کر رکھ رہی تھی جب پانی کے موٹے موٹے قطروں نے گلی کے کچھ گھروں کے دروازوں کے اوپر بنی ٹین کی چھتوں پر گر کر بارش کے شروع ہونے کا اعلان کیا۔

جویریہ نے ہاتھ بڑھا کر باورچی خانے کی چھوٹی سی کھڑکی کو بند کیا جس کے ذریعے تیز بوچھاڑ اندر آ کر سارے باورچی خانے کو گیلا کر دیتی تھی۔

جویریہ کھڑکی بند کر کے مڑی تو گھر میں پھیلے گھپ اندھیرے نے استقبال کیا۔ بیٹھک کا وہ بڑا سا بلب جو جویریہ نے تھوڑی دیر پہلے جلایا تھا، بجھ کر بجلی چلی جانے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

جویریہ نے وہیں کچن کی ایک دراز سے موم بتی نکال کر روشن کی تو اسے یاد آیا کہ اس نے بیرونی دروازے کو ابھی تک تالا نہیں لگایا تھا۔ عموماً یہ کام وہ سر شام ہی کر لیا کرتی تھی، آج جانے کیسے چوک گئی۔ واپس جا کر دروازے کو اچھی طرح سے بند کر لینے کے بعد جویریہ پلٹی تو اسے بیٹھک میں رکھے صوفے کے پاس ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔

دہشت کے مارے جویریہ کے ہاتھ سے موم بتی گرتے گرتے بچی۔ ہیولا تھوڑا آگے بڑھا اور موم بتی کی مدھم سی روشنی نے اس ہیولے کو مختار کی شکل و صورت عطا کی۔

”مختار چچا! آپ؟“ جویریہ کی رکی سانسیں بحال ہوئیں۔

”ڈر گئیں کیا؟“

”اب اگر اندھیرے میں کوئی اچانک سامنے آئے تو ڈر تو لگے گا ہی۔“ جویریہ کو مختار کا سوال عجیب سا لگا پر اس نے جتایا نہیں۔

جویریہ کو مختار سے کبھی ڈر نہیں لگا تھا، پر اس وقت موم بتی کی لرزتی لو میں مختار کی خود پر جمی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر اسے بے اختیار خوف محسوس ہوا۔

”چچا! آپ صبح آ جائیے گا۔ اس وقت خاصی رات ہو چکی ہے۔“ جویریہ نے اپنا لہجہ مضبوط رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تم مجھے چچا کس حساب سے کہتی ہو؟ میں تمہارا چچا تو نہیں ہوں۔“ مختار بولا۔

”میں نے تو ہمیشہ آپ کو چچا کہا ہے۔“ جویریہ نے اس کی انوکھی بات پر سٹپٹا کر کہا۔

”تو یہ تو تمہاری غلطی ہوئی نا۔“ وہ بولا۔

وہ ابھی تک اسی جگہ پر کھڑا تھا اور اس کا وہاں سے جانے کا کوئی ارادہ بھی نہیں لگ رہا تھا۔

جویریہ کو مختار کی گفتگو ہی نہیں اس کے انداز و اطوار بھی بدلے ہوئے لگے۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا باپ میرا مقروض تھا؟“ مختار نے اچانک جویریہ سے سوال کیا۔

”جی۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تمام واجب رقم حذیفہ آپ کو جانے سے پہلے ہی ادا کر گئے تھے۔“ جویریہ نے جواب دیا۔

مرنے سے ایک رات قبل ندیم صاحب نے حذیفہ کو پاس بٹھا کر اپنے ذمے تمام واجبات کی تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ حساب کتاب کوئی اتنا لمبا چوڑا نہیں تھا کچھ ان کا مان رکھنے کے لیے اور کچھ بحث سے بچنے کے لیے حذیفہ نے چپ چاپ سمجھ لیا۔ اس وقت حذیفہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان تمام ادائیگیوں کی ذمہ داری اسے سچ مچ نبھانی پڑے گی۔

”لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم ہو گا کہ میں نے تمہارے باپ سے رقم کے بدلے تمہارا ہاتھ مانگا تھا۔“ مختار بولا تو جویریہ جھٹکا کھا گئی۔

ندیم صاحب نے اپنے آخری وقت میں اور سب کچھ تو حذیفہ کو سمجھا دیا مگر یہ انتہائی اہم بات بتانا بھول گئے یا پھر یہ بھی ممکن تھا کہ انہوں نے دانستہ اس کا ذکر کرنے سے گریز کیا ہو، یہ سوچ کر کہ حذیفہ سے شادی ہو جانے کے بعد مختار کا مطالبہ از خود بے معنی ہو جائے گا اور بے معنی چیزوں کو زیر بحث لا کر وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل؟

پر انہوں نے جو بھی سوچا، غلط سوچا۔

کیونکہ رات گئے اس نیم اندھیرے گھر میں مختار سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر کھڑی جویریہ کو اس کی آنکھوں میں اپنے مطالبے سے دستبرداری نہیں، بلکہ کچھ اور ہی نظر آیا۔

”میں نے تو عزت دار طریقہ اپنانے کی کوشش کی تھی مگر تمہارے باپ کو منظور نہیں تھا۔ خواہ مخواہ انکار کیے جا رہا تھا۔ آخر تنگ پڑ گیا میں اس کی بے کار کی حجت سے۔ دو دن کا وقت دیا تھا میں نے اسے اور کہا تھا کہ اگر ان دو دنوں کے اندر اس نے ہاں نہ کی تو میں

بھی شرافت کا دامن چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اپنانے پر مجبور ہو جاؤں گا کیونکہ جو چیز مجھے چاہیے ہوتی ہے' وہ میں کسی بھی قیمت پر حاصل کر کے ہی رہتا ہوں۔ اس کے بعد جانتی ہو تمہارے باپ نے کیا کیا؟"

مختار نے دم سادھے کھڑی جوریہ سے پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔

"اس نے دو دن کی مہلت ختم ہونے سے پہلے ہی تمہارا نکاح اس لڑکے کے ساتھ کروا دیا اور میں۔"

مختار اپنی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"اپنے آپ کو ہوشیار سمجھنے والا دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف منہ دیکھتا رہ گیا۔ بہت کائیاں آدمی تھا تمہارا باپ جو مجھ جیسے بندے کے ساتھ بھی اتنا بڑا ہاتھ کر گیا۔"

مختار کے اندر دبا ہوا سارا غصہ اب باہر آ رہا تھا اور اس کے سامنے کھڑی جوریہ کا خوف کے مارے خون خشک ہو رہا تھا۔

پچھلے کچھ دنوں کے دوران گزرنے والے واقعات جوریہ کو اب سمجھ میں آ رہے تھے۔ ندیم صاحب کی تیزی سے گرتی صحت' ان کی بار بار بگڑ جانے والی طبیعت جسے وہ اپنی ناسمجھی اور لاعلمی کی بدولت جسمانی بیماری کے کھاتے میں ڈالتی رہی' دراصل اس ذہنی دباؤ کا نتیجہ تھی جو مختار کا پیدا کردہ تھا۔

"یہ سب بے کار کی باتیں ہیں جن کو دہرانے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر آپ یہی سب کہنے کے لیے آئے تھے تو برائے مہربانی یہاں سے چلے جایئے۔"

جوریہ اتنی نڈر ہرگز نہیں تھی' جتنا دکھائی دینے کی وہ کوشش کر رہی تھی۔ اسے تو اس وقت یہ سوچ کر بھی رونا آ رہا تھا کہ مختار کے چہرے کی خباثت اسے پہلے کیوں نہ نظر آئی۔ نیت کا فتور آج سے قبل کیوں نہ محسوس ہوا۔

وہ نہایت بے وقوف تھی۔ دوسروں پر آنکھ بند کر کے بھروسا کر لینے والی کم عقل لڑکی۔

"آپ نے سنا نہیں' میں نے کیا کہا۔ آپ پلیز! اس وقت یہاں سے چلے جایئے۔"

مختار کو وہیں جما کھڑا دیکھ کر جوریہ نے ایک بار پھر زور دے کر کہا۔

"اگر جانا ہی ہوتا تو میں یہاں آتا ہی کیوں؟" مختار عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب؟" خوف کی ایک شدید لہر جوریہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناتی ہوئی اوپر سے نیچے تک گئی۔

"میں نے کہا نا کہ جو مجھے چاہیے وہ میں ہر قیمت پر حاصل کر کے رہتا ہوں۔" مختار نے اپنا قدم آگے بڑھایا تو جوریہ بے اختیار پیچھے ہوتی ہوئی بند دروازے سے جا لگی۔

مختار کی آنکھیں ایک ایسے خونخوار جانور کی آنکھیں بن چکی تھیں جسے اپنا شکار اپنے سامنے نظر آ رہا ہوتا ہے۔

"تمہارے باپ نے تمہاری شادی تو کروا دی لیکن یہ شادی مختار کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی۔ اب جب تمہارا شوہر تمہیں لینے کے لیے آئے گا تو اسے برتی ہوئی دلہن ملے گی۔"

مختار یہ کہہ کر دروازے کے ساتھ لگ کر سہمی کھڑی ہوئی جوریہ کو دبوچنے کے لیے سرعت سے آگے بڑھا۔

دونوں کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا جو سیکنڈوں میں پار ہو جاتا۔ جوریہ اتنی دیر میں دروازے کا وہ تالا کھول کر باہر نہیں نکل سکتی تھی جسے تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا۔

جوریہ نے وہی کیا جو وہ کر سکتی تھی۔

اس نے بجلی کی تیزی کے ساتھ پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور دروازے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس کے درمیان سے ہٹ جانے کی وجہ سے اس کی طرف تیزی سے آتا ہوا مختار سیدھا دروازے کو جا لگا۔

درد کی کراہ کے ساتھ مختار کے منہ سے جوریہ کے لیے ایک گندی گالی بھی نکلی جسے سننے کے لیے جوریہ رکی نہیں۔ وہ اندھا دھند اندر کو دوڑی۔

یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ گھپ اندھیرے میں بھی اسے اندازہ تھا کہ کون سا دروازہ کہاں ہے۔ جوریہ نے ایک

کمرے کے اندر گھس کر دروازہ بند کر لیا مگر اسے معلوم تھا کہ دروازے پر لگی معمولی سی چٹخنی مختار جیسے آدمی کو زیادہ دیر باہر رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پائے گی۔

جوریہ نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ اندھیرے میں ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن جوریہ کو پتا تھا کہ وہ اس وقت ندیم صاحب کے کمرے میں ہے۔ اس کے دائیں طرف مہمانوں کو بٹھانے والی کرسی تھی اور سامنے ندیم صاحب کا بستر اور بستر کے پیچھے کھڑکی جو پچھلی گلی میں کھلتی تھی۔

جوریہ تیزی کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھی۔ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے مختار کمرے کے دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم اس بند کمرے میں محفوظ ہو گئی ہو؟ تمہاری اس غلط فہمی کو میں ابھی دور کیے دیتا ہوں۔"

جوریہ کو دروازے کے دوسری طرف سے مختار کے کہے الفاظ سنائی دیے۔ ساتھ ہی دروازے کے ساتھ کسی بھاری وجود کے ٹکرانے کی زوردار آواز بھی۔

دروازے پر لگی چٹخنی ان زوردار ٹکروں کے آگے ایک یا ڈیڑھ منٹ سے زیادہ ٹکنے والی نہیں تھی۔

جوریہ نے پوری قوت لگا کر کھڑکی کی کنڈی کھولنے کی کوشش کی مگر کنڈی زنگ لگ جانے کی وجہ سے ایک جگہ پر اٹک سی گئی تھی۔ جوریہ پاگلوں کی طرح اس سے زور آزمائی کرنے لگی۔

دروازے کی طرف سے دھاڑ دھم کی آوازیں متواتر آ رہی تھیں۔ دو لوگ دو مختلف راستوں کو کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔

مختار کمرے کے اندر آنے کا راستہ اور جوریہ کمرے سے باہر جانے کا راستہ۔

بالآخر ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ کنڈی کھل گئی۔ جوریہ نے کھڑکی کے دونوں پٹ وا کیے اور اس کے اوپر چڑھ گئی۔

کھڑکی گلی سے پانچ یا چھ فٹ کی اونچائی پر تھی۔ پر

اس وقت یہ اونچائی بیس فٹ بھی ہوتی تو جویریہ بلا جھجک کود جاتی۔

کمرے کا دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ کھلا اور مختار لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا۔

ساتھ ہی جویریہ نے باہر چھلانگ لگادی۔

ہلکی پھلکی بوچھاڑ اب تیز بارش میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد بجلی کڑکنے کی زوردار آواز دل کو دہلا رہی تھی۔

جویریہ اپنے نزدیک ترین دروازے کو ہاتھوں سے پیٹنے لگی مگر ٹین کی چھتوں پر شور مچا کر گرتے بارش کے پانی اور گرجتے بادلوں کی آواز نے اس کی پکار کو دبا ڈالا۔

جویریہ زار و قطار روتے ہوئے پاگلوں کی طرح دروازہ پیٹے جا رہی تھی۔ مختار اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

جب جویریہ کو لگا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو گھر کا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھلا اور آگے کو گرتی جویریہ "ہیں ہیں" کرتی بتول خالہ کی بانہوں میں جھول گئی۔

"ارے بے ہمت تو دیکھو اس ناس پیٹے کی۔ سوچا ہوگا' اکیلی لڑکی ہے۔ کوئی والی وارث نہیں جو چاہے کرو۔ مرن جوگا کہیں کا۔" خالہ بتول خوب غصے سے بول رہی تھیں۔

"ارے اس بدمعاش کے کرتوتوں سے تو سارا محلّہ واقف ہے۔ اللہ بخشے تمہارے ابا مرحوم ہی کا ظرف تھا کہ برے سے برے انسان میں بھی اچھائی تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ پر کیا فائدہ ہوا۔ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ کم بخت ان ہی کی عزت پر ڈاکا ڈالنے پہنچ گیا۔"

خالہ اپنی پالتو بلی کے پیالے میں دودھ ڈالنے کے ساتھ ساتھ مختار کو کوس رہی تھیں۔

جویریہ چپ چاپ دودھ کے پیالے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

خالہ بتول کا گھر گلی کا آخری گھر تھا۔ کچھ وہ زبان کی بھی ذرا کڑوی تھیں۔ محلے والوں سے زیادہ بنتی نہیں تھی۔ بہو بھی اتفاق سے تنگ مزاج ملی جو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اکلوتے بیٹے کو لے کر الگ ہو گئی۔ نہ خود ملنے آتی تھی' نہ ہی بچوں کو دادی سے زیادہ ملنے دیتی تھی۔ خالہ کا بیٹا ہی دس پندرہ دن کے بعد چکر لگا کر اور تھوڑا خرچا پانی ماں کے ہاتھ میں دے کر بیٹا ہونے کا فرض ادا کر جاتا تھا۔

"یہ تو اچھا ہوا کہ منیر ملنے آیا ہوا تھا۔ بارش کی وجہ سے رات ٹھہر گیا۔ مرد کو گھر کے اندر دیکھ کر وہ خبیث الٹے پیر بھاگ گیا۔ اکیلی میں اور تم ہوتیں تو اس شیطان کو بھلا کیا روک پاتیں؟" خالہ نے جویریہ سے کہا۔

"بھئی! میں تو خدا لگتی کہوں گی۔ اس سارے قصے میں قصور تمہارا خود کا ہے۔ ہمارے زمانے میں تو جوان جہان لڑکی کا اکیلے گھر میں رہنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پر تم آج کل کے بچے' نہ تو حالات کی نزاکتوں کو سمجھتے ہو' نہ ہی معاشرے کے رائج کردہ اصولوں کو کوئی اہمیت دیتے ہو۔ نتیجہ خود ہی دیکھ لو۔"

خالہ جویریہ کو کھری کھری سنا رہی تھیں پر اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ خالہ کی باتیں جویریہ کو سو فیصد درست لگ رہی تھیں۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ اگر خالہ کا دروازہ وقت پر نہ کھلتا یا بارش کی وجہ سے خالہ کا بیٹا منیر ان کے گھر رات گزارنے نہ ٹھہر گیا ہوتا تو اس کا کیا بنتا۔ منیر کی للکار پر مختار دوڑا تھا' پلٹ کر گلی سے نکلتا ہوا کچے میدان کی طرف بھاگ گیا تھا۔

خالہ بتول لاکھ زبان کی کڑوی سہی پر رات وہ اور ان کا بیٹا جویریہ کے لیے فرشتہ ثابت ہوئے تھے۔

"اب میری مان تو یہاں بیٹھ کر اس لڑکے کا انتظار کرنا بند کردے۔ وہ نہیں آسکتا تو تو اس کے پاس چلی جا۔ آخر منکوحہ ہے اس کی۔ اتنا تو تیرا حق بنتا ہے۔ گھر جا کر تھوڑا بہت جو ضروری سامان اکٹھا کرنا ہے' کرلے اور جا۔ کب تک تیرے میرے آسرے پر یہاں بیٹھی رہے گی۔"

خالہ نے جویریہ سے کہا جو ڈر کے مارے رات بھر سے اپنے گھر واپس لوٹ کر ہی نہیں گئی تھی۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں' یہ منیر ساتھ ہے نا۔"

خالہ نے باہر برآمدے میں بیٹھ کر ناشتا کرتے بیٹے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے بھی آج لاہور جانا ہے۔ تجھے تیرے میاں کے گھر تک چھوڑ آئے گا۔"

خالہ اس وقت مہربانی کے موڈ میں تھیں یا پھر جویریہ کی حالت دیکھ کر انہیں واقعی ترس آرہا تھا۔

"اور سن!" خالہ نے بلی کے خالی کیے پیالے کو پیر سے ایک طرف کرتے ہوئے جویریہ سے کہا۔

"رات والے قصے کا ذکر کسی سے نہ ہی کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ عزت بچ گئی۔ یہی غنیمت ہے۔ بات پھیلے گی تو تیرا ہی نقصان ہوگا۔ چار دن ہوئے نکاح کو' تیرے میاں کو اس بات کی خبر ہوگئی تو خدا جانے کیا سمجھے۔ یاد رکھ! مرد کی ذات کان کی کچی ہوتی ہے۔"

خالہ نے جویریہ کو بڑے پتے کی بات بتائی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسمارہ نے چلتی گاڑی کے اندر سے باہر کی دنیا پر نظر ڈالی۔

تیزی کے ساتھ گزرنے والے درخت اور پودے' یہاں تک کہ سڑک کے کنارے چلنے والے انسان بھی سارے دن کی دھوپ میں جھلسنے کے بعد اب سر اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ دن ڈھلنے کا وقت قریب تھا۔ پھر بھی گرمی کی شدت میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔

اسمارہ کے برابر والی سیٹ پر بیٹھی رعنا نہ جانے کیا بات کر رہی تھیں۔ وہ "ہوں ہاں" کر رہی تھیں۔

یہ سچ تھا کہ اعلا طبقے کا حصہ ہونے کے باوجود اسمارہ کے اندر ایک روایتی عورت چھپی ہوئی تھی جو شوہر کی عدم موجودگی میں خود کو بھری دنیا میں اکیلا محسوس کرنے لگتی ہے' مگر اسمارہ کی فی الوقت پریشانی کا سبب دانش نہیں' حذیفہ تھا۔ دانش کی موت پر اسمارہ صبر کر چکی تھیں' کیونکہ صبر کرنے کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

پر جو کچھ حذیفہ کرنے جا رہا تھا' اس نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر ڈالی تھی۔

رعنا کو بھی جب پتا چلا تھا کہ حذیفہ اس لڑکی کو لینے چلا گیا ہے تو وہ بہت آگ بگولہ ہوئیں۔

"تمہیں حذیفہ کو صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ اس لڑکی کے لیے تمہارے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے۔" رعنا نے سخت غصے کے عالم میں اسمارہ سے کہا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اس لڑکی کو یہاں لے کر آنے کی بجائے کہیں اور لے جاتا' پھر میں اور آپ کیا کرلیتے؟" اسمارہ نے سپاٹ لہجے میں کہا تو رعنا جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔

رعنا کے مقابلے میں اسمارہ اس موقع پر زیادہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

حذیفہ ضدی طبیعت کا نہیں تھا۔ عرشی کی طرح بے جا اور فضول باتوں پر اڑ جانے کی عادت بھی اسے نہیں تھی' لیکن ایک ماں ہونے کے ناتے اسمارہ کو اپنے بیٹے کے بارے میں اتنا ضرور پتا تھا کہ وہ اپنے ارادے کا پکا ہے۔ جس کام کو کرنے کی ایک بار ٹھان لے' اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے گا۔

اسمارہ نے تھک کر گاڑی کی کھڑکی کے ساتھ اپنا ماتھا ٹیکا۔ رعنا بھی اسمارہ کی بے توجہی محسوس کرکے خاموش ہو چکی تھیں۔

"حنیف! ذرا گاڑی روکنا۔"

گاڑی گھر کے آہنی دروازے سے اندر داخل ہونے کو تھی جب اسمارہ نے ڈرائیور سے اسے روکنے کو کہا۔

"کیا ہوا؟" رعنا نے پوچھا۔

مگر اسمارہ کا دھیان رعنا کی طرف نہیں تھا۔ وہ نیلے پرنٹ والے لان کے سوٹ میں ملبوس لڑکی کو دیکھ رہی تھیں جو گیٹ کے پاس چوکیدار کے برابر کھڑی تھی۔

اسمارہ نے اس لڑکی کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' مگر ان کی چھٹی حس ان سے کہہ رہی تھی کہ یہ لڑکی جویریہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سائرہ رضا

بے حد دلفریب خوشبو اور ٹک ٹک کی بتدریج نزدیک ہوتی آواز پر ملاحت مصطفیٰ کا کی بورڈ پر چلتا ہاتھ رک گیا۔ اس نے اسکرین سے نگاہیں اٹھا کر سامنے اپنا بیگ بے نیازی سے میز پر رکھتی انبساط پیرزادہ کو دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔

"اوہ۔" اس نے ہونٹ سکوڑے۔

"السلام علیکم!" انبساط نے حسب عادت بڑے سلیقے سے کہا۔

"وعلیکم السلام..." ملاحت نے کہا۔ "آج تو جون ہی بدلی ہوئی ہے؟"

اس نے انبساط کو سرتاپا دیکھا، جس نے بند کالر کڑھائی سے بھرا بہت کھلا کرتا یا شاید جھبلا پہن رکھا تھا۔ بلیک ٹائٹس کے ساتھ بہت باریک اور لمبی ہیل کا بند شوز، سلکی بالوں میں کرل ڈلوائے گئے تھے۔ گلاسز سر پر ٹکے تھے۔ اس کے چہرے پر رنگ تھے۔ آنکھوں میں چمک اور ہنسی۔ خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اب اپنی سیٹ پر بیٹھ کر لیپ ٹاپ کھول رہی تھی۔

ملاحت نے اپنا کام روک دیا۔ اب وہ یکسوئی سے اس کا چہرہ تک رہی تھی، یہاں تک کہ انبساط نے جھنجلا کر جارحانہ انداز میں اس کی سمت دیکھا۔

"کیا ہے؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو، کام کرو اپنا..."

"کام ہی تو کر رہی ہوں، کسی کا چہرہ پڑھنا، آنکھیں کھوجنا، حرکات و سکنات سے نتیجہ اخذ کرنا باقاعدہ علم ہے یار!"

"تو میرے چہرے کو پڑھ کر تمہیں کون سی ڈگری ملنی ہے؟" اس نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔

"ڈگری نہ سہی خوشی تو مل سکتی ہے۔ اتنا جھلملاتا دمکتا چہرہ، روئیں روئیں سے سرشاری ٹپک رہی ہے بلکہ..."

"ہو گئی تمہاری شاعری شروع۔" اس نے اس کی بات کاٹی اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"شاعری ہی سہی پر یاد رکھو بھید دل کے کھولتی ہے شاعری سچ بولتی ہے۔"

ملاحت گنگنائی۔

"تو آج کون سا بھید کھلا؟"

"یہی کہ تو پیا سے مل کر آئی ہے۔" ملاحت کی گنگناہٹ میں ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

"لو خواہ مخواہ، دیر سے آنے کی یہ وجہ ہی تو نہیں ہو سکتی، بندے کے ہزار کام۔" بولتے بولتے اس نے دیوار گیر گھڑی کو دیکھا۔ وہ ساڑھے گیارہ بجے آفس آجایا کرتی تھی۔ جبکہ اب سوئی دو کے ہندسے سے بھی گزر چکی تھی۔

"بجا فرمایا... بالکل درست مگر مستی بے خبری... ان دوسری وجوہات میں یہ خوشبو بھرا وجود... یہ ایکسٹرا سنگھار... یہ رکھتے کہیں اور پڑتے کہیں جیسے پیر... یہ سب نہیں ہوتے۔ یہ مصنوعی بے گانگی اور مصروفیت کا ڈھونگ... میری جان! ہم اوروں کی طرح اڑتی چڑیا کے پر گننے کا دعوا تو نہیں کرتے ہاں مگر اس بدلتے چہرے اور چال و آواز کے سیاق و سباق کو جاننے کا دعوا ضرور کر سکتے ہیں۔" ملاحت نے اپنی گھومنے والی کرسی اس کے عین سامنے کر لی اور نیم دراز حالت میں مزے لے کر کہا۔ اس کا انداز اتنا پر یقین تھا کہ انبساط کا خود پر زبردستی سنجیدگی کا چڑھایا جانے والا چولا سرک گیا۔

"اچھا تو پھر محترمہ چہرہ شناس خاتون! آپ کا علم کیا کہتا ہے؟" اس نے سینے پر ہاتھ لپیٹ لیے۔ ملاحت پل بھر کو خاموش ہو گئی، وہ اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"اونہوں، تم مکر جاؤ گی۔ میرے بتلائے سچ کی نفی کر دو گی۔ مجھے تم پر اعتبار نہیں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر رائٹنگ پیڈ سے دو کاغذ کھینچے۔

"تم اپنا سچ اپنے کاغذ پر لکھ کر مجھے دو اور میں اپنا قیافہ تمہیں... ایک دوسرے کو دھوکا دینے والی بات ہی ختم۔"

ملاحت نے جملہ مکمل کرتے ہی لکھنا شروع کر دیا۔ انبساط کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

"بہت بدتمیز ہو تم۔" اب وہ بھی اس کی تقلید کر رہی تھی، پھر ملاحت نے دو پرچیاں بنا کر اسے دیں اور انبساط نے اسے...

ملاحت نے اردو جبکہ انبساط نے انگریزی کا سہارا لیا تھا۔ اگلے پل ملاحت کا کھنکتا قہقہہ کمرے میں گونج رہا تھا جبکہ انبساط کی آنکھیں تحیر سے پھیلی ہوئی تھیں۔

"پرچی نمبر 1۔ میرز کاء نے انبساط پیرزادہ کو پرپوز کیا ہے۔"

پرچی نمبر 2 انبساط پیرزادہ نے بقائمی ہوش و حواس بقصد خوشی و احترام آج لنچ میں اسے منظور کر لیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

انبساط پیرزادہ نے میرز کاء کو پہلی مرتبہ اور بعد میں کئی مرتبہ اپنے دوست کم باس فیصل زیدی کے ساتھ

دیکھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن بہت تیزی سے فیض کے کمرے میں داخل ہوئی اور کاغذوں کا پلندہ ٹیبل پر پٹختے ہوئے حسب عادت شروع ہو گئی تھی۔ تب فیض زیدی نے اس کی پشت پر ہلکے سے اخبار کا رول مارتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ کرنٹ کھا کر پہلے سیدھی ہوئی، فیض کو دیکھا پھر ذکاء کو، جو یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ حیرت، دلچسپی، احترام اور بری طرح متاثر

"بس قسمت سے ہی تم شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچی ہو، جہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔ ہڑبونگ کا عالم ملاحظہ ہو۔ بندے کو اندازہ ہی ہو جاتا ہے کہ سامنے مطلوبہ بندہ نہیں ہے۔ مجھ میں اور ذکاء میں ہر معاملے میں اتنا ڈفرنس ہے اور تمہیں کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں کالا یہ گورا۔ میں موٹا، یہ پتلا میں باس، یہ مہمان، یہ اتنی بڑی بڑی آنکھیں۔"

"بس....!" وہ بھڑک گئی۔ "میری اتنی ساری کوتاہیاں گنوا دیں اور آپ کی غلطی کوئی نہیں؟ باس کے کمرے میں باس کی چیئر پر باس ہی بیٹھے گا ناں۔ آپ نے اپنی جگہ پر انہیں کیوں بٹھایا اور اگر فیض کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی تو آپ کیوں بیٹھے یہاں؟"

اس نے رخ موڑ کر ذکاء کے بھی لتے لے لیے اور وہ جو پہلے ہی سحر زدہ تھا، فوراً" غلطی تسلیم کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "آئی ایم سوری۔"

"ہونہہ!" انبساط کا غصہ اب اوپر ہی چڑھنا تھا، اس نے باہر قدم بڑھائے۔

"ارے رکو ٹھہرو، انبساط ٹھہرو یار! ایک منٹ۔" فیض نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ پھیلا کر جیسے اس کا راستہ روکا۔

"اب خبردار، جو میرا راستہ روکا تو، میرے آن ایئر جانے میں صرف...." اس اپنی کلائی کی گھڑی فیض کی آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ "انتیس منٹ رہ گئے ہیں اور وہ سرفراز آکر کہہ رہا ہے، وزیر داخلہ لائیو نہیں ہو سکتے، مصروف ہیں۔ میرا اور افارمیٹ تیار ہے۔ اب انتیس منٹ بلکہ ستائیس منٹ میں، میں کیا کروں گی۔ مجھے نہیں معلوم، جہاں سے مرضی لا کر دو۔"

"کیا لا کر دوں.... وزیر داخلہ؟" فیض کا موڈ بہت ہی خوشگوار تھا۔

"پوری بات سنا کرو بلکہ یہاں کرسی پر بیٹھو، ذکاء! پانی کا گلاس۔"

اس نے اشارہ کیا اور میر ذکاء تو نجانے کیوں ابھی تک حیران تھا۔ جلدی سے گلاس پیش کیا۔

"یہ پیغام میں نے آج کے پروگرام کے لیے نہیں دیا۔ تم بلواؤ سرفراز کو، یہ تو وہ جو سیلاب متاثرین کے لیے میراتھون ہوئی ہے، اس کے لیے تھا اور اس میں ابھی تین دن ہیں۔ مہمان ہی مہمان.... تم بھی ہر شے کو سر پر سوار کر لیتی ہو۔" فیض بالکل سامنے کرسی رکھ کے بیٹھ گیا۔

پانی پی کر انبساط کے حواس بحال ہوئے۔

"سر پر سوار کیسے نہ کروں، پتا نہیں تمہارا چینل کیسے نمبرون ہے۔ سارے کے سارے دو نمبر لوگ بھرے ہیں اور یہ سرفراز، اس کی...."

فیض نے چھت پھاڑ قہقہہ لگایا۔ انبساط نے اچنبھے سے اس کی شکل دیکھی۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے؟" اگلے پل اس نے میر ذکاء کو گھورا جو فیض کا ساتھ دینے کو ہم آواز ہوا تھا۔

"بولنے سے پہلے سوچو انبساط پیرزادہ.... تم بھی ہمارے نمبرون چینل میں ہی کام کرتی ہو۔ اس طرح تو...."

"اچھا بس!" انبساط نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ بات سمجھ کر اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ ٹھہری، بلکہ نہیں مسئلہ حل ہو جانے پر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

"جا رہی ہوں، ٹائم ختم۔ ابھی میک اپ باقی ہے۔" وہ تیزی سے کھڑی ہوئی۔

"ارے اس سے تو مل لو میرا بیسٹ فرینڈ میر...."

"ہیلو.... آئی ایم سوری! میں اپنے پروگرام کے حوالے سے بہت حساس ہوں، آپ پلیز بیٹھیں مگر یہاں گیسٹ چیئر پر.... ورنہ کسی اور کو بھی غلط فہمی ہو

جائے گی۔" وہ باہر لپکی۔

"نہیں ہو گی۔ سب باس کے کمرے کو باس کا کمرا سمجھ کر ہی آتے ہیں۔ تمہاری طرح...."

فیض کی جلی بھنی آواز نے پیچھا کیا۔ انبساط کے پاس سچ مچ وقت نہیں تھا، مگر وہ پل بھر کو رکی۔ گردن موڑ کر فیض کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

میر ذکاء کا آدھا کام وہیں تمام ہوا۔ اس نے اسے پہلی بار اس طرح ہنستے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

میر ذکاء کو وہ پہلی نگاہ میں ہی اچھی بلکہ بہت اچھی لگی تھی۔ اسے اسکرین پر دیکھنا اور بات تھی اور سامنے دیکھنا بالکل الگ تجربہ۔ سنجیدہ چہرہ، کاٹ دار جملے برجستگی، صاف گوئی، مقابل کو زیر کرتی ذہین آنکھیں وہ پرائم ٹائم میں کرنٹ افیئرز کا پروگرام کرتی تھی۔

"صرف عوام" نامی یہ پروگرام اپنے موضوع کے اعتبار سے باقی سارے پروگرامز سے بہت مختلف تھا۔ صرف اور صرف عوامی مسائل۔ اس نے میمو کے معاملے پر کوئی شو نہ کیا، منصور اعجاز کے آنے اور حقانی کے جانے سے عوام کو کیا فرق پڑے گا۔ این آر او جب نیوز کاسٹر بہت تیزی سے یہ جملہ ادا کرتے ہیں تو عوام سمجھتے ہیں "انہیں نہ رو" کی تلقین کی جا رہی ہو۔ آٹھویں اور نویں ترمیم سے عوام کو کوئی مطلب نہیں۔ امریکہ مہربان ہے یا پاکستان نادان.... عوام کو سننے میں بھی دلچسپی نہیں۔ روٹی اور صرف روٹی.... عوام اب کپڑے اور مکان کے مطالبے سے بھی پیچھے ہٹ گئے۔

انبساط پیرزادہ لوگوں کے اعتراضات کے جواب میں کہتی۔

"میں بڑے بڑے پارلیمانی مسائل حل کروانے کے لیے خود کو ملنے والا گھنٹہ ضائع نہیں کر سکتی۔ مجھے تو چھوٹے چھوٹے مسئلے حل کرنے ہیں۔" اس نے اپنے پروگرام کے موڈ پر کبھی سمجھوتا نہ کیا۔ کوئی ملکی اور بین الاقوامی مسئلہ نہیں، کوئی بڑا ڈسکشن نہیں چھوٹے لوگ، چھوٹی باتیں، چھوٹے مسئلے مگر جو حل نہ ہوں تو زندگیوں کو بڑی مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔"

پہلے پہل تو لوگ محض انبساط پیرزادہ کی بے پناہ خوب صورتی، لمبے سیدھے بالوں اور روانی سے چلتی زبان دیکھ کر چینل بدلنا بھولے، پھر رفتہ رفتہ مقصد بھی سمجھ میں آنے لگا۔ وہ اپنے طرز کی ایک ہی تھی۔ آج کی لڑکی "پڑھی لکھی، باشعور۔ اپنی آواز، بات، انداز ہر شے نوٹ کرواتی۔"

میر ذکاء نے اسے اسکرین پر ہی دیکھا تھا اور اب وہ عجب بے خودی کے عالم میں اسے دیکھنے روز دفتر پہنچ جاتا۔ وہ فیض زیدی کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں نے ابراڈ سے اکٹھے ڈگری بھی لے رکھی تھی۔ ادھر انبساط پیرزادہ اور ملاحت نے جامعہ کراچی سے آئی آر کی ڈگری لی تھی۔ چینل فیض کے ابا اور تایا کا تھا۔ انبساط شوق شوق میں گئی تھی۔ اب چینل کی مجبوری اور میڈیا کے لیے ضروری بن گئی۔

میر ذکاء کو اس دن کی مڈبھیڑ کے بعد اس نے خود سے مخاطب نہ کیا، ضرورت بھی نہیں تھی۔ مگر میر ذکاء کے لیے زندگی موت کا مسئلہ بن گیا۔ اسے لگتا، اس کی ساری دنیا انبساط پیرزادہ کے گرد ٹھہر گئی ہے اور میر ذکاء.... وہ کون سا کم تھا۔ ملک کے بڑے قبیلے کے سردار کا سب سے چھوٹا بیٹا، جو زیادہ تر ملک سے باہر رہا۔ جو سال کے سال بس ملنے جلنے محض موڈ بدلنے کو پاکستان کی طرف منہ کرتا تھا مگر اب کی بار منہ کے بل گرا۔ اسے لگا کہ وہ جیسے اب تک انبساط کے بنا بے کار زندگی گزار رہا تھا اور زندگی میں بس ایک اس کی کمی تھی۔ مگر اسے یہ بات بھی پریشان کرتی کہ وہ اسے مسلسل نظر انداز کرتی تھی۔ اب جان بوجھ کر یا یہ بھی ایک انداز دلربائی تھا، خبر نہیں۔ میر ذکاء ایسا تو نہیں تھا جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ سیب اور چھری ہاتھ میں تھما کر محفل سجائی جاتی تو سحر زدگی کے عالم میں انگلیاں کٹ سکتی تھیں۔ مگر مگر....

وہ اکثر آتا، فیض زیدی اپنے ابا کی موجودگی میں باس

بننے کا کامیاب ناٹک کرتا اور بعد میں انبساط اور ملاحت کے روم میں آکر وہ محفل سجتی کہ بس، ملاحت کا میاں مصطفیٰ احمد جو نیوز اینکر تھا اور ایب ذکاء کے دوستوں میں شامل، فارغ ہو کر یہاں پہنچ جاتا۔ پھر جو محفل سجتی تو الاماں۔

انبساط پوری محفل میں اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں کے ساتھ موجود رہتی۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ لیپ ٹاپ سنبھالے پروگرام ترتیب دے رہی تھی اور وہ چاروں مزے لے لے کر ایک دوسرے کے لتے لے رہے تھے۔ انبساط اور ذکاء کے درمیان پردہ چاک ہو گیا۔

"دادا بزرگ سیاست دان، ابا تجربہ کار سیاست دان، تایا حزب اختلاف، چاچا حزب اقتدار، پھوپھا نے اپنی کوئی آزاد پارٹی بنالی۔ مقام حیرت ہے، میر ذکاء سیاست سے دور بھاگتا ہے۔"

مصطفیٰ نے اپنی الجھن بیان کر دی۔ ملاحت نے سوال پر تائیدی سر ہلایا۔

"آپ کو مطمئن کرنا ہو گا۔"

"لے اب دے جواب!" فیض اسے پھنسا دیکھ کے خوش ہوا۔

ذکاء نے شانے اچکائے۔ انبساط نے بھی اسکرین سے نگاہیں اٹھائی تھیں۔

"مائنڈ نہیں ہے۔ اتنے بہت سے لوگ ہیں، میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں آزاد زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کے بڑے سبھاؤ سے وہی جواب دے رہا تھا، جو ہمیشہ اس سوال کے جواب میں دیتا تھا۔

"یہ تو ہو گیا بیان۔ اب اصل بات بتا دے۔" فیض زیدی نے پچکارنے والے انداز میں کپ میز پر رکھا۔

"یہی بات ہے یار.....!" وہ ہنس پڑا۔

"سیاست دان کے بیٹے کا سیاست میں نہ ہونا بھی سیاست ہے۔"

انبساط نے لحظہ بھر کو انگلیاں روکیں اور ایک لوہار کی کرتے ہوئے قصہ تمام کیا۔

اس بار قہقہے چھت پھاڑ تھے۔ میر ذکاء کی بے حد خوب صورت مردانہ ہنسی جب تھمی تو اس نے سب سے نگاہ بچا کر انبساط کو شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا۔ اسی پل ان کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اس نے ہونٹ دانتوں میں دبا کر شریر انداز سے سر جھکا لیا۔

☼ ☼ ☼

انبساط پیرزادہ اکتیس برس کی عقل و شعور سے معمور ایک بردبار زمانہ ساز لڑکی تھی۔ وہ جس مقام پر تھی، وہاں ہر گھنٹے اسے اچھے برے لوگ ملتے تھے اور کئی سے وہ متاثر بھی ہوئی تھی۔ میر ذکاء بھی اپنے پیچھے یاد چھوڑ گیا تھا۔ وہ ایسی شخصیت نہیں تھا، جسے نظر انداز کیا جا سکے اور پھر اس کی آنکھوں میں مچلتے جذبے اور رنگ۔ انبساط نے خود پر جبراً "پہرہ" لگا رکھا تھا۔

وہ ایک عملی لڑکی تھی۔ ہر چیز کو سوچ سمجھ کر کرنے والی۔ پسندیدگی نے محبت بن کر دل کے کواڑ پر زوردار دستک دی تھی، مگر اس نے کواڑ نیم وا کرنے سے پہلے ہر پہلو کو اچھے طریقے سے جانچ لیا تھا۔ جمع تفریق کے سارے مسئلے حل کر لیے تھے۔ یہ سچ تھا اور جس کا اعتراف اس نے ملاحت کے سامنے بلا جھجک کر دیا تھا۔

"تم نے دیکھا ہو گا شوبز کی بہت اسٹائلش، پڑھی لکھی، جینئس ہر دل عزیز خواتین کے لائف پارٹنرز کسی نہ کسی حوالے سے بہت عام سے ہوتے ہیں۔ دولت مند ہوں گے تو بڈھے اور بدشکل۔ جوان ہوئے تو اسمگلرز، بیوی سے کم حیثیت۔ بیوی انہیں جس طرح مرضی پورٹریٹ کرے۔ بیوی سے کمتری کا احساس ان کے پورے وجود پر کسی لیبل کی طرح چپک جاتا ہے۔ عجیب احمقانہ جوڑی دکھتی ہے۔ میاں بیوی جب گاڑی کے دو پہیے ہیں تو دونوں کو ایک ہی کمپنی کا ہونا چاہیے۔ بھان متی کا کنبہ کیوں جوڑیں۔ شاید جب میں نے پہلی بار، ابھی تو یادداشت کے پردے میں

بھی نہیں مگر..... یہ سوچ لیا تھا میں کسی بھی حوالے سے بے جوڑ رشتہ نہیں بناؤں گی۔ عمر، شکل، تعلیم، حیثیت میں مجھ سے اوپر نہ سہی، برابر تو ہونا چاہیے۔ میری اب تک کی زندگی میں ہر چیز میرے معیار کی ہے۔ الحمدللہ! اللہ نے جو تمام چیزیں اپنی پسند سے دیں۔ میرے ہوش سے پہلے وہ ہر لحاظ سے مکمل ہیں اب جبکہ یہ ایک رشتہ جو مجھے خود جوڑنا ہے تو اسے میں الگ راستے پر جا کر کیوں بناؤں۔"

"اس لیے تمہیں میر ذکاء اپنے لیے بہتر لگ رہا ہے۔" ملاحت جو از حد حیران تھی، بمشکل بولنے کے قابل ہوئی۔

"ہاں!" انبساط نے صرف ایک لفظ کہا۔

"جب تم اس قدر کلیئر ہو اپنے پوائنٹ آف ویو میں..... ہوش سنبھالنے سے آج تک تو میری پیاری! غلطی تو تم کر رہی ہو۔" ملاحت نے تاسف سے انکشاف کیا۔

"کیسی غلطی.....؟" انبساط کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ایک بالکل الگ کلچر یار! زبان کا فرق، لباس کا، کھانے پینے، رہنے سہنے، اٹھنے بیٹھنے..... وہ سب لوگ تم سے بالکل الگ ہیں۔ تم ایک شہری لڑکی، اس کا تعلق ایک قبیلے سے ہے اور یہ قبائلی جتنا مرضی پڑھ لکھ لیں، جتنے مرضی ماڈرنائز ہو جائیں، اپنی روایات سے انچ پیچھے نہیں ہٹتے..... تم نے تو سوشیالوجی پڑھ رکھی ہے۔ مادی تبدیلی کو تو لوگ قبول کر لیتے ہیں مگر غیر مادی تبدیلی..... خدا کے لیے انبساط! وہ بہت اچھا ہے مگر تمہاری سیٹنگ ناممکن یار!"

انبساط پر خاک اثر نہ ہو۔ وہ سارا وزن کرسی کے پچھلے پیروں پر گرائے اپنے ہاتھ میں موجود پین سے کھیلتی رہی۔

"ہمارے درمیان محبت ہے، جو دن بدن پروان چڑھ رہی ہے اور یہ محبت امربیل کی طرح ہر دن میرے وجود کو ڈھانپتی جا رہی ہے۔" انبساط کے لہجے میں سرشاری تھی۔ ملاحت کی جان جل کر خاک ہو گئی۔

"تمہیں شاید خبر نہیں۔ امربیل جس سے لپٹ جائے وہ، وہ اپنا آپ کھو بیٹھتا ہے۔"

"تو یہی تو محبت ہے یار!" وہ جیسے مطمئن ہو گئی۔

"تم نے وہ ڈراما دیکھا ہے، جس میں ہمایوں سعید باہر ملک سے بیوی لا کر اسے قبیلے کے قلعے میں قید کر دیتا ہے۔"

"میں ڈرامے کب دیکھتی ہوں، میر ذکا ہمایوں کب ہے اور میں وہ ہیروئن نہیں ہوں اور تم میرے آگے کیسے بول رہی ہو، میر کے سامنے تو اس کی تعریفیں کر کر کے پاگل ہو رہی ہوتی ہو۔ میں بتاؤں کی میر کو تم دوغلی ہو۔"

"میں دوغلی نہیں ہوں، میر واقعی بہت اچھا ہے۔ وہ ہر لحاظ سے تمہارے لائق ہے..... بلکہ لائق ہوتا مگر اس کا وہ قبائلی بیک گراؤنڈ..... تم اس کے خاندان کے مردوں کا بائیو ڈیٹا تو نکالو ذرا۔" ملاحت بے بس ہو جاتی۔

"جانے دو ملاحت مصطفیٰ! مجھے ان لمحوں کو جینے دو۔ فائنلی میری زندگی میں محبت آ گئی، وہ بھی بہت ساری۔"

☼ ☼ ☼

اس نے کچھ سچائی اور کچھ ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملاحت کو بلکہ خود اپنے آپ کو تو مطمئن کر دیا تھا مگر ماما، پاپا کے سامنے بھیا اور بھابھی کے سامنے ان سب کا رویہ ایسا تھا، جیسے اچھی خاصی عقل و خرد والی انبساط ایک صبح اٹھی تو پاگل ہو چکی تھی۔ اول تو اسے اسی بات میں بہت دن لگے کہ کم از کم ماما، پاپا ایک بار میر ذکاء سے مل لیں۔

"جب میں اس سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہتا تو مل کر ٹائم ویسٹ کیوں کروں۔" وہ قطعیت سے بولے۔

"بابا! میری خاطر بس ایک بار۔" وہ ملتجی لہجے میں

بولی۔
"میں تمہاری خاطر ہی تو اس سے ملنا نہیں چاہتا۔" وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر اخبار میں مگن ہو گئے۔ یعنی اب مزید بات نہ ہو گی۔
"ماما! آپ تو مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔" وہ کٹھور چہرہ بنا کر بیٹھی ماما کے سامنے گڑگڑائی۔
"انبساط! تمہیں پتا ہے پریگننسی میں حاملہ عورت کو عجیب عجیب خواہشیں ہوتی ہیں، کھانے پینے کے حوالے سے 'میرا دل کرتا ملتانی مٹی کڑکڑ کر کے چبا لوں' اتنی شدید طلب کہ کوئی مثال نہیں۔ تمہاری نانی سے ذکر کیا تو کہنے لگیں 'کھالو۔ پھر لا کر بھی دی۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی، منہ تک لے کر گئی مگر پھر ایک دم پوری طاقت سے اٹھا کر دور پھینک دی۔ صرف زبان کے چسکے کے لیے میں اپنے معیار سے کیسے گر سکتی ہوں۔ میں وجیہہ پیرزادہ اور ملتانی مٹی' میں نو ماہ تڑپی مگر اسے دوبارہ ہاتھ نہ لگایا۔ میں نے اس بے چینی اور بے چارگی کے عالم میں بھی ایسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا، جو مجھ سے میچ نہیں کرتی تھی۔ تمہیں یقیناً" اپنی ضرورت لگتا ہو گا، مگر وہ تمہارے لیے صحیح نہیں ہے۔"
"اتنا لمبا جواب!" وہ جو الجھن بھرے انداز میں ماما کا چہرہ تک رہی تھی۔ جھٹکے سے اٹھی اور صوفے پر پیر اوپر کر کے بیٹھ کے رونا شروع کر دیا۔ پہلے صرف سوں سوں کی آواز۔ پھر ایک آدھ ہچکی پھر جسم لرزنے لگا۔
فاروق پیرزادہ نے بہت تاسف سے اپنی قابل فخر بیٹی کو ایک مڈل کلاس مظلوم، مجبور لڑکی کی طرح بلاوجہ روتے دیکھا۔ عقل کا پنچھی ہمیشہ شانے پر نہیں ٹکتا، وہ پل بھر کے لیے بھی پرواز بھرے تو دماغ سوچنا اور آنکھیں دیکھنا بند کر دیتی ہیں۔
"بلاؤ اسے وجیہہ! مل لو تاکہ ملال نہ رہے کہ ہم نے موقع نہیں دیا اور تم انبساط۔" وہ انگلی اٹھا کر تنبیہی انداز میں بولے۔ "ہو سکتا ہے وہ تمہارے کہے سے زیادہ اچھا نکلے مگر اس کے باوجود میں قائل نہیں ہوں گا۔" وہ کمرے سے نکل گئے۔
وجیہہ بہت تاسف اور حیرانی سے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔
"وہ برا نہیں ہے ماما! آپ اس سے ملیں گی تو آپ..."
"بس۔۔۔!" انہوں نے اسے روک دیا۔ "تمہیں پتا ہے، تمہیں اس وقت اس طرح روتے دیکھ کر مجھے کیا خیال آ رہا ہے۔ ایک ان پڑھ جاہل عقل سے پیدل ... بلکہ اگر تم میں سننے کا حوصلہ ہو تو۔" وہ پل بھر کو رکیں۔ "تم نے دارالامان والا شو کیا تھا ناں، گھر سے بھاگی لڑکیاں بہت نو عمر بہت ناسمجھ، بچوں والی عورتیں اور تم ہی نے سوال اٹھایا تھا کہ آخر ایسی ضدیں باندھتے ہوئے، ہر رشتے کو نظر انداز کر کے لڑکیاں نئے رشتے کو سب پر حاوی کیسے کر لیتی ہیں؟ آخر کون سی چیز انہیں گھروں سے بھاگنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انہیں سامنے کی کھلی حقیقت نظر نہیں آتی۔ میں تمہیں بتاؤں تم مجھے آج انہی لڑکیوں کی قطار میں کھڑی نظر آ رہی ہو۔۔۔ اور تمہاری آنکھوں میں یہ جو بیزاری اور ناگواری ہے ناں، سراسر بغاوت ہے۔ میرے اندر پہلے حیرت تھی اور اب دکھ کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"
وہ کمرے سے نکل گئیں۔ انبساط کا چہرہ تپ رہا تھا۔ وہ ششدر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گہرے نیلے تھری پیس میں خوش رنگ ٹائی لگائے بال جیل سے جمائے وہ اتنا دلکش لگ رہا تھا کہ انبساط کن اکھیوں سے بھی نظر کرتی تو دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہو جاتیں۔ اس کی ہتھیلیوں میں بار بار پسینہ پھوٹ رہا۔ وہ اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرتی۔ پاپا اسے بر دکھوے کے لیے آنے والے لڑکے سے زیادہ ایک عام ملاقاتی سمجھ رہے تھے۔ ان کے انداز میں قطعیت اور روکھا پن تھا۔ وہ بیوروکریسی سے ریٹائر ہو چکے تھے مگر انداز ہنوز وہی تھا اور آج تو خاص طور پر اختیار کیا گیا تھا۔
ماما کا انداز نپا تلا تھا۔ بھائی نے خود کو نارمل ظاہر کیا۔

بھابھی کے چہرے پر اشتیاق تھا اور ہر گزرتے پل وہ تاثرین میں شامل ہو رہی تھیں۔ اس کی اردو ذرا سی جھجکتی ہوئی تھی مگر انگلش بولتا وہ بلاشبہ انگریز معلوم ہوتا۔ ماما کا اس دن کا جملہ انگاروں پر پیر رکھ دینے کی مصداق جلن دیتا رہا تھا اور وہ اس بات کے لیے انہیں کبھی معاف نہ کرنے کا عہد کیے بیٹھی تھی مگر اس وقت خود اپنے دل کی حالت اسے شرمندگی سے ہمکنار کر رہی تھی اتنی بھی کیا بے تابی، کیا بے چینی۔
ڈنر تک میر ذکاء کا سحر سب پر طاری ہو چکا تھا۔ لحہ بہ لحہ اس کا اعتماد بڑھتا جا رہا تھا۔ میر ذکاء اور سیاست۔ میر ڈراما اور شاعری۔ شیکسپیئر، پینٹنگ، تاریخ... بھابھی بڑا نے میں ماہر تھیں۔ انہوں نے بہت زیادہ تعریف کی اور بتایا۔
"اب چیلنج تو خیر نہیں کر رہا مگر میں شاید اس سے کی اچھا بناؤں۔" وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔
"واقعی؟" بھابھی کی آنکھیں پھیلیں۔ "تو آپ ولنٹ بھی کرتے ہیں؟"
"بالکل 'جیسا دیس ویسا بھیس۔"
"تو اس وقت آپ کی سرداری کہاں چلی جاتی ہے میر ذکاء!" ماما کا لہجہ کھوجتا ہوا تھا۔
"سرداری کو تو ہمیں ایئرپورٹ پر کسٹم والے روک لیتے ہیں اور اگر کبھی یہاں نظر انداز ہو بھی جائے تو وہاں سنھورو پر کڑی چیکنگ ہوتی ہے۔ ممنوعہ اشیا وہاں "روک لی جاتی ہیں۔ آپ لارڈ ہوں گے تو اپنے گھر میں۔۔۔"
وہ اپنی دلکش ہنسی ہنسا۔ بھیا اور بھابھی نے قہقہے کا ساتھ دیا۔ انبساط کا دل بلیوں اچھلا۔ پاپا کے تنے چہرے پر مسکراہٹ کا کوندا لپکا تھا۔ ہر گزرتا پل انبساط کے حق میں جا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، میر نمبر دیکھتے ہی الرٹ ہو گیا۔ اس نے اپنا چمچ پلیٹ میں رکھ دیا پھر معذرت کرتا کرسی کھسکا کر باہر نکلا۔
"یس بابا!" سب نے سنا، وہ اپنے والد سے مخاطب تھا۔ اگلے پل وہ اپنی قبائلی زبان میں بہت احترام سے سر جھکائے ہوئے گفتگو کر رہا تھا۔ اس کی جھجکتی اردو چہرے پر مسکراہٹ لائی تھی تو اس کی انگلش فخر میں مبتلا کرتی اور دوسرے پل غیر محسوس انداز میں احساس کمتری جگاتی تھی۔ زبان سے تو سب ناآشنا تھے مگر اس کا ہلتا سر اور چہرے کے فرماں بردار تاثرات اس کی مستقل "جی، جی" فاروق پیرزادہ نے ایک بے حد سرد نگاہ بیٹی پر ڈالی اور اپنے سامنے پڑی پلیٹ کھسکا دی۔

☼ ☼ ☼

ملاحت نے اس کی تیاری میں بھرپور مدد کی تھی۔ اسے ذہنی و جسمانی طور پر سجانے کی کوشش کی تھی۔ میر ذکاء اسے اپنی فیملی سے ملوانے لے جانے والا تھا۔ انبساط پیرزادہ نے اس بات کو چھپایا نہیں تھا مگر دل کے کسی کونے میں یہ خواہش ضرور تھی کہ پاپا بے خبر رہیں اور مما کو بھی پتا نہ چلے۔
انبساط نے دوپٹا پہلے سر پر ڈالا، پھر شانوں سے گزارا پھر فقط بائیں کندھے پر ٹکایا۔۔۔ مگر مطمئن تب بھی نہ ہوئی۔
"ساری دنیا جانتی ہے، میں دوپٹا لیتی ہی نہیں تو اب دکھاوا کیوں کروں؟" ملاحت کے دوپٹہ سوٹ پہننے کے مسلسل اصرار سے وہ چڑ کر بولی۔
"تم چھوڑو۔ مجھے تو یہ اچھا لگ رہا ہے۔ سفید کھلے پائنچوں کے ٹراؤزر کے ساتھ بہت کھلا ڈلا سفید، سیاہ اور سرخ پرنٹ کا کرتا۔"
"اور اس کا دوپٹا۔۔۔؟" ملاحت کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔
"نہیں ہے۔" انبساط نے ناک سکوڑی۔
"یار! وہ سب لوگ مجھے ہفتے میں پانچ دن ایسے ہی دیکھتے ہیں۔ میں ایسی ہی ہوں اور رہوں گی۔" وہ اپنی جگہ درست تھی۔
"اوہو تو پھر ایسے ہی رہو۔" ملاحت جل کر بولی۔ "دلہن جتنی مرضی ماڈرن ہو، شرارہ کے ساتھ بیک لیس بلاؤز پہنے یا سلیولیس، مگر سر پر دوپٹا ضرور ٹکاتی ہے، یہ روایت ہے۔ اب کل کو دلہن بنتے وقت کہہ دینا، میں کبھی دوپٹا لیتی نہیں۔" اس نے منہ بگاڑ کر نقل

اتاری۔"جس طرح تم اپنے گھر والوں سے ملواتے ہوئے تحفظات کا شکار تھیں یار! ہو سکتا ہے میر کے بھی کچھ پوائنٹس ہوں۔ انسان کی بچی بن کر جاؤ اور۔۔۔"

ملاحت نے بیڈ پر پڑے ڈھیر میں آخر کار کچھ برآمد کر ہی لیا۔ سیاہ و سفید اجرک "تم یہ لوگی اور بال نہ تو سارے باندھنا اور نہ کھولنا۔ بس یہ کلپ۔"

"او کے۔" اور پھر ان بہت سارے لوگوں کے درمیان نجانے کب اس نے غیر محسوس انداز میں اجرک کو سر پر ٹکا لیا تھا۔ مردوں کے رنگ گورے اور بال اور مونچھیں سیاہ۔ سفید لباس اور سر پر بہت بڑا پگڑ۔۔۔ انبساط پیرزادہ کی خود اعتمادی میں کمی آنا تو مشکل تھا لیکن وہ محفل کے ادب آداب دیکھ کر احترام کے مارے چپ سی تھی۔

میر کے دادا کے سامنے ایک تلوار اور بہت بڑی گن بڑی بے نیازی سے پڑی تھیں۔ عورتیں روایتی لباس میں تھیں۔ چادروں کی بکل پیشانی تک ڈھلکی ہوئی۔ ٹھوڑی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ بس ناک اور اوپری ہونٹ۔ وہ رشک و حسرت اور حیرت کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھتی جاتی تھیں۔ اس کا باپ کار ٹائرڈ بیوروکریٹ بھائی کا امریکن ایمبیسی کا افسر ہونا میر کے والد اور تایا کی آنکھیں چمک اٹھیں (مرا ہاتھی بھی۔۔۔)

"زیادہ نہیں بولنا۔ جواب بھی دینا ہو تو مختصر سے مختصر۔" میر ذکاء نے ہدایت دی۔

"مگر میر؟" وہ الجھی۔ "ساری دنیا جانتی ہے میں کتنا بولتی ہوں اور کیسا بولتی ہوں۔"

"ہاں! لیکن یہاں وہ دنیا نہیں ہے بس یہی دنیا ہے اور یہاں تمہارا بولنا اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔"

"میر۔۔۔!" وہ بمشکل اسے پکار سکی۔

"ریلیکس یار! ہمیں کون سا یہاں رہنا ہے۔" اس کی آنکھوں میں ٹھہرے تعجب نے اسے مڑنے پر مجبور کر دیا۔

"میں تو بس یہ کہہ رہا تھا یہاں، یہاں کے حساب سے رہو۔ کچھ باتیں کریں گے، لنچ اور بس۔۔۔ تمہارا دنیا میں ہوں اور میری دنیا یہ سب نہیں ہے۔"

وہ اپنی جگمگاتی آنکھیں اس کے چہرے پر جما کر بولا اور بہت نرمی سے اس کی ٹھوڑی چھوئی انبساط پیرزادہ پھونک گئی۔

یہاں سب عجیب تھا۔ اپنی تمام منفی سوچوں سے پہلو تہی کرتے کرتے بھی وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ وہاں عورتیں تھیں، بچے، بچیاں سب مگر اسے بار بار یہ کیوں لگ رہا تھا کہ وہ عورتیں وہاں اس لیے تھیں کہ خدا نے پیدا کر کے بھیج دیا تھا۔ سو اب انہیں دنیا میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی طرح تو رہنا ہے۔ شہنا بھابھی نے کہا تھا۔ "میر ذکاء بہت اچھا ہے۔ بہت اچھا رہے گا۔ اس کی مجبوری ہے، وہ اتنا اچھا نہ ہو تو اسے اتنی اچھی لڑکی کیسے ملے گی اور ان سرداروں کے بہت قصے ہوتے ہیں۔ انہیں بیوی کے روپ میں ایک بہت اچھی عورت چاہیے ہوتی ہے۔ خاندانی، پڑھی لکھی، باکردار، اولاد والی اور خاموش اور جب ایک عورت میں اتنی خوبیاں ہوں گی تو وہ چپ کیوں رہے گی؟ بولے گی مگر بولنے کی اجازت نہیں ملتی اور جو بلا اجازت بول پڑیں تو۔۔۔ بلا اجازت بولنے والے کو سزا تو مل سکتی ہے ناں۔"

"سالے صاحب نے واقعی بہت بڑا ہاتھ مارا ہے۔" اب پتا نہیں یہ جملہ تعریفی تھا یا اور خود کو بمشکل کمپوز کرتی انبساط اب مشکل میں پڑ گئی تھی۔ خود پر غصہ آرہا تھا۔

اسے دھیان کیوں نہ آیا کہ میر ذکاء کا یہ بہنوئی ممبر قومی اسمبلی میر شاذل ہے۔ وہ جو رقاصاؤں کے لہو و لعب میں ڈوب کر ہر شے کو فراموش کر دیتا ہے۔ جو دنیا میں فقط عیاشی کے لیے آیا ہے۔ کھانے کی عیاشی، پینے کی عیاشی، سونے جاگنے کی۔

"ہمارے چھوٹے چچا میر امداد کی بیٹی کے شوہر ہوتے ہیں یہ۔ شاید تمہیں خبر ہو، انہیں ان کی بیگم سمیت مروا دیا گیا تھا۔ تقریباً" پینتیس سال پرانی بات

ہے۔" انبساط سر ہلا کر رہ گئی۔

"سکینہ ہماری بہن ہے اور یہ ہمارے پھوپھی زاد۔۔۔ یہ ایسے ہی ہیں۔ عادتوں سے تو دنیا واقف ہے مگر ہماری مجبوری ہے یار۔۔۔! پانچ بیٹیاں ہیں اس کی۔۔۔ ان ابنارمل ہیں اسے وارث کی خواہش ہے مگر اس کی بہن میری بھابھیاں ہیں۔ دوسری شادی کا مطالبہ غلط بھی نہیں مگر سکینہ بہت واویلا کرتی ہے۔۔۔ سردار عطاء اور سردار ثنا دونوں کا بہت پیار ہے سکینہ سے۔۔۔ سکینہ کے اس ڈر کو دیکھتے ہوئے وہ بھابھیوں کو یاد دلاتے رہتے ہیں کہ اپنے بھائی کو سنبھال کر رکھیں ورنہ دوسری لانے کا کسے شوق نہیں۔"

میر ذکاء بہت دردمندی سے بہن سے محبت جتا رہا تھا۔

"تو کیا تم بھی دوسری لاؤ گے؟" اس کا سوال تاسف سے نہیں، حیرت سے لبریز تھا۔

"عورت تم جیسی بھرپور ہو تو۔۔۔ مرد ایک پر گزارا کر ہی لیتا ہے۔" اس کی تعریف کرتا شریر، گمبھیر لہجہ۔۔۔ انبساط کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ظہر کی اذان پر مرد نماز پڑھنے چلے گئے تو میر ذکاء انبساط کو اندرونی مہمان خانے میں کچھ دیر آرام کی خاطر چھوڑنے آیا تھا۔ لنچ دو بجے ہونا تھا۔ وہ اس کا گال تھپتھپا کر نکل گیا۔ انبساط نے اجرک اتار کر پھینکنی چاہی۔ وہ کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ اسی پل سکینہ اپنی بچیوں کے ہمراہ اندر آگئی۔

ساتھ میں ذکاء کی تین بھابھیاں تھیں۔ پتا نہیں کون سی شاذل کی بہنیں تھیں۔ انبساط بدقت مسکرائی۔

"لیٹی رہو۔ آرام کرو۔ نماز تو پڑھتی ہو گی تو ہمارے ساتھ آجاؤ۔"

"جی جی بالکل!" وہ سیدھی ہوئی۔

"نہیں، بیٹھو! ابھی سونہل بلائے گی۔ اماں کے ساتھ سب کھڑی ہوں گی۔" انبساط نے بچیوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پل بھر میں پہچان گئی تھی۔ ان تین بچیوں کو جو ابنارمل تھیں۔

"انہیں کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟" اب وہ کیا بات کرتی بھلا۔ "کیوں ہو گئی ہیں ایسی؟"

"وہ جو کہتے ہیں، جب خاندان میں زیادہ شادیاں کریں تو ہو جاتی ہے یہ بیماری، وہی ہوئی ہے۔" عمر میں شاید انبساط کے برابر مگر حلیے سے بہت مختلف۔ بہت قیمتی جوڑے اور خوب سونے سے سجی پتا نہیں وہ کون سی بھابھی تھی۔ جو بہت کھوجتی، کینہ پرور نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"تم نے کچھ پہنا نہیں پہلی بار سسرال آرہی تھیں؟" اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

"میں ایسے ہی رہتی ہوں۔"

"ہاں، پر میر کی گھر والی بن کر تو ایسے رہنا ہو گا جیسے میں رہتی ہوں۔" اس نے دوپٹا سینے کے پاس سے کھول کر اور کچھ گھوم کر دکھایا۔ "اور وہ بھی اس صورت میں جو بیٹوں کی ماں ہو تو۔"

اب اس کی نگاہ عطاء کی بیوی اور سکینہ پر تھی۔ سکینہ جیسے ڈھے گئی۔ انبساط کے موبائل پر بیل ہوئی۔ اس نے معذرت خواہانہ نگاہوں سے حاضرین کو دیکھا اور بہت تیزی سے موبائل چیک کیا۔ ملاحت اور بھابھی کو اس نے بہت تیزی سے جوابی میسج کیے۔

"کون ہے؟"

"سہیلی اور بھابھی تھیں۔"

"تو تم فون رکھتی ہو اور بھابھی بھی۔۔۔" یہ ثنا کی بیوی تھی۔

"جی گزارا ہی نہیں ہوتا اب اس کے بغیر۔"

"یہاں فون نہیں رکھ سکو گی۔ عورتوں کے پاس بھلا فون کا کیا کام۔"

"جی۔۔۔!" اس کے حلق سے بس یہی نکل سکا۔

"تمہارے خاندان میں تمہارے جوڑ کا کوئی نہیں تھا جو۔۔۔" ثنا کی بیوی نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"جوڑ۔۔۔ مطلب؟ او آئی سی، آئی تھنک ہوں گے یا معلوم نہیں۔۔۔ مگر شادی تو پسند سے کی جاتی ہے، میچ کر کے، زبردستی کا سودا تھوڑا ہی ہے۔"

"یہاں ایسا نہیں ہے۔ عورتیں تو مظلوم ہوتی ہی

ہیں، مرد بھی مظلوم ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بڑوں کے فیصلے کے آگے سر نہیں اٹھاتا۔ اب جیسے میرا بھائی شاذل ..... اتنا جوان، اتنا خوب صورت، دولت کا بھی کیا حساب، جانشین ہے، مگر بڑے بابا نے پہلے ہی کہہ دیا تھا ہمارے بابا سے اگر بیٹا ہوا تو سکینہ کے لیے ہو گا۔ یہ بڑی ہے ناں میرے بھائی سے۔ چلو خیر ٹھیک ہے کوئی بات نہیں مگر دیکھو اس کی طرف۔ تھکی ہوئی عورت ہے پھر اولاد بھی ستھری نہ دی، بیٹیاں وہ بھی پاگل ..... ڈاکٹر صاف کہتی ہے۔ آگے بھی بچے پاگل ہو سکتے ہیں۔ اب وہ بیچارہ ہماری وجہ سے مجبور۔ یہ روتے ہوئے بھائیوں کے پیچھے آتی ہے اور ہمارے شوہر بھی جیسے شاذل کی بے بسی کا مزا لیتے ہیں۔ میری تو خیر ہے تین بیٹے ایک بیٹی ..... مگر اس چھوٹی زینت ..... عطاء کی بیوی کی تین بیٹیاں ہیں، آگے بچے پیدا نہیں ہو سکتے۔ ادھر شاذل دوسری کرے تو عطاء اگلا منٹ نہ لگائے اور پھر۔"

عصمت کو ابھی کچھ اور کہنا تھا مگر سکینہ بل کھائی ناگن کی طرح پلٹی تھی۔

"اتنا بھی دودھ کا دھلا نہیں آپ کا بھائی، سارے کام پورے ہیں اس کے اور ....."

"ہاں تو کیوں نہ کرے۔ جوان مرد ہے۔ گھر میں مدن سی عورت ہو گی تو..... لاکھ نہ کرنے دیں تمہارے بھائی اسے حق بات ..... سکھ تو تمہیں بھی کب ہے؟ بھائی گھر آتے ہیں تو بہنیں خوشی مناتی ہیں، پر اسے یہاں دیکھو تو دل جلتا ہے ..... باہر وہ کم از کم خوش تو رہتا ہے۔"

"میں ..... میں بتاتی ہوں ابھی بھائیوں کو۔" وہ دیوانوں کی طرح باہر کو لپکنے لگی تو ثنا کی بیوی نے پکڑ لیا اور اپنی بولی میں سمجھانے لگی۔

زینت اور عصمت انبساط کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"کیا ہم غلط کہہ رہی ہیں۔ بہن، بہن کا تو نام ہے خالی، کون سی سگی ہے، میرے چچا کی بیٹی۔ یہ سب تو چاہیں گے ہمارا بھائی بغیر وارث مرے تو پہلے چاچا کا سارا نام ان کے قبضے میں پھر پھوپھی کا بھی ..... مگر ہم اتنی آسانی سے ہار نہیں مانیں گی۔ تم کہو کیا غلط ہے؟"

انبساط کا دماغ جیسے سن ہو رہا تھا۔ وہ حق دق تھی۔

"تندرست اولاد کے لیے تو شادی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ بیٹا، بیٹی تو خیر برابر ہوتے ہیں مگر خدا کا شکر ہے دو بچیاں ٹھیک ہیں ناں۔" وہ اب کیا کہتی ہیں۔

"یہی تو ہم کہتے ہیں۔" دونوں نے "وہ مارا" انداز میں ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

نماز کے بعد کھانا لگا دیا گیا۔

"ویسے تو مردانہ زنانہ الگ ہوتا ہے مگر یہاں کراچی آ کر ہم تھوڑا بہت نرم پڑ جاتے ہیں اور ویسے بھی تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہیں زنانے تک محدود رہتا مگر....."

ذکاء نے دھیرے سے جیسے اس کی اہمیت جتائی۔ انبساط پیرزادہ مسکرا نہ سکی وہ دھیرے دھیرے گھبرا رہی تھی۔ بہت بڑے ڈائننگ ہال کے سائیڈ پر چھ کرسیاں اور گول میز تھی۔ سکینہ اور متعدد ملازمائیں بچیوں کو کھانا کھلانے میں بے حال ہو رہی تھیں۔ شیشے کی بہت بڑی دیوار سے بہت دور سیاہ گیٹ دکھائی دیتا تھا جس کے اوپر مورچہ تھا اور بہت کرخت بے تاثر چہرے اور سرد نگاہوں والے گن مین تعینات تھے۔

"بابا! بی اے پاس تو ہو ناں؟" بڑے سردار نے اس سے پہلا جملہ کہا تھا۔ اس نے نا سمجھی کے عالم میں سر ہلا دیا۔ مردوں کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی عورتوں کے سر اور جھک گئے البتہ سردار شاذل کا قہقہہ بہت بلند تھا۔ یہ سراسر بد تمیزی تھی مگر پروا کسے؟ بھلے سے اس کی دو بہنیں سرداروں کی بیویاں تھیں تو ہوا کریں۔ سرداروں کے خاندان کی اکلوتی بیٹی اس کی بیوی تھی۔

"بہت خوب ..... بہت خوب!" سردار شاذل نے میرزکاء کے والد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "سرداری تو مار دھاڑ کر کے جائز ناجائز حاصل کر لی مگر ماں گئے سردار کی عقل کے جنہیں اپنی سیٹ پر بار بار ہو کو جتوانا ہو گا۔ خوب۔ بہت خوب!"

ناگواری کی لہر ہر جگہ دوڑ گئی۔ بڑے سردار او

چاروں کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات اتنے سرد تھے کہ انبساط کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ وہ میرزکاء کی ہدایت کے خلاف سب کے چہرے پڑھنے لگی۔

"خوش قسمت ہے لاڈلا بیٹا میرزکاء۔ شکر ہے پورے قبیلے میں کوئی چھوٹی بڑی اس کے لیے سنبھال کر نہیں رکھی گئی۔ باہر کے عیش بھی اور تعلیم و تہذیب کا ٹھپہ بھی ..... اور بیوی بھی من پسند۔ آج سامنے آئی بیٹھی ہے۔ جو کبھی نہ ہوا، وہ ہو رہا ہے تو ہمیں بھی اچھی امید رکھنی چاہیے، کیوں؟"

وہ ذکاء کو دیکھنے کے بعد اب بہت بد تمیزی سے سردار عطاء اور سردار ثناء کو دیکھ رہا تھا۔

"اور ہم تو شکر ادا کرتے ہیں کہ یہ یہیں کی ہے اجرک سر پر ڈالے بیٹھی ہے۔ اگر جو لے آتا کوئی میم ..... تو واہ ..... ویسے میم ہوتی کیسی ہے تم نے کبھی بتایا ہیں ..... وقت واقعی بدل رہا ہے۔ ورنہ یہ عورتیں کب اس طرح ایک ٹیبل پر بلکہ مردوں کے ساتھ کھانا کھا سکتی تھیں۔ آپ کی آمد تبدیلی لا رہی ہے۔ کیا ہم بھی اپنی زندگی میں کسی تبدیلی کی امید رکھیں؟"

وہ براہ راست انبساط سے مخاطب ہوا۔ انبساط نے چچ چھوڑ دیا۔ اسے رگ و پے میں بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ یہاں کے کلچر سے ناواقف تھی، مگر اسے بد تمیزی کا باقاعدہ احساس ہو رہا تھا۔ اس نے پانی کا گھونٹ حلق سے اتار کر جیسے اپنا سانس بحال کیا تھا۔

"آپ ہماری آپس کی تو تکار سے نہ گھبرانا۔ یہ مرد عورت کو عورت سے لڑوا دیتے ہیں جان بوجھ کر کہ ہم اپنے اندر کا غصہ، بے بسی، بے چارگی ایک دوسرے پر نکال کر خود ہی ٹھنڈی ہوتی رہیں۔ گرم ہوتی رہیں۔ آپ مجھے سنیں گی تو میں مظلوم لگوں گی۔ ان کی سنیں گی تو وہ بھی سچی لگیں گی۔ آپ تو بہت پڑھی لکھی ہیں، ساری دنیا گھومی ہیں، مگر میں بتاؤں عورت حق ملکیت کی چیز ہے۔ گھر بناؤ تو دروازے، کھڑکیاں، پنکھے سب لگاؤ تو ایک عورت بھی رکھ دو کسی کونے میں۔ کسی بھی روپ میں، ماں، بہن، بیوی، بیٹی جیسے مرضی بلکہ سجاوٹ سے بھی ہٹا دو۔ دروازے کھڑکیاں تو مرمت مانگتے ہیں۔ بدل دیے جاتے ہیں۔ عورت سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے، نہ رنگ بدلو نہ مرمت کرواؤ ..... دروازہ چوں کرتا ہے، یہ وہ بھی نہیں کرتی۔"

ثنا کی بارہ جماعت پاس بیوی جو بہت مغرور سی تھی سکینہ کے ساتھ مل کر بول رہی تھی۔

"مجھے حیرت ہے آپ پر۔ آپ کو تو بہت اچھے لوگ مل سکتے تھے۔ یہ سکینہ باجی پاس بیٹھی ہیں۔ ان سے ڈر کر نہیں کہہ رہی۔ میرزکاء بہت اچھا ہے۔ بہت پیارا مگر وہ سردار ہے۔ وہ ننانوے قدم آپ کی مرضی سے چلے گا، مگر سوواں اس کا اور جب ننانوے قدم ہاتھ میں ہاتھ پکڑ کے پورے کیے ہوئے تو سوویں قدم پر ہاتھ چھوڑا نہیں جا سکتا۔"

انبساط پیرزادہ ششدر رہ گئی۔ ایک بہت ہی روایتی حلیے میں، جاہل دکھنے والی عورت اور اس کا تجزیہ.....

"عورت پیر کی جوتی ہے بس۔" سکینہ بولی تھی اور یہی تو ملاحت اور ماما کہہ رہی تھیں۔

اور صرف یہاں نہیں، ہر جگہ، ہر کلچر میں، ہر معاشرے میں، ہر نظام میں ..... اور وہاں موجود سردار شاذل، وہ سب کو مخاطب کر کے انہیں یاد کروا رہا تھا۔ "عورت پیر کی جوتی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ ہمارے بڑوں نے ہمیں ہمیشہ یہی بتایا ہے۔ سردار صاحب بلکہ آپ تو خود یہی کہتے رہے ہیں، آج جوتی کے پاس بی اے کی ڈگری پوچھ رہے ہیں۔ ڈگری جو مرضی لگ جائے۔ جوتی، جوتی رہتی ہے، سر پر سجائی نہیں جا سکتی۔ آج آپ کا اپنا پوتا جوتی سر پر سجانے لگا ہے۔ مانا اچھی برانڈ کی ہے، پائیدار ہو گی۔ اسٹائلش تو خیر نظر آ ہی رہی ہے ہاہاہا۔"

"سردار شاذل! اب کافی ہو گیا۔" سردار عطاء ہی ٹوک سکتا تھا۔ وہ شاذل کی بہن زینت جو مزید بچے پیدا نہیں کر سکتی، کا شوہر تھا۔

سردار شاذل ڈائننگ ٹیبل پر کہنیاں ٹکا کر آگے ہوا، سردار عطاء کی آنکھوں میں جھانکا اور ایک بار پھر اس کی ہنسی شروع ہو گئی۔ انبساط نے سرداروں کی سرد

آنکھیں اور بھینچے جبڑے بغور دیکھے۔ اس نے عورتوں کی خوف سے بھری آنکھیں اور ہونٹوں کا لرزنا دیکھا ..... سب لوگ کھانا چھوڑ کر اب صرف سردار شاذل کے ڈرامے کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ آنکھوں میں غصہ، بے بسی اور ضبط تھا کچھ خوف زدہ.....

"سردار کے پگ میں یاقوت جڑا تو ہمیشہ دیکھا تھا۔ اب جوتی بھی دیکھیں گے، واہ، ہاہا۔"

محبت برداشت کرنا سکھاتی ہے۔ بے خوف کرتی ہے۔ خوف زدہ بھی کردیتی ہے۔ نئے راستے دکھاتی ہے محبت آتش فشاں کے دہانے پر لگا خوش رنگ پھول ہے مگر اسے توڑتے وقت آپ اس کے اندر گر کے بھسم بھی ہو سکتے ہیں محبت تب ہی باوقار لگتی ہے جب عزت کے ساتھ پیش کی جائے۔ جس میں عزت نہیں، وہ ہوس ہوتی ہے اور اگر زندگی کبھی اس مقام پر لے آتی، جہاں (جیسے کہ آج .....) دولت شہرت، محبت اور عزت میں سے بس ایک چیز کو اٹھانا پڑتا تو؟

وہ انبساط پیرزادہ تھی۔

"ایکسکیوزمی.....!" اس نے براہ راست سردار شاذل کو مخاطب کیا۔ "آپ صحیح کہہ رہے ہیں عورت پیر کی جوتی ہے، جب تنگ کرے تو اتار کر نئی پہن لو..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، عورت واقعی پاؤں کی جوتی ہے، مگر آپ کی اطلاع کے لیے ضروری ہے، گزارا نہیں ہے ہمیں اس کے بغیر۔"

میرزکاء کھنکارا مگر انبساط پیرزادہ اب سب بھول گئی تھی۔ کوئی آواز کوئی تنبیہہ حتیٰ کہ میرزکاء کو بھی۔

"آپ کتنے اچھے لگ رہے ہیں اس وقت، مکمل۔ یہ خوب صورت سا سفید کلف لگا نیا سوٹ..... یہ بہت بڑی اونچی پگڑی جس میں یاقوت لگا ہے۔ یہ شیشوں بھری شال..... یہ سونے کی گھڑی یہ انگوٹھی۔ اور ایسے میں سردار صاحب! پاؤں سے ننگے؟ تصور کی آنکھ سے خود کو دیکھیں..... دیکھیں، ..... سب کچھ قیمتی ہوگا، مکمل ہوگا مگر گھر سے نکلنے کے قابل نہیں ہوں گے سردار صاحب! جوتی تو بہرحال لانی پڑے گی۔ صرف آپ کو نہیں، ساری دنیا کے مردوں کو۔"

انبساط پیرزادہ کا لہجہ طنز سے لبریز تھا، مگر نہیں اس میں دکھ تھا، اس میں ماتم تھا۔ اس میں خود پر ملامت تھی۔ اپنی ناسمجھی پر کف افسوس ملتی خود اپنے آپ سے شرمندہ..... وہ یکدم سر پر پڑی اجرک کو جماتی کھڑی ہو گئی۔

"سر پر بے شک نہ سجائیں۔ پیر میں ہی رکھیں مگر رکھنی پڑتی ہے۔"

پتا نہیں کون سے دکھ نے آواز میں لڑکھڑاہٹ پیدا کردی تھی۔

بے حد طویل راستے میں میرزکاء نے اسے کئی بار مخاطب کرنے کا سوچا، مگر اس کے چہرے کے پتھریلے تاثرات..... وہ جملے بناتا اور کاٹتا رہا۔

"بس یہیں روک دیں۔" اس نے اپنے گھر کے سفید و سنہری دروازے کو دیکھ کر طمانیت کا سانس لیا۔ وہ گاڑی سے اتری تو لڑکھڑا گئی۔ میرزکا بہت تیزی سے سنبھالنے کو آگے آیا۔ مگر وہ سنبھل چکی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

"بہت اندھیرے سے اچانک روشنی میں آئیں تو نظریں مانوس ہونے میں کچھ وقت لیتی ہی ہیں۔"

یہ اس کا جواب تھا۔ سردار میرزکاء چونک گیا۔

"وہ..... وہ سب ان کے اندر کا زہر تھا..... شاید حسد ..... میں مانتا ہوں..... انہوں نے بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا مگر..... میں ویسا نہیں ہوں انبساط پیرزادہ! میں تمہارا ساتھ چاہتا ہوں۔"

اس نے اپنی خوب صورت آواز سحر انگیز آنکھوں اور دلنشیں لہجے کا سہارا لے کر انگریزی میں التجا کی۔

"پلیز کچھ کہو۔" وہ اپنے پس منظر سے ہٹ کر کتنا بے ضرر لگ رہا تھا۔ مگر بیل پر لگا ننھا سا پیلا پھول کتنا بے ضرر، دلنشین نرم اور خوب صورت لگتا ہے مگر بڑا ہونے پر روپ بدل کر اسے کریلا ہی بن جانا ہوتا ہے۔

"آئی ایم سوری میر!" اس کی آنکھوں میں انکار تھا، پھر اس کا سر بھی نفی میں ہلنے لگا۔ اس نے اپنے ہونٹ کچل ڈالے اور کھلے دروازے سے بھاگتی اندر غائب ہو گئی۔

مہوش مغل

جاں دے جانا رے

مکمل ناول
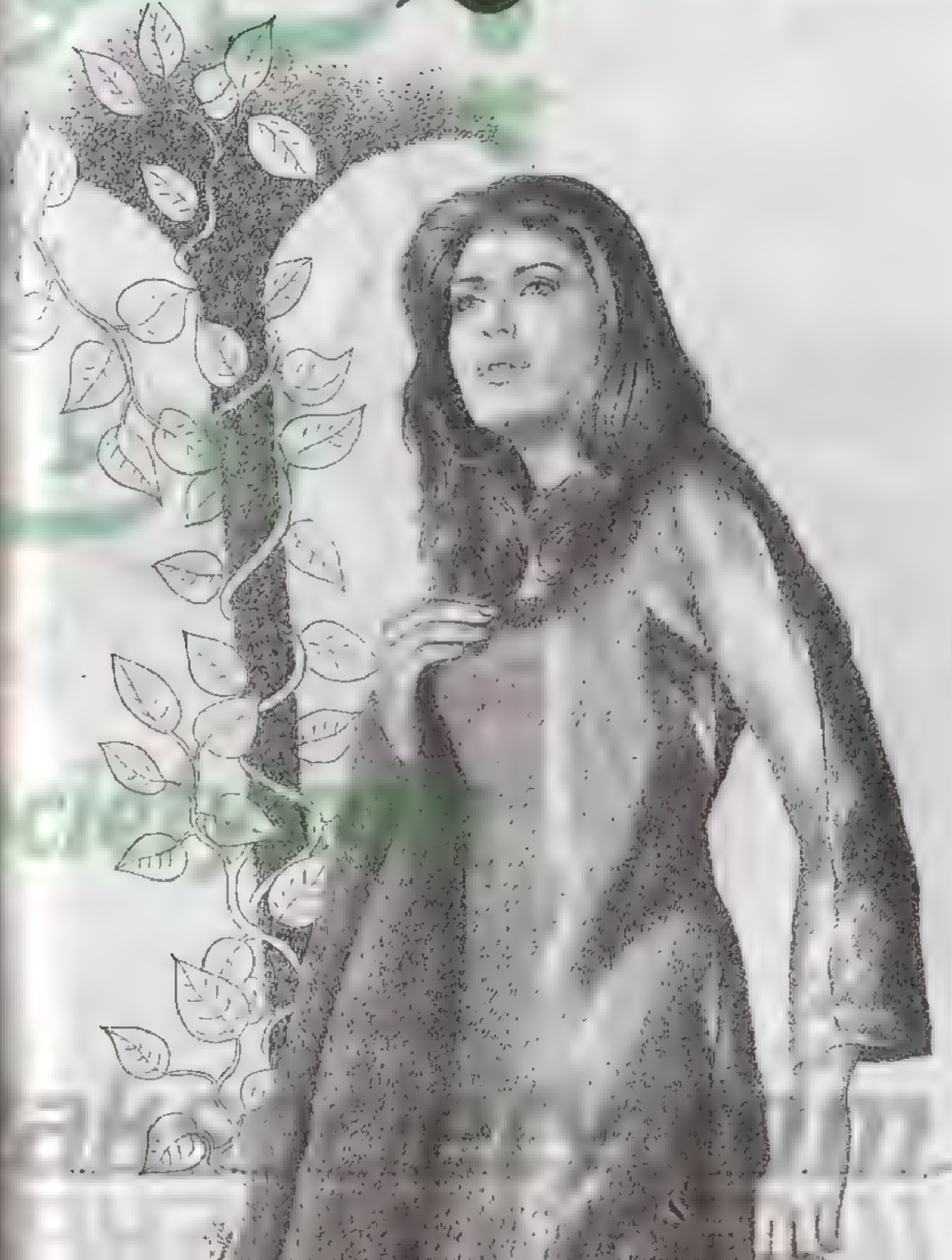
زندگی ایک تلخ حقیقت ہے کہ نہ تو ہم اسے شروع کرنے پر قادر ہیں اور نہ ہی ختم کرنے پر۔

آج وہ بھی اسی تلخ حقیقت کا سامنا کرنے پر مجبور تھی۔ اسے زندگی کو جینا تھا اپنے لیے نہ سہی مگر خود سے جڑے ان رشتوں کے لیے جو اس کی کل متاع تھے۔ امی، بابا اور غیراث اس کا اکلوتا اور لاڈلا بھائی اور سب سے بڑھ کر وہ اس ظالم شخص کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ ایک اس کے چلے جانے سے اس کی زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ اس کم ظرف انسان کے بغیر بھی جی سکتی ہے۔

کاش نعمان احمد! تم میری زندگی میں نہ آئے ہوتے اور اگر آ ہی گئے تھے تو میری زندگی میں وہ مقام نہ رکھتے جس کے تم قابل نہیں تھے۔"

ڈائیوو چلنے میں ابھی کچھ وقت تھا سو وہ اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ تمام سواریاں اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئی تھیں مگر اس کے ساتھ والی سیٹ ابھی تک خالی تھی شاید کسی کا جانے کا ارادہ ملتوی ہو گیا تھا وہ خود بھی تو واپس نہیں جانا چاہتی تھی اس شہر میں جو اس کا اصل تھا۔ اس گھر میں جہاں اس کے گھر والے شدت سے اس کا انتظار کرتے تھے۔ ہر بار لاہور سے اسلام آباد واپسی کا سفر وہ بڑے جوش و خروش سے کرتی تھی مگر اس بار وہ وہاں جانے پر عجیب سا محسوس کر رہی تھی جیسے وہاں موجود ہر چہرے پر اس کے لیے ہمدردی ہو گی۔

"ہیلو!" اچانک کوئی اس کے برابر والی سیٹ سنبھال کر اس کے سامنے ہاتھ ہلا رہا تھا۔

"ہائے!" اپنے برابر ایک لڑکے کو دیکھا تو اسے کوفت ہوئی۔ اس کو سرسری سا جواب دے کر وہ پھر سے باہر دیکھنے لگی۔

"آپ اسلام آباد جا رہی ہیں؟" وہ پھر مخاطب ہوا۔

"جی!"

"میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ دراصل یہ میرا پبلک ٹرانسپورٹ سے پہلا سفر ہے۔ اس لیے تھوڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔" وہ بھول گیا تھا کہ وہ اس کے لیے اجنبی ہے مگر وہ تو جانتی تھی سو خاموش رہی۔

"مجھے عباد کہتے ہیں عباد منصور اور آپ؟" شاباش تھی اس کے اخلاق کو اتنی سرد مہری کے باوجود تعارف چاہ رہا تھا۔

"عزیزہ رحمٰن۔" نام بتا کر وہ پھر باہر دیکھنے لگی۔

"کہیں جا رہی ہیں یا کہیں سے آ رہی ہیں؟" اس

نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔
"میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔ پڑھتی تھی یہاں۔" پھر نپا تلا جواب۔
"تھی کیا مطلب؟ اب نہیں پڑھتیں؟" اسے زیادہ بولنے کی عادت تھی۔
"نہیں۔ پڑھائی مکمل ہو گئی ہے۔" عجیب شخص تھا اسے فرق ہی نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ کتنے اکھڑپن سے جواب دے رہی تھی۔
"بھئی پڑھائی تو کبھی بھی مکمل نہیں ہوتی' اتنی فیلڈز ہیں کہ عمر ختم ہو سکتی ہے۔ پڑھائی نہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔"
"ایکسکیوزمی۔"
"ارے ابھی تو ہم ملے ہیں۔ آپ نے ایسا کیا کر دیا کہ ایکسکیوز کر رہی ہیں؟" اس نے بات کاٹ کر کہا۔
"اے مسٹر! آپ کچھ زیادہ ہی فاسٹ ہیں۔ اگر آپ کو بولنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنی سیٹ تبدیل کرا لیں۔" کہیں کا غصہ کہیں نکل گیا اور وہ بے چارہ اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا۔
"دیکھیے میڈم! پیچھے صرف ایک ہی سیٹ خالی ہے اور اس کے ساتھ والی آنٹی شکل سے ہی باتونی لگ رہی ہیں مجھے زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے۔"
اپنی مجبوری بیان کر کے وہ اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا اور وہ اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو "آپ کم بولتے ہیں؟
"ویسے آپ اتنا کم کیوں بولتی ہیں؟" اب کی بار موضوع اسے بنایا گیا۔ وہ خاموش رہی۔
"بلکہ یہ بتائیے کہ آپ اتنا غصے میں کیوں بولتی ہیں؟" وہ پھر خاموش رہی۔
"بھئی! میں تو اتنی دیر خاموش رہوں میری پسلی میرے تو منہ میں درد شروع ہو جاتا ہے۔" وہ ہنس پڑا مگر اس بار عزیزہ نے بھی ہنسنے میں اس کا ساتھ دیا تھا۔
"ارے آپ تو ہنستی بھی ہیں۔" اس نے چونکنے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔
"کیا کرتے ہیں آپ؟" وہ واقعی اس کی باتوں سے محظوظ ہو رہی تھی سو سرد مہری کا لبادہ ہٹا دیا۔
"شکر ہے' آپ کو بھی میرے بارے میں پوچھنے کا خیال آیا۔ ویسے میں نے ACCA کیا ہے لیکن جاب نہیں کرتا۔ پاپا کا بزنس دیکھتا ہوں۔" اس نے تفصیلاً بتایا۔
"دراصل آج میں نے فلائٹ مس کر دی۔ میری کزن ہوتی ہیں اسلام آباد میں ان ہی کو لینے جا رہا ہوں"
یہ پیاری سی لڑکی اسے بات کرنے پر مجبور کر رہی تھی اور عباد منصور اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں دیکھتا بولتا جا رہا تھا۔
"آپ کی آنکھیں بہت پیاری ہیں۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔
"مجھے تمہاری آنکھوں کا رنگ بالکل پسند نہیں ہے۔ ہر بندہ گھور گھور کر دیکھنے لگتا ہے۔"
کوئی عکس اس کے سامنے لہرایا۔ یہ بات پہلی بار عباد نے تو نہ کہی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر ہر کوئی ان کی خوب صورتی کا معترف ہو جاتا تھا۔ بس وہی ایک شخص تھا جو ہمیشہ ہر چیز کا مخالف ہوتا۔
عزیزہ نے کچھ بھی کہے بنا آنکھیں موند لیں۔ ماضی ایک فلم کی طرح اس کے دماغ کے کینوس پر بکھرنے لگا اور عباد منصور اس کی آنکھ کے کنارے سے نکلتے موتی دیکھ کر اپنی بات پر غور کرنے لگا۔
خوشی ہر لمحہ ان کے آنگن میں مہکتی تھی۔ ہر دل خوش' ہر کوئی مطمئن' نہ کوئی فکر' نہ زیادہ کی ہوس سب بس ایک دوسرے کے ساتھ خوش تھے۔
وہ اور عیرات... امی اور بابا کی کل کائنات تھے۔
بڑے تایا ابو کے ایک ہی بیٹے تھے نعمان احمد۔
میڈیکل فورتھ ایر کے اسٹوڈنٹ' اپنی دنیا میں مگن' وہ گھر سے زیادہ باہر دوستوں میں رہنا پسند کرتے تھے گھر کا پہلا بیٹا ہونے کی وجہ سے انہیں کافی رعایتیں ملی ہوئی تھیں اور وہ ان کا فائدہ بھی خوب اٹھاتے تھے۔

چھوٹے تایا ابو کے تین بچے تھے مہک' اسد اور فاریہ چلبلے' نٹ کھٹ اور زندہ دل' یہ سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے' ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے تھے' یہ رونق مزید دوبالا ہو جاتی جب شگفتہ پھپھو اپنے چاروں بچوں کے ساتھ آ جاتیں۔
ایک ایسی ہی ہنستی مسکراتی شام اس آنگن میں اتری تھی' جب پھپھو نے عزیزہ کے بابا سے اس کا ہاتھ اپنے بڑے بیٹے حماد کے لیے مانگا۔ یہ مدعا اتنی اچانک بیان کیا گیا تھا کہ سب حیران رہ گئے بظاہر اس رشتے میں کوئی خامی نہ تھی۔ حماد ڈاکٹر تھا' اچھی پوسٹ پر تھا' برخوش شکل تھا' لیکن اس پر اعتراض کرنے والا وہ شخص تھا جس نے کبھی گھر کے کسی معاملے میں دلچسپی نہ لی تھی۔ نعمان احمد کے اعتراض نے جہاں سب کو چونکا دیا' وہیں پریشان بھی کر دیا۔
دونوں ہی گھر کے بچے تھے۔ دونوں ہی سگے رشتے تھے لیکن پھر شگفتہ پھپھو نے بنا کسی حیل و حجت کے مہک کے لیے دامن دراز کر دیا کہ ان کے لیے مہک اور عزیزہ میں کوئی فرق نہ تھا۔ ویسے بھی عزیزہ مہک سے ایک ماہ بڑی تھی۔ اسی لیے انہوں نے اس کا نام لیا تھا۔ فیصلہ خود بخود نعمان کے حق میں ہو گیا۔ عزیزہ کو تو اس وقت علم ہوا جب وہ اپنے دوسرے سمسٹر کے امتحانات سے فارغ ہو کر گھر آئی اور "نومی بھائی" کی رٹ لگاتے اسے کسی کام کا کہنے اس کے کمرے میں گئی۔
"یہ کیا نومی بھائی نومی بھائی لگا رکھا ہے؟ میرا نام نعمان ہے۔" اسے غصہ آ گیا۔
"تو اب اتنا لمبا نعمان بھائی کہوں؟"
"تو کون کہہ رہا ہے بھائی کا صیغہ لگانے کو؟ بس نعمان کہہ لیا کرو۔"
عزیزہ نے اسے ان نگاہوں سے دیکھا جیسے اس کی عقل پر شبہ ہو۔
"وہ جوتے لگائیں گی امی مجھے ہر دفعہ ایسا کہنے پر۔ پھر آپ نہیں آئیں گے مجھے بچانے۔"
"اب کچھ نہیں کہیں گی۔ کہہ کر دیکھ لو۔" وہ اس کی بے خبری سے لاعلم تھا۔
"کیوں اب میں آپ سے بڑی ہو گئی ہوں؟" وہ اس "اب" کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھی۔
"بے وقوف لڑکی! تمہیں واقعی کچھ نہیں پتا؟" وہ حیران ہوا۔
"کیا؟"
"جا کر امی سے پوچھو اور تمہاری اس بے خبری کو دیکھ کر لگتا ہے' میں اپنے اس فیصلے پر ایک دفعہ نظرثانی کر لوں۔" وہ دوبارہ کتاب کھول کر بیٹھ گیا اور وہ پل میں غائب۔
"کیا میرا یہ فیصلہ ٹھیک ہے؟ میں نے جذبات میں آ کر تو یہ قدم نہیں اٹھا لیا یا یہ صرف اس کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کا ایک سہارا' ایک بہانہ ہے۔" وہ اپنی سوچ پر خود ہی حیران تھا۔
یہ لڑکی جسے اپنی ہی زندگی کے بارے میں ہونے والے اتنے بڑے فیصلے کی خبر نہیں۔ مجھ جیسے اپ ٹو ڈیٹ بندے کے ساتھ چل سکے گی؟ لیکن اس کی سوچ اس تک ہی رہی اور ان دونوں کی منگنی ہو گئی اور ساتھ مہک اور حماد کی بھی۔
عزیزہ اگر خوش نہیں تھی تو ناخوش بھی نہ تھی۔ اسے زیادہ ہنسنے بولنے والے پسند تھے جبکہ نعمان کافی لیے دیے رہتا تھا۔ خصوصاً" گھر والوں کے ساتھ۔ ان دونوں کی پسند ناپسند ایک دوسرے سے قطعاً" مختلف تھی مگر وہ بڑوں کا فیصلہ سمجھ کر مطمئن تھی۔
اور یہ اس کے فائنل سمسٹر سے کچھ روز پہلے کی بات تھی۔ امی نے اسے روتے ہوئے فون پر بتایا کہ نعمان نے منگنی توڑ دی ہے یہ کہہ کر کہ عزیزہ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی۔ وہ آج کل کی لڑکیوں کی طرح اپ ٹو ڈیٹ اور فیشن ایبل نہیں ہے۔
یہ ہے... وہ ہے۔
کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹا تھا۔ بس ایک نازک سا دل ٹوٹ گیا۔ اپنی محبت کے لیے نہیں

بلکہ اس محبت کے لیے جو اس کے ماں باپ نے نعمان کو دی تھی۔ ان پر کیا گزری ہوگی۔ وہ یہ دکھ کیسے برداشت کر رہے ہوں گے۔ اور اس لمحے اسے اس شخص سے شدید نفرت محسوس ہوئی جو کتنی ہی زندگیوں کو برباد کرنے کی وجہ بنا اور اسے احساس بھی نہیں۔

اس کے دماغ میں نعمان کے حوالے سے کوئی اچھی یاد نہ تھی۔ یہاں تک کہ منگنی ہونے کے باوجود بھی وہ ہمیشہ اس سے دور ہی رہا نہ کبھی کوئی فون نہ کوئی میسج۔ کبھی کبھی تو وہ حیران ہوتی تھی کیا واقعی یہ سب نعمان کی مرضی سے ہوا ہے۔ مگر اب تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ تایا ابو اور تائی امی کی مرضی تھی جسے اس نے زبردستی قبول کیا اور ایڈجسٹ نہ کرنے کی صورت میں رد کر دیا۔ لیکن اس سارے قصے میں وہ خود کہاں فٹ ہوتی تھی شاید کہیں بھی نہیں۔

"یہ رنگ مت پہنا کرو۔"

"لینسز استعمال کیا کرو۔ یہ تمہاری ہیزل گرین آنکھیں ہر بندہ گھور گھور کر دیکھنے لگتا ہے۔ مجھے پسند نہیں۔"

اور اسی قسم کے فقرے اس کے حافظے میں محفوظ تھے جن میں سوائے تنبیہہ یا پابندی کے کوئی تاثر ہی نہ ہوتا۔

"ارے میڈم! ہم اسلام آباد پہنچنے والے ہیں۔ ابھی اناؤنس ہوا ہے۔ کافی سو چکی ہیں آپ۔ باقی کا کوٹا گھر جا کر پورا کر لیجیے گا۔"

عباد نے آہستہ سے اس کا سر تھپتھپایا جو سیٹ کی پشت سے سر لگائے جانے کب ماضی کی بھول بھلیوں سے نیند کی وادیوں میں جا چکی تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ وہ تو کبھی سفر میں نہ سوئی تھی پر آج...

"ویسے آپ اچھی ساتھی نہیں ہیں۔ پورا راستہ میں آپ کے جاگنے کا انتظار کرتا رہا اور آپ بے خبر سوتی رہیں۔" وہ اپنی ہی دھن میں تھا لیکن اس کے ان لفظوں نے اسے پھر بہت کچھ یاد دلا دیا۔

"واقعی میں اچھی ساتھی نہیں۔"

"ایک پرسنل سا سوال کروں؟" عباد نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"ابھی تک آپ نے جو بھی پوچھا' بنا روک ٹوک پوچھا ہے' اب یہ ڈر کیسا۔" عزیزہ نے کافی سرسری سا کہا۔

"آپ انگیجڈ ہیں؟" سوال تھا یا پگھلا ہوا سیسہ۔ وہ اسے پھر سے چپ کرا گیا۔

"اگر آپ کو برا لگا ہو تو..." وہ گڑبڑا گیا۔

"نہیں۔ میں انگیجڈ نہیں ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"ویری گڈ۔" وہ بے ساختہ خوش ہوا تھا۔ وہ اسے بس گھور کر رہ گئی۔

"وہ میرا مطلب ہے۔ پڑھائی کے دوران ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے۔ توجہ بٹ جاتی ہے خواہ مخواہ۔" اپنی بے ساختہ خوشی پر وہ خود بھی حیران تھا مگر پھر فوراً ہی بات سنبھالی تھی۔

"ہم دوبارہ مل سکتے ہیں؟" اس کے لہجے میں آس تھی۔

"نہیں۔ یہ ہماری پہلی اور آخری ملاقات ہے۔" عباد کے چہرے پر سایہ سا لہرایا۔

"پر میں ملنا چاہوں گا پلیز۔" وہ ملتجی ہوا۔

"سوری! میں شاید دوبارہ کبھی لاہور نہ آؤں۔" اس نے وجہ بتائی۔

"اوکے! آپ میرا یہ کارڈ رکھ لیں۔ کبھی آپ ملنا چاہیں یا میری کوئی... یا آپ جاب کے سلسلے میں۔"

"جاب۔ آپ کو میری کوالیفکیشن معلوم ہے؟" وہ حیران ہوئی۔

"جب اپلائی کریں گی تو جان لوں گا۔"

"اوکے! رکھ لیتی ہوں۔ ویسے میرا کوئی ارادہ نہیں ہے جاب کا۔" اس نے کارڈ رکھ لیا۔

ان ہی باتوں کے دوران وہ لوگ اسلام آباد پہنچ گئے۔ عباد بے چین ہو گیا۔ وہ چلی جائے گی' جانے دوبارہ اس سے ملے گی بھی یا نہیں مگر وہ اسے روکنے پر قادر نہ تھا۔

عباد نے اسے ڈراپ کرنے کی آفر کی کیونکہ اسے لینے کے لیے ڈرائیور آ چکا تھا لیکن وہ معذرت کرتی ٹیکسی روک چکی تھی۔

وہ وہیں کھڑا کتنی ہی دیر تک اس ٹیکسی کو دیکھتا رہا اس میں موجود وہ کومل سی لڑکی جاتے جاتے عباد منصور کا دل بھی لے گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

خدا سمجھے تم سے روحی! بیچارہ ڈرائیور بھی سامان لوڈ کرتا کرتا تھک گیا ہے۔ کیا پورا اسلام آباد ساتھ لے جا رہی ہو؟"

عباد زچ ہو گیا۔ ایک تو صبح صبح اٹھنا جو اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اوپر سے روحانہ کا نہ ختم ہونے والا سامان۔

"تم ہمیشہ ایسے ہی کہتے ہو۔ کہاں زیادہ ہے۔ بس دو بیگ ہی رہتے ہیں۔"

کیا ابھی دو بیگ اور ہیں؟ محترمہ! میں یہیں رہ جاتا ہوں کیونکہ ان کے بعد میری جگہ تو مشکل سے ہی بنے گی۔" اسے غصہ آ گیا مگر وہ اسے کہاں سن رہی تھی وہ تو رحمو بابا کو ہدایات دے رہی تھی۔

"ہر چیز کا دھیان رکھنا! میں آتی ہوں۔" جلدی جلدی کہتی وہ اپنی آخری چیزیں بھی اٹھا رہی تھی' پھر ایک طائرانہ نگاہ اس گھر پہ ڈالی جہاں اس نے پچھلے پانچ سال گزارے تھے اور اپنا میڈیکل مکمل کیا تھا۔ اب ہاؤس جاب وہ لاہور میں کرنا چاہتی تھی سو واپس جا رہی تھی۔

"تم بھی ناں عباد! ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہو۔" وہ جیسے ہی گاڑی میں آ کر بیٹھی اس پر چڑھ دوڑی۔

"اور تم ہمیشہ کی سست ہو بس اب چپ رہنا میں میوزک سننا چاہ رہا ہوں۔" اس نے سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔

"ڈونٹ ٹیل می' تم اور بولنے کے موڈ میں نہیں ہو!" اس نے بھنویں چڑھائیں۔

"ویسے کل سے تم مجھے کافی عجیب لگ رہے ہو۔ رات تم لان میں بیٹھے ہنس رہے تھے۔ میں سمجھی کسی سے فون پر بات کر رہے ہو' مسئلہ کیا ہے۔" وہ مکمل اس کی طرف گھوم گئی۔

"کچھ نہیں۔" وہ مسکرا دیا۔ "کوئی یاد آ رہا تھا۔"

"کون؟" اسے تشویش ہوئی۔

"کیا رومی! بیویوں کی طرح تفتیش مت کیا کرو۔ کہا ہے نا! میوزک کا موڈ ہو رہا ہے۔" وہ پھر سے اس کے خیال کے تحت مسکرا دیا۔

اور رومانہ اس کے مسکرانے کا کچھ اور ہی مطلب لے کر اس کے فقرے کو اپنے مطلب کا رنگ دے کر خود بھی مسکرا دی۔

" آنٹی! مجھے واپس اسلام آباد ہی چلے جانا چاہیے۔ یہاں تو بور ہو جاتی ہوں۔"

اسے یہاں آئے پورا ایک مہینہ ہو گیا تھا اور ہر دم ہجوم میں رہنے والی رومانہ کو یہ تنہائی کچھ زیادہ ہی ڈسٹرب کرنے لگی تھی۔

"بور کیوں ہوتی ہو۔ گھومنے پھرنے چلی جایا کرو۔ یہاں بھی دوست بناؤ اور نہیں تو عباد کو ہی ساتھ لے لیا کرو۔" مسز منصور نے شفقت سے کہا وہ انہیں بہت عزیز تھی۔ دس سال پہلے ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کے دیور اور دیورانی کے انتقال کے بعد انہوں نے ہی اسے پالا تھا۔

"اسے تو ٹائم ہی نہیں ملتا۔ پہلے جب میں آتی تھی تب تو پھر بھی ہم لوگ نکل جاتے تھے' مگر اب تو اسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے آنٹی..... مجھے تو لگتا ہے' آپ کے بیٹے پر کسی بھوت ووت کا سایہ ہو گیا ہے۔" وہ راز داری سے کہنے لگی۔

"میرا بیٹا تمہارا ابھی کچھ لگتا ہے شریر!" انہوں نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"سیریسلی آنٹی! بیٹھے بیٹھے مسکرانے لگتا ہے۔ بات کیا ہوتی ہے' وہ کہیں اور پہنچا ہوتا ہے۔ آدھا پاگل ہو گیا ہے۔"

"اگر پورا بھی ہو جاؤں تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بالکل اچانک نمودار ہوا۔

"مجھے کیا' میں تو آنٹی کو تسلی دے رہی تھی۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"مما! میں کل اسلام آباد جا رہا ہوں۔ میری پیکنگ کر دیجیے گا۔" وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے شوز اتارنے شروع کر دیے مگر رومانہ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"خیریت؟" وہ پوچھے بغیر کہاں رہ سکتی تھی۔

"تم سے مطلب؟ اور مما پلیز مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے تو سونے جا رہا ہوں۔ بس ایک گلاس دودھ بھجوا دیں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

"دیکھا آنٹی! میری بات کا جواب دینا تو ضروری ہی نہیں ہے۔" اسے غصہ آ گیا۔

"چھوڑو رومی! میں پوچھتی ہوں اس سے۔ کام سے ہی جا رہا ہو گا۔"

وہ آج کل خود بھی عباد کے رویے پر حیران تھیں۔ کچھ دنوں سے وہ انہیں کچھ چپ چپ کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں آ گئیں مگر بس اسلام آباد جانے کی وجہ ہی پوچھ سکیں۔

"کچھ کام ہے مما..... آپ بھی بس..... پہلے پاپا کو مشکل سے منایا ہے اور اب آپ..... دوستوں کے ساتھ جا رہا ہوں..... آپ پریشان نہ ہوں..... آ جاؤں گا ایک ہفتے تک۔"

لیکن وہ اس کے جواب سے مطمئن نہ ہوئی تھیں کیونکہ آج وہ نظریں چرا رہا تھا اور انسان نظریں اسی وقت چراتا ہے جب سچ نہ بول پا رہا ہو یا جھوٹ بول رہا ہو۔

☼ ☼ ☼

ایک لڑکی خواہ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔ خود کو کتنا ہی پتھر ثابت کرنے کی کوشش کرے مگر اس کا دل کانچ سے بھی زیادہ نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے کرچی کرچی ہو جانے والا۔ پورے دو ماہ وہ مضبوط رہی۔ اس نے کسی کو کچھ محسوس نہ ہونے دیا لیکن اپنے گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اس

کے قدم ڈگمگائے تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ ماں باپ کے اترے چہروں اور جھکے کندھوں نے اس کے دل میں موجود نعمان احمد کے لیے نفرت کو مزید شدید کر دیا تھا۔

اگر عزیزہ رحمٰن یہ جانتی کہ اس کا یہ رونا اسے کتنے بڑے نقصان سے دوچار کرے گا تو شاید وہ اپنے آنسوؤں کو روک لیتی۔ خود پر جبر کر لیتی۔ اپنے دل کو پتھرا دیتی۔ لمحہ لمحہ خود بکھرتی مگر خود سے جڑے دونوں رشتوں کو اس عظیم سانحے پر بکھرنے سے بچا لیتی۔ رحمٰن صاحب بیٹی کا درد اس کے آنسوؤں کو برداشت نہ کر پائے تھے اور ہمیشہ کے لیے ان تینوں کو اس دنیا میں تنہا چھوڑ گئے۔

ایک قیامت برپا ہوئی تھی۔ ایک الاؤ تھا جس میں سب جل کر راکھ ہو گیا۔ ساری خوشیاں تباہ ہو گئیں۔ وہ گھر جہاں ہر دم خوشیاں رقص کرتی تھیں' ایک انسان کی خود غرضی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ وہ محل جو تین حصوں میں بٹا ہونے کے باوجود یک جان تھا' زمین بوس ہو گیا۔ جو رشتے پھر دوبارہ جڑنے کا امکان رکھتے بھی تھے' ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئے۔ وہ عزیزہ جو رحمٰن صاحب کی موت پر دھواں دار روئی تھی' جس کے رونے نے ہر آنکھ کو اشکبار کر دیا تھا' وہ اپنے باپ کی موت کے فقط ایک ماہ بعد تمام مشترکہ اثاثوں سے اپنا حصہ مانگ رہی تھی کہ وہ ان رشتوں میں نہیں رہنا چاہتی جنہوں نے اس کے سر سے باپ کا سائبان چھین لیا۔

ہر کسی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اسے دنیا کی اونچ نیچ' اچھائی برائی سے واقف کرانا چاہا مگر سب بے سود۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اسے اس چھت تلے نہیں رہنا جہاں ایک قاتل رہتا تھا۔

عافیہ بیگم نے اسے سمجھانا چاہا تو اس نے بس اتنا کہا تھا۔

"امی! میں نے زندگی میں کبھی کوئی فیصلہ خود نہیں کیا۔ ہر بات کو آپ لوگوں پر چھوڑ دیا لیکن آج میں آپ کی بات نہیں مان سکتی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے آپ پر بھروسا نہیں بلکہ اس لیے کہ میرا دل کہتا ہے میں ٹھیک ہوں۔"

اور پھر عافیہ بیگم نے بھی ہار مان لی۔ وہ لوگ سب کچھ بیچ کر لاہور آ گئے۔ عزیزہ کو امید تھی کہ یہاں وہ نئے سرے سے زندگی کی گاڑی کو چلانے میں کامیاب ہو ہی جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں ڈھونڈوں میں تمہیں عزیزہ رحمٰن! اپنا کوئی ایک نشان تو چھوڑ جاتیں۔ کچھ تو ہوتا کہ میں تم تک پہنچ جاتا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارے ساتھ گزارے وہ چند گھنٹے میرے دل و دماغ پر اس طرح سوار ہو جائیں گے کہ میں ان کے اثر سے نکل ہی نہ پاؤں گا۔ مجھ جیسا لاابالی اور غیر جذباتی شخص کسی کے لیے خوار ہو گا۔

تم تو شاید مجھے بھول کر اپنی دنیا میں گم ہو گئی ہو لیکن میں اپنے دل کا کیا کروں۔ اسے کیسے سمجھاؤں۔ اس کی اس بے چینی کو کیسے ختم کروں جو تمہاری نم آنکھوں کو سوچ کر پیدا ہو جاتی ہے۔

تمہاری وہ مسکراہٹ۔ کتنا کرب تھا اس میں بھی جیسے کوئی دکھ تمہاری مسکراہٹ کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہا ہو۔ کاش میں تمہیں روک لیتا۔ کوئی نشان مانگ لیتا۔ اس اتنے بڑے شہر میں کہاں تلاش کروں کس سے پوچھوں کہ عباد منصور اس شہر بے کراں میں ایک ایسی لڑکی کو ڈھونڈ رہا ہے' جس کے نام کے سوا وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

☼ ☼ ☼

"امی! میں انٹرویو کے لیے جا رہی ہوں دعا کیجیے گا۔" ابھی تک اسے نوکری نہ مل سکی تھی مگر وہ پر امید تھی۔

لاہور آ کر انہوں نے ایک اپارٹمنٹ لیا تھا گھر کی چھوٹی چھوٹی چیزیں۔ اسے سجانا' غیراث کا اچھے کالج میں ایڈمیشن۔ یہ سب ہونے کے بعد جو تھوڑے بہت پیسے بچے تھے' وہ اس نے بنک میں جمع کرا دیے اور خود

نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہو گئی۔ وہ جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی تھی مگر نوکریاں یا تو ختم ہو گئی تھیں یا پھر انٹرویو کی رسمی کارروائی کے بعد منتخب شدہ لوگوں کو مل رہی تھیں۔
عافیہ بیگم نے آیت الکرسی کا ورد کر کے اس پر پھونکا۔
"جاؤ بیٹا! اللہ تمہاری مدد کرے۔"
انٹرویو اس کا اچھا ہوا تھا مگر اپنے دائیں بائیں موجود بجی سنوری لڑکیاں دیکھ کر اس کو امید نہیں تھی لیکن شاید اندر بیٹھے لوگوں کو اس کی ڈگری سے غرض تھی اس کے حلیے سے نہیں۔ اسی وقت اپائنمنٹ لیٹر مل گیا جو اس کی ماں کی دعاؤں اور اس کی اپنی محنت کا ثمر تھا۔

٭ ٭ ٭

آج کافی دنوں بعد اس کا موڈ اچھا تھا دوستوں کے ساتھ نے اس پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اس نے ہلکا سا میوزک آن کر دیا اور خود بھی گنگنانے لگا کہ اچانک اس کے لب ساکت ہوئے' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے وہی دیکھا ہے' جو وہ پچھلے چار ماہ سے دیکھنا چاہتا تھا وہ بلاشبہ وہی تھی۔
"سوری! میں شاید دوبارہ کبھی لاہور نہ آؤں۔" آواز کہیں قریب ہی گونجی۔
اس کے ساتھ کوئی عورت اور ایک لڑکا تھا اس سے پہلے کہ وہ ہوش کی دنیا میں آتا' اس کے ساتھ موجود لڑکے نے ٹیکسی روکی' پھر وہ تینوں اس میں سوار ہوئے اور ٹیکسی چل پڑی۔ عباد نے بلا سوچے سمجھے اس ٹیکسی کے تعاقب میں گاڑی دوڑا دی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اسے ہر حال میں اس لڑکی تک پہنچنا تھا۔۔۔۔ مگر ٹریفک کا ریڈ سگنل اسے اس سے پھر دور کر گیا۔
"وہ مجھے اسلام آباد جاتے ہوئے ملی تھی۔ میں رومی کو لینے جا رہا تھا اور وہ اپنی اسٹڈیز سے فارغ ہو کر اپنے گھر۔۔۔ کچھ کچھ اداس' کھوئی کھوئی۔ میں اپنی عادت کے مطابق شروع ہو گیا لیکن وہ بہت ریزرو رہی۔ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں ہیزل گرے' جیسے کانچ کی ہوں مگر ان سے بہتے آنسوؤں نے ہی پہلی بار اپنی طرف کھینچا تھا۔ وہ بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ بہت پریشان' پھر جب وہ ہنسی تو مجھے لگا دنیا کی ساری خوب صورتی اس کی اس ایک مسکراہٹ میں آ گئی ہو لیکن اس مسکراہٹ میں بھی کرب تھا۔۔۔ مما! میں۔۔۔ میں اس وقت سمجھ ہی نہیں سکا کہ وہ لڑکی میرے لیے اتنی اہم ہو گی۔ پھر وہ چلی گئی اور آپ کا بیٹا اسے ڈھونڈتا رہ گیا۔ کل میں نے اسے یہاں دیکھا لیکن پھر کھو دیا۔"
اپنی ماں کی گود میں سر رکھے وہ انہیں تمام باتیں بتاتا چلا گیا۔ وہ جب سے گھر آیا تھا۔ چپ چاپ تھا۔ آج تو آفس بھی نہ گیا تھا' پھر رابعہ بیگم کے استفسار پر اس نے کچھ نہ چھپایا۔
"اگر وہ تمہارے لیے ہوئی تو دوبارہ ضرور ملے گی۔ بیٹا! تم پریشان مت ہو جو کل اسے تمہارے سامنے لایا ہے وہی دوبارہ بھی لائے گا۔" انہوں نے اسے تسلی دی۔
"مما! آپ کو برا تو نہیں لگا؟"
"مجھے خوشی ہوئی ہے عباد کہ تم نے مجھے ماں سے زیادہ دوست سمجھا۔ ویسے نام کا کیا تھا اس کا؟" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔
"عزیزہ رحمٰن۔" وہ مسکرا دیا۔
"بہت پیارا نام ہے۔" انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی پر پیار کیا۔ باہر کھڑی رومانہ کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔

٭ ٭ ٭

"توبہ مریم! تم نے تو مجھے ڈرا دیا تھا۔ اتنے غصے والے ہیں۔ ایسے سوال کرتے ہیں۔ کتنے نائس تھے یہ تو۔۔۔" جونہی وہ دونوں آفس سے باہر نکلیں' وہ مریم پر برس پڑی۔
آج وہ پہلی بار ہیڈ آفس آئی تھی ورنہ وہ تو ماڈل ٹاؤن برانچ میں ہوتی تھی۔
"ہاں ہاں' وہ ہٹلر کے جانشین جو نہیں تھے آج۔ اسی لیے خیریت رہی عزیزہ! ورنہ ایڈمنسٹریشن کے ہر بندے سے وہی بات کرتے ہیں۔ جانے آج کیسے غائب تھے۔ ہاں' سر واقعی نائس ہیں۔"
مریم "عباد منصور" کی غیر حاضری پر خود بھی حیران تھی۔
"اچھا چھوڑو! بلا ٹلی میں سمجھ رہی تھی میری کوئی کمپلین نہ ہو اس لیے کال کیا گیا ہو۔" عزیزہ کی سانس ابھی تک نارمل نہ ہوئی تھی۔
"اب پتا نہیں ویٹ کرنے کو کیوں کہا ہے۔" اتنے میں پیون نے اسے آنے کے لیے کہا۔ وہ دوبارہ اندر چلی گئی۔
جب وہ آفس میں داخل ہوئی تو منصور صاحب کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"وہ آج آئی ہوئی ہیں۔ اب اگر چاہو تو آجاؤ ورنہ میں انہیں لیٹر دے رہا ہوں۔" وہ آفس کا جائزہ لینے لگی۔
"او کے! اینگ مین ٹرسٹ می۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔
"مس رحمٰن! آپ کا اکیڈمک ریکارڈ دیکھتے ہوئے اور منیجر صاحب کے آپ کے بارے میں دیے گئے کمپلیمنٹس کے پیش نظر۔۔۔" وہ رکے "آپ کی پروموشن کر دی گئی ہے۔ یو آر ناؤ دا اسسٹنٹ منیجر آف یور برانچ۔"
"جی سر؟"
"یس اور آپ کی پے میں 15 فیصد اضافہ کیا جا رہا ہے پلس آپ کو گاڑی کی سہولت دی جا رہی ہے۔"
وہ منہ کھولے انہیں دیکھے جا رہی تھی قدرت نے ایک در بند کر کے اس سے کہیں بہتر در کھول دیا تھا۔
"مس رحمٰن اینی پرابلم؟" وہ اس کی غائب دماغی پر چونکے۔
"نو۔۔۔ نو سر ناٹ ایٹ آل۔۔۔ تھینک یو سر!" خوشی' مسرت' حیرت۔۔۔۔ جانے کون سی کیفیت کے زیر اثر اس نے یہ لفظ ادا کیے اور نکل آئی۔

٭ ٭ ٭

"تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟" پی سی کا خوشگوار ماحول بھی اس کی طبیعت بحال کرنے سے قاصر تھا۔
"تاکہ یہ جو ڈپریشن تم نے خود پر سوار کر رکھا ہے' اس سے باہر نکلو۔" رومانہ نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما مگر اسے تو جیسے کرنٹ لگا۔
"ڈونٹ انٹرفیئر ان مائی پرسنل لائف۔ اس کی اجازت میں تمہیں کبھی نہیں دوں گا۔" ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑاتا وہ اسے بہت کچھ باور کرا گیا۔
"اور اگر کبھی دینا پڑی۔۔۔؟" اس نے پھر سے چھیڑا حالانکہ عباد کی ہاتھ کھینچنے والی حرکت اسے کافی بری لگی تھی لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔
"یہ ممکن نہیں میں یہ اجازت صرف ایک ہی لڑکی کو دوں گا اور وہ کم از کم تم کبھی نہیں ہو گی۔" عباد نے بہت واضح جواب دیا تھا۔
وہ کافی دنوں سے رومانہ کے طور اطوار دیکھ رہا تھا' سو دو ٹوک کہہ دیا۔
"ویسے! میرے وہ لڑکی ہونے میں حرج کیا ہے؟" وہ ضرورت سے زیادہ بے باک ہو رہی تھی۔
"بی ہیو یور سیلف! ضرورت سے زیادہ بولڈنیس انسان کو لے ڈوبتی ہے۔" وہ غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔
"یہ بولڈنیس نہیں۔ میرا اقرار ہے۔ بس تمہاری ہاں کی دیر ہے۔"
"جو کبھی نہیں ہو گی کیونکہ مجھے تم جیسی بے ہودہ لڑکیاں قطعاً پسند نہیں۔ سمجھیں تم۔" وہ کھڑا ہو گیا۔
"ہاں! تمہیں تو عزیزہ رحمٰن جیسی لڑکیاں پسند ہیں۔۔۔ ہے نا۔" وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں ٹھٹکا تھا۔
"میرے منہ سے اس کا نام سن کر حیرت ہو رہی ہے یا شاک لگا ہے؟"
"کیسے جانتی ہو تم اسے؟"
"جانتی نہیں ہوں' لیکن شوق ہے اسے جاننے کا جو اتنی آسانی سے میری برسوں کی محبت چھین لے گئی۔"

کتنا حسد تھا اس کے لہجے میں۔
"محبت چھینی نہیں جاتی رومانہ! جو اسے چھیننے کی کوشش کرتا ہے اس کے ہاتھ ساری زندگی پچھتاووں کے سوا کچھ نہیں آتا۔" اس نے سرد مہری سے کہا تھا۔
"رومی! یہ معاملات ایسے طے نہیں ہوتے۔ تم سمجھتی کیوں نہیں۔ میں تمہارے انکل سے بات۔۔۔"
"میں نے کہا نا آنٹی! آپ لوگوں کو صرف ہاں کرنا ہے۔ انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں کمٹ منٹ کر چکی ہوں۔"
تیزی سے ان کی بات کاٹتی وہ انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کر رہی تھی جسے ابھی اندر داخل ہوتے منصور صاحب نے بھی سن لیا۔
"رومانہ! یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا؟" وہ گرجے۔ رابعہ نے انہیں بتایا تھا کہ رومانہ کے کسی کلاس فیلو کی فیملی اس کے لیے آنا چاہ رہی ہے مگر حالات اس موڑ پر ہوں گے، وہ نہیں جانتے تھے۔
"میرا طریقہ اور لہجہ اس سے بھی زیادہ خراب ہو سکتا ہے اگر آپ لوگوں نے میری بات نہ مانی۔" وہ بدلحاظی کی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔
"تو ہم نے کب انکار کیا ہے تمہاری بات ماننے سے؟" رابعہ نے سمجھانا چاہا۔
"تو اقرار بھی تو نہیں کر رہے۔ میں نے ان لوگوں کی انویسٹی گیشن کرانے کو نہیں کہا۔ بس ان کے آنے پر انہیں ہاں کر دی جائے۔"
"اگر ہم ہاں نہ کریں تو؟" منصور صاحب بھی غصے میں آ گئے۔
"تو میں کورٹ میرج کر لوں گی اور اپنی جائیداد کے لیے کورٹ میں دعوا دائر کر دوں گی۔" اس کی زبان شعلے اگل رہی تھی۔
"رومانہ تم۔" رابعہ نے صوفے کا سہارا لیا۔
"بس۔" منصور صاحب کی پرجلال آواز پر بھی وہ نہ کانپی۔
"اب اس سے کوئی سوال نہیں کرے گا۔ بلاؤ ان لوگوں کو اور کہو کہ سیدھا سیدھا تمہیں لینے آئیں مگر یاد رکھنا، اس گھر سے جانے کے بعد تمہارا سب سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ از دیٹ کلیئر؟"
ان کا لال چہرہ، تنی رگیں بھی اسے نہ ہلا سکیں اور وہ پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں آ گئی۔
"کون ہو تم عزیزہ رحمٰن! جس نے مجھ سے میرے رشتے چھین لیے۔ مجھے اس کی نظروں میں گرا دیا جس کی زندگی میں میں اپنا مقام سب سے اوپر دیکھنا چاہتی تھی۔ کون ہو تم۔"
وہ پوری رات اس نے جاگتے گزار دی اور صبح ہوتے ہی وہ "اسے" فون کر چکی تھی۔ وہ جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہمیں عافیہ کو بلانا چاہیے، جو بھی ہوا، قصوروار تو نومی ہی ہے نا۔" سفیان سوچ میں پڑ گئے۔
"مگر کیا وہ آئیں گی؟"
"یہ ان کی مرضی۔ ہمیں تو بلانا چاہیے۔"
"اس نومی نے اتنی جلدی مچائی ہے کہ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" نعمان ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کی خوشی پر وہ کسی چیز کو ترجیح نہیں دیتے تھے لیکن پھر بھی اتنی افراتفری پریشان کیے۔

☼ ☼ ☼

"لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے عزیزہ!" عافیہ اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں۔
"حرج ہے امی! جب ہمیں کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا تو خوشی یا غم میں شریک ہونے کا کیا جواز ہے۔" اس کا رویہ بدستور منفی تھا۔
"بیٹا پودا کتنا ہی توانا کیوں نہ ہو جائے اپنی جڑوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کی جڑیں ہی اس کی طاقت ہوتی ہیں۔"
"لیکن اگر جڑیں کمزور ہو جائیں تو پودا نئی جگہ سے پھوٹ پڑتا ہے امی!" وہ آمادہ نہ تھی۔
"بھائی سفیان اور بھابھی اتنی چاہت سے بلا رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے امی! اگر آپ کو یہی صحیح لگتا ہے تو جو آپ کی مرضی۔" وہ خود بھی اس بحث سے تنگ آ چکی تھی، سو بات سمیٹتے ہوئے اٹھ گئی۔ عافیہ آہ بھر کر رہ گئیں۔ اب جانا ممکن کہاں تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم جانتی ہو کہ کیا کر رہی ہو؟" وہ پھر اس کے سامنے تھا۔
"تم اپنی زندگی برباد کر لو گی۔ پتا نہیں وہ کیسا ہے۔ اس کی فیملی کیسی ہے۔ صرف پانچ سال کسی کو جاننے کے لیے کافی نہیں ہوتے۔"
"میں پچھلے بیس سال سے تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تو تمہیں کبھی نہ جان سکی۔"
"رومی! یہ ضروری تو نہیں ہم جسے چاہیں، وہ بھی ہمیں چاہے۔"
"اسی لیے تو عباد! میں نے تم سے دوبارہ سوال نہیں کیا کیونکہ میں کسی ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی جس کی زندگی میں میرے علاوہ کسی اور کی پرچھائیں بھی ہو۔"
بہت دنوں بعد وہ کھل کر بولی۔
"پلیز عباد! میں بھول جانا چاہتی ہوں سب۔ جاؤ یہاں سے۔ مت یاد دلاؤ مجھے کچھ بھی۔ پلیز گو۔" وہ بیڈ پر ڈھے گئی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے اسے بیٹیوں کی طرح چاہا۔ عباد سے زیادہ پیار دیا لیکن۔"
منصور صاحب بے حد افسردہ تھے۔ دو دن بعد رومانہ کی رخصتی تھی، سادگی کے ساتھ۔ مایوں مہندی کوئی تقریب نہ ہوئی تھی۔
"پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔" وہ رو پڑیں۔
اس نے تمہیں بھی کچھ نہیں بتایا۔
"اگر وہ بتاتی تو کیا میں چپ رہتی۔ اس کے منہ سے نکلی ہر فرمائش کو میں نے پورا کیا ہے سب کچھ اس کی مرضی سے ہو رہا ہے پھر بھی خوش نہیں ہے۔ اگر آپ ایک دفعہ اس سے بات۔۔۔"
"اس نے اس قابل ہی کہاں چھوڑا ہے۔" انہوں نے بات کاٹی۔ "تم نے اس کا رویہ دیکھا تھا۔ کتنا سرکش کتنا باغیانہ، ایسے میں، میں کیا بات کرتا اس سے۔"
"کیا آپ واقعی اس سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے؟"
"اولاد کتنی ہی نافرمان ہو جائے رابعہ! والدین نفرت نہیں کر سکتے۔ دو دن بعد وہ چلی جائے گی۔ اس سوچ سے ہی میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔"
وہ رو پڑے۔ ایک دکھ تھا درد تھا۔ کاش رومانہ نے ان کا لحاظ کیا ہوتا۔
جتنی خاموشی سے یہ تقریب ہوئی تھی، اتنی ہی خاموشی سے رخصتی بھی ہو گئی۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے رومانہ، منصور صاحب کے پاس آئی تھی۔
"آئی ایم سوری انکل! میں مجبور تھی۔ میں نے یہ سب کیوں کیا میں نہیں بتا سکتی۔ بس زندگی کی آخری غلطی سمجھ کر معاف کر دیں۔"
وہ جو اتنے دنوں سے گھٹ گھٹ کر جی رہی تھی، بے قابو ہو گئی۔ انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔
یہ کیسی معافی تھی۔ رومانہ کے ساتھ کھڑا نعمان احمد سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اتنے میں عباد اس سے ملنے کے لیے بڑھا۔ سب سے مل کر وہ بیٹھا اور گاڑی جانے پہچانے راستوں پر چل پڑی۔
پہلے عزیزہ اور۔۔۔ اب رومانہ۔ وہ واقعی خوش قسمت تھا۔ سب لوگوں نے دلہن کو بہت سراہا تھا۔ لاہور تو چند لوگ ہی گئے تھے لیکن یہاں پورا خاندان جمع تھا۔
ٹیرس پر کھڑا نعمان ان ہنستے مسکراتے لوگوں کو دیکھ کر شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے عزیزہ سے رشتہ توڑتے وقت صرف دل کی سنی تھی۔ خاندان والوں کی پروا نہ کی تھی ورنہ ساری زندگی پچھتاتا رہتا۔ خاندان والے تو آج رومانہ سے بھی خوش تھے بلکہ وہ رومانہ سے مرعوب بھی تھے۔ وہ بہت امیر تھی۔ اس کے باپ کے

سوشل سرکل میں ملک کے منسٹرز' لینڈ لارڈز اور بڑے بڑے صنعت کار آتے تھے۔ بھلا رومانہ اور عزیزہ کا کیا مقابلہ!

وہ لاشعوری طور پر ان کا موازنہ کر رہا تھا' پھر سر جھٹک کر اس نے کمرے کا رخ کیا' جہاں اس کی بہت پرانی خواہش اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے پہلا جھٹکا رومانہ کے حلیے پر لگا تھا جو بناؤ سنگھار سے آزاد سادہ سے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس تھی۔ دھلا دھلایا چہرہ جانے کس سوچ میں غرق تھا۔ وہ گلا کھنکھارتا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"السلام علیکم۔" اس کے سلام کا جواب سر کی جنبش سے دیا گیا۔

"کیسی ہو؟" وہ پھر بولا۔

"فائن۔" مختصراً" جواب دیا گیا۔

"خوش ہو؟" لفظوں کی اس قدر قلت شاید پہلے کبھی نہ تھی۔

"یہ عزیزہ کون ہے؟" سوال گندم' جواب چنا اور چنا بھی وہ جسے وہ نگل نہیں پایا۔

"بولو۔" وہ چپ رہا۔

"نعمان! تمہاری خاموشی کا کیا مطلب لوں؟" وہ پھر مخاطب ہوئی۔

"میری کزن ہے۔" آخر کچھ تو بولنا ہی تھا۔

"صرف کزن؟" جانے وہ کیا کریدنا چاہ رہی تھی۔

"دیکھو نعمان مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ تمہارا آج کا بولا ہوا سچ ہمیں بہت سی تلخیوں سے بچا لے گا۔" کتنا سناٹا تھا اس کے لفظوں میں۔

"میری فیانسی بھی تھی۔" یہ بات وہ زیادہ عرصہ چھپا بھی تو نہ سکتا تھا۔

"اوہ تو میری حیثیت کسی بھی مرد کی زندگی میں دوسری عورت ہونا تھی۔ میں بے وقوف اپنے مقدر سے لڑ پڑی۔" اس کی آواز خود کلامی سے زیادہ نہ تھی۔

"کیا مطلب؟"

"میں فیز ڈیل کرتی ہوں۔ تم جانتے ہو۔ کالج کے پانچ سال میرا کسی سے کبھی افیئر نہیں رہا۔" وہ رکی۔

"میرا ان سے افیئر نہیں تھا۔ وہ تو تمہیں بھلانے کے لیے کسی سہارے کی تلاش مجھے وہاں لے گئی۔" اس نے صفائی دینا چاہی۔

"او کے ۔۔۔ ڈونٹ ایکس پلین ناؤ ۔۔۔ میں نے تم سے ایک وعدہ لیا تھا۔" وہ پوچھنے لگی۔

"مجھے یاد ہے لیکن اس میں کچھ وقت تو لگے گا نا۔"

"کتنا؟"

"بس کچھ دن۔ دراصل یہ سب اتنا اچانک ہوا۔ کہ میں لاہور شفٹ ہونے کی بات چاہتے ہوئے بھی نہیں کر سکا۔" وہ نظریں چرا گیا حالانکہ ابھی کل منہدی پر ہی اس نے یہ بات اپنے والدین کو بتائی تھی اور انہوں نے اسے خوب سنائی تھیں۔

"مجھے جلد از جلد جانا ہے۔ میں جوائنٹ سسٹم سے تھوڑا ڈرتی ہوں پلیز۔"

"ڈونٹ وری روی! آئی ول ہینڈل۔" اس کے ہاتھ پر اپنا تسلی بخش ہاتھ رکھ کر وہ اسے اپنے ساتھ کا یقین دلانے لگا۔

☼ ☼ ☼

ان کی کمپنی کے ہیڈ آفس میں میٹنگ تھی اور منیجر صاحب کی بیگم کی بیماری کی وجہ سے وہ اسسٹنٹ منیجر کی حیثیت سے میٹنگ میں شرکت کے لیے موجود تھی۔

"ہیلو ایوری ون گڈ مارننگ!" منصور صاحب کی بارعب آواز پر سب ہی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ ان کی پشت پر کھڑے عباد کو دیکھ کر عزیزہ کو بے ساختہ ایک بھولا سفر یاد آیا تھا۔

"تو میں ان کی کمپنی میں!"

"کین وی اسٹارٹ اور پریزنٹیشن۔"

"شیور سر!" منصور صاحب نے عباد کو اشارہ کیا۔ آج وہ اپنی کمپنی کی نئی پروڈکٹ کی تفصیلات دینے والا تھا اور ابھی تک عزیزہ کو دیکھ نہ پایا تھا۔

"سو لیڈیز اینڈ جنٹلمین لیٹس از ۔۔۔" تمام لائٹس مدھم ہو گئیں۔ صرف اسکرین پر ان کی پروڈکٹ واضح تھی یا اسکرین کے ساتھ کھڑا عباد منصور۔

"لیٹ می ٹیل یو ون تھنگ اباؤٹ اٹس بینیفٹ دی ۔۔۔"

وہ کیا کہنے جا رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ اسے تو صرف دائیں سائیڈ کی رو میں چوتھے نمبر پر بیٹھی عزیزہ نظر آ رہی تھی۔

وہ خواب دیکھ رہا تھا یا حقیقت' فرق کرنا مشکل تھا۔ اس کی اتنی طویل خاموشی پر سب ہی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"عباد!" منصور صاحب نے پکارا۔

"عباد! آر یو آل رائٹ؟" منصور صاحب نے دوبارہ پوچھا۔

"آں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ سوری ایکسٹریملی سوری!" اس کے بعد وہ کئی بار اپنے موضوع سے ہٹا تھا۔ پوچھے گئے سوالوں کے جواب بھی غائب دماغی سے دیتا رہا۔

اللہ اللہ کرکے میٹنگ ختم ہوئی۔ منصور صاحب حیران تھے۔ آخر ایسا کیا ہوا ہے مگر وہ سر درد کا بہانہ بنا گیا۔

"تو تم پہلے بتاتے۔ ہم کینسل کر دیتے میٹنگ۔"

"نہیں پاپا! ایسے ہی بس۔ اچھا ایک بات بتائیں یہ مس عزیزہ رحمٰن کب سے ۔۔۔ میرا مطلب کب جوائن کیا انہوں نے اور ان کی پوسٹ یہاں تک ۔۔۔" وہ پوچھتے ہوئے جھجک رہا تھا۔

"یہ تو کافی عرصے سے کام کر رہی ہیں۔ تقریباً" ایک سال سے۔ بہت محنتی ہے ویری ہارڈ ورکنگ۔" وہ اس کی لاعلمی پر حیران ہوئے۔

"اسی لیے کہتا ہوں تینوں برانچز کے راؤنڈ لے لیا کرو۔ پتا رہتا ہے کون ہے اور کون نہیں۔"

"جی جی! میں کل جاؤں گا ماڈل ٹاؤن برانچ۔"

"اب یہ بھی نہیں کہا کہ کل ہی چل پڑو۔" وہ ہنسے۔

"نہیں پاپا! جانا چاہیے۔ آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ میں کل ہی جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ ضرور جاؤں گا۔" خوشی سے اس کا برا حال تھا۔

"میں کیوں فکر کروں گا۔ عجیب ہو' تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے سر درد زیادہ بڑھ گیا ہے۔" وہ سہلاتے اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

جونہی وہ آفس میں داخل ہوا۔ ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ تمام اسٹاف مستعد ہو گیا کیونکہ وہ آفس ڈسپلن کے بارے میں کافی سخت تھا۔ اس برانچ کی انسپکشن ہر جگہ منصور صاحب خود کرتے تھے۔ وہ تو بس ہیڈ آفس میں رہتا تھا۔ اس لیے آج اس کی اچانک آمد سب کے لیے حیرانی کا باعث تھی۔ وہ سیدھا منیجر الیاس رضا کے پاس گیا۔ معمول کا کام ختم کرنے کے بعد اس نے اسسٹنٹ منیجر کے آفس کا رخ کیا۔ مزید صبر اب اس کے بس میں نہ تھا۔

"ہیلو مس عزیزہ رحمٰن۔" دروازے پر دستک دے کے وہ اندر داخل ہو گیا۔

عزیزہ نے اسے دیکھتے ہی کرسی چھوڑ دی مگر وہ اسے اشارے سے اپنی کرسی پر بیٹھنے کا کہتا خود میز کے دوسری طرف موجود کرسی پر براجمان ہو گیا۔

"گڈ مارننگ سر!" وہ ہنوز کھڑی تھی مگر اس کے طرز تخاطب پر عباد کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔ نظریں اس کے صبیح چہرے پر خود بخود رک گئیں۔

وہ اس کی نظروں سے کنفیوز ہونے لگی۔ ابھی کل بھی میٹنگ میں اس کے نظروں کے مسلسل ارتکاز نے اسے چونکا دیا تھا۔

"آپ بیٹھیے پلیز۔" نظروں کو بھٹکنے سے روکا۔

"کب سے جاب کر رہی ہیں آپ یہاں؟"

"پچھلے ایک سال سے سر۔" وہ حیران ہوئی۔ اسے یہ تک معلوم نہ تھا۔ وہ ہنسنے لگا۔

"آپ یہ سوچ رہی ہوں گی کہ میں ہنس کیوں رہا ہوں۔" اس کے اندازے کی درستگی پر وہ صرف سر ہلا گئی۔

"مجھے آپ سے ۔۔۔ پہلی ملاقات یاد آ گئی جب آپ نے کہا تھا کہ اے مسٹر آپ بہت فاسٹ جا رہے ہیں۔ بات کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو سیٹ تبدیل

کرالیں۔ آپ آج بھی ایسا ہی کچھ کہنا چاہ رہی ہیں لیکن یہ سر کالاحقہ آپ کو باز رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔"
وہ بلا کا زیرک تھا۔
وہ نہ اقرار کر سکی نہ انکار۔
"آپ تو ایسا گم ہوئیں کہ میں آپ کو ڈھونڈتا ہی رہ گیا۔"
"جی۔" وہ ناسمجھی سے بولی۔
"آپ آئیے نا کبھی گھر۔ مما آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"
اس کی ہیزل گرین آنکھیں اسے پھر سے بہکانے لگیں۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی خود کو روک نہ پا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا دل بالکل ہی بے قابو ہو جاتا' وہ کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی ساتھ ہی اٹھی۔
"ویسے آپ کا سر کے بجائے عباد کہنا زیادہ اچھا لگے گا۔ اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ آئی ہوپ یو ڈونٹ مائنڈ۔"
ایک الوداعی نگاہ اس کے روشن چہرے پر ڈالتا وہ آفس سے نکل گیا۔ وہ ابھی تک اس کے لفظوں کے معنی سمجھنے کی کوشش میں تھی اور جب سمجھ میں آئے تو جانے کیوں اس کے لب مسکرا اٹھے۔

☼ ☼ ☼

"غیراث! اکیڈمی جوائن کر لو بہت دن ہو گئے ہیں ایگزامز ختم ہوئے۔" عافیہ بیگم لاؤنج سمیٹتے اس سے بھی مخاطب تھیں۔
"امی! میرا ڈاکٹر بننا ضروری ہے کیا؟" عجیب سے سوال پر وہ حیران ہوئیں۔
"میرا مطلب ہے اس طرح آپی پر برڈن مزید بڑھ جائے گا۔ میں سوچ رہا تھا' سمپل سا کچھ کر لوں۔ اس طرح کوئی پارٹ ٹائم جاب بھی کر لوں گا۔"
عافیہ کشن چھوڑ کر اس کے پاس آگئیں۔ کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ وہ ان کی آنکھوں میں نمکین پانی بھرنے لگا۔
"دیکھو ذرا! مجھے پتا ہی نہ چلا اور میرا بیٹا اتنا بڑا ہو گیا۔ لیکن تم جانتے ہو نا تمہارے بابا تمہیں ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے اور عزیزہ ان کا یہ خواب پورا کرنا چاہتی ہے۔"
وہ اس کو پیار کرنے لگیں۔
"امی! آپی کو سمجھائیں نا وہ۔۔۔ وہ شادی کر لیں۔ وہ کب تک ہمارے لیے۔۔۔"
ایک زوردار تھپڑ اسے مزید بولنے سے روک گیا۔
"اتنے بڑے ہو گئے ہو تم کہ اپنے بڑوں کے لیے فیصلے کرنے لگو اور آپ اس کی یہ بکواس سن رہی ہیں۔"
اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔
"عزیزہ! اس نے غلط تو نہیں کہا۔"
"جب تک غیراث اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔ کوئی آئندہ ایسا ذکر نہیں کرے گا اور تم کان کھول کر سن لو' تمہیں بابا کا خواب پورا کرنا ہے۔ سمجھے تم۔"
اپنا بیگ اٹھا کر وہ کمرے میں بند ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"اومن سیونٹیز کی مخلوق! میں یہاں تمہیں خود کو بور کرانے نہیں لائی تھی۔ کہاں جم کر بیٹھ گئی ہو؟"
مریم اسے ڈھونڈتے ہوئے ادھر ہی آگئی۔ وہ دونوں جیولری کی نمائش میں موجود تھیں اور وجہ صرف اور صرف مریم کا جیولری کے لیے شوقین ہونا تھا۔ ساتھ مریم کی ایک کزن بھی تھی۔
"مجھے کہاں شوق ہے اور جیولری کی نالج بھی صفر ہے۔ تم جاؤ دیکھو۔" وہ بیزار سی کہنے لگی۔
"کوئی بوڑھی روح سما گئی ہے تمہارے اندر تو۔" وہ خود بھی بیٹھ گئی۔
"میری وجہ سے تم اپنی تفریح برباد نہ کرو بلکہ ایسا ہے' اگر تمہیں وقت لگے گا تو پلیز یار میں چلی جاتی ہوں۔"
وہ بوریت محسوس کر رہی تھی۔
"ہاں وقت تو ابھی لگے گا۔ سنبل کو بھی ابھی اور چیزیں لینا ہیں۔ ٹھیک ہے پھر تم نکلو ہم آجائیں گے۔"
وہ تو جیسے اس کی اجازت کی منتظر تھی۔ فوراً" کھڑی ہو گئی مگر باہر نکلنے کے آدھا گھنٹا بعد بھی وہ ٹیکسی تلاش کرنے میں ناکام رہی۔ ابھی وہ تھک کر اندر واپس جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ ایک سیاہ اکارڈ اس کے سامنے رکی اور فرنٹ سیٹ سے اترنے والی شخصیت کو دیکھ کر اسے رکنا ہی پڑا۔
"اینی پرابلم؟" وہ اتر کر قریب آیا۔ اس نے وجہ بتادی۔
"آپ کی گاڑی کہاں ہے۔"
"وہ میں مریم کے ساتھ آئی تھی۔"
"ویل! میں آپ کو ڈراپ کر سکتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں۔"
"نو۔۔۔ نو تھینکس۔ میں کچھ دیر بعد مریم کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔" وہ یوں بدکی جیسے وہ زبردستی اسے گاڑی میں بٹھا رہا ہو۔
"ویسے میں اتنا ناقابل اعتبار بھی نہیں ہوں۔ یو کین ٹرسٹ۔" اس کا لہجہ شریر تھا عزیزہ کو ماننا ہی پڑا۔
"ایک بات پوچھوں آپ سے؟" وہ گویا ہوا۔
"جی۔"
"آپ کو تو اسلام آباد میں ہی رہنا تھا نا پھر آپ یہاں؟"
"بابا کی ڈیتھ کے بعد کچھ فیملی پرابلمز کی وجہ سے ہم یہاں شفٹ ہو گئے۔" وہ سنبھل کر بولی۔
"اوہ سوری!" اسے افسوس ہوا۔
"ایک پرسنل سا سوال ہے۔ پوچھ سکتا ہوں۔"
عباد آج موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ خاموش رہی۔
"ایک کپ کافی پئیں گی میرے ساتھ۔" وہ جلدی سے بولا۔
"یہ پرسنل سوال ہے؟" وہ حیران ہوئی۔
آپ کا موڈ دیکھ کر بدلنا پڑا۔ چلیں اس کا ہی جواب دے دیں۔"
وہ مسکرا دی۔ اس کے رخسار پر پڑنے والے ڈمپل نے اس کو مزید دلکش بنا دیا تھا۔
"پھر کبھی سہی۔ ابھی امی انتظار کر رہی ہوں گی۔۔۔ بلکہ ایسا ہے کہ آپ کافی ہماری طرف ہی پی لیں۔"
عزیزہ نے سہولت سے انکار کر کے خود آفر کر دی۔
"آنٹی مائنڈ تو نہیں کریں گی؟"
"نہیں۔ وہ جانتی ہیں میں ہر ایرے غیرے سے بات نہیں کرتی اور گھر لانا تو بہت دور کی بات ہے۔"
"چلیں! شکر ہے آپ نے مجھے اپنوں کی لسٹ میں تو شامل کیا۔"
"ایسا میں نے کب کہا؟" وہ ترچھی نظروں سے دیکھتی مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

"آج رومانہ کا فون آیا تھا۔" رابعہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔
"کیسی ہے وہ اور کب تک شفٹ ہو رہی ہے؟" انہوں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی۔
"جلدی ہی کہہ رہی تھی۔"
"رابعہ! میں سوچ رہا تھا کیوں نہ ہم عباد کی شادی کر دیں۔ یار تنگ آگئے ہیں اس خاموشی سے۔ گھر میں کچھ رونق ہوگی۔ کوئی لڑکی وڑکی دیکھو۔" منصور صاحب نے ان کے دل کی بات کر دی۔
"بلکہ اگر عباد کی کوئی پسند یا کمٹ منٹ ہے تو بات کرو اس سے۔"
وہ دوسروں پر اپنی مرضی مسلط کرنے والے نہ تھے کچھ ان کا اپنا تجربہ ان کے ساتھ تھا سو وہ زبردستی کے قائل نہ تھے۔
"کمٹ منٹ تو نہیں۔۔۔ ہاں پسند کرتا ہے۔" وہ دھیرے دھیرے انہیں سب بتانے لگیں۔
"ہاں' ملا ہوں میں۔ بڑی پیاری بچی ہے لیکن۔۔۔" وہ رکے۔
"لیکن کیا۔"
"بی انگیجڈ ہو۔ ہو سکتا ہے ہی اس کے والدین کہیں اور کرنا چاہتے ہوں۔ ہم خود سے تو سب طے نہیں کر سکتے نا اور یہ صاحبزادے نے مجھ سے ذکر ہی نہیں کیا۔"
ان کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ ابھری۔ انہیں عباد کے سر کا ورد یاد آگیا۔
"مجھ سے جو کر دیا ہے۔ آپ کہیں تو میں جاؤں ان کے گھر؟ حالات کا علم ہو جائے گا اور میں عزیزہ سے بھی مل لوں گی۔" وہ خوشی سے پروگرام سیٹ کرنے

لگیں۔
"تو کیا تم نے نہیں دیکھا ابھی تک؟"
"کہاں دیکھا ہے۔ آپ کا بیٹا ہی دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے بلکہ ابھی تک تو ان کے درمیان اس ٹاپک پر بات بھی نہیں ہوئی۔ بتا رہا تھا جب بھی ملتا ہوں وہ سڑسر کی گردان سے ہی نہیں نکلتی۔ بات کیا خاک کروں۔" دونوں ہی ہنسنے لگے۔

✲ ✲ ✲

"آپ عزیزہ ہو نا؟" وہ بس سرہلا کے رہ گئی۔
"کیسی ہو آپ؟"
"میں ٹھیک ہوں۔ آئیے بیٹھیے۔" وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ کون ہیں۔
"سوری آنٹی! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" وہ ابھی تک انہیں پہچان نہ پائی تھی لیکن ان میں کسی کی شباہت تھی۔
"یہ تو میں تمہاری امی کو ہی بتاؤں گی۔" وہ ہنسنے لگیں۔
"وہ ذرا ساتھ والے فلیٹ میں گئی ہیں۔ میں فون کرتی ہوں۔" جلدی جلدی انہیں کہتی وہ اندر بھاگی۔ وہ گھر کا جائزہ لینے لگیں۔
مگر دیوار پر لگی ایک تصویر نے ان پر سکتہ طاری کر دیا۔ وہ بے ساختہ اس تصویر کی طرف بڑھی تھیں۔
"عافی۔۔۔"
"آنٹی! وہ امی بس۔۔۔"
"یہ تمہاری۔۔۔" انہوں نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ میری امی ہیں۔"
"نہیں نہیں۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹیں۔
"آنٹی آر یو آل رائٹ؟"
"تم عافیہ کی بیٹی ہو؟" وہ اسے بے یقینی سے دیکھنے لگیں۔
"جی مگر۔" انہوں نے بس اس کا اقرار سنا تھا۔ اس کے لاکھ پوچھنے اور روکنے کے باوجود وہ الٹے قدموں بھاگی تھیں۔ یہ کون سی حقیقت روشناس ہوئی تھی۔ یہ کیسا کڑوا سچ تھا جو انہیں حواس باختہ کر گیا۔ عزیزہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ عافیہ کے آنے پر اس نے ساری تفصیل بتا دی۔ وہ خود بھی پریشان ہو گئیں۔

✲ ✲ ✲

بیگ سینٹر ٹیبل پر ڈال کر وہ کارنر والے صوفے پر دراز ہو گئی اور انگلیوں کی پوروں سے کنپٹی کو دبانے لگی
"تھک گئی ہو؟"
"جی۔" اس نے عافیہ کی گود میں سر رکھ دیا۔
"اپنا خیال رکھا کرو۔ اپنا بھی حق ہوتا ہے بیٹا!" وہ ممتا سے چور لہجے میں کہنے لگیں۔ وہ بس مسکرا دی۔
"آج تمہاری چھوٹی تائی کا فون آیا تھا۔ مہک کی شادی کر رہے ہیں۔ مہک سے بھی بات ہوئی۔ تمہارا بہت پوچھ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی ہماری یاد نہیں آتی۔ کبھی تو فون کر لیا کرو بیٹا ان کا کیا قصور تھا۔"
عزیزہ کو پتا ہی نہ چلا کب آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر اس کے رخساروں کو نم کر گئے۔ مہک کو کتنا مس کرتی تھی وہ بھی۔
"لاہور آنے کے کچھ عرصے بعد میں نے اسے فون کیا تھا مگر وہ بھی دوسروں کی طرح مجھے غلط کہتی رہی واپسی کے لیے زور دینے لگی پھر بس میں نے دوبارہ اسے فون نہیں کیا۔" وہ دکھ سے بولی۔
"کیا آپ کو بھی لگتا ہے امی میں نے غلط کیا؟"
"جو گزر گیا اسے غلط یا صحیح کہنے سے گزرا وقت واپس نہیں آسکتا عزیزہ! لیکن ہم اپنے آنے والے وقت کو ماضی کی تلخیوں کی وجہ سے کیوں بگاڑیں۔ تمہارے سامنے ابھی لمبی زندگی پڑی ہے۔ اسے اچھے سے گزارنے کے لیے تمہیں ایک اچھے انسان کا ساتھ چاہیے۔ میں جانتی ہوں نعمان نے جو کیا اس نے لوگوں سے تمہارا اعتبار اٹھا دیا لیکن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اس دنیا میں ضرور کوئی ایسا ہو گا جو تمہیں وہ سب خوشیاں دے گا جو تمہارا حق ہوں گی۔ بس

صرف وہ ہاتھ تھامنے کی دیر ہے۔" وہ خود بھی آبدیدہ ہو گئیں۔
"آپ میری وجہ سے بہت پریشان رہتی ہیں نا امی۔" وہ ان کے ہاتھ چومتے ہوئے بولی۔
"یہ پریشانی تو ہر بیٹی کی ماں کو ہوتی ہے نا۔ پھر میں اکیلی جان ہوں۔ کب آنکھیں بند کر لوں۔ اسی لیے کہتی ہوں واپس چلتے ہیں۔ وہیں جہاں تمہارے بابا کی یادیں ہیں۔ تمہارا ہنستا کھیلتا بچپن ہے۔"
"ٹھیک ہے امی! ہم مستقل نہیں جا رہے لیکن مہک کی شادی پر چلیں گے۔" اس نے تھک کر ہار مان لی اور عافیہ کھل اٹھیں۔
"واقعی۔"
"پہلے آپ کی اتنی نافرمانی کر چکی ہوں۔ اب نہیں۔" وہ روتے چہرے کے ساتھ ہنس دی۔

✲ ✲ ✲

یاد کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ انسان اپنے ماضی کی تمام تر رنجشیں راحتیں، تلخیاں، ہجر و وصل، موسموں کی رعنائیاں، رت جگوں کی کرم فرمائیاں حتیٰ کہ ماہ و سال کے دھاگے میں لپٹی ہوئی خواہشیں اور حسرتیں یاد کے دامن میں سمو لیتا ہے لیکن دامن ہے کہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ کبھی تنگی داماں کا احساس نہیں ہونے دیتا۔ یاد کے دامن میں بیٹھا انسان کبھی بچپن کی بے وقوفیاں دھیان میں لے آتا ہے تو کبھی جوانی کے سرکش گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے۔
کبھی ماضی کی کھٹی میٹھی باتوں سے محظوظ ہوتا ہے تو کبھی تلخی ایام کا زہر قطرہ قطرہ گردش کرتا نظر آتا ہے۔ ایسے میں انسان پر ایک وحشت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور ان یادوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ تلخی ایام بجا سہی لیکن اس میں بیچاری یاد کا کیا قصور۔ یہ تو بس انسان کے ماضی کی اسکرین پر چلتی ہوئی ایک فلم دکھا رہی ہوتی ہے۔
عزیزہ کی یادیں اس گھر میں اس قدر گہری تھیں کہ ان سے وہ پیچھا چھڑا ہی نہیں سکتی تھی۔ آج جب ڈیڑھ سال کے بعد اس نے اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کی کیفیات میں ایک تلاطم اٹھا تھا۔ کتنے طوفان بپا تھے۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کے دل پر برس رہے تھے۔ کتنی آنکھوں میں بیک وقت آنسو جھلملائے تھے۔ محبتوں کے امین یہ لوگ آج بھی ویسے ہی تھے۔ آج بھی ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے وہی محبت تھی جو عزیزہ کے ڈیڑھ سال پہلے کیے گئے فیصلے کی بھینٹ نہ چڑھی تھی۔
گھر میں ڈھولک رکھی جا چکی تھی ان لوگوں کے آنے پر نئے سرے سے خوشیاں منائی گئیں۔ عافیہ بیگم کو مہک کی ساری چیزیں دکھائی گئیں۔ مہک عزیزہ کا سر کھا رہی تھی کہ وہ اتنی لیٹ آئی ہے اور یہ کہ اسے مہندی عزیزہ ہی لگائے گی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ درمیان کا ایک لمبا عرصہ یہ لوگ ایک دوسرے کے بغیر رہے ہیں

"یہ رومانہ کہاں ہے۔" عافیہ کے پوچھنے پر نفیسہ سر جھکا گئیں۔ میمونہ کو ہی بولنا پڑا۔
بھابھی! وہ لوگ تو لاہور شفٹ ہو گئے ہیں۔"
"کیا! لیکن کب؟" عافیہ چونکیں۔
"بس بھابھی! ویسے تو وہ بہت اچھی ہے۔ ہنسنے بولنے والی مگر پتا نہیں کیا ہوا کہ نعمان رومانہ کو لے کر وہیں شفٹ ہو گیا۔ آج ہی آئیں گے وہ لوگ اور رومانہ کے گھر والے بھی۔" میمونہ چپ ہو گئیں اور نفیسہ کے آنسو چپکے چپکے گرنے لگے۔
"ارے بھابھی! کیوں روتی ہیں جب نعمان کو ہی احساس نہیں۔"
"اولاد جیسے خوش ہو والدین کیا کر سکتے ہیں۔"
"چلیں! آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ اللہ بہتر کرے گا۔"
"اگر آج رومانہ کی جگہ عزیزہ۔۔۔"
"جس کی جگہ جہاں ہوتی ہے وہ وہیں ہوتا ہے۔" عافیہ نے نفیسہ کی بات کاٹ دی۔

✲ ✲ ✲

جب ہم تنہائی میں دعا مانگتے ہیں تو دراصل اس

حقیقت کا اعلان کرتے ہیں کہ اللہ ہمارے پاس ہے۔
وہ ہماری خاموشی کی زبان کو بھی سنتا ہے اور دل کا حال بھی بخوبی جانتا ہے۔ دعا میں خلوص آنکھوں کو پر نم کر دیتا ہے اور یہی آنسو دعا کی قبولیت کی دلیل ہیں۔
وہ بھی اپنے آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ وہ دعا میں کیا مانگتی تھی۔ بس ہاتھ اٹھاتے ہی اس کے آنسو اس کے رب کی بارگاہ میں اسے ریزہ ریزہ بکھیر دیتے اور پھر دعا کے بعد اس کے دل میں اترتا سکون اس کی ذات کو پھر سے یکجا کر دیتا۔ جائے نماز تہہ کر کے جیسے ہی وہ پلٹی اس شخص کی وہاں موجودگی نے اسے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔
"آپ؟" وہ سراپا سوال ہوئی۔
"کچھ بات کرنا تھی تم سے۔" وہ سامنے آگیا۔
"جی۔" جائے نماز ساتھ پڑی کرسی پر رکھ دی۔
"تم مجھے کیا سمجھتی تھیں؟" اگر نعمان کی یہاں موجودگی حیران کن تھی تو یہ سوال اس سے زیادہ عجیب تھا۔ وہ گنگ رہ گئی۔
"آخر ڈیڑھ سال ہماری منگنی رہی ہے۔ کوئی انسیت کوئی لگاؤ۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔
"نہیں۔ ایک یہی احسان تو کیا ہے آپ نے مجھ پر کہ آپ کے رویے نے کبھی کوئی خوش کن خیال آنے ہی نہ دیا۔" اس کا لہجہ کھردرا ہو گیا۔
"تو پھر یہ غصہ یہ ناراضی... کیا معنی رکھتی ہے۔"
"آپ کے خیال میں... میں منگنی ٹوٹنے کا دکھ لیے بیٹھی ہوں؟" اسے شاک لگا۔
"میرا دکھ یہ ہے کہ آپ کی وجہ سے میرے بابا چلے گئے۔ میں امی اور غیراث تنہا رہ گئے۔ ہم بکھر گئے۔ بچھڑ گئے اپنوں سے۔ خونی رشتوں سے دور ہو گئے کیا یہ کافی نہیں ہے آپ سے دور رہنے کے لیے؟" وہ روہانسی ہو گئی۔
"میں مانتا ہوں! عزیزہ میرا انکار اس سب کا باعث بنا لیکن کیا ہوتا اس وقت جب مجھ سے شادی کے بعد بھی تم خوش نہ رہتیں۔ کیا گزرتی رحمن چاچا پر جب انہیں یہ پتا چلتا کہ میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں مانتا ہوں میرا انکار بعد از وقت تھا لیکن اس کے نتائج یہ ہوں گے یہ مجھے بھی معلوم نہ تھا اور جہاں تک رحمن چچا کی موت کا سوال ہے۔ تو اس کا مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا کہ تمہیں ہے اور آج میں اسی لیے تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔"
وہ دونوں بیٹھ گئے۔ نعمان نے اس سے منگنی کرنے سے لے کر ٹوٹنے تک کی تمام وجوہات بتا دیں۔
"کچھ عرصہ تو میری خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ بس دل کہتا تھا میں ٹھیک ہوں اور میں دل کی سنتی رہی مگر آج امی اور غیراث کے چہروں پر پھیلتی چمک نے مجھے احساس دلایا کہ شاید میں خود غرض بن کر فیصلہ کر گئی۔ ان دونوں کے ساتھ بھی زیادتی کی مگر اس وقت..." اس کے لفظوں میں پہلے جیسی خفگی مفقود تھی۔ شاید اب وہ بھی تھک گئی تھی۔
"کیا فائدہ اب اس بحث کا... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔"
"فائدہ کیوں نہیں۔ ساری خوشیاں لوٹ آئیں گی۔ سب پھر سے ایک ہو جائیں گے اگر تم واپس آجاؤ تو۔"
"رومانہ بھابھی جانتی ہیں کہ۔" وہ رکی۔
"ہاں! سب جانتی ہے۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ بس واپسی کی تیاری کرو۔ دیکھو سب لوگ تمہارے آنے سے کتنا خوش ہیں۔"
"اتنا آسان نہیں ہے لیکن پھر بھی کوشش کروں گی۔" وہ مسکرائی۔
"رومانہ سے کوئی پرابلم تو نہیں ہو گی تمہیں۔" وہ اسے چھیڑنے لگا۔
"ہاں ہو گی۔ اگر آپ بھابھی کی بلاوجہ فیور کریں گے تو بہن کو دکھ ضرور ہو گا۔" وہ بھی شرارت سے گویا ہوئی۔

☼ ☼ ☼

محبت دنیا کا وہ جذبہ ہے جس کے لیے نہ تو قوت ارادی کی ضرورت ہے اور نہ ہی زور بازو کی۔ بس ایک

لمحے میں دل کے گہرے سمندر میں لہروں کا طوفان موجزن ہوتا ہے اور یہ طوفان ہماری کشتی کو یا تو کنارا دے دیتا ہے یا ہمیشہ کے لیے اپنی گہرائیوں میں لے ڈوبتا ہے مگر وہ ڈوبنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی کشتی کا کنارا چاہتی تھی۔ وہ احساس جو کبھی نعمان کے لیے محسوس نہ ہوا وہ کشش جو ایک رشتے میں بندھنے کے بعد بھی نعمان کے لیے پیدا نہ ہوئی وہ اس بے نام رشتے کے لیے جاگی تھی۔

"عباد منصور" اس کے دل کے کاغذ پر ابھرنے والا پہلا نام تھا۔ وہ ہنستا مسکراتا' شوخ' شرارتی سا انسان کب اس کی سوچوں کا محور بنا' وہ خود بھی نہ جان پائی۔ کب دل کے دروازوں کو کھولتا' وہ بنا کسی آہٹ کے براجمان ہو گیا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی۔

اسے سوچنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ یہ اس وقت کوئی عزیزہ سے پوچھتا جو آج یہ حقیقت تسلیم کر کے مطمئن ہو گئی تھی کہ اسے بھی عباد سے محبت ہو گئی ہے۔ پچھلے پندرہ دن سے اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ایک ہفتے سے وہ یہاں شادی میں مصروف تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ مصروفیت کی وجہ سے نہ آسکا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ دنیا واقعی گول ہے۔ آج سے پچیس سال پہلے جن رشتوں ناتوں سے بھاگ کر وہ اپنی الگ دنیا بسا چکی تھیں' وہ اب پھر سے ان کے سامنے آنے لگے تھے۔ اس وقت ان کی حالت جو تھی' سو تھی مگر عافیہ کی جو حالت تھی' وہ بھی ان سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔ رسمی سلام دعا کے بعد دونوں ہی ایک دوسرے سے کنارا کر گئیں۔ وہ عافیہ سے نظریں نہ ملا پا رہی تھیں مگر ان کے برعکس منصور صاحب نے عافیہ سے نہ صرف ان کا حال پوچھا تھا بلکہ ان بھولے بھٹکے لوگوں کا بھی جو کبھی رابعہ کے سب سے زیادہ اپنے تھے۔

رات کے دو بجے اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی وہ آج سے پچیس سال پہلے والی رابعہ تھیں۔

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں اگر میں رابعہ کو یہاں لے آؤں؟" صادقہ نے ڈرتے ڈرتے حسین صاحب سے پوچھا۔

"نہیں' مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ پھر سے فائل پر جھک گئے۔ صادقہ' حسین نظامی کی دوسری بیوی تھیں۔ ان کی پہلی بیوی بیٹی کی پیدائش پر انتقال کر گئی تھیں۔ صادقہ خود پہلے سے ایک بچی کی ماں تھیں لیکن شادی کے وقت رابعہ کو نہ لا سکیں' مگر اب جبکہ وہ جان چکی تھیں کہ وہ ایک نہایت ہی سلجھے ہوئے اور شفیق انسان ہیں تو انہوں نے سوچا ان کی بیٹی بھی یہیں آجائے۔

"تو میں کل لے آؤں اسے؟" وہ خوش ہو گئیں۔

"ہاں! لیکن دھیان رہے کہ عافیہ اور رابعہ میں نہ میں کبھی فرق کروں گا اور نہ ہی..... تم۔" انہوں نے تنبیہہ کی۔

اکٹھے کھیلتے کودتے کب وہ دونوں جوان ہوئیں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ دونوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت تھیں۔ ہاں' عافیہ غصے کی قدرے تیز تھی لیکن رابعہ کی نرم مزاجی کی وجہ سے اچھی نبھ رہی تھی۔ اس محبت بھری زندگی میں پہلی دراڑ اس وقت پڑی جب حسین صاحب کے ایک قریبی دوست نے اپنے بیٹے منصور کے لیے عافیہ کا ہاتھ مانگا۔ یہ خبر رابعہ اور منصور کے لیے کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ وہ دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔

ادھر انہوں نے رشتے کی بات کی' ادھر حسین صاحب نے ہاں کر دی۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ تھا۔ دونوں گھروں میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔

"منصور میں..... میں مر جاؤں گی۔ پلیز کچھ کرو۔" وہ رونے لگی۔ اس کی عافیہ کی طرف پشت تھی جو اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔

"دیکھو تم..... تم ہی کچھ کر سکتے ہو پلیز..... پلیز منصور انکار کر دو۔"

عافیہ نے ستون کا سہارا لیا۔ بیشک اسے منصور سے

محبت نہ تھی مگر وہ اس کا ہونے والا شوہر تھا اور یہ اس کی بہن۔

"تم کیسے یہ شادی کر سکتے ہو جبکہ ہم دونوں....." وہ چلاتے ہوئے گھومی تھی مگر ریسیور اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔

"امی..... امی..... بابا!" عافیہ پوری قوت سے چلائی تھی۔

"کیا ہوا بیٹا!" ساری بات انہیں بتا کر اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"اب چاہے آپ ان کی شادی کریں یا نہ کریں لیکن میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" وہ غصے سے پلٹی مگر ایک منٹ کے لیے دیوار کے ساتھ بت بنی کھڑی رابعہ کے پاس رکی۔

"زندگی کی قیمتی چیزوں اور رشتوں کو ہر کوئی سنبھال کر رکھتا ہے مگر کچھ لوگ چور دروازوں سے آکر سب لوٹ لے جاتے ہیں۔ اپنی قیمتی چیزیں اور رشتے سنبھال کر رکھنا۔ کوئی چور تمہارے گھر کا راستہ نہ ناپ لے۔" وہ پھنکاری۔

اگلی شام سادگی سے ان دونوں کا نکاح کر دیا گیا اور حسین صاحب کے ساتھ ساتھ صادقہ نے بھی رابعہ سے ہر طرح کا تعلق توڑ لیا۔ البتہ منصور صاحب کی فیملی نے طوعاً" کرہاً" اسے قبول کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی کی وجہ سے اس نے پندرہ دن کی چھٹیاں لی تھیں مگر واپس آنے کے بعد اسے بخار ہو گیا۔ آج طبیعت میں کچھ بہتری محسوس ہوئی تھی۔ اس لیے اس کا کل آفس جانے کا ارادہ تھا۔

"کیا بات ہے امی کچھ پریشان ہیں آپ؟ جب سے شادی سے آئی ہیں' چپ چپ ہیں۔" وہ مگ نکال کر سامنے آکر بیٹھ گئی۔

"کچھ روز سے تمہارے نانا ابو اور نانو یاد آرہے ہیں۔" وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

"اوہ..... اچھا دیکھیں' روئیں تو نہیں۔" وہ فوراً ان کے گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"عزیزہ! سگے رشتوں کے دکھ ہمیشہ ہرے ہی رہتے ہیں۔ وقت کی گرم ہوائیں انہیں سکھا نہیں پاتیں۔" وہ کھوئی کھوئی سی کہہ رہی تھیں۔

"کیسے دکھ امی؟"

"ہاں عزیزہ..... میں بتانا چاہتی ہوں..... کسی کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں اور تم سے اچھا دوست تو میرا کوئی ہے ہی نہیں۔" وہ نم آنکھوں سے مسکرا دیں۔ "مگر وعدہ کرو یہ بات تم کبھی عباد کو نہیں بتاؤ گی۔ تم نے رومانہ کی آنٹی کو دیکھ کر کہا تھا ناکہ یہ وہی آنٹی ہیں جو اس روز ہمارے گھر آئی تھیں اور پھر اچانک....."

"جی۔"

"تو وہ کوئی اور نہیں تھیں۔ تمہاری..... تمہاری خالہ تھیں۔"

"کیا؟ عباد کی مدر میری..... میری خالہ ہیں۔" وہ شاک میں تھی۔

☼ ☼ ☼

سیل فون کی مسلسل بیپ نے اس کی نیند توڑی تھی۔ آج وہ عافیہ سے باتیں کرتے کرتے وہیں سو گئی تھی۔ بے دھیانی میں کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو۔"

"ہیلو۔" مگر خاموشی

"ہیل..... لو۔"

"مجھے آپ سے ابھی اور اسی وقت ملنا ہے۔ میں آؤں یا آپ آرہی ہیں؟" اس آواز کو تو وہ لاکھوں میں بھی پہچان سکتی تھی۔

"جی۔" وہ فقط اتنا ہی کہہ پائی۔

"کسی کو اتنا نہیں آزمانا چاہیے کہ آزمائش درد دینے لگے۔" وہ شدت جذبات سے گویا ہوا۔ وہ بے چین ہو گئی ایک گھنٹے بعد وہ اس کے سامنے موجود تھا۔ ریسٹورنٹ کے فسوں خیز ماحول میں وہ بس خاموشی سے اپنے ہاتھوں کو تکے جا رہی تھی۔

"کچھ کہیں گی نہیں؟"

"کیا؟"

"یہی پوچھ لیں کہ اتنی ایمر جنسی میں کیوں بلایا ہے۔"

آج عباد کے لیے ایک ایک پل قیمتی تھا۔

"آپ خود ہی بتا دیں۔" اسے نظریں اٹھانا دشوار ہو گیا۔

"عزیزہ... ادھر دیکھیں میری طرف۔" اس نے بمشکل تمام نظریں اٹھائی تھیں مگر عباد کی آنکھوں میں بسے رنگوں نے پھر سے جھکانے پر مجبور کر دیا۔

"ایسا کب تک چلے گا عزیزہ؟"

"کیا؟"

"یہی کہ تم مجھ سے بھاگتی رہو۔" وہ شکوہ کرتے "آپ" سے "تم" کا سفر طے کر گیا۔

"میں آپ سے بھاگ تو نہیں رہی۔" اسے عباد کا تم کہنا اچھا لگا۔

"تو ہاتھ بھی تو نہیں آ رہیں۔"

"آپ نے ہاتھ بڑھایا ہی کب ہے۔" وہ کہنے لگی۔

"ڈرتا ہوں اگر تم نہ تھامو تو۔"

"اس ڈر سے کہ کل کیا ہوگا، ہم اپنا آج برباد کر لیں تو اس میں قصور ہمارا ہے یا ہماری قسمت کا؟" وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگی۔ وہ مسکرا دیا۔

"تو ٹھیک ہے میں پوری دنیا کے سامنے تمہارا ہاتھ تھامنا چاہتا ہوں۔ تمہیں اپنانا چاہتا ہوں عزیزہ... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

عباد کی بوجھل آواز اس کے چاروں اور پھول ہی پھول کھلا گئی۔ وہ جسے چاہتی تھی وہ بھی اسے چاہتا تھا۔ اس کے رب نے اسے کتنی محبت سے نوازا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمکین پانی بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ننھے موتیوں نے عباد کو پریشان کر دیا۔

"تمہیں پتا ہے میں پہلی مرتبہ بھی تمہارے آنسوؤں سے ڈسٹرب ہوا تھا مگر ان کی وجہ نہ میں اس وقت سمجھ سکا تھا اور نہ ہی آج۔" وہ بے چارگی سے کہنے لگا۔

"آپ بہت سی باتوں سے لاعلم ہیں۔ آپ میرے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ شاید آپ کا فیصلہ بدل جائے۔"

"تمہارا ماضی کیا تھا، مجھے پروا نہیں، مجھے تمہارا حال خود سے جوڑنا ہے تاکہ تمہارے مستقبل میں تمہارا ماضی اور حال میں بن جاؤں۔"

"مگر مجھے گلٹ رہے گا۔" وہ پھر سے گود میں دھرے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

"ٹھیک ہے مگر یہ طے ہے کہ میں اپنے لفظوں پر قائم رہوں گا۔" وہ مضبوطی سے بولا۔

عزیزہ نے بس ایک پل کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر اپنی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق اس کے سامنے کھول ڈالا۔

"میں انہیں معاف کر چکی ہوں اور میری دعا ہے کہ وہ اور روحانہ ہمیشہ خوش رہیں۔"

اس نے ایک بار بھی عباد کی طرف نہ دیکھا تھا۔ جانے اس کی نظروں میں اب وہ شوق کا جہاں ہو یا نہ ہو مگر اس کے چپ ہونے کے بعد بھی عباد کی خاموشی اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ اس نے سر اٹھایا وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"میرے خیال سے تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ میرا وعدہ ہے اس ٹاپک پر ہمارے درمیان پھر کبھی بات نہیں ہوگی۔ تم بھی بھول جاؤ... میری محبت اتنی ارزاں نہیں ہے۔ عزیزہ! میری زندگی میں تمہارا کیا مقام ہے، اس کا اندازہ تمہیں میری زندگی میں شامل ہونے کے بعد ہوگا۔" وہ رکا اور پھر دھیرے سے عزیزہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"محبت کرتی ہو مجھ سے؟" اس کے لفظوں میں یقین تھا۔ دل چاہا فوراً "ہاں" کہہ دے لیکن زبان کھلنے سے انکاری تھی۔ دھڑکنوں نے الگ اودھم مچا دیا۔ اپنے کانپتے دل کو سنبھالتے اس نے محض اس کی سمت دیکھا تھا اور دل کا حال عیاں ہو گیا۔

عباد نے نرمی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "کوئی بات نہیں۔ ایک دن میں نے تم سے یہ اگلوا نہ لیا تو میرا نام بھی عباد نہیں۔ ابھی کے لیے اتنا ہی کافی ہے ورنہ تمہارے ٹھنڈے ہاتھوں سے تو لگ رہا ہے ابھی بے ہوش ہو جاؤ گی۔"

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ویٹر کو اشارہ کیا۔ "ویسے ایک افسوس ساری زندگی رہے گا۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے یہ شادی کیوں مس کر دی ورنہ تمہیں خود مما سے ملواتا۔ اب دیکھو وہ جانتی بھی نہیں کہ اپنی ہونے والی بہو سے مل چکی ہیں۔" وہ پھر شریر ہوا مگر عزیزہ اسے بتا نہ پائی کہ وہ سب جانتی ہیں۔

وہ آفس سے سیدھا گھر آیا کیونکہ آج منصور صاحب اور رابعہ کو واپس آنا تھا۔ وہ لوگ اسلام آباد سے کوئٹہ چلے گئے تھے جہاں منصور صاحب کے چچازاد کے بیٹے کی شادی تھی۔ کافی دن بعد جانا ہوا تھا سو انہیں زیادہ دن لگ گئے۔ آج ان کی واپسی ہوئی تھی۔

رابعہ اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ وہیں آ گیا۔ وہ ابھی ابھی وضو کر کے آئی تھیں۔ وہ ان سے لپٹ گیا۔

"میری پیاری مما! کتنے دن لگا دیے۔ میں اداس ہو گیا تھا۔" وہ لاڈ کرنے لگا۔

"میں بھی... اتنی لیٹ کیوں آئے ہو۔" اب ان کا ارادہ تھوڑی دیر بعد نماز ادا کرنے کا تھا۔

"بس، تھوڑا کام تھا۔ پاپا کہاں ہیں؟" جانے کیوں وہ بتا نہ پایا کہ عزیزہ کے ساتھ تھا۔

"کلب گئے ہیں۔"

"کیسا رہا ٹور؟ انجوائے کیا؟" عباد نے تکیہ گود میں رکھ لیا۔

"ہاں مگر تھکاوٹ بہت ہو گئی ہے۔"

"وہ بھی اتر جائے گی۔ یہ بتائیں سب کیسے تھے؟"

"ٹھیک تھے۔ جاؤ فریش ہو جاؤ۔ میں آتی ہوں۔ تم سے ضروری بات کرنا ہے۔"

"ارے! تو ابھی کریں نا۔ انتظار ہی تو کر رہا ہوں۔" وہ شوخ ہوا۔

"جو کہا ہے وہ کرو اور جاؤ یہاں سے۔" وہ سنجیدہ تھیں۔

"کیا بات ہے مما؟" وہ پریشان ہو گیا۔ رابعہ کو دکھ ہوا۔

"میں آتی ہوں نا۔ پھر بات کرتے ہیں جاؤ شاباش۔" وہ سنبھلیں مگر عباد حیران تھا۔ رابعہ کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔ وہ آج ہی تو عزیزہ کو بتا کر آیا تھا کہ اس کی مما نے یقیناً اسے عباد کے حوالے سے ہی دیکھا ہوگا کیونکہ منصور صاحب نے انہیں ضرور بتایا ہوگا کہ عزیزہ ان کے آفس میں ہے اور وہ انہیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الگ تھا۔

"شاید کوئی اور پرابلم ہو۔" وہ سر کھجا کر رہ گیا۔

"عباد تم... تم عزیزہ کو بھول جاؤ۔" انہوں نے گویا اس کے سر پر بم پھوڑا۔

"کیا... لیکن کیوں مما؟"

"کیونکہ تمہاری ماں کہہ رہی ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟" وہ غصے سے بولیں۔

"کوئی وجہ بھی تو ہو... کل تک تو آپ خود... پھر اچانک۔"

وہ بے ربط ہوا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا رابعہ کسی اپنے مسئلے کے بارے میں بات کریں گی مگر ان کے لفظوں نے تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

"بس مجھے وہ لڑکی پسند نہیں۔" وہ رخ پھیر گئیں۔

"لیکن کیوں؟ یہی تو پوچھ رہا ہوں۔" وہ ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھتا نیچے ہی بیٹھ گیا۔

"عباد بیٹا... وہ لڑکی..." وہ اسے کیسے بتاتیں۔

"مما! کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسا کیا ہوا؟" وہ دو زانو ہوا۔

"عباد بس... یہ یقین رکھو تمہاری ماں تم سے غلط نہیں کہہ سکتی۔" وہ کندھوں سے تھامتے بولیں۔

"میں جانتا ہوں مما! لیکن ایسا کیا ہے جو میں نہیں جان سکتا؟" وہ بضد ہوا "میری محبت ہے وہ مما۔ میں خوش نہیں رہوں گا اس کے بنا۔"

"تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بس جب میں نے کہہ دیا اب تم اس لڑکی کے لیے ماں سے آرگیو کرو گے؟" وہ برہم ہو گئیں۔

وہ اسے کیسے بتاتیں کہ عافیہ کبھی بھی اس رشتے کے

لیے نہیں مانیں گی۔

انہوں نے عافیہ کے ساتھ جو کیا تھا وہ تو نرم مزاج انسان بھی معاف نہ کرے پھر عافیہ بیگم تو ویسے بھی غصے کی تیز تھیں ان کو آج بھی عافیہ بیگم کے الفاظ یاد تھے کتنا سرد لہجہ تھا اس کا لیکن وہ بھول گئی تھیں کہ وقت کی گرد جب زندگی کے ماہ و سال پر پڑتی ہے تو وہ زندگی کی شکل و صورت تبدیل کر دیتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے آنٹی! بڑی خاموشی ہے آج تو۔" وہ ابھی ابھی آئی تھی اور آتے ہی عباد کی غیر معمولی سنجیدگی پر حیران ہوئی۔

"نہیں۔۔۔ بس ویسے ہی نعمان نہیں آیا؟"

"نہیں۔ کل لینے آئے گا۔ مجھے چیک اپ کے لیے جانا تھا۔ سوچا آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے ویسے احتیاط کیا کرو۔ پہلی مرتبہ ذرا بے احتیاطی ہو جائے تو مسئلے بڑھ جاتے ہیں۔" وہ اسے سمجھانے لگیں۔

"رومانہ! تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"جی آنٹی کہیے۔" وہ کشن پیچھے لگا کر بیٹھ گئی۔

"بات دراصل یہ ہے رومانہ کہ۔۔۔" انہوں نے اسے عزیزہ اور عباد کے متعلق سب بتا دیا اور کچھ رد و بدل کے بعد اپنے عزیزہ کے لیے منع کرنے کی وجہ بھی۔

"مگر آنٹی یہ بات اتنی بڑی تو نہیں کہ آپ رشتہ ہی نہ مانگیں۔ ہو سکتا ہے وہ مان جائیں۔" رومانہ کو ایک منٹ لگا تھا سوچنے میں۔

"میں عافیہ کو جانتی ہوں۔ وہ اب تک دل میں لیے بیٹھی ہو گی۔"

"آنٹی سالوں گزر جانے کے بعد واقعے، قصے بن جاتے ہیں اور وہ بھی دھول مٹی سے اٹے۔ اگر آپ کو عزیزہ ۔۔۔ پسند ہے تو کیا حرج ہے۔" وہ انہیں سمجھانے لگی۔

"الٹے الٹے خیالات کو دل میں جگہ نہ دیں اور عباد سے تو نارمل بات کرنا چاہیے تھی آپ کو۔ اس کے ساتھ ایسے مت کریں ورنہ وہ آپ کو غلط سمجھے گا۔" وہ فکر مند ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا یہ مسز رابعہ منصور کا نمبر ہے؟" اجنبی نمبر سے آنے والی کال پر اپنا نام سن کر وہ چونکیں۔

"جی ہاں! آپ کون؟"

"یہ چھوڑیے بس آپ کو یہ بتانا ہے کہ بدلے کا وقت آ گیا ہے۔ پچیس سال پہلے آپ نے کسی کا ہونے والا شوہر چھینا تھا۔ اب اپنا بیٹا کھونے کے لیے تیار رہیے۔ اسے آپ سے چھین کر ہی مجھے سکون ملے گا۔"

سپاٹ آواز، چٹانوں سا سخت لہجہ اور دل ہلا دینے والے لفظ ان کے ہوش اڑا گئے۔ زمین آسمان ان کے سامنے گھومنے لگے۔ ان کا ماتھا عرق آلود ہو گیا۔ وہ ریسیور کریڈل پر ڈالنا بھی بھول گئیں۔

☼ ☼ ☼

"لگتا ہے سورج مغرب سے نکلا ہے۔" دروازہ کھولتے ہی رومانہ کا ہنستا چہرہ نظر آیا۔

"چلو جی! آ تو گئی ہوں۔ تمہیں تو یہ توفیق بھی نہیں ہوئی۔" وہ چہکی۔

"آنٹی کہاں ہیں؟"

"نماز پڑھ رہی ہیں۔ آپ سنائیں کیسی گزر رہی ہے۔" عزیزہ نے دوپٹہ درست کرتے پوچھا۔

"بھئی! مجھے یہ آپ جناب نہ کہا کرو۔" اس نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

"او کے رومانہ صاحبہ۔"

"چلو اسی بات پر اچھی سی کافی پلاؤ۔" وہ اٹھی۔ ساتھ ہی عافیہ آ گئیں۔

"آپ تو ہمارے گھر ہی نہیں آئیں۔ رابعہ آنٹی بھی کہہ رہی تھیں آپ کو انوائٹ کرنا ہے۔"

"رابعہ؟"

"کیوں وہ نہیں کہہ سکتیں؟"

"نہیں وہ۔" وہ سنبھلیں "نعمان کیسا ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہیں آنٹی! مارکیٹ جانا تھا مجھے، سوچا سنڈے ہے عزیزہ فری ہو گی اسے ساتھ لے لوں۔"

"ہاں ہاں چلی جائے بس ذرا جلدی آ جانا۔"

"کافی میڈم!" عزیزہ کافی لے آئی۔

"جاؤ عزیزہ! رومانہ کے ساتھ۔" انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کیا۔

"مجھے لے جانا فضول ہی ہے۔"

"تم چلو تو سہی۔"

☼ ☼ ☼

"کچھ کریں منصور! پلیز کچھ کریں۔"

"مجھے وہ نمبر دو ابھی۔" رابعہ کے بتائے واقعے نے انہیں بھی پریشان کر دیا۔

"یہ تو پی سی او کا نمبر ہے۔" رابعہ نے سانس کھینچی۔

"تم ایزی رہو۔۔۔ کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ عافیہ یا عزیزہ ایسی نہیں ہیں۔۔۔ میرا نہیں خیال وہ ایسا کریں گی۔" منصور صاحب الجھ گئے آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

"آئندہ تم ان نون (نامعلوم) نمبر اٹینڈ نہیں کرو گی۔" وہ انہیں تسلی دینے لگے۔

★★★

گلا کھنکارتی وہ اس کے بالکل پیچھے آ گئی۔ وہ کہیں اور گم تھا ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ ہاتھ میں پکڑی تصویر نیچے گر گئی۔ رومانہ نے جھٹ سے اٹھالی۔

"رومی۔۔۔ رومی۔" وہ روکتا ہی رہ گیا۔

"ارے واہ! سر درد بھگانے کا بہت خوب صورت طریقہ ہے۔" اس نے تصویر کا رخ اس کی طرف کیا۔ یہ تصویر اس نے زبردستی عزیزہ کے ساتھ بنوائی تھی۔ وہ محض سر کھجا کر رہ گیا۔

"تم کہو تو۔۔۔ میں عزیزہ کی امی سے بات کروں؟" وہ پُرجوش سی کہنے لگی۔

"پہلے مما تو راضی ہوں۔" وہ رک گیا۔

"آنٹی کو اعتراض ہے کیا؟" وہ انجان بنی۔ عباد کو سب بتانا پڑا۔

"مما عجیب سا بی ہیو کر رہی ہیں۔ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔" وہ الجھا الجھا سا کافی ڈسٹرب تھا۔

☼ ☼ ☼

"فون نہ اٹھانے سے آپ کی قسمت نہیں بدل جائے گی۔ میں آپ کی بربادی ہوں اور آپ کے گھر کا راستہ دیکھ چکی ہوں۔ آج شام میرا انتظار کیجیے گا میں آ رہی ہوں۔"

"کون ہو تم۔۔۔ میں تم سے نہیں ڈرتی۔ سنا تم نے ۔۔۔ اور میرے بیٹے کی طرف دیکھا بھی تو آنکھیں نوچ لوں گی تمہاری۔"

وہ چیختی رہ گئیں مگر فون بند ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہارے آفس کے باہر کھڑا ہوں۔ جلدی باہر آؤ۔"

"مگر عباد۔"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ ویسے بھی تمہارا ٹائم ہو ہی گیا ہے۔ کم آن۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔" اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی فون کاٹ دیا گیا۔

پورے پندرہ منٹ بعد وہ اس کے ساتھ تھی۔

"سوری بٹ اٹ واز آ گڈ چانس۔" (یہ ایک اچھا موقع تھا)۔

"چانس؟" وہ نہ سمجھی۔

"مما کی طبیعت تھوڑی خراب ہے تو تم انہیں پوچھنے کے لیے جا رہی ہو۔" وہ فراٹے سے بولا۔

"میں۔۔۔ مگر عباد اچھا نہیں لگتا۔ ایسے میں۔۔۔ آپ کے ساتھ۔" وہ اٹکی۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ کچھ بیمار ہیں۔ تمہیں خود آنا چاہیے تھا مگر پتا نہیں کیا وجہ ہے کہ تم۔۔۔" وہ خفا ہوا۔

"بات وہ نہیں ہے۔ میں آپ کو نہیں سمجھا سکتی۔" وہ رخ پھیر گئی۔

"تو کس نے کہا ہے سمجھانے کو۔ بس خاموشی ہے

میرے ساتھ چلو۔" وہ کافی تیز ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ چپ ہو گئی۔

★★★

"میری صورت دیکھ کر آپ کے چہرے کا رنگ جیسے اڑا تھا۔ وہ میرے اندر کی پیاس بجھانے کے لیے ناکافی ہے مسز رابعہ منصور! آپ کا بیٹا سر سے پاؤں تک میرا ہے میں اسے آپ سے چھین کر ہی رہوں گی۔ یہ عزیزہ رحمٰن کا وعدہ رہا آپ سے۔" فون ایک بار پھر بند ہو چکا تھا۔

"نہیں..... نہیں۔" وہ روتے روتے گڑگڑا رہی تھیں۔

"بیگم صاحبہ۔" ثریا ان کی آواز سن کر بھاگی مگر وہ چکرا کر گر پڑیں۔

"پاپا! آخر بات کیا ہے؟ آپ لوگ مجھے کچھ بتاتے کیوں نہیں۔" وہ فوراً گھر پہنچا۔

"کام ڈاؤن عباد!"

انہوں نے اسے باہر بلایا، آج عباد کو سب کچھ بتانے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا مگر وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ اتنی بڑی سچائی اتنی بڑی حقیقت جو برسوں اس سے پوشیدہ رہی مگر اس سے بھی بڑا وہ الزام تھا جو عزیزہ کی ذات پر لگا تھا اس کا دل ماننے کو قطعی تیار نہ تھا مگر اس کی ماں کی حالت۔ وہ کچھ سمجھنے کے قابل نہ تھا' دماغ ماؤف تھا' اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ اس پوری رات وہ سو نہ سکا۔

پچھلے ایک گھنٹے سے وہ پارک کی بینچ پر بیٹھا ایک ہی نقطے کو سوچ رہا تھا۔

"آپ نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟" وہ محض اسے دیکھ کر رہ گیا۔ کیا تھا ان نگاہوں میں۔

"عباد! کوئی مسئلہ ہے؟"

"جو میں ابھی تم سے پوچھ رہا ہوں' ہو سکتا ہے تم پریشان ہو جاؤ مگر تمہیں سوچ کر جواب دینا ہے۔" وہ بہت سنجیدہ تھا۔

"صاف صاف بات کریں۔"

"تمہاری فیملی میں..... آئی مین پوری فیملی میں کوئی ایسا ہے جو..... جو تمہارے خلاف ہو؟" وہ نہ سمجھی۔

"کوئی ایسا جو تمہارے متعلق یا تمہارے رلیشنز سے غلط بیانی کرے۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ کوئی ایسا کیوں کرے گا۔" وہ ٹھٹکی۔

عزیزہ کے استفسار اور پریشان صورت پر عباد کو افسوس ہوا۔ اس کے منہ سے نکلتے لفظوں نے اسے ساکت کر دیا تھا۔

"میں صرف معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہوں عزیزہ۔" مگر عزیزہ کا تو برا حال اس نے تھک کر بینچ سے ساتھ ٹیک لگا لی۔

"تو آج آپ بھی مجھے کٹہرے میں کھڑا کرنے آئے ہیں۔" آنسو اس کے رخساروں پر پھسلنے لگے۔

"نہیں..... میرا مطلب..... میں تو محض مما کی۔"

"مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا..... مجھے آپ سے..... آپ سے کچھ نہیں کہنا۔" عباد نے بولنا چاہا لیکن اس نے روک دیا۔

"امی کہتی ہیں اس دنیا میں ایک شخص ایسا ضرور ہے جو مجھے وہ ساری خوشیاں دے گا جو میرا حق ہیں۔ میں بس اس کا ہاتھ تھام لوں۔" اس کی برستی آنکھیں عباد کو تکلیف دے رہی تھیں۔

"اور میں نے تھامنا چاہا..... پر شاید خوشیوں پر میرا حق ہی نہیں ہے۔" وہ حسرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو..... میں تو۔"

"یہ مائیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں نا عباد..... خواب دیکھتی ہیں کہ ان کی بیٹیاں شہزادیاں ہیں اور انہیں شہزادوں کے محل ملیں گے۔" اس کی آواز رندھ رہی تھی۔

اسے خود کو سنبھالنے میں ایک لمحہ لگا تھا اس نے دائیں ہاتھ کی پشت سے چہرہ صاف کرنا چاہا۔

"کوئی بات نہیں..... مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ آپ نے بھی نعمان کی طرح خود ہی ہاتھ بڑھایا! اور خود ہی کھینچ لیا' بس اس وقت کوئی آرزو..... کوئی خواہش نہ تھی تو اب یہ غلطی کیوں کر بیٹھی میں..... کیوں؟"

وہ روتے روتے اس سے دور ہوتی گئی۔ عباد اسے روکتا رہا' پکارتا رہا مگر وہ ان سنی کرتی پارک سے نکلتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

عافیہ اس سے پوچھ پوچھ کر تھک چکی تھیں مگر اس کی زبان پر وہی لفظ تھے۔

"امی! بس آپ تیاری کریں..... ہم واپس جا رہے ہیں۔"

"مگر کیوں..... کل تک تو تم۔"

"ایک بار ہو آئے ہیں نا تو اب سب کی یاد ستاتی ہے اور آپ ہی تو کہتی ہیں کہ اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔" وہ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے ان کا ہاتھ بٹاتی رہی۔

عباد نے اسے کئی کالز کیں۔ وہ اس سے بات کر کے ڈگمگانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے عباد کی محبت پر شک نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی عباد کی اس سے محبت کبھی غلط فہمیوں کی نذر نہیں ہو سکتی لیکن رابعہ .....

یقیناً" وہ اس کی مخالفت کر رہی تھیں' تب ہی تو عباد کو اس سے بات کرنا پڑی اور وہ کبھی بھی عباد اور رابعہ کے درمیان نہیں آنا چاہتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ کی خواہاں تھی۔ ان کے درمیان خلیج بننے کی نہیں۔ سو چپ چاپ واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اپنا استعفیٰ دینے آفس آئی تھی اور بس۔

سفیان صاحب نے ان لوگوں کی واپسی کا سارا انتظام خود کیا تھا۔ ان کا لوگوں کا پورشن تو ویسے بھی خالی ہی تھا۔ عباد سے ملنے کے ٹھیک بائیسویں دن وہ لوگ واپس آ گئے تھے۔ البتہ غیراث وہیں ہاسٹل شفٹ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

کچھ لمحے نومبر کے ہم نے یوں گزارے ہیں
موسم تیری یادوں کے تصور میں اتارے ہیں
کپکپاتے ہونٹوں سے ڈگمگاتی دھڑکن سے
میں نے اپنے خالق سے
بس دعا یہ مانگی ہے
اب کے بار ساون میں
جب بادل اتریں تو
بس یہی تمنا ہے
نفرتوں کی بارش میں
زندگی کو جینے کا
اختیار مل جائے
اے میرے خدا اس کو
اپنا پیار مل جائے

آج پھر اسے ٹیکسٹ پر نظم ملی تھی۔ جانے کتنے ہی میسج وہ اسے بھیجتا رہا جو اس کے سچے جذبوں کی عکاس تھے لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ نہ کوئی کال ریسیو کی۔ بس کچھ قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپکتے رہے مگر بے بس تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ کچن میں ثریا کو دوپہر کے کھانے کی ہدایات دے رہی تھیں۔ وہ وہیں چلا آیا۔

"کوئی کام تھا؟" وہ متوجہ ہوئیں۔

"بات کرنا ہے دو منٹ کے لیے۔ آسکتی ہیں؟"

"ہاں! چلو آتی ہوں۔" جب وہ اس کے کمرے میں آئیں تو وہ ان ہی کا منتظر تھا۔

"مجھے عزیزہ کے حوالے سے کچھ کہنا ہے۔" وہ بلا تمہید بولا۔

"ساری صورت حال تمہارے سامنے ہے۔ تمہارے پاپا تمہیں سب بتا چکے ہیں۔ اوپر سے عافیہ اور عزیزہ کا رویہ' وہ دھمکیاں۔ ایسے میں کیا بات کرنے کو رہ جاتی ہے۔" وہ آج دو ٹوک بولیں۔

"یہی بات تو کرنا ہے مما! وہ ایسی نہیں ہے۔ میں اسے جانتا ہوں۔"

"اور میں اس کی ماں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ جو چیز اسے نہیں ملتی تھی نا' وہ اسے توڑ دیتی تھی تاکہ کسی اور کو بھی نہ ملے۔ پتا نہیں کیسے منصور کے معاملے میں وہ پیچھے ہٹ گئی مگر اس کا نتیجہ آج میں دیکھ

رہی ہوں۔ وہ تمہیں مجھ سے چھین لے گی عباد۔" وہ رونے لگیں۔

"ہم بہت اچھے دوست تھے۔ بہت پیار بھی کرتے تھے ایک دوسرے سے۔ بالکل سگی بہنوں کی طرح لیکن شیشہ چاہے کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو جب ٹوٹتا ہے نا تو خطرناک بن جاتا ہے اور میں نے اس کے شیشے جیسے دل کو توڑا تھا۔ میں گناہ گار ہوں لیکن پھر بھی۔۔۔ پھر بھی تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔"

اس کے چہرے کو ہاتھوں کے کٹورے میں تھامے وہ التجا کر رہی تھیں۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا مما۔۔۔ آئی پرامس۔" اس نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے مگر انہوں نے ایک جھٹکے سے چھڑا لیے۔

"میں جتنا تمہیں سمجھا رہی ہوں۔ تم اتنا ہی ضدی ہو رہے ہو۔ تم سے زیادہ جانتی ہوں میں دنیا کو۔"

"مگر مما۔۔۔"

"بس۔۔۔" وہ گرجیں "تمہاری شادی اس سے نہیں ہو سکتی' یہ تم کان کھول کر سن لو اور ہاں۔۔۔" وہ اچانک اٹھیں۔

"میں نے تمہارے لیے دو تین لڑکیاں دیکھی ہیں۔ پسند کر لو مگر یاد رکھنا وہ لڑکی عزیزہ کبھی نہیں ہوگی۔" اسے تنبیہہ کرتی وہ کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

پورے تین منٹ سیل فون کی بپ سننے کے بعد بالآخر اس نے کال ریسیو کر لی۔

"ہیلو۔۔۔ عزیزہ! پلیز فون بند مت کرنا۔" عباد کو تو جیسے قارون کا خزانہ مل گیا۔

"پلیز' صرف ایک بار میری بات سن لو۔" عزیزہ کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

"کہیے۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔" لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے ادا ہوئے۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مگر یہ ممکن نہیں میں۔۔۔ میں اسلام آباد میں ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں آ سکتا ہوں۔" وہ اسے ہر صورت قائل کرنا چاہتا تھا۔

"یہ مناسب نہیں ہوگا۔ سب کیا کہیں گے۔"

"تم کسی کو نہ بتاؤ۔ بس آنٹی سے پرمیشن لے کر آ جانا۔"

"میں نے بہت مشکل سے خود کو سمیٹا ہے عباد۔ آپ سے مل کر پھر بکھر جاؤں گی۔"

"تمہیں بکھرنے سے ہی تو بچانا چاہتا ہوں۔۔۔ میں کل آ رہا ہوں۔" وہ جلدی جلدی اپنا پروگرام بتانے لگا۔

"میں انتظار کروں گا۔"

"میں کوشش کروں گی۔" فون بند کرتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عافیہ کچھ سمجھ سکیں اور کچھ نہیں۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس نے آہوں' آنسوؤں' سسکیوں کے درمیان انہیں سب بتا دیا۔

"زندگی تمہاری ہے۔۔۔ فیصلہ بھی تمہارا ہی ہوگا مگر اتنا ضرور کہوں گی' اس سب میں عباد کا کیا قصور ہے۔۔۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔ رہا سوال رابعہ کا تو میں نے اسے اسی روز معاف کر دیا تھا کہیں اس کی زندگی میری آہوں کی نذر نہ ہو جائے اور اب اس کو منانا عباد کا اپنا کام ہے۔"

ماں کا سہارا ملتے ہی جیسے اس کا دل مطمئن ہو گیا۔ ایک بوجھ تھا جو سرک گیا۔

"ایک دفعہ خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو۔۔۔ تمہارے اس قدم سے مجھ پر کیا گزری ہوگی۔۔۔ بنا بتائے۔۔۔ بنا میری کوئی وضاحت سنے تم چلی آئیں' میری محبت' میرے جذبے کو نہیں سوچا۔"

عباد کی حالت دیکھ کر عزیزہ کو صحیح معنوں میں اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ کتنی اداسی بکھری تھی اس کے چہرے پر' بڑھی ہوئی شیو' بکھرا وجود' عزیزہ کا دل تڑپ گیا۔

"اب کچھ تو کہو۔۔۔ کوئی اور الزام ہی لگا لو۔" اس کے لفظوں میں چبھن تھی۔

"ایسا تو نہ کہیں۔ میں آپ کو اس دوراہے پر نہیں لانا چاہتی تھی' جہاں آپ کو ایک طرف مجھے اور دوسری طرف آنٹی کو رکھنا پڑے۔"

اس نے شکوہ کیا۔ "میں کسی کو بھی دکھ نہیں دینا چاہتی لیکن پھر بھی میری ذات سے کسی نہ کسی کو تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ میں تو یہاں بھی اسی لیے آ گئی کہ۔۔۔ کہ آپ مجھے بھول جائیں۔"

افسردگی سے کہتی وہ سر جھکا گئی۔

"تمہیں بھول جاؤں۔۔۔ تمہیں؟" اس نے سر جھٹکا۔

"عزیزہ! تمہیں بھلا کر میرے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ تم کتنے آرام سے کہہ گئیں نا! تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہارے لیے میں۔۔۔ میں پاگل ہو رہا ہوں۔ تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہیں سوچتے۔۔۔ صرف تمہیں سوچتے میں نے کتنی راتیں جاگتے گزار دیں۔

تم سے ملنے کے لیے پہلی بار میں نے آج اپنی ماں سے جھوٹ بولا کہ میں کسی بزنس میٹنگ میں جا رہا ہوں۔۔۔ میں یہاں تک چلا آیا صرف تمہارے لیے اور تم کہتی ہو' میں تمہیں بھول جاؤں۔" شدت ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے' آج میں چلا جاتا ہوں۔ کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔۔۔ کبھی تمہیں پانے کی کوشش نہیں کروں گا۔" وہ جیسے تھک گیا۔

"لیکن میں تمہیں بھول جاؤں' یہ میرے بس میں نہیں' میں تمہیں یاد نہ کروں' اس پر میرا اختیار نہیں۔ میں تمہارا انتظار کروں گا ہمیشہ۔۔۔ آخری سانس تک جب کبھی تمہیں لگے کہ عباد منصور تمہاری زندگی میں اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے' جتنی اس کی زندگی میں تمہاری ہے۔ بس ایک بار پکار لینا۔۔۔ محبت تمہارا دامن بھرنے خود ہی چلی آئے گی۔"

ایک آخری نگاہ اس کے بے یقین چہرے پر ڈالتا وہ آہستہ آہستہ پلٹنے لگا اور پھر وہ چلا گیا جو عزیزہ رحمٰن کی زندگی میں وہی اہمیت رکھتا تھا جو اس کی زندگی میں عزیزہ کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"امی دیکھیں نا' کتنا پیارا ہے' یہ کتنا معصوم۔۔۔ جیسے فرشتہ ہو' نرم نرم پھول جیسا۔" عزیزہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

"بھئی مجھے تو یہ بالکل نومی لگتا ہے۔ کیوں عافیہ! یاد ہے نا نومی بھی ایسا ہی تھا۔" نفیسہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ عافیہ ہنسنے لگیں۔

نعمان رومانہ کو ڈلیوری سے پہلے اسلام آباد ہی لے آیا تھا۔ نفیسہ نے ہی اسے کہا تھا کہ وہ ایسا چاہتی ہیں اور نعمان انکار نہ کر سکا۔

"ہاں بھابھی! بالکل ویسا ہی ہے۔ البتہ آنکھیں رومانہ جیسی ہیں' بڑی بڑی۔" وہ بھی ننھے ریان کا معائنہ کرتے کہنے لگیں۔

جب سے ریان پیدا ہوا تھا سارے گھر میں جیسے رونق کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ ہر وقت ایک افراتفری سی رہتی۔ مبارکباد دینے آنے والے الگ تھے کیونکہ وہ اگلی نسل کا پہلا بچہ تھا سو چاؤ بھی بہت زیادہ تھے۔

مگر اس قدر خوشیوں کے باوجود ایک انسان ایسا بھی تھا جو کچھ زیادہ ہی خاموش تھا۔ رومانہ' جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ ہر وقت کھوئی سی رہتی۔ کہیں اور موجود ہوتی اور سوچ کہیں اور بھٹکتی رہتی۔ یہ رویہ سب سے پہلے نعمان نے ہی محسوس کیا مگر رومانہ نے اس کی تسلی کرا دی کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔

"آپ کے لیے سوپ بنا دوں؟" عزیزہ نے آنکھیں کھولتی رومانہ سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ کسی خیال سے چونکی۔ "نہیں' ابھی دل نہیں چاہ رہا۔" وہ پھر سے آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ عزیزہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

جان وے جان لے حال دل
جان وے بول وے حال دل

آجا تیرے سینے میں سانس سانس پگھلوں میں
آجا تیرے ہونٹوں سے بات بات نکلوں میں
تو میری آگ سے روشنی چھانٹ لے
یہ زمین آسمان جو بھی ہے بانٹ لے
جان دے جان لے حال دل

راحت فتح علی خان کی پرسوز آواز اس کے اپنے درد کی غماز تھی۔ وہ ایک بار پھر سے وہی عباد بن گیا تھا جو عزرہ کے ملنے سے پہلے تھا۔ پورا دن آفس میں گزار دیتا۔ بے وجہ سڑکیں ناپتا مگر وہ اور زیادہ یاد آتی۔

آج بھی جب رابعہ، رومانہ سے ملنے جانے کے لیے تیاری کر رہی تھیں تو دل نے کئی بار صدا لگائی کہ ایک بار صرف ایک بار اس دشمن جاں کو دیکھ آ جس کے بغیر تو ادھورا ہے، جس سے تیری سانسوں کی ڈور بندھی ہے، جو تیری زندگی کی متاع ہے مگر اس نے دماغ کی انگلی پکڑے بڑی مشکل سے دل سے دامن بچا لیا اور پھر اسی آگ میں جلنے لگا جس میں وہ پچھلے پانچ ماہ اور بارہ دن سے جل رہا تھا۔

اس کیفیت روح کو وہی سمجھ سکتا ہے
جان دے کر جس نے جینے کا ہنر سیکھا ہو

☼ ☼ ☼

وہ جب کمرے میں داخل ہوا تو ہر طرف اندھیرا تھا اس نے لائٹس آن کر دیں۔ وہ بیڈ پر سیدھی لیٹی تھی۔ وہ اس کے قریب آگیا۔

"رومانہ۔"

"ہاں۔" وہ چونک کر اٹھی۔

"تم ..... تم رو رہی ہو؟" وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

"میں ..... نہیں تو۔" اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھے۔

"رومی کیا ہوا ہے بتاؤ۔" وہ پریشان ہوا۔

"وہ سر میں درد ہے شاید۔ ریان کہاں ہے؟" وہ ٹال گئی۔

"وہ امی کے پاس ہے۔ تم بتاؤ کیوں رو رہی ہو؟"

"کچھ نہیں نعمان! سر میں درد ہے بس۔ پلیز میں کچھ دیر سونا چاہتی ہوں۔ لائٹس آف کر دو۔"

"اوکے! سو جاؤ مگر میں تم سے پوچھوں گا ضرور۔"

وہ لائٹس آف کر کے باہر آگیا۔

"میں تمہیں کیسے بتاؤں نعمان! کہ آج کل تو آنسو ہر وقت ہی میری آنکھوں سے نکلتے رہتے ہیں خود ماں بنی ہوں تو ماں کے جذبات کا درد محسوس کیا ہے۔ میرا بیٹا ایک سسکی بھی لے تو میں پریشان ہو جاتی ہوں اور میں نے ..... مگر کیا کروں اب کیسے سدھاروں حالات کو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

☼ ☼ ☼

وہ ایک بہت ہی حسین صبح تھی ہر طرف ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کالے بادل برسنے کو بے تاب تھے۔ گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی کیونکہ چھٹی ہونے کے باعث سب گھر پر تھے۔

"بھابھی! آپ کی فرینڈز آئی ہیں اور ان کے ساتھ کوئی صاحب بھی ہیں۔" اسد کی اطلاع پر سب ہی متوجہ ہوئے۔

"میری فرینڈز؟" وہ حیران ہوئی۔

"جی! نیچے ہال میں ہیں اور ان صاحب کو میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔ نومی بھیا! آپ آجائیں۔ مجھے تو ضروری جانا ہے کہیں۔"

رومانہ کی دوستوں کا یہاں آنا کافی حیرت انگیز تھا۔ سب نیچے ہی آگئے جہاں میمونہ چچی اس کی دوستوں سے محو گفتگو تھیں۔

مگر رومانہ آخری سیڑھی سے نیچے قدم اتارنے کے قابل نہ رہی تھی۔ اس کا رنگ لٹھے کی مانند سفید ہو گیا تھا۔

"ہیلو میڈم!" کافی طنزیہ سا لہجہ تھا مگر رومانہ کے وجود میں حرکت نہ ہوئی۔

"رومی آؤ نا۔" رابعہ نے اسے بلایا۔ وہ آج ہی آئی تھیں۔ حقیقت بہت غلط وقت پر سامنے آ رہی تھی۔ وہ جی جان سے کانپ گئی۔

"یہ تمہاری کوئی پرانی فرینڈز ہیں کیا؟" نعمان نے سرگوشی کی مگر وہ سننے سمجھنے کی پوزیشن میں کہاں تھی۔

"ارے آپ تو سکتے میں ہی آگئیں۔ گھبرایئے نہیں ہم آپ کو لوٹنے نہیں آئے۔" ہنوز پراسرار لہجہ

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔" نفیسہ نے کہا۔

سب ہی رومانہ کے رویہ پر حیران تھے۔

"ہم نے آپ کے ایڈریس پر معلوم کیا تو یہاں کا ایڈریس مل گیا۔ دراصل آنٹی ....."

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" رومانہ نے اس کی بات کاٹی۔

"جیسے آپ جانتی ہی نہیں ہیں۔ پچھلے دو ماہ کی پے منٹ نہیں دی آپ نے۔" وہ ہاتھ نچا کر بولی۔

"کیسی پے منٹ؟" رابعہ اور نفیسہ یک زبان بولیں۔

"ان کے کسی کزن کی ....."

"دیکھو! میں نے تم سے کہا تھا نا۔" رومانہ گڑبڑائی۔

"کہنے کو چھوڑیے۔ بس باقی کے ایک لاکھ کے ساتھ اجازت دیجیے۔" سب کے لیے صورت حال ناقابل فہم تھی۔ نعمان کبھی رومانہ کو دیکھتا اور کبھی ان دونوں لڑکیوں کو۔ آخر ماجرا کیا تھا۔

"میں ....."

"ایک منٹ رومانہ۔" نعمان نے اسے روکا۔

"کیسے پانچ لاکھ؟"

"تم رہنے دو نعمان! میں ....." نعمان نے اسے پھر سے روکا اور ان کی طرف سوالیہ دیکھا۔

"ان کی مدد ان کے بھائی کی شادی جہاں کر رہی تھیں، وہ ایک تھرڈ کلاس آوارہ لڑکی تھی اور یہ چاہتی تھیں کہ ہم یہ شادی رکوا دیں۔ ہم نے کچھ فون کالز کی مدد سے ان کا کام کر دیا، دو دینے کا وعدہ کیا تھا ایک دے چکی ہیں باقی کے لیے ہمیں ٹال رہی ہیں۔" ان میں سے ایک آفت نے بم پھوڑا۔

"پیسے تو ویسے بھی اب ملنے نہیں اس لیے چاچا کا اصول ہے کہ جو ہمیں دھوکا دے گیا اس کا سارا کچا چٹھا مع سود واپس کر دو۔" دوسری نے زوردار قہقہہ لگایا۔

رومانہ نے بمشکل کرسی کا سہارا لیا۔

رابعہ سکتے میں تھیں۔

نعمان شدید مشتعل اور نفیسہ اور میمونہ سراپا حیرت۔ وہ جیسے آئی تھیں، ویسے ہی چلی بھی گئیں مگر طوفان آ چکا تھا۔ نعمان لال بھبھوکا چہرہ لیے اس کی طرف بڑھا۔ اس کی روح فنا ہونے لگی۔

"پلیز نعمان! میری بات سنو۔" وہ التجا کرنے لگی۔

"رومانہ! صرف سچ بولو۔" وہ اس کے روبرو آگیا۔

"وہ میں نعمان ..... میں پلیز۔" وہ گڑگڑانے لگی۔

"آنٹی میں ..... میں نہیں چاہتی تھی کہ عباد اور عزرہ کی شادی ..... آنٹی میں ..... میں پہلے عباد سے محبت ..... مگر سچ آنٹی! اب مجھے احساس ہوا ہے۔ آنٹی میں ..... میں بدل گئی ہوں۔" وہ انہیں سب بتانے لگی

"نعمان پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں غلطی پر تھی، بہک گئی تھی پلیز بس ایک بار معاف کر دو۔"

"تمہیں معاف کر دوں جس نے مجھے سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ کتنی محبت، کتنی چاہت دی میں نے تمہیں اور تم نے ایک معصوم لڑکی پر اتنے گھناؤنے الزام لگائے۔ تم ایک عورت ہوتے ہوئے دوسری عورت کا کرب بھول گئیں۔"

دکھ سے بوجھل شہادت کی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتا وہ ٹوٹا بکھرا سا بول رہا تھا۔

"لیکن اس میں تمہارا قصور نہیں، یہ غلطی سراسر میری ہے جو میں نے کندن چھوڑ کر پیتل اپنایا۔ ہیرا چھوڑا اور سنگ مرمر اٹھا لیا اور سب سے بڑھ کر اپنوں کا دل توڑ کر تمہیں چن لیا۔ اس سے بڑھ کر میرا گناہ کیا ہوگا۔"

وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سب خاموش تھے، رابعہ سمیت۔ وہ تو خود شاکڈ تھیں۔ اس خاموشی کو صرف رومانہ کی سسکیاں توڑ رہی تھیں۔

"مگر اب میں مزید کوئی نقصان افورڈ نہیں کر سکتا۔ تمہارا کردار ہی تمہاری خوب صورتی تھی اور اس کردار کا بت اب پاش پاش ہو گیا ہے۔ تم ایک کرپٹ عورت

ہو جو ایک شخص کی زندگی میں اس کی محبت صرف اس لیے نہیں آنے دے رہی کیونکہ اس نے تمہیں محبت نہ دی۔" وہ پھر بھڑکا۔

"تم جا سکتی ہو میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے۔"

"نہیں نعمان پلیز مجھے۔۔۔" اس نے روتے روتے اس کے ہاتھ پکڑ لیے مگر اس نے جھٹک دیے۔

"نومی بیٹا! ایسے معاملات۔۔۔"

"نہیں امی! آج کوئی کچھ نہیں بولے گا۔ یہ میری غلطی ہے۔ اسے میں ہی سدھاروں گا۔"

"بیٹا! ایک بار اسے موقع تو دو۔" وہ پھر بولیں۔

"کوئی موقع نہیں جس نے ماں جیسی ہستی کے جذبات کی دھجیاں اڑا دیں' اس نے جانے مجھ سے کیا کیا چھپایا ہو گا۔" نفرت سے کہتا وہ کہیں سے بھی رومانہ سے محبت کرنے والا نعمان نہیں لگ رہا تھا۔

"پلیز نعمان! تمہیں۔۔۔ تمہیں ریان کا واسطہ۔"

مگر نعمان پر مطلق اثر نہ ہوا۔

"میں نعمان احمد بقائمی ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں۔" لفظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ۔ سب پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ رومانہ کی حالت غیر ہونے لگی۔

"نعمان! سنبھالو خود کو تمہارا بیٹا۔۔۔" سفیان صاحب کی آواز ریان کے رونے کی آواز میں کہیں گم ہو گئی۔

"طلاق دیتا ہوں۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ اس لمحے پردے کے پیچھے کھڑی عزیزہ کے جامد وجود میں حرکت ہوئی تھی۔ اس کے بندھے ہاتھ نعمان کے سامنے تھے۔ اس کی برستی آنکھوں میں التجا تھی' امید تھی۔

"ایسا مت کریں نومی بھائی! مزید ایک الزام میرے کھاتے میں مت ڈالیے۔" آس و امید سے اس کی طرف دیکھتی وہ اسے روک رہی تھی۔ نعمان نے ایک بازو سے پکڑ کر اسے رومانہ کے سامنے کیا۔

"غور سے دیکھو اس لڑکی کو۔۔۔ اسی کے پیروں تلے سے زمین کھینچنا چاہتی تھیں نا تم جو آج تمہارا سائبان بچانے کے لیے اپنے ساتھ ہوئی زیادتی بھول گئی۔ دیکھو اسے اور سوچو۔" وہ اسے باور کرا تا' خود کو بھی کرا رہا تھا۔

"کیا فرق ہے اس میں اور تم میں۔" اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا۔

"بس یہی کہ یہ میری بیوی ہو سکتی تھی اور تم میری بیوی ہو پر مجھے دکھ رہے گا کہ کاش تم میری بیوی نہ ہو تیں۔"

اس کے بعد وہ مزید وہاں نہ رکا تھا۔ خاموشی سے کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی باہر چلا گیا۔ سب لوگ آہستہ آہستہ ہٹنے لگے۔

وہ کسی کو بھی نہ روک سکی۔ ہمت ہی نہ تھی یا شاید احساس جرم تھا' احساس شرمندگی تھا جو اسے روک رہا تھا۔ وہ تو اسی شام جانے والی رابعہ کو بھی نہ روک پائی تھی جو اس سے ملے بغیر ہی چلی گئیں مگر جانے سے پہلے انہوں نے نہ صرف عزیزہ کی پیشانی کو چوما تھا بلکہ عافیہ سے اپنے ہر غلط رویے' ہر غلط فیصلے کی معافی بھی مانگی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور یہ میں ہوں رومانہ نعمان احمد جو صحیح معنوں میں سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی۔ میں اپنے والدین کی شادی کے تین سال بعد پیدا ہوئی مگر انہوں نے ان تین سالوں کو تین صدیوں کی طرح گزارا تھا کیونکہ دونوں ہی بچوں کے شوقین تھے۔ میرے آنے سے جیسے انہیں کل کائنات مل گئی تھی۔ دونوں نے ہر لمحہ مجھے توجہ دی۔ اپنی تمام مصروفیات پس پشت ڈال کر بڑے لاڈ سے مجھے پالا۔

میری خواہش جیسے حرف آخر ہوتی۔ میری ہر آرزو ان کا مقصد زندگی تھا۔ میرے منہ سے نکلا ایک ایک لفظ ان کے لیے اہم تھا۔ میں اس پیار محبت کو فار گرانٹڈ لینے لگی مجھے لگنے لگا یہ میرا حق ہے میں جو چاہوں منوالوں اور اس کے لیے مجھے زیادہ تردد بھی نہ کرنا پڑتا۔

بس پاپا کے گرد بازو حمائل کر کے ایک نئی فرمائش کر دیتا اور وہ جھٹ سے پوری کر دیتے اور زیادہ میرے پیدا ہونے سے پہلے ایک این جی او کی با قاعدہ رکن تھیں

لیکن پھر کبھی ہاؤس وائف بن گئیں۔ انہی محبتوں چاہتوں میں بڑے ہونے کا پتا ہی نہ چلا۔ وہ میری زندگی کے ایسے دن تھے جنہیں میں کبھی بھول نہیں سکی۔

میرے بہت سے دوست تھے اور ان میں ہمیشہ زیادہ تعداد لڑکوں کی ہوتی۔ جانے کیوں؟ اسکول میں ڈیبیٹ کمپیٹیشن تھا اور ہمیشہ کی طرح میں نے جیت لیا مگر قبل اس کے کہ میں مما پاپا کو یہ خبر سناتی اور ان سے پھر سے کوئی انعام لیتی' وہ دونوں اس روز ایکسیڈنٹ میں ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ گئے۔

میں روئی' چیخی' چلائی' پاگلوں کی طرح انہیں پکارتی رہی مگر نہ انہیں لوٹ کر آنا تھا نہ وہ آئے' وقت کا کام گزرنا تھا سو گزرتا رہا۔ میں آنٹی اور انکل کی طرف آ گئی تھی حالانکہ پہلے پاپا اور مما مجھے ان کی طرف زیادہ نہ آنے دیتے تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ آنٹی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے مگر اب میں نے جانا کہ وہ تو بہت سویٹ سی تھیں۔ انہوں نے میرا بہت ساتھ دیا۔ ان کی بے تحاشا محبت اور عباد کی پر خلوص دوستی نے مجھے پھر سے زندگی کی طرف کھینچ لیا۔ دوستوں کی کمپنی نے مجھے زیادہ دن پژمردہ نہ رہنے دیا۔ پھر وہی دن تھے' وہی مقابلے' وہی میری جیت بس مما پاپا نہ تھے لیکن آنٹی انکل مجھے ان سے بھی زیادہ پیار دیتے تھے۔ میری ہر فرمائش بہ خوشی پورا کرتے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ایف ایس سی کے فرسٹ پارٹ میں تھی مجھے اور اک ہوا کہ میں عباد کو پسند کرنے لگی ہوں۔ وہ مجھے اچھا لگنے لگا میں جو کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ مگر عباد کی کہی گئی ہر بات مجھے درست لگتی' حالانکہ اس کی اور میری فیلڈز ٹوٹلی ڈفرنٹ تھیں مگر پھر بھی میں اپنا کام لے کر اس کے پاس پہنچ جاتی۔ وہ ہنستا اور میں برا مان جاتی۔

"او میڈم! ایک اکاؤنٹنٹ سے آپ میڈیکل پوچھیں گی تو وہ بے چارا ہنسے گا ہی۔" وہ سمجھاتا مگر میں کہاں کام سے جاتی تھی۔ میں تو بس اس کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ میرا مقصد بس اس کی توجہ حاصل کرنا تھا اور وہ میں کر لیتی۔

میری پسندیدگی محبت میں بدلنے لگی مگر میں نے خود کو نہ روکا کیونکہ یہ ایسا مشکل نہ تھا۔ میں خوب صورت تھی مستقبل کی ڈاکٹر تھی اور بہت سے پلس پوائنٹس تھے۔ ایسی کوئی برائی نہ تھی مگر میں یہ ضرور چاہتی تھی کہ محبت کا اظہار عباد کی طرف سے ہو۔ میں بھول گئی تھی کہ اگر میں محبت کے ہاتھوں مجبور ہوں تو یہی محبت اس کے قدموں کی زنجیر بھی تو بن سکتی ہے۔

میرا میڈیکل میں ایڈمیشن ہو گیا' وہ بھی اسلام آباد میں یہ بھی میرا اپنا شوق تھا۔ میں جانے کے لیے تیار تھی جس دن میری وہاں کی فلائٹ تھی اس دن پہلی بار مجھے عباد کی کسی بات پر حیرت ہوئی۔

"کبھی تو ڈھنگ کے کپڑے پہن لیا کرو۔ بڑی ہو گئی ہو اب" میری ٹائیٹ جینز' شرٹ جس کے اوپر میں نے جینز کی جیکٹ پہن رکھی تھی اور چھوٹا سا میچنگ مفلر صرف فیشن کے طور پر میرے گلے میں جھول رہا تھا۔ میرے حلیے کو ناپسندیدگی سے دیکھتا وہ کہہ رہا تھا۔ جس کلاس سے ہمارا تعلق تھا۔ وہاں یہی ڈھنگ کا لباس تھا مگر عباد!

اس کی اکثر باتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔ وہ لڑکیوں کی آزادی کے خلاف نہ تھا لیکن حد سے بڑھی آزادی اسے پسند نہ تھی۔ اسلام آباد میں بھی میرے دوستوں میں لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مجھے اپنی صنف سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس کی وجہ میرا احساس برتری تھا مجھے لگتا تھا دنیا میں مجھ سے بہتر لڑکی ہو ہی نہیں سکتی۔

"I am the one and only۔"

نعمان احمد میرے گروپ کا ہی نہیں' کالج کا بھی بہترین اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ ایک اپر مڈل کلاس سے تھا مگر اس کے رنگ ڈھنگ ہماری کلاس کے لڑکوں سے کسی طور بھی کم نہ تھے اور میرے لیے سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ مجھے پسند کرتا تھا' مگر یہ بات وہ کبھی کہہ نہ پایا۔ شاید اس کی وجہ میرے اور اس کے درمیان کا طبقاتی فرق تھا۔

یہ اچھا بھی تھا کہ خاموشی ہی میں اس بھرم تھا۔ میں تو خود اسیر محبت تھی۔ عباد کے لیے میری محبت

جنونی تھی' پاگل پن کی حد تک وہ میرے لیے کیا تھا یہ بس میں جانتی تھی۔ میرا ایم بی بی ایس مکمل ہو گیا۔ میں واپس آ گئی مگر یہاں آ کر میں الجھ گئی۔ عباد کا رویہ کچھ عجیب سا تھا مگر ایک دن جب میں نے اس کے اور آنٹی کے درمیان ہونے والی باتیں سنیں تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

وہ کسی اور سے محبت کر سکتا ہے یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کوئی لڑکی اس کے لیے مجھ سے زیادہ اہم ہو گی۔ یہ میں برداشت نہ کر پائی' مجھے دنیا گھومتی محسوس ہوئی' کون تھی وہ جو بنا کچھ کیے مجھ سے میری محبت چھین لے گئی' جسے دیکھ کر جس سے مل کر عباد مجھے بھول گیا۔ میں حسد کی آگ میں جلنے لگی نارسائی کا ناگ مجھے ڈسنے لگا اور پھر میں نے اپنی انا' خودداری کو ایک طرف ڈال کر صرف اپنی محبت کی خاطر عباد کو پروپوز کیا مگر وہی ہوا جس کا خوف مجھے سکون نہ لینے دے رہا تھا۔

اس نے مجھے ریجیکٹ کر دیا۔

مجھے رومانہ حیات کو جو خود کو "ون اینڈ اونلی" (One and only) سمجھتی تھی۔ بجائے اس کے کہ میں خود کو سنبھالتی میں نے ایک اور غلط فیصلہ کیا۔ میری انا جسے میں روند چکی تھی اب یہ قطعی گوارا نہ کر رہی تھی کہ میں عباد کے سامنے رہوں۔ احساس زیاں مجھے رلا رہا تھا۔ میں نے ایک شرط کے عوض نعمان سے شادی کے لیے نعمان کو رضامندی دے دی اور جلد ہی نعمان سے شادی کر کے لاہور ہی شفٹ ہو گئی۔ یہی میری شرط تھی۔

اب میرا صرف اور صرف ایک مقصد تھا کہ عباد کو اس کی محبت نہ ملے' مگر ایک اور ڈراؤنی حقیقت اس سے پہلے ہی میرے سامنے تھی۔ عباد کی محبت اور میرے شوہر کی سابقہ منگیتر ایک ہی ہستی تھی۔ غم و غصے سے میرا برا حال تھا' پھر وہ سب ہوتا چلا گیا جس کا نتیجہ میں مع سود وصول کر چکی تھی۔

ہاں ایک حقیقت جس کے کھلنے سے میرا کام آسان ہو گیا' وہ تھی عباد اور عزہ کی ماؤں کے رشتے میں پڑی دراڑ۔ میں نے اسی کا فائدہ اٹھایا مگر افسوس میں بھول گئی تھی۔

"ایک چال تم چلتے ہو اور ایک (چال) وہ چلتا ہے۔ اور بے شک وہ بہترین چال چلنے والا ہے۔"

سچ تو یہ ہے قصور اپنا ہے
چاند کو چھونے کی تمنا کی
آسمان کو زمین پر مانگا
پھول چاہا کہ پتھروں پر کھلیں
کانٹوں میں کی تلاش خوشبو کی
آرزو کی کہ آگ ٹھنڈک دے
برف میں ڈھونڈتے رہے گرمی
خواب جو دیکھا' چاہا سچ ہو جائے
اس کی ہم کو سزا تو ملنی تھی
سچ تو یہ ہے قصور اپنا ہے

پانے کو کچھ نہیں رہا تھا مگر ہاں! گنوانے کو ایک گھر تھا' ایک محبت کرنے والا شوہر' ایک بیٹا جسے پانے کے بعد ہی مجھے احساس ہوا تھا کہ میں کتنا غلط تھی مگر حقیقت نے غلط وقت پر سامنے آ کر مجھے تہی داماں کر دیا۔ ان رشتوں کی اہمیت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب یہ مجھ سے دور جا رہے تھے۔ اس وقت میری کوئی نیکی میرے سامنے نہ تھی جس کا واسطہ دے کر میں اپنے خدا سے کچھ مانگتی۔ کوئی امید کوئی آسرا نہ تھا' بس اندھیرا تھا' تاریکی تھی۔

اس اندھیر نگری میں صرف ایک روشنی کی کرن تھی۔ میں نے آخری امید لیے اسے دیکھا اور اس نے مجھے بچا لیا۔ میں نے جس کی زندگی اجاڑنا چاہی' میرے نہ اجڑنے کی بھیک بھی وہی مانگنے لگی۔ میری سمجھ میں آیا کہ کیا فرق ہے مجھ میں اور عزہ میں۔۔۔ میں صرف چھیننا چاہتی تھی اور وہ دینا۔ میں محبت کے لفظ سے آشنا تھی اور وہ اس کے بے کراں معنی سے واقف۔۔۔ میں کچھ بھی نہ تھی اور وہ سب کچھ۔

میں نے سب سے پہلے اسی سے معافی مانگی تھی۔ اگر وہ مجھے معاف کر دیتی تو سب کر دیتے یہاں تک کہ میرا خدا بھی۔

"اس دنیا میں بہت سے لوگ برے ہیں مگر آپ کی اچھائی یہ ہے آپ میں ابھی برائی کر کے نادم ہونے کا احساس باقی ہے۔ یہی آپ کو مجھ تک لایا ہے۔ یہی آپ کے نادم ہونے کی دلیل بھی ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"مجھے پورا یقین ہے نومی بھائی بھی آپ کو معاف کر دیں گے کیونکہ پہلے صرف وہ آپ سے محبت کرتے تھے مگر اب آپ بھی ان سے محبت کرنے لگی ہیں۔" میرے چہرے پر پھیلتی مسکراہٹ نے اسے یقین کر دیا۔

"جائیے اور منائیے انہیں۔ اتنا تو وہ ڈیزرو کرتے ہی ہیں۔" رومانہ کو چھیڑتے وہ خود ہی اپنے لفظوں میں الجھ گئی۔

سب کچھ صاف تھا' رابعہ نے عافیہ کو فون کر کے اپنے رویے کے لیے معذرت کی اور ساتھ ہی اپنی خواہش کا اظہار بھی۔ عزہ نے سب انہی پر چھوڑ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی کی تاریخ کیا طے ہوئی ہر کوئی مصروف ہو گیا۔ بازاروں کے چکر' گھر کی نئے سرے سے صفائیاں' لینے دینے کے انتظامات غرض یہ کہ کاموں کا ایک انبار تھا۔

رابعہ نے منگنی کے بجائے ڈائریکٹ شادی کی ہی تاریخ لی تھی۔ کسی کو بھی اعتراض نہ تھا۔ سب نے رومانہ کو معاف کر دیا تھا۔ اس میں بھی زیادہ ہاتھ عزہ کا ہی تھا اور رومانہ نے بھی مستقل یہیں رہنے کا فیصلہ کر کے کدورتوں کو اور زائل کر دیا۔

"میں بارات کی واپسی کے ساتھ چلی جاؤں گی' پھر ولیمہ پر وہیں سے شامل ہو جاؤں گی۔" وہ نعمان کو جھجکتے ہوئے بتا رہی تھی مگر اس وقت نعمان کی مسکراہٹ نے اس کے دل سے آخری کانٹا بھی نکال دیا۔

سب کچھ "آناً" فاناً" ہو گیا۔ کب دن گزرے۔ شادی ہوئی اور وہ دلہن بن کر لاہور آ گئی۔ پورا راستہ اس کی عجیب و غریب کیفیت تھی اس نے کئی بار عباد کو فون کرنے کا سوچا تھا مگر ہر بار بس سوچ کر ہی رہ گئی اور عباد۔۔۔ وہ شاید زیادہ ہی ناراض تھا۔ اس نے بھی کوئی رابطہ نہ کیا۔

رومانہ اسے کمرے میں چھوڑ گئی۔ وہ اپنے آپ کو اس کے ہر طرح کے رویے کے لیے تیار کر چکی تھی اس کا غصہ ناراضی اسے ہر صورت سہنا تھا۔ کہیں نہ کہیں غلطی اس کی بھی تو تھی۔

پورا کمرا سرخ گلابوں سے سجا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سر پیچھے ٹکاتی کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا وہ سیدھی ہو بیٹھی مگر یہ کیا۔ بجائے اس کے پاس آنے کے وہ سیدھا بیڈ کے سامنے موجود ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ کوٹ اس کی پشت پر لٹکا دیا اور چھت کو گھورنے لگا۔

کافی دیر بعد بھی جب اس کے ساکت وجود میں حرکت نہ ہوئی تو وہ چونکی سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ہنوز اسی جگہ تھا۔ مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق اس نے خود ہی پیش رفت کا فیصلہ کیا۔ دونوں ہاتھوں سے لہنگا سمیٹ کر پاؤں نیچے اتارے۔ کمرے میں موجود خاموشی کو اس کی چوڑیوں اور پائلوں کی آواز نے توڑا۔ وہ خاموشی سے آ کر اس کے سامنے دو زانو بیٹھ گئی۔

"ناراض ہیں؟" عباد کے چہرے کے سنجیدہ تاثرات ہولانے لگے۔

"خفا ہیں مجھ سے؟" جواب ندارد۔

"آپ غصے میں بالکل اچھے نہیں لگتے۔" اس نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ اس نے کھینچ لیا اور دور جا کھڑا ہوا۔

"مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنا۔ تمہیں تو کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔ میں ناراض تھا' تم نے ایک بار بھی منانے کی کوشش نہیں کی۔ میری یہی اہمیت ہے تمہاری زندگی میں؟ تو اب دیکھو ذرا۔۔۔" وہ رخ موڑے سنانے لگا مگر وہ ہل بھی نہ سکی۔ آنکھوں میں گرم مادہ بھرنے لگا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

"میں تمہیں بتاؤں گا جب کوئی بہت ہی بے دردی سے آپ کو اگنور کرے تو کیا محسوس ہوتا ہے۔ جس پر

"آپ کو مان ہو، وہی مان توڑ دے تو کیسا لگتا ہے۔"
اس کے غصے میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔
"اور ہاں۔" وہ وہیں کھڑا کھڑا گھوم گیا۔ مگر عزیزہ نے اس کی طرف رخ نہ کیا۔
"آج سے سہنے کی عادت ڈال لو، جتنا میں تمہارے پیچھے بھاگا ہوں اتنا ہی تمہیں اب بھاگنا ہے۔ سمجھیں؟" وہ پھر بھی چپ رہی وہ جھنجھلاتا ہوا خود ہی اس کے سامنے آگیا۔
"تم سن رہی ہو؟" عباد نے غصے سے پوچھا عزیزہ نے سر اثبات میں ہلاتے اس کی طرف دیکھا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ آنسوؤں سے تر چہرہ اسے حواس باختہ کرنے کو کافی تھا۔
"اوشٹ..." لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ اس کے سامنے نیچے ہی بیٹھ گیا۔
"سوری یار... ایکسٹریملی سوری۔" ایک ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کرتے دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھتے۔ وہ کہیں سے بھی تھوڑی دیر پہلے والا عباد نہ لگ رہا تھا۔ وہ اور شدت سے رونے لگی۔
"میں مذاق کر رہا تھا۔ سیریسلی میں... اس کی سمجھ میں نہ آیا اسے کیسے چپ کرائے، جس کا رونا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
"اب اتنا بھی حق نہیں بنتا میرا کیا؟" وہ اس سے پوچھنے لگا۔ "اتنے دن تم نے ستایا اگر میں نے تھوڑی سی ایکٹنگ کر لی تو اتنا تو میرا رائٹ تھا ناں۔" عزیزہ نے اس کے ہاتھوں سے ہاتھ چھڑائے اور آنسو صاف کرنے لگی۔
"یہ مذاق تھا؟" وہ خفگی سے بولی۔ "ایسا ہوتا ہے مذاق اگر میرا ہارٹ فیل ہو جاتا؟"
"توبہ ہے مسز! سارا پلان خراب کر دیا۔ تمہیں تو میں کبھی کچھ کہہ بھی نہیں سکوں گا ورنہ چپ کون کرائے گا۔" مصنوعی ڈر چہرے پر سجایا گیا۔ وہ تو اس کے "مسز" کہنے پر ہی سر جھکا گئی تھی۔
"ویسے تم نے میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔" وہ گلہ کرنے سے باز نہ آیا۔
"جتنے شکوے ہیں نا آج ہی کر لیجیے پھر کہاں ٹائم ملا ہے۔" وہ روٹھی روٹھی اور بھی پیاری لگنے لگی۔

"ہائے آداب محبت کے تقاضے ساغر
لب ہلے اور شکایات نے دم توڑ دیا"

دلفریبی سے شعر پڑھتا وہ اس کے دلکش روپ کو نظروں کے ذریعے دل میں اتارنے لگا۔ وہ گہرے سرخ رنگ کے مدراسی لہنگے میں غضب ڈھا رہی تھی۔
"تمہاری مہندی کا کلر تو بہت ہی خوب صورت آیا ہے۔" اس کے برف ہاتھوں کو اپنے گرم ہاتھوں میں لیتے وہ اس کی مہندی کو سراہنے لگا۔
"کہتے ہیں جس کے ہزبینڈ کو اس سے شدید محبت ہو، اسی کے ہاتھوں پر مہندی کا کلر ڈارک آتا ہے۔" اس کے ہاتھوں پر اپنی محبت کی پہلی مہر ثبت کرتا وہ کہنے لگا۔
"یہ مثال ساس کے بارے میں ہے غالباً۔" شرمائی شرمائی سی کہتی وہ ہاتھ کھینچنے لگی مگر عباد کی مضبوط گرفت اس کی کوشش ناکام بنا گئی۔
"تم آج تک مجھ سے بھاگ بھاگ کر تھکی نہیں ہو جو آج بھی یہ کوششیں جاری ہیں۔" عباد نے اسے خود سے قریب کیا۔
"ایسی کتنی ہی کوششیں کر لو، تمہارا ہر راستہ اب مجھ تک ہی آئے گا۔" اس کی آنکھوں میں صاف لکھا تھا اب فرار ممکن نہیں۔
"مجھے کسی اور راستے پر اب جانا بھی نہیں۔" وہ طمانیت سے کہتے ہوئے مسکرا دی۔
محبت کی حسین شاہراہ پر اب انہیں ساتھ ساتھ چلنا تھا۔

بات سمجھ کر

جنرل میک آرتھر جب کیڈٹ تھے تو انہیں آئن اسٹائن کی تھیوری یاد کرنے کے لیے کہا گیا۔ تھیوری بے حد مشکل تھی۔ میک آرتھر نے اسے لفظ بہ لفظ رٹ لیا۔ جب کرنل فیبو جر نے ان سے اسی تھیوری کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر کے پوری تھیوری لفظ بہ لفظ سنا دی۔ کرنل فیبو جر نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔
"کیا تم نے یہ تھیوری اچھی طرح سمجھ لی ہے؟"
میک آرتھر کے لیے یہ بڑا نازک لمحہ تھا مگر انہوں نے فوراً جواب دیا۔ "جی نہیں۔" پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ کرنل فیبو جر نے دھیمے لہجے میں کہا۔
"خود میری سمجھ میں بھی یہ تھیوری نہیں آئی۔ کلاس برخاست۔"

سندس عمران۔ گارڈن

جن

ایک سردار صاحب نے ایک گاڑی کو روکنے کے لیے اشارہ کیا۔ گاڑی رک گئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد دیکھتے ہیں کہ گاڑی میں ڈرائیور موجود نہیں اور گاڑی خود بخود چل رہی ہے۔ سردار صاحب بہت پریشان ہوئے اور ڈر گئے کہ گاڑی کو جن چلا رہا ہے۔
نزدیکی پیٹرول پمپ پر گاڑی رکی اور تھوڑی دیر بعد ایک پسینے سے شرابور شخص گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے لگا تو سردار بولا۔
"یہاں نہ بیٹھو، یہاں جن بیٹھا گاڑی چلا رہا ہے۔"
وہ صاحب غصے سے بولے "اوئے اخروٹ کے بچے! میں دو کلومیٹر سے دھکا لگا رہا ہوں اور تم کہہ رہے ہو کہ جن چلا رہا ہے۔"

موجد

ایک خاتون نے اپنی سہیلی سے پوچھا "سنا ہے تمہارا شوہر بہت بڑا موجد ہے؟"
سہیلی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں! تم نے ٹھیک سنا ہے۔ وہ دیر سے گھر آنے کے اتنے بہانے ایجاد کرتا ہے کہ بعد میں انہیں ساری دنیا میں استعمال کرتی ہے۔"

افشاں فرقان۔ سخی حسن

آرڈر

ریسٹورنٹ میں ویٹر کے آنے پر ایک صاحب نے اپنی محبوبہ سے پوچھا۔
"کیا آرڈر دوں؟"
"میرے لیے کافی اور اپنے لیے ایمبولنس۔" محبوبہ نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"دروازے کی طرف دیکھو! میرا شوہر آرہا ہے۔"

بینا عابد۔ کورنگی کراچی

موڈ آف

"بارش میں چلتے ہوئے پتا نہیں کیوں مجھے اپنے بچپن کا دوست شیخ رضا مہدی عرف جوجی یاد آگیا۔ اس کا سر بھی میری طرح بالوں سے تقریباً" ہاتھ دھو چکا تھا ایک دن مجھ سے کہنے لگا۔ "یہ قدرت نے ہمارے بال اڑا کے ہمارے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔"
"کوئی بات نہیں یار! کوئی فرق نہیں پڑتا جوجی!" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔
"فرق کیوں نہیں پڑتا یار! صبح سویرے جب میں

دانت صاف کرنے کے لیے باتھ روم میں بیسن کے آگے کھڑا ہوتا ہوں اور سامنے لگے شیشے میں اپنی صورت دیکھتا ہوں تو خود میرا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ دوسروں سے ہم کیا توقع کر سکتے ہیں۔"

(امجد اسلام امجد کی تحریر سے اقتباس)

زینت رئیس۔ سیاپوش، کراچی

خوامخواہ

ہیر نکلی جس گھڑی رانجھے کے سنگ
اس کا ماما آن ٹپکا خوامخواہ
چل رہے تھے اشتہار اچھے بھلے
ایک ڈراما آن ٹپکا خوامخواہ

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

ٹیکنالوجی کی جنگ

گوگل نے کہا : ایک لفظ لکھو، ہزاروں رزلٹ دوں گا۔

وکی پیڈیا بولا : ایک لفظ لکھو ہزاروں پیجز دوں گا۔

انٹرنیٹ بولا : میرے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔

کمپیوٹر بولا : تو کون سا میرے بغیر چل سکتا ہے؟

یہ سب سن کے بجلی ہنسی اور بولی۔

"بھونکتے رہو، میں تو چلی۔"

کشف بٹ، عظمیٰ بٹ۔ سیالکوٹ کینٹ

معصومیت کی حد

چھوٹا بچہ : (فون پر) میڈم! میرا بیٹا آج اسکول نہیں آئے گا۔

میڈم : آپ کون بات کر رہے ہیں؟

چھوٹا بچہ : میرے پاپا بات کر رہے ہیں۔

سمیرا مثل۔ جہلم

وفادار کتا

ایک صاحب کا کتا بہت سمجھدار تھا۔ اسے جو کام کہا جاتا، سعادت مندی سے کرتا۔ ایک مرتبہ دونوں پارک میں بیٹھے تھے کہ مالک کے پاس سگریٹ ختم ہو گئی۔ اس نے سو کا نوٹ کتے کو دیتے ہوئے کہا۔

"جاؤ! ایک پیکٹ سگریٹ لے آؤ اور باقی پیسے واپس لے آنا۔"

کتا نوٹ لے کر چلا گیا اور گھنٹے بھر تک نہ آیا تو مالک اسے ڈھونڈنے نکلا۔ وہ اسے ایک ریسٹورنٹ میں تکہ کھاتا نظر آیا۔ مالک نے غم زدہ لہجے میں شکوہ کیا۔

"اس سے پہلے تو کبھی تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔ یہ آج تمہیں کیا ہو گیا۔"

کتا اطمینان سے بولا۔ "اس سے پہلے کبھی آپ نے پیسے میرے ہاتھ میں نہیں دیے تھے۔"

الماس تنویر۔ ہزارہ

اتنی سی بات

پہاڑی علاقے کی ایک نہایت ضعیف عورت کو ایک جھگڑے کے سلسلے میں بطور گواہ عدالت میں پیش کیا گیا تو جج صاحب نے پوچھا۔ "آپ اس جھگڑے کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟"

"ایسی تو خاص بات نہیں تھی۔" بوڑھی خاتون نے مبہم جواب دیا۔

"پھر بھی آپ بتائیے کہ آپ نے کیا دیکھا؟" جج نے اصرار کیا۔

"بات تو کچھ خاص نہ تھی۔" خاتون نے پھر لاپروائی سے بات شروع کی۔ "بس ادھر کاشف خان نے امجد خان کو جھوٹا بولا۔ امجد خان نے کاشف خان کے سر پر ڈنڈا مارا۔ کاشف گر گیا۔ امجد خان سمجھا وہ ٹھنڈا ہو گیا مگر کاشف خان نے خنجر نکال کر امجد خان پر حملہ کر دیا۔ ادھر امجد خان کا دوست بھی موجود تھا۔ اس نے دیکھا تو گولی چلا کر کاشف خان کو ٹھنڈا کر دیا۔ اسی بک بک میں دو تین آدمی اور مر گئے۔ بس! اتنی سی بات پر جھگڑا شروع ہو گیا۔"

شگفتہ فیاض۔ میٹرو ول

سگی بہن

ایک سکھ لڑکا روزانہ اپنی بہن کو چھوڑنے کالج جاتا

تو راستے میں چند لڑکے اس پر آوازیں کستے۔

"سجناں نوں لے کے کتھے چلے او؟"

وہ لڑکا خاموش رہتا۔ تنگ آکر اس کی بہن نے کہا۔

"تمہارا میرے ساتھ آنے کا کیا فائدہ بھیا! وہ لوگ کتنی غلط باتیں کرتے ہیں۔ تم انہیں بتاتے کیوں نہیں کہ میں تمہاری بہن ہوں۔"

لڑکے کی غیرت جاگی۔ اس نے منہ توڑ جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ دوسرے دن وہ اپنی بہن کو لے کر چلا تو لڑکوں نے پھر آواز لگائی۔

"سجناں نوں لے کر کتھے چلے او؟"

"اوئے بے غیرو! اہ سجن ہووے گی تواڈی۔ میری تے سگی بہن اے۔"

(رشیدہ بتول۔ کراچی)

سخاوت

ایک سردار صاحب چائے پی رہے تھے۔ ان کی چائے میں مکھی گر گئی۔ سامنے بیٹھے دوست نے چائے کی طرف سردار صاحب کی توجہ دلائی۔

"سردار صاحب! آپ کی چائے میں مکھی گر گئی ہے۔"

سردار صاحب نے دیکھا اور ہنس کر کہا۔

"اوئے یار! دل بڑا کر۔ اس نے کتنی چائے پی لینی ہے۔"

رابعہ چنڑ۔ سیالکوٹ

فرمانبردار بیٹا

ایک صاحب اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں بچے کھیل میں مصروف تھے۔ انہوں نے ایک بچے کو مخاطب کر کے کہا۔

"بیٹا! ذرا پانی تو پلانا۔" بچے نے کھٹ جواب دیا۔

"آپ کو نظر نہیں آرہا، میں کھیل رہا ہوں۔"

باپ شرمندہ ہوا تو دوسرا بیٹا فوراً بولا۔

"ابو! یہ بہت بدتمیز ہو گیا ہے۔ کسی کا کہنا نہیں مانتا۔ آپ خود اٹھ کر پانی پی لیں۔"

حنا شاہد۔ اورنگی ٹاؤن

علم کا روگ

علم کا روگ ٹھیک ہے لیکن
ڈگریوں کا بھی کچھ اثر ڈالو
کر لیا ہے ایم اے تم نے
میٹرک بھی اب کر ہی ڈالو

عائشہ غلام رسول۔ سرجانی ٹاؤن

معذرت

ایک بہت موٹی، بدصورت اور بھدی عورت کلفٹن کے ساحل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سمندر کی لہروں کے ساتھ ایک بند بوتل بہتی ہوئی کنارے کی ریت پر آگئی۔ عورت نے اسے اٹھا کر کھولا تو اس میں جن برآمد ہوا اور بولا۔

"میں پانچ ہزار سال سے اس بوتل میں بند تھا۔ آپ نے مجھے آزاد کر دیا ہے۔ آپ اپنی خواہش بتائیں۔ میں پوری کروں گا۔"

"میری شکل ریما جیسی... جسم زیبا جیسا اور عمر سترہ سال بنا دو۔" عورت نے فرمائش کی۔

جن نے عورت کا سر تا پا جائزہ لیا اور مردہ سی آواز میں بولا۔

"تم مجھے واپس بوتل میں ہی بند کر دو۔"

ناہید غفور۔ گنگا پور

فوری تدبیر

نرس۔ "ڈاکٹر صاحب! جس آدمی کو آپ نے ابھی مکمل طور پر صحت مند قرار دیا تھا، وہ باہر نکلتے ہوئے دہلیز پر گر کر مر گیا ہے۔"

ڈاکٹر۔ "اس کی لاش کی پوزیشن بدل دو، ایسا لگے جیسے وہ اندر آرہا تھا۔"

شاہدہ شبیر۔ ہنومان گڑھ

*

جس نے دل کو حصار میں رکھا
اُس نے ہی انتظار میں رکھا

اک نئی روشنی نظر آئی
دل کو جب بھی غبار میں رکھا

ہے جدا مجھ سے پھر بھی اُس نے مجھے
اپنے ہی اختیار میں رکھا

مجھ کو جذبوں کی بے قراری نے
زندگی بھر قرار میں رکھا

ایک امید ہے مجھے جس نے
حالتِ اعتبار میں رکھا

منزلِ عشق نے ہمیں پیہم
جستجو کے حصار میں رکھا

عرفان صدیقی

ہجر اندر وصال کا دریا
آئینہ ہے کمال کا دریا

اُڑ رہے ہیں پرند جنگل میں
بہ رہا ہے خیال کا دریا

دعوتِ فکر ہے سخن سازی
شاعری ہے مثال کا دریا

آپ ماضی میں ہوں کہ فردا میں
ساتھ رہتا ہے حال کا دریا

خون بن کر بدن میں بہتا ہے
روز و شب ماہ و سال کا دریا

اک شرارے سے ہو گیا کیسے؟
آدمی اشتعال کا دریا

دشت کو آگ لگ گئی کاظمی
کس نے دیکھا جمال کا دریا

سید کاظمی شاہ

خواہش،

اب تو خواہش ہے یہ "درد" ایسا ملے
سانس لینے کی حسرت میں مر جائیں گے
اب تو خواہش ہے یہ
ایسی آندھی چلے
جس میں پتوں کی مانند بکھر جائیں ہم
اب تو خواہش ہے یہ، دُنیا والوں کا غم
ایسی ٹھوکر لگائے کہ جی نہ سکیں
ایسی اُلجھیں یہ سینے میں سانسیں کہ پھر
ہم دوا پینا چاہیں تو پی نہ سکیں
کوئی ہمدم نہ راہی نہ راحت ملے
ایک پل کا سہارا نہ چاہت ملے
اب تو خواہش ہے یہ
دشت ہی دشت ہو ننگے پاؤں چلیں
ہم سرِ بزم شمع کی مانند جلیں
جس کو چاہیں اسے پھر نہ پائیں کبھی
چھوڑ جائیں یوں چپ چاپ دُنیا کو ہم
دل یہ چاہے بھی تو پھر نہ آئیں کبھی
اب تو خواہش ہے یہ کہ سزا وہ ملے
کوئی صحرا، قلعہ یا بیابان ہو
جس میں سالوں تلک قید ہی قید ہو
اپنے خالق و مالک سے میں نے جو کی
"بے وفائی" وہاں پہ وہ ناپید ہو
ابنِ آدم کی چاہ کے کڑے جرم میں
اپنے ہی ذات کے کھوکھلے بھرم میں
اب تو خواہش ہے یہ کہ سزا وہ ملے
روٹھ جاؤں تو چپ نہ کرائے کوئی
دور جنگل میں یا پھر کسی دشت میں
ہاتھ پکڑے میرا چھوڑ آئے کوئی!

نازیہ کنول نازی

اگر وہ شخص کسی سے وفا نہیں کرتا
تو میں بھی رسمِ تکلف ادا نہیں کرتا

عجیب شہر ہے یہ مصلحت کا مارا ہوا
یہاں پہ کوئی کسی کا بھلا نہیں کرتا

سو چراغ بجھاتا چلا ہی جاتا ہے
ہوا کا جھونکا کسی کی سنا نہیں کرتا

ترا مزاج سمجھتا ہے تیرا دیوانہ
گلی میں آتا ہے لیکن صدا نہیں کرتا

میں اپنے دھیان میں بن اور گزر جاتا ہوں
سوال مجھ سے کوئی راستہ نہیں کرتا

بہت عزیز ہے مجھ کو یہ میری تنہائی
میں اس لیے بھی تجھے ہم نوا نہیں کرتا

اُڑا دیے ہیں مری زندگی نے ہوش مرے
علی زبیر میں کوئی نشہ نہیں کرتا

علی زبیر

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کامیاب وہ ہے جسے اسلام کی ہدایت مل گئی۔ ضرورت کے مطابق رزق مل گیا اور وہ اس پر قانع ہو گیا۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ اسلام سب سے بڑی دولت ہے کیونکہ اس سے آخرت میں جنت ملتی ہے جس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔
2۔ رزق کفاف کا مطلب اتنی روزی ہے جس سے بنیادی ضروریات بغیر فضول خرچی کے پوری ہوتی رہیں اور قرض اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔
3۔ کامیابی دولت کے ڈھیر جمع کرنے کا نام نہیں بلکہ موجود رزق پر قناعت اور شکر اصل دولت اور بڑی کامیابی ہے۔

بچوں سے محبت،

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بعض دفعہ نماز پڑھ رہے ہوتے تھے۔ جب آپ سجدے میں جاتے تو حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کود کر آپ کی پشت پر بیٹھ جایا کرتے۔ جب لوگ ان دونوں کو روکنا چاہتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں اشارہ فرما دیتے کہ انہیں چھوڑ دو (جو کرتے ہیں انہیں کرنے دو) اور نماز پوری کر کے انہیں (سینے سے لگاتے اور پھر) اپنی گود میں بٹھا لیتے اور ارشاد فرماتے کہ جسے مجھ سے محبت ہے اسے ان دونوں سے بھی محبت کرنا چاہیے۔ (طبرانی)

کیسے دوست ہو؟

ایک چغل خور نے ایک بزرگ سے کہا۔
"فلاں شخص آپ کے خلاف یہ باتیں کر رہا تھا۔"
بزرگ نے کہا۔ "تم عجیب دوست ہو۔ جو تیر اس نے مجھے مارے وہ مجھے نہ لگے۔ تم وہ تیر اٹھا اٹھا کر مجھے مار رہے ہو تا کہ مجھے تکلیف محسوس ہو۔"

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

جواب،

شاہ عبدالعزیز دہلوی کے کسی طالب علم نے ان سے ایک میلے میں جانے کی اجازت مانگی۔ وہ میلہ کسی غیر معروف بزرگ کے مزار پر لگتا تھا۔ شاہ صاحب نے کہا۔
"وہاں لہو و لعب اور ناچ گانے کا سلسلہ رہتا ہے۔ کیوں جاتے ہو۔"
طالب علم نے اصرار کیا۔ شاہ صاحب نے ایک رقعہ لکھ کر اسے دیا کہ "مزار پر رکھ دینا۔"
طالب علم کو میلے کی حدود سے باہر ہی ایک درخت کے نیچے ایک کمبل پوش فقیر بیٹھا ملا۔ اس نے کہا۔
"لاؤ، وہ کاغذ جو تمہارے مولوی صاحب نے بھیجا ہے۔"
طالب علم نے اسے کاغذ دے دیا۔ فقیر نے کاغذ لے کر ایک ٹھیکری پر کوئلے سے کچھ نشان لگائے اور کہا۔
"فوراً واپس جاؤ اور یہ ٹھیکری اپنے مولوی صاحب کو دے دو۔"

لڑکے پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ وہ میلہ دیکھے بغیر لوٹ آیا اور ٹھیکری شاہ صاحب کو دی۔ انہوں نے ٹھیکری پر نظر ڈالی اور ہنس دیے۔ بولے۔
"ہم نے صاحب مزار کو لکھا تھا۔ بزرگ ہو کر اتنا تصرف بھی نہیں رکھتے کہ لوگوں کو اس بدعت سے روکیں جو وہ آپ کی قبر پر کر رہے ہیں۔"
انہوں نے جواب میں لکھا ہے کہ "آپ اپنے درس کے ایک شاگرد کو نہیں روک سکے تو میں خدا کی اتنی مخلوق کو کیسے روک سکتا ہوں؟ اور میرا کیا ہے۔ میں تو یہاں باہر نکل کر بیٹھا ہوں۔ لوگ خالی قبروں پر جو چاہیں، کرتے پھریں۔"

عائشہ، گوجرہ

توبہ،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت میرے پاس آئی اور اس نے مجھ سے کہا۔
"کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ میں نے زنا کیا تھا جس سے میرے ہاں بچہ پیدا ہوا پھر میں نے اس بچے کو قتل کر ڈالا۔"
میں نے کہا۔ "نہیں (تو نے دو بڑے گناہ کیے ہیں اس لیے) نہ تو تیری آنکھ کبھی ٹھنڈی ہو اور نہ تجھے شرافت و کرامت کبھی حاصل ہو۔" اس پر وہ عورت افسوس کرتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ پھر میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی اور اس عورت نے جو کچھ کہا تھا اور میں نے اسے جو جواب دیا تھا وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم نے اسے برا جواب دیا۔ کیا تم نے یہ آیتیں آخر تک نہیں پڑھیں۔ (الفرقان آیت 68 - 70)
"اور جو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہیں کرتے اور جس شخص کے قتل کرنے کو اللہ نے حرام فرمایا ہے اس کو قتل نہیں کرتے ہاں مگر حق پر اور وہ زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسے کام کرے گا تو سزا سے اس کو سابقہ پڑے گا کہ قیامت کے روز اس کا عذاب بڑھتا چلا جائے گا اور وہ اس (عذاب) میں ہمیشہ ذلیل (و خوار) ہو کر رہے گا مگر جو (شرک و معاصی سے) توبہ کر لے اور ایمان (بھی) لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے (گزشتہ) گناہوں کی جگہ نیکیاں عنایت فرمائے گا اور اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے۔" (سورۃ الفرقان۔ آیت 64 - 70)
پھر میں نے یہ آیتیں اس عورت کو پڑھ کر سنائیں۔ اس نے کہا "تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے میری خلاصی کی صورت بنا دی۔"
ابن جریر کی ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ افسوس کرتے ہوئے ان کے پاس سے چلی گئی اور وہ کہہ رہی تھی۔
"ہائے افسوس! کیا یہ حسن جہنم کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔"
اس روایت میں آگے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے حضرت ابوہریرہؓ واپس آئے اور انہوں نے مدینہ کے تمام محلوں اور گھروں میں اس عورت کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ اسے بہت ڈھونڈا لیکن وہ عورت کہیں نہ ملی۔ اگلی رات کو وہ خود حضرت ابوہریرہؓ کے پاس آئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا تھا وہ حضرت ابوہریرہؓ نے اسے بتایا۔ وہ فوراً سجدے میں گر گئی اور کہنے لگی۔
"تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے میرے لیے خلاصی کی صورت بنا دی اور جو گناہ مجھ سے سرزد ہو گیا تھا اس سے توبہ کا راستہ بتا دیا اور اس عورت نے اپنی ایک باندی اور اس کی بیٹی آزاد کی اور اللہ کے سامنے سچی توبہ کی۔

فریال رشید۔ مہاجر کیمپ

اقوال زریں،

- عقل مند وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے نہ کہ دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ (حضرت علی المرتضیٰؓ)
- اگر تم کسی سے نیکی نہیں کر سکتے تو اس کی برائی بھی نہ کرو۔ (شیخ سعدیؒ)
- کتابیں جوانی میں رہنما، بڑھاپے میں تفریح اور تنہائی میں رفیق ثابت ہوتی ہیں۔ (البیرونیؒ)

- اس دُنیا میں اتنی بلند دیواروں والے محلوں میں نہ رہو کہ جس میں تمہاری آواز گھٹ جائے۔
(خلیل جبران)
- غصہ کبھی کبھی قابل سے قابل انسان کو بھی بے وقوف بنا دیتا ہے۔ (بقراط)
- اونچے پہاڑ پر چڑھنے کے لیے آہستہ آہستہ چلنا چاہیے۔ (سیکسپیئر)
- سب سے آسان کام اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے کیونکہ آدمی کو جو بات پسند ہوتی ہے، اسے عموماً وہ سچ سمجھتا ہے۔ (ڈلے ماس)
- جو لوگ تعریف کے بھوکے ہوتے ہیں وہ باصلاحیت نہیں ہوتے۔ [illegible]
- کچھ چیزیں جلد کھو جانے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم کھونے کا فن سیکھ کر خوش رہنے کا ڈھنگ سیکھیں۔ (الزبتھ بشپ)
- خاموش انسان، خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔ خاموشی خود ایک راز ہے۔
(واصف علی واصف)
- جو گھر حاجت مند کو روٹی کا ایک ٹکڑا اور ضرورت مند کو ایک بستر کی جگہ دینے میں بخل سے کام لے وہ بربادی کے قابل ہے۔ (خلیل جبران)

نمرہ، اقرأ۔ کراچی

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا ایمان،

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے (بعد میں) اپنے والد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔
"میں نے جنگ احد کے دن آپ کو دیکھ لیا تھا لیکن میں نے آپ سے منہ پھیر لیا۔ (باپ سمجھ کر)"
حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
"لیکن اگر میں تمہیں دیکھ لیتا تو میں تم سے ہرگز منہ نہ پھیرتا۔ بلکہ اللہ کا دشمن سمجھ کر قتل کر دیتا۔" (اس وقت تک حضرت عبدالرحمن مسلمان نہیں ہوئے تھے۔)

سلام کی اہمیت،

حضرت محمد بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے گھر واپس جا رہے تھے۔ میں ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ راستے میں جس آدمی پر ان کا گزر ہوتا، چاہے وہ مسلمان ہوتا یا نصرانی، چھوٹا ہوتا یا بڑا، حضرت ابو امامہؓ اسے سلام ضرور کرتے۔ جب گھر کے دروازے پر پہنچے تو انہوں نے ہماری طرف متوجہ ہو کر کہا۔
"اے میرے بھتیجے! ہمیں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ ہم آپس میں سلام پھیلائیں۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا عدل و انصاف،

حضرت علی بن ربیعہؒ کہتے ہیں حضرت جعدہ بن ہبیرہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں آ کر کہا۔
"اے امیر المومنین! آپ کے پاس دو آدمی آئیں گے۔ ان میں سے ایک کو تو اپنی جان سے بھی زیادہ آپ سے محبت ہے یا یوں کہیے اپنے اہل و عیال اور مال و دولت سے بھی زیادہ آپ سے محبت ہے جبکہ دوسرے کا بس چلے تو آپ کو ذبح کر دے۔ (نعوذ باللہ) اس لیے آپ دوسرے کے خلاف پہلے کے حق میں فیصلہ کریں۔"
اس پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جعدہ کے سینے پر مکا مارا اور فرمایا۔
"اگر یہ فیصلے اپنے آپ کو راضی کرنے کے لیے ہوتے تو میں ضرور ایسا کرتا، لیکن یہ فیصلے تو اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ (اس لیے میں تو حق کے مطابق فیصلہ کروں گا) بے شک وہ فیصلہ کسی کے بھی حق میں ہو جائے۔"

حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کا مال واپس کرنا،

حضرت محمد بن سیرینؒ کہتے ہیں۔ (عراق کے دیہات کے ایک چوہدری نے حضرت ابن جعفر سے کہا کہ وہ اس کی ایک ضرورت کے بارے میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سفارش کر دیں۔ انہوں نے سفارش کر دی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کی وہ ضرورت پوری کر دی۔ اس پر اس چوہدری نے حضرت ابن جعفر کے پاس چالیس ہزار درہم بھیجے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ اس چوہدری نے بھیجے ہیں تو انہوں نے اسے واپس کر دیا اور فرمایا۔
"ہم نیکی بیچا نہیں کرتے۔"

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

رابعہ رشید ـــــــ حویلی بہادر شاہ

اپنے انعام حسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

لبنیٰ اسلم ـــــــ کراچی

تیرے بغیر جس میں گزاری تھی ساری عمر
تجھ سے جب آ کے ملے تو وہ گھر ہی اور تھا
کیا ہوتے ہم کلام بھلا ساحل و چراغ
وہ شب ہی اور تھی، وہ سمندر ہی اور تھا

ثمینہ کوثر ـــــــ میاں چنوں

کیا عشق بھی بھول گئے ہیں لوگ
ہر قصہ نیا نیا کیوں ہے
ہر زخم جاں کے پیش نظر
آئینہ رکھا ہوا کیوں ہے

کومل عدنان ـــــــ ملیر

جب اس کو جیتنا بھی ہار ٹھہرے
تو کھیلے زندگی بھر کا جوا کون
وصال و ہجر سے ماورا تھا عشق
مگر اس زاویے سے دیکھتا کون

ملیکہ احمد ـــــــ سہراب گوٹھ

کچھ بھی تو ہمیں حسب تمنا نہ ملا
منزل تو بڑی بات تھی، رستہ نہ ملا
میں سب کو تو دکھ درد سنانے سے رہا
اک شخص ہے سو وہ بھی تنہا نہ ملا

سونیا تابانی ـــــــ قاضیاں محلہ

وہ اگر مل کر بچھڑتا تو کوئی بات بھی تھی
جس کو پایا ہی نہیں اسے کھونا کیسا

ثوبیہ کاشف ـــــــ لاہور

نہ سوچتے تھے جو دیوار و در بدلنے تک
وہ لوگ ہو گئے تیار گھر بدلنے تک
کمال اس نے کیا اور میں نے حد کر دی
کہ خود بدل گیا اس کی نظر بدلنے تک

حمیرا علی ـــــــ کراچی

کھلے رکھو دروازے اندھیری راتوں میں
کبھی ضرور آئے گی کرن مہتاب کی بھی
ہنستی گاتی آبادی کو اُجاڑنے میں
حالت غیر ہوئی ہو گی سیلاب کی بھی

غزالہ شہناز ـــــــ کراچی

ذرا سی بات پہ دل سے بگاڑ آیا ہوں
بنا بنایا ہوا گھر اُجاڑ آیا ہوں
میں اس جہاں کی قسمت بدلنے نکلا تھا
اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہی پھاڑ آیا ہوں

رخسانہ ظفر ـــــــ لاہور

اس کو تو جیت دیکھنا یا ہار دیکھنا
مجھ کو مگر لڑائی کا معیار دیکھنا
خلوت میں آنکھ بھر کے جسے دیکھنا محال
بر انجمن میں اس کو لگاتار دیکھنا

نیم سحر ـــــــ گلشن اقبال

سلجھا ہوا سا فرد سمجھتے ہیں مجھ کو لوگ
الجھا ہوا سا مجھ میں کوئی دوسرا بھی ہے

پروین اسلم ـــــــ ہجرت کالونی

وہ سب معصوم سے چہرے تلاش رزق میں گم ہیں
جنہیں تتلی پکڑنا تھی، جنہیں باغوں میں ہونا تھا

اقصیٰ شہباز ـــــــ کراچی

نگاہِ عشق کا عیب ہی مشغلہ دیکھا
اسے ہی دیکھنا چاہے، جسے بے پناہ دیکھا

ثمرہ جبیں ـــــــ کراچی

کون سا شعر سناؤں میں تمہیں، سوچتا ہوں
نیا مبہم ہے بہت اور پرانا مشکل

مسرت جبیں ـــــــ ڈیفنس

خودکشی کیا دکھوں کا حل بنتی
موت کے اپنے سو جھمیلے تھے

ثمرہ رزاق ـــــــ کراچی

اپنی وجہ بربادی سنیے تو مزے کی ہے
زندگی سے یوں کھیلے جیسے دوسرے کی ہے

حنا سلیم اعوان ـــــــ آخون باندی

وہ پاس نہیں احساس تو ہے اک یاد تو ہے اک آس تو ہے
دریائے جدائی میں دیکھو تنکے کا سہارا کیسا ہے
کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگھرو ہیں ہوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں اب وقت کا دھارا کیسا ہے

آمنہ اُجالا ـــــــ ڈہرکی

راہِ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں
چاند سے مکھڑے رشکِ غزالاں سب جانے پہچانے ہیں
بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

عائشہ رانجھا ـــــــ کندن سیان (ڈسکہ)

اک ہجر تھا سو وہ بھی رہا شورش میں گم
اک وصل تھا سو وصل کو شدت نہ مل سکی
جو لوگ دور تھے وہ سدا دور ہی رہے
جو پاس تھے سو اُن سے طبیعت نہ مل سکی

منزہ معراج ـــــــ ٹنڈو محمد خان

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

حمنہ حبیب ـــــــ عبدالحکیم

وفا میں اب یہ ہنر اختیار کرنا ہے
وہ سچ کہے نہ کہے اعتبار کرنا ہے

ثریا رشید ـــــــ بلدیہ ٹاؤن

تم لوٹ کے آنے کا تکلف نہ کرنا
ہم ایک محبت کو دوبارہ نہیں کرتے

فاطمہ ثانی ـــــــ کراچی

یہاں ہیں جسم بہت سے، ضمیر کوئی نہیں
یہ وہ قفس ہیں کہ جن میں اسیر کوئی نہیں

ارم آفتاب ـــــــ لاڑکانہ

وہ بھی اب میرا شریکِ غمِ تنہائی ہے
دشت کی پیاس سمندر میں اتر آئی ہے

نسرین اختر ـــــــ میٹرو ول

ان کو ناموس بھی، عزت بھی، پذیرائی بھی
مجھ کو رونے کو میسر نہیں تنہائی بھی

یاسمین ظفر ـــــــ لاہور

رہتی ہے ان کے رخ پہ شگفتہ سی برہمی
یہ طرزِ التفات ہے یا اجتناب ہے
ہوتا نہیں عیاں کبھی ان کے مزاج سے
نیت خراب ہے کہ طبیعت خراب ہے

راحیلہ شکیل ـــــــ کراچی

جہاں ہے دھول وہیں پر لہو کے پھول بھی ہیں
برہنہ پا ہوں خزاں کو بہار کرتے ہوئے

شگرف اعجاز ـــــــ کراچی

بس اب کچھ دیر میں محسن وہ پتھر ٹوٹ جائے گا
میں اس کی سرد مہری پر محبت مار آیا ہوں

نشاط احسان ـــــــ لاہور

زمین تنگ تو ہے کورِ چشم شب سے مگر
کسے خبر کہ یہ اندازِ شب سحر کا بھی ہو

اسیلا شاہین ـــــــ کراچی

بہت دنوں سے دکھائی نہیں دیا وہ شخص
یہ تجھ سے پوچھتے ہوں گے تری گلی والے
اسی مقام پہ کل مجھ کو دیکھ کر تنہا
بہت اداس ہوئے پھول بیچنے والے

شاعری سچ بولتی ہے

صالحہ شبیر

انسان کی زبان جھوٹ گھڑتی ہے، آنکھ بہت کچھ چھپا جاتی ہے لیکن شاعری نہیں۔ شاعری وہ سچ ہے جو زبان کے بجائے دل سے نکلتا ہے اور دل پر اثر کرتا ہے۔ جذبات و احساسات کا دوسرا نام شاعری ہے اور جذبات و احساسات کبھی جھوٹ نہیں ہوتے۔

بات شاعری کی ہو اور ابتدا حضرت علامہ اقبال سے نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

مرزا اسداللہ خان غالب، شاعری کی دنیا کا ایک اور نام جو ابھی تک، آج تک لوگوں کے اندر سانس لے رہا ہے۔ تکلیف و مصیبت کا شاعر۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز ماہ و سال کہاں

فرصت کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارہ جمال کہاں

تھی اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

انسانی کیفیتوں کو اپنی زبان سے ادا کرنے والا ایک اور نام فیض احمد فیض۔

تمہارے حسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر
تمہاری یاد سے دل ہمکلام رہتا ہے
رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

فیض کے ہاں محبوب کے حسن کو خراجِ عقیدت کچھ ایسے پیش کیا جاتا ہے۔

تیرا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

حادثات کا شاعر، درد و الم کی مکمل تصویر کشی کرنے والا ایک نام ساحر لدھیانوی۔ ساحر اپنی زندگی کے

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

ان کی ایک مختصر نظم سے دو اشعار۔

اس رینگتی حیات کا کب تک اٹھائیں بار
بیمار اب الجھنے لگے ہیں طبیب سے
اس طرح زندگی نے دیا ہے ہمارا ساتھ
جیسے کوئی نباہ رہا ہو رقیب سے

محسن نقوی وہ نام جس نے زندگی کے کسی ایک رخ کی عکاسی کرنے کے بجائے زندگی کے ہر پہلو کی ترجمانی

کی۔ وہ خوابوں میں حقیقتیں بننے والا شاعر، ٹوٹے پھوٹے خوابوں کو شاعری میں سمونے والا شاعر۔

- بُرا نہ مان میرا حرف حرف زہر سہی
میں کیا کروں، یہی ذائقہ زبان کا ہے
ہر ایک پر مسلط ہے ویرانی دل کی
تمام شہر پر سایا میرے مکان کا ہے

ابر برسا نہ تیز ہوا چلی ہے اب کے
کتنی ویران تیری یادوں کی گلی ہے اب کے

صبح کی دھوپ اُتر آئی ہے میرے بالوں میں
شب ڈھلی ہے کہ میری عمر ڈھلی ہے اب کے

کیا کہوں کتنے بہانوں سے بھلایا اسے
یہ قیامت بڑی مشکل سے ٹلی ہے اب کے

اب کچھ متفرق اشعار جو پڑھنے والے کے دل کی نظر کو بھی اچھے لگتے ہیں۔

- ناصحو! یوں بھی تو مر جاتے ہیں
عشق سے مجھ کو ڈراتے کیوں ہو

- میرے جنوں کو زلف کے سائے سے دور رکھ
رستے میں چھاؤں پا کے مسافر ٹھہر نہ جائے

- وہ بات بات پہ ہنستا تیری ادا ہی سہی
تمام عمر رلایا اسی ادا نے مجھے

- دی مؤذن نے شب وصال اذان پچھلے پہر
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

- مجھ سے مانگے گا تیرے عہد محبت کا حساب
تیرے ہجراں کا دہکتا ہوا محشر جاناں
یوں تیرے غم سے شکستہ ہے دل کا مزاج
جیسے ٹکرائے کسی شیشے سے پتھر جاناں

اس سلسلے کا اختتام کرنے سے کچھ پہلے اپنے بارے میں تحریر کرتی چلوں۔ صالحہ میرا نام ہے۔ شاعری سے ایسا لگتا ہے جیسے انسانی جسم کو سردیوں میں دھوپ سے اور گرمیوں میں چھاؤں سے ہوتا ہے۔
آخر میں اپنے کلام کے ساتھ رخصت مانگوں گی۔ اللہ رب العزت نے مجھے بھی ان ہی خوش نصیبوں میں شامل کیا ہے جو جذبات و احساسات کو الفاظ کا روپ دے سکتے ہیں اس کے کرم سے۔

- میں ہی تو اس کے گھر کا پتا ہوں
تلاش رہے ہو جسے تم نگر نگر

- کچھ درد، کچھ داغ، کچھ پتھر ملے
خود کو بیچ کر کیا کیا نہیں پایا

زندگی کے جھمیلوں میں
ان رونقوں اور میلوں میں
جن کو ملنا ہوتا ہے
وہی تو کھو جاتے ہیں
چاہت کی فصل اگتی ہے
خون جگر سے پکتی ہے
تو
ہجر کی درانتی چلتی ہے
خواب اپنے بیج بو جاتے ہیں
اور
تعبیروں کے تن بانجھ ہو جاتے ہیں

امید نہیں بلکہ یقین رکھتی ہوں کہ تمام اہل ذوق خواتین و حضرات کو میرا انتخاب اچھا لگے گا۔ ایک قابل عمل بات کہنا چاہوں گی آخر میں۔
"زندگی کو تنہائی مت بنائیں ورنہ آباد رہنے کا ہنر بھول جائیں گے اور دنیا ساتھ چھوڑ دے گی۔"
اور زندگی کیا ہے!

- زندگی تو اپنی زلف یار ہی بن گئی
الجھتی ہی جائے جتنا بھی سلجھائیں

تبصیر نشاط

قسمت

انسان کی کامیابی میں محنت اور جدوجہد کا مقام اپنی جگہ 'تاہم اس میں قسمت کے عمل دخل سے کسی طور بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ابھرتے ہوئے نوجوان اداکار عمر قاضی صرف خوبرو ہی نہیں 'باصلاحیت بھی ہیں۔ ان کی پہلی فلم سید نور کی "سپنے اپنے" تھی۔ اس کے بعد انہوں نے دو فلمیں اور پھر کچھ ٹی وی سیریلز کیں۔ چند ماہ قبل وہ محض سیر و تفریح کی غرض سے امریکا گئے۔ (اور امریکیوں کے لیے سیر و تفریح کا میدان ہماری سرزمین ہے۔) عمر قاضی اپنی ایک ڈراما سیریل "کبھی تم جدا نہ ہونا" میں وینا ملک کے ساتھ کام کرچکے تھے 'سوانہوں نے ایسے ہی ہالی ووڈ میں آڈیشن دے ڈالا۔ (غالباً" وینا کے ساتھ کام کرکے وہاں بھی کام کرنے کا چسکا لگ گیا ہوگا) چونکہ وینا کے ساتھ کام کرچکے تھے 'لہٰذا آڈیشن میں ذرا بھی نہ گھبرائے اور میدان مارلیا۔

امریکی ادارے وارنر برادرز نے اپنی نئی فلم " Enough "میں عمر کو بطور ہیرو کاسٹ کیا ہے۔ یوں عمر وہ پہلے پاکستانی اداکار ہیں جو ہالی ووڈ کی فلم میں مرکزی کردار ادا کریں گے۔ ان سے قبل پاکستان سے عدنان صدیقی اور کچھ دوسرے اداکار بھی ہالی ووڈ کے لیے کام کرچکے ہیں۔ حال ہی میں اداکار احسن خان کو بھی ہالی ووڈ سے پیش کش ہوئی ہے 'مگر عمر وہ پہلے اداکار ہیں جو ہیرو کا رول ادا کررہے ہیں۔ (اور لوگوں کو وینا کے ساتھ کام کا تجربہ جو نہیں تھا۔)

انتظار

کہتے ہیں کہ شخصیت کے خوب صورت اور دیرپا تاثر کے لیے اجلے چہرے سے زیادہ من کا اجلا ہونا ضروری ہے۔ اکثر اجلے چہرے والے اپنے عمل سے اپنی شخصیت کے خوب صورت تاثر کو مجروح کرتے دیکھے گئے ہیں۔

عائشہ خان جونیر ایک خوب صورت اور باصلاحیت اداکارہ ہیں۔ تاہم خوب صورتی اور اداکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کے نخرے بھی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ چند سال قبل کی بات ہے۔ عائشہ خان نجی چینل کی ایک سیریل میں کام کررہی تھیں۔ سیریل کی ریکارڈنگ اختتامی مراحل میں تھی۔ آخری دن کا کام ہورہا تھا۔ سارا دن ریکارڈنگ ہوتی رہی۔ سب تیزی سے کام کررہے تھے 'کیونکہ عائشہ کو اگلے دن دو ماہ کے لیے امریکا چلے جانا تھا۔ عائشہ کے صرف دو سین کا کام باقی تھا۔ ایک سین تھوڑا بڑا تھا۔ ہدایت کار نے سوچا پہلے اسے نمٹالیا جائے۔ عائشہ کو اسکرپٹ دیا گیا۔ سین پر نظر پڑتے ہی عائشہ کا موڈ خراب ہوگیا۔ انہوں نے فوراً" سردرد کی شکایت کردی۔ ہدایت کار نے تھوڑی دیر آرام کرنے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد جب ریکارڈنگ کا وقت ہوا تو عائشہ بگڑنے لگیں کہ

"اتنا بڑا سین کیسے یاد کروں؟ میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔"

ہدایت کار نے کہا۔ "چلو! تھوڑا تھوڑا کرکے ریکارڈ کرادو۔ ہم وقفہ دے کر ریکارڈ کرلیں گے۔"

عائشہ مان گئیں 'لیکن جب ریکارڈنگ شروع ہوئی تو چند مکالموں کے بعد ہی عائشہ نے غصے میں کٹ کرادیا اور کام چھوڑ چھاڑ ایک طرف بیٹھ گئیں۔ ہدایت کار کے پوچھنے پر بولیں۔

"اگر زبردستی شوٹ کرایا تو پرفارمنس خراب ہوگی' جس کا اثر سیریل پر پڑے گا۔ (دیکھا! سیریل کا کتنا خیال ہے۔) بہتر ہوگا 'آج کام نہ کیا جائے۔ امریکا سے آنے کے بعد دونوں سین شوٹ کرادوں گی۔"

ہدایت کار سٹپٹا گئے 'کہنے لگے۔ "صرف دو سین کے لیے ہمیں یہ لوکیشن دوبارہ لینی پڑے گی اور کرایہ بھی دینا پڑے گا۔"

عائشہ ناگواری سے بولیں۔ "میری صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ (اور کیا! جان ہے تو ہی جہان ہے نا) کرایہ میں دے دوں گی۔"

یہ کہتے ہی عائشہ نے اپنا پرس سنبھالا اور چلی گئیں۔ بے چارے ہدایت کار کو صرف دو سین کے لیے دو ماہ انتظار کرنا پڑا۔ (ہدایت کار صاحب! شکر کریں 'دو ہی سین باقی تھے۔ چھ ہوتے تو چھ ماہ انتظار کرنا پڑتا۔)

شہد

میٹھا میٹھا شہد بچوں اور بڑوں کو مرغوب تو ہے ہی' تاہم اللہ تعالیٰ نے اسے شفابخش بھی قرار دیا ہے۔ چودہ سو سال پہلے نازل ہونے والے قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو آج کی سائنس باقاعدہ تحقیق کے بعد تسلیم کررہی ہے۔ بحیثیت مسلمان ہم تو اس پر پہلے ہی سے آنکھ بند کرکے یقین رکھتے ہیں 'مگر بقول شاعر۔

"پھیلائے ہوئے گوشہ داماں تجسس
سائنس مرے محمد کا پتا پوچھ رہی ہے"

جی جناب! حال ہی میں ہونے والی ایک جدید سائنسی تحقیق کے مطابق "منو کا شہد" سے ناسور کا علاج بھی کیا جاسکتا ہے۔ ایک موقر طبی جریدے میں شائع ہونے والی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق کسی

بھی زخم پر شہد لگایا جائے تو وہ دو گھنٹے میں پچاسی فیصد تک ٹھیک ہوجاتا ہے۔ شہد میں جراثیم کش خصوصیات حیرت انگیز حد تک پائی جاتی ہیں۔ ویسے تو جراثیموں کو ختم کرنے کی صلاحیت ہر قسم کے شہد میں موجود ہے، تاہم "منو کا شہد" میں یہ صلاحیت بدرجہ انتہا پائی جاتی ہے۔

شہد کی اس خصوصیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسے پٹیوں اور ڈریسنگز وغیرہ میں استعمال کیا جارہا ہے، تاہم آپ اسے زخموں پر براہ راست بھی لگا سکتے ہیں، بشرطیکہ شہد اصلی اور خالص ہو۔ (اور ہمارے ملک میں یہ کام بے حد مشکل ہے۔)

یہ بیان کالمانہ

☆ امریکی مصنف نے انکشاف کیا ہے کہ چند برس قبل آزاد کشمیر میں تباہ کن زلزلہ آیا تھا تو امدادی سرگرمیوں کی آڑ میں امریکا نے "ٹارگٹ کلرز" کی فوج بھیج دی۔ مشرف سرکار نے اسی لیے جماعت الدعوۃ اور جماعت اسلامی اور اسی قسم کی دوسری تنظیموں کو امدادی سرگرمیوں سے روکنے کی کوشش کی کہ وہ معزز مہمانوں کی حفاظت چاہتے تھے۔

(وغیرہ وغیرہ۔ عبداللہ طارق سہیل)

☆ جنوری میں جو ڈرون حملے پاکستانی سرزمین پر ہوئے، وہ پاکستان کے تعاون سے ہوئے۔

(برطانوی خبر رساں ادارہ کی رپورٹ)

☆ امریکا پھر جیت گیا، وہ ریمنڈ ڈیوس کو بھی مکھن میں سے بال کی طرح نکال کرلے گیا تھا۔ اب حسین حقانی کو بھی لے گیا۔ بے شک وہ جسے چاہتا ہے ہم پر چھوڑ دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لے جاتا ہے۔

(وغیرہ وغیرہ۔ عبداللہ طارق سہیل)

☆ اسلامی یونیورسٹی کے متعلق سنتے تھے۔ کبھی جاکر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دیکھا تو پتا چلا کہ کم از کم ویسا تو نقشہ نہیں ہے جیسا یار و اغیار نے کھینچ کر بتایا تھا۔ مطلب نقشہ متوازی تعلیم والا ہی نظر آتا ہے۔

(بندگی نامہ۔ انتظار حسین)

☆ ہم نے کیری لوگر بل پڑھا تو پتا چلا کہ بل کی ایک شرط کے ذریعے پاکستان امریکا کو ملک میں جاسوسی کا نیٹ ورک بنانے کی اجازت دے چکا ہے اور اب ہم ریمنڈ ڈیوس جیسے لوگوں کو نکالنا بھی چاہیں تو نہیں نکال سکیں گے۔

(جسٹس جاوید اقبال)

☆ میں نے متحدہ قومی موومنٹ کے لیے بہت کچھ کیا، دیکھتا ہوں یہ میرے لیے کیا کرتی ہے۔ 1999ء سے قبل ان کی کیا شہرت تھی، میرے آنے کے بعد کیا ہوا۔

(سابق صدر پرویز مشرف)

☆ اسامہ بن لادن کی شہادت میں معاونت کرنے والے پاکستانی غدار ڈاکٹر شکیل کو امریکی شہریت اور میڈل دینے کے لیے امریکی کانگریس میں بل پیش کردیا۔

(واشنگٹن پوسٹ)

شہنشاہ

مصنف: ایشارد کاپوشنسکی
ترجمہ: اجمل کمال
تبصرہ: آمنہ زرین

یادداشت، مشاہدہ، پرکھ اور تجزیہ جیسے خواص صحافی کو عام آدمی سے ممتاز کرتے ہیں۔ اپنے پیشے سے دیانت دارانہ وابستگی اور حق کی حمایت اسے اپنے ہم پیشہ لوگوں میں بھی بلند اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے!

"شہنشاہ" ایک ایسے ہی عالمی سطح پر شہرت یافتہ صحافی کے قلم کا شاہکار ہے.... جس میں ایرانی انقلاب کے پس منظر، حکمران طبقے کی مخصوص بے حسی اور عام آدمی پر تنگ کردی گئی زندگی کے بیان کو صحافیانہ معلومات اور حساس مشاہدے کے امتزاج نے ایسا موثر انداز عطا کیا ہے کہ پڑھنے والا جزئیات سے تفصیلات تک، خود کو ایران ہی میں چلتا پھرتا کردار سمجھنے لگتا ہے!

مصنف نے ایران میں رہ کر، مخصوص صحافتی طریقوں کی بدولت معلومات اکٹھی کیں.... جن میں تصویریں، نوٹس، لوگوں سے بات چیت پر مشتمل کیسٹ اور روزمرہ کے حالات کا مشاہدہ شامل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود تحریر عام صحافتی تحریر سے بہت مختلف ہے اور یہی اس کا امتیازی وصف ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس شان دار کتاب تک ہمارے فہم کی رسائی کو ممکن بنانے والے، یعنی ہماری اپنی زبان میں ڈھالنے والے صاحبِ ترجمہ کا ذکر بھی لازم ہے کہ یہ بھی شان دار ہے۔ اجمل کمال نے اس کتاب کا کمال ترجمہ کیا ہے۔

اس دفعہ اپنے موضوع اور انداز کے اعتبار سے کتاب کچھ مختلف سی ہے۔ لہٰذا ترتیب وار کچھ اقتباس حاضر ہیں، جو کتاب میں موجود مکمل تصویر کی نمایاں جھلک دکھا سکیں۔ یعنی میرے تبصرے کی گنجائش ہی نہیں اور ہوتا بھی اگر.... تو سوائے شان دار! شان دار کے کچھ بھی نہ ہوتا!

لوگ دوسروں کی طاقت کی تحسین کرسکتے ہیں بشرطیکہ یہ طاقت ان سے مناسب فاصلے پر ہو اور ان کے خلاف استعمال نہ کی جارہی ہو۔ ہر قوت اپنی حرکیات، اپنے فرماں روایانہ توسیعی رجحانات اور کمزوروں کو کچل ڈالنے کی شدید، زور آور طلب رکھتی ہے۔ یہ طاقت کا قانون ہے، جیسا کہ ہر کوئی جانتا ہے۔

مگر کمزور کیا کرسکتے ہیں؟ وہ صرف اپنے گرد باڑھ بنا سکتے ہیں اور نگل لیے جانے، محروم کردیے جانے، یکساں چال ڈھال، روپ رنگ، زبان، سوچ اور ردعمل کی بے چہرہ قطاروں کا حصہ بنادیے جانے، کسی اجنبی مقصد کے لیے خون بہانے پر مجبور کیے جانے اور آخر کار کچل کر ملیامیٹ کردیے جانے کے خوف میں مبتلا رہ سکتے ہیں۔

شاہ ایک ہیبت ناک فوج کے قیام سے ابتدا کرتا ہے۔ فوج شاہ کو اپنی آنکھ کی پتلی کی طرح عزیز ہے، اس کے اشتیاق کا مرکز ہے۔ فوج کو رقم کی کمی کبھی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کو ہر چیز میسر رہنی چاہیے۔ فوج ہی قوم کو جدید منظم اور فرماں بردار بنائے گی۔ ہر شخص اٹینشن ہوجائے!

شاہ روایتی لباس کو ممنوع کرنے کا حکم جاری کرتا ہے۔ ہر شخص یورپی وضع کے سوٹ پہنے۔ ہر شخص یورپی ہیٹ لگائے۔

شاہ چادر پہننے پر پابندی لگا دیتا ہے۔ گلیوں میں پولیس والے سہمی ہوئی عورتوں کی چادریں کھینچ کر اتار دیتے ہیں۔

مشہد کی مسجدوں میں مومن احتجاج کرتے ہیں۔ وہ اپنا توپ خانہ بھیج کر مسجدوں کو ہموار اور باغیوں کو قتل کرا دیتا ہے۔

وہ حکم جاری کرتا ہے کہ خانہ بدوش قبائلیوں کو مستقل طور پر بسنے پر مجبور کیا جائے۔ خانہ بدوش احتجاج کرتے ہیں۔ وہ ان کے کنوؤں کے پانی کو زہر آلود کرا دیتا ہے اور انہیں بھوک پیاس سے ہلاک کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ خانہ بدوش احتجاج جاری رکھتے ہیں وہ فوجی دستے بھیج کر بڑے بڑے علاقوں کو اجاڑ بنا دیتا ہے۔

قم میں ایک ملا اپنے وعظ میں تنقیدی لہجہ اختیار کرتا ہے' شاہ خود اپنے ہاتھ میں چھڑی لیے مسجد میں داخل ہوتا ہے اور ناقد ملا کی پٹائی کرتا ہے۔

"شاہ کے حکم پر ایک فائرنگ اسکواڈ ایک گدھے کو ہلاک کرتا ہے جو خبردار کرنے کی تمام تختیوں کو نظر انداز کرتا ہوا رضا خان کی ملک کی ایک چراگاہ میں جا گھسا تھا۔ آس پاس کے گاؤں کے رہنے والوں کو یہ منظر دیکھنے کے لیے گھیر کر لے جایا جاتا ہے تاکہ ان میں اپنے مالک کی جائیداد کا احترام پیدا ہو۔"

"ہاں بالکل' آپ ریکارڈ کر سکتے ہیں۔ اب اس کا ذکر ممنوع نہیں رہا۔"

پہلے ممنوع تھا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ پچیس سال تک اس کا نام بر سر عام لینے پر پابندی تھی؟ کہ "مصدق" نام کو تمام کتابوں سے' پوری تاریخ سے نکال دیا گیا تھا؟ اور ذرا سوچیے! آج نوعمر لوگ' جن کے بارے میں فرض کیا گیا تھا کہ انہیں اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں' اس کی بڑی بڑی تصویریں ہاتھوں میں اٹھائے اپنی موت کا سامنا کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو اس بات کا ثبوت مل سکتا ہے کہ تاریخ سے کسی کو نکالنا اور تاریخ کو از سر نو تحریر کرنا کن نتائج کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یہ بات شاہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ آپ کسی شخص کو مار سکتے ہیں لیکن مار دینے سے اس کا وجود ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے برعکس' میں تو کہوں گا کہ اس کا وجود اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔"

"درانتی گھومتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ گھاس دوبارہ اگنے لگتی ہے۔ دوبارہ کاٹیں تو اور بھی تیزی سے بڑھنے لگتی ہے۔ یہ فطرت کا بڑا اطمینان بخش قانون ہے۔"

"مصدق نے کہا تھا کہ جس زمین پر ہم چلتے ہیں وہ ہماری ہے! اور اس زمین سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ بھی ہمارا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا۔ ہر شخص کو بات کرنے دو' میں سب کی رائے جاننا چاہتا ہوں۔ ڈھائی ہزار سال تک جبر کے پیروں تلے روندے جانے والے ایرانی کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا کہ تم سوچنے والے وجود ہو۔ کسی حکمران نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا! لوگوں کو مصدق کی باتیں یاد رہیں۔ جو لفظ دنیا کے مقابل ہماری آنکھیں کھول دیتے ہیں' انہیں یاد رکھنا سب سے آسان کام ہے۔ آج ہر کوئی کہتا ہے کہ اس کی بات درست تھی' مگر مشکل یہ تھی کہ اس نے یہ درست بات وقت آنے سے بہت پہلے کہہ دی۔ وقت آنے سے پہلے درست بات کہنا آپ کے اقتدار بلکہ آپ کی زندگی کے لیے بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ سچ کے پھل کو پکنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ لیکن اچانک ایک شخص آ کر وقت سے پہلے یہ سچی بات کہہ دیتا ہے' اس سے پہلے کہ یہ بات اپنی جڑیں اچھی طرح جما سکے' حکمران قوتیں اس گستاخ کو پکڑ کر زندہ جلا دیتی ہیں یا قید کر دیتی ہیں یا پھانسی چڑھا دیتی ہیں کیونکہ اس نے ان کے مفادات پر ضرب لگائی' یا ان کے سکون میں خلل ڈالا۔ مصدق شاہی آمریت اور غیر ملکی استبداد کے

سامنے کھڑا ہوا۔ آج شاہیاں ایک ایک کر کے زمین بوس ہو رہی ہیں اور استبداد کو ہزار طرح کے بھیس بدلنے پڑتے ہیں کیونکہ اس کی شدید مخالفت شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ تیس سال پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا جب یہاں کوئی بھی اتنی سادہ باتیں کہنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔"

"تیل سے غیر معمولی جذبے اور امیدیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ تیل سب سے بڑھ کر ایک بہت بڑی ترغیب ہے۔ یہ آسائش' دولت' طاقت' خزانے اور اقتدار کی ترغیب ہے۔ تیل کا تصور انسان کے اس ابدی خواب کا اظہار ہے جس میں وہ خون پسینے اور محنت کے بجائے خوش قسمتی کے ایک حادثے کی بدولت راتوں رات مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تیل پریوں کی کہانیوں کی طرح ہے اور پریوں کی کہانیوں ہی کی طرح اس میں جھوٹ کا سا عنصر شامل ہے۔

تیل ہمیں ایسے تکبر میں مبتلا کر دیتا ہے کہ ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے لیے وقت جیسی ناقابل عبور رکاوٹ کو بھی عبور کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ آخری شاہ کہا کرتا تھا۔ "تیل کی مدد سے ایک نسل کی زندگی کے عرصے میں دوسرے امریکا کی تخلیق کروں گا!"

ایران ساواک کے قبضے میں تھا۔ یونیورسٹیوں' دفتروں اور کارخانوں میں ساواک کا راج تھا۔ وہ بہت بڑا ہشت پا تھی جو بری طرح پھیل گئی تھی۔ جس کی لچک دار سونڈیں ہر چیز کو گرفت میں لیے ہوئے تھیں' ہر چیز کو الجھا لیتی تھیں۔ ساواک کے ایجنٹوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ مگر کسی نے حساب لگایا تھا کہ اس کے پاس تیس لاکھ مخبر موجود تھے جو مختلف قسم کے محرکات کے زیر اثر دوسرے لوگوں کی مخبری کرتے تھے۔ ساواک یا تو لوگوں کو خرید لیتی تھی یا ان پر تشدد کرتی تھی۔ انہیں عہدوں پر فائز کرتی تھی یا قید میں ڈال دیتی تھی۔ وہی طے کرتی تھی کہ دشمن کون ہے اور یہ فیصلہ بھی اسی کے ہاتھ میں تھا کہ کس کو ختم کر دیا جائے۔"

"ساواک کا مطلب' سب سے بڑھ کر' انتہائی دہشت ناک قسم کا تشدد ہی تھا۔ گلی میں چلتے ہوئے کسی شخص کو اغوا کر کے' آنکھوں پر پٹی باندھ کر کوئی سوال کیے بغیر اسے سیدھا عقوبت خانے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ وہاں اس پر تشدد کے مخصوص بہیمانہ طریقے سلسلے وار آزمائے جاتے تھے' ہڈیاں توڑنا' ناخن اکھاڑنا' ہاتھوں کو جلتے ہوئے توے پر رکھ دینا' زندہ آدمی کی کھوپڑی میں ڈرل مشین سے سوراخ کرنا اور ایسی ہی دوسری ہولناک ایذائیں۔ آخر میں' جب وہ درد سے پاگل ہو کر ایک ٹوٹا پھوٹا خون آلود ڈھیر بن چکا ہوتا' تب اس سے پوچھ گچھ کا آغاز کیا جاتا۔

"نام؟ پتا؟ تم شاہ کے خلاف کیا باتیں کرتے پھر رہے تھے؟ جلدی بتاؤ' کیا بات کر رہے تھے تم؟"

ساواک کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ کوئی شخص بے قصور ہے یا نہیں۔ اس طرح ہر شخص خواہ وہ قصوروار ہو یا بے قصور' خوف کے عالم میں رہے گا۔ کوئی خود کو محفوظ نہیں سمجھے گا۔

ساواک کی دہشت کی اصل بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ کسی بھی شخص پر جھپٹ سکتی تھی' کسی بھی شخص پر الزام لگا سکتی تھی کیوں کہ ساواک کے لگائے ہوئے الزاموں کا تعلق کسی فعل سے نہیں بلکہ فعل کے ارادے سے تھا' جسے وہ کسی بھی شخص سے منسوب کر سکتی تھی۔

"تم نے شاہ کی مخالفت کی تھی؟ نہیں مگر کرنا چاہتے تھے' حرام زادے! بس اتنا ہی کافی ہوتا تھا۔"

"خیر آباد ایئرپورٹ پر کھڑا جرمن ایئرلائن لفتانزا کا ایک جہاز کوئی اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس جہاز کو اشتہار بازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کی تمام نشستیں فروخت ہو چکی ہیں' یہ جہاز ہر روز تہران سے پرواز کرتا اور دوپہر کے وقت میونخ پہنچتا ہے۔ منتظر لیموزین کاریں مسافروں کو لے کر عمدہ ریستورانوں میں کھانا کھلانے لے جاتی ہیں۔ کھانے کے بعد وہ سب اسی جہاز میں سوار ہو کر تہران واپس آجاتے ہیں اور رات کا کھانا اپنے گھر پہ کھاتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی مہنگی تفریح نہیں ہے۔ فی کس صرف دو ہزار ڈالر خرچ آتا ہے۔ جنہیں شاہ کی خوشنودی حاصل

ہے ان کے لیے یہ رقم کیا حیثیت رکھتی ہے! درحقیقت یہ لوگ محل کے ادنیٰ ملازم ہیں جو دوپہر کا کھانا میونخ جاکر کھاتے ہیں۔"

"آمرانہ معاشروں میں (جہاں مراعات یافتہ لوگ اپنے مفادات ریاست کے ساتھ پیوست کرلیتے ہیں جوان کے اقتدار کی ضامن ہوتی ہے) یہی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ ایسے معاشروں میں ترقی کا مطلب ریاست اور اس کی جابرانہ مشینری کو مزید طاقت ور کر کے آمریت، محکومیت، بنجرپن، ابہام اور وجود کے خالی پن کو مستحکم کرنا ہوتا ہے۔ جس ترقی کو عظیم تہذیب کے نام پر تیار کرکے ایران کے ہاتھ فروخت کیا گیا' اسی قسم کی ترقی تھی۔ کیا اس کے رد عمل میں ایرانیوں کا اٹھ کھڑا ہونا اور بے پناہ قربانیاں دے کر اس ترقی کو تباہ و برباد کرڈالنا قابل ملامت بات تھی؟"

"انقلاب کو حرکت میں لانے کی ذمہ دار حاکمیت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے' وہ یہ عمل شعوری طور پر نہیں کرتی' لیکن اس کا طرز زندگی اور طرز حکمرانی خود اشتعال کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب انجام سے بے پروائی حاکم طبقوں میں جڑ پکڑ لیتی ہے۔ کچھ عرصے تک یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ حکمران افراد جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ ستائے ہوئے لوگ خاموش' صابر اور محتاط رہتے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہیں اور ابھی اپنی طاقت کا احساس نہیں رکھتے۔ لیکن وہ ناانصافیوں کو فہرست میں درج کرتے جاتے ہیں اور آخر کار ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب ان ناانصافیوں کا حاصل جمع نکالا جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس لمحے کا انتخاب تاریخ کے سامنے آنے والا سب سے لاینحل معما ہے۔"

8جنوری 1978ء کو

سرکاری روزنامہ اخبار اطلاعات میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں خمینی کی شخصیت پر حملہ کیا گیا تھا۔ ان دنوں خمینی ملک سے باہر ایک جلاوطن کی حیثیت سے رہتے ہوئے شاہ کے خلاف جدوجہد کررہے تھے۔ شاہ کی ستم رانیوں اور جبری جلاوطنی کا شکار خمینی' لوگوں کے ضمیر اور پرستش کی علامت تھا۔ خمینی کی حیثیت کی تباہی دراصل ایک مقدس شے کی تباہی' ظلم اور ذلت کے شکار لوگوں کی امیدوں کے خاتمے کے مترادف تھی۔ اس اخباری مضمون کی اشاعت کا یہی منشا تھا۔"

"خوف ایک غارت گر اور حریص جانور ہے جو ہمارے اندر بستا ہے۔ وہ ہمیں لمحے بھر کو یہ بات بھولنے نہیں دیتا کہ وہ موجود ہے۔ وہ ہمیں کھاتا رہتا ہے اور ہماری آنتوں کو مروڑتا رہتا ہے۔ اسے ہر وقت خوراک درکار ہوتی ہے اور ہم اسے نفیس ترین غذا مہیا کرتے رہتے ہیں۔ اس کی مرغوب خوراک میں مایوس کن گفتگو' بری خبریں' مضطرب خیالات اور بھیانک خواب شامل ہیں۔ بات چیت' بدشگونیوں اور خیالوں کے ہزاروں اجزا میں سے ہم ہولناک ترین اجزا منتخب کرتے ہیں۔ جو خوف کو سب سے زیادہ پسند آئیں۔ ہم اس عفریت کو مطمئن رکھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔"

"آمر انسان کو ایک رذیل مخلوق خیال کرتا ہے۔ کیوں کہ رذیل لوگ ہی اس کے دربار میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کے اردگرد کے ماحول کو آباد کرتے ہیں۔"

"شاہ اپنے تکبر کا شکار ہوا۔ وہ اس لیے بھی ختم ہو گیا کہ اپنے ملک سے ناواقف تھا۔ اس کی تمام زندگی محل میں گزری تھی۔ اس کا کبھی کبھار محل سے باہر نکلنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی شخص گرم کمرے سے' جما دینے والی سردی میں لمحے بھر کو سر باہر نکال کر دیکھے اور پھر اندر کرلے۔ مگر تمام محلوں کی زندگی تباہ کن اور مسخ شدہ قوانین کے ایک ہی نظام کی پابند ہوتی ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے' ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ آپ چاہیں تو دس نئے محل بنالیں' جوں ہی وہ بن کر تیار ہوں گے انہیں قوانین کی پابندی شروع کردیں گے جن کی پابندی پانچ ہزار سال پہلے بنے ہوئے محل کیا کرتے تھے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ محل کو ایک عارضی قیام گاہ خیال کیا جائے' بلکہ بس یا کوئی اور سواری سمجھا جائے۔ آپ اس میں سوار ہوتے ہیں' کچھ فاصلہ طے کرتے ہیں اور اتر جاتے ہیں۔ اور یہ خیال رکھنا بہت

ضروری ہے کہ درست بس اسٹاپ کہیں نکل نہ جائے' آپ کہیں آگے نہ پہنچ جائیں۔"

"شاہ نے ایسا نظام تخلیق کیا جو صرف اپنی حفاظت کرنے پر قادر تھا لیکن لوگوں کو مطمئن نہیں کرسکتا تھا اس قسم کے نظام کی بنیاد حکمران کی اپنی رعایا کی بابت تحقیر پر استوار ہوتی ہے اور اس کے اس یقین پر کہ جاہل قوم کو ہمیشہ وعدوں سے بہلایا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک ایرانی کہاوت ہے کہ وعدوں کی اہمیت انہیں کے لیے ہوتی ہے جو وعدوں پر یقین کرتے ہوں۔"

"خمینی نے جلاوطنی سے لوٹنے پر قم جانے سے پہلے تہران میں مختصر قیام کیا۔ ہر شخص اس کو دیکھنا چاہتا تھا' لاکھوں لوگ اس سے ہاتھ ملانے کی تمنا رکھتے تھے۔ آخر ان سب نے اس کی واپسی کے لیے جنگ لڑی تھی انہوں نے اپنا خون بہایا تھا۔ ہوا میں ہر طرف جوش و خروش اور مسرت تھی۔ لوگ چلتے ہوئے ایک دوسرے کی پیٹھ پر ہاتھ مارتے تھے' جیسے کہہ رہے ہوں دیکھا ہم سب کچھ کرسکتے ہیں!"

"انقلابوں کے بارے میں تمام کتابوں کے پہلے باب زوال آمادہ حاکمیت کی شکستگی یا لوگوں کے مصائب اور ان پر ہونے والے مظالم کو بیان کرتے ہیں۔ دراصل ان کتابوں کا آغاز ایک نفسیاتی باب سے ہونا چاہیے' جس میں دکھایا جائے کہ کس طرح ایک دہشت زدہ' ستایا ہوا شخص اچانک دہشت کے اس طلسم کو توڑ ڈالتا ہے' خوف سے آزاد ہوجاتا ہے۔ یہ غیر معمولی عمل' کسی صدمے یا پاکیزگی کی مختصر سی رسم کی طرح' اکثر لمحے بھر پر محیط ہوتا ہے۔ آدمی اپنے خوف کو نکال پھینکتا ہے اور آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی انقلاب نہیں آسکتا۔"

"شاہ نے سوچا کہ شہری اور صنعتی ثقافت کا قیام ترقی کی کلید ہے' مگر یہ غلط خیال تھا۔ ترقی کی کلید گاؤں ہے۔ جب تک گاؤں پس ماندہ ہیں' ملک پس ماندہ رہے گا۔ خواہ اس میں کارخانوں کی تعداد پانچ ہزار ہی کیوں نہ ہو۔ جب تک شہر منتقل ہونے والا بیٹا ہر کچھ سال بعد اپنے آبائی گاؤں کا یوں دورہ کرتا رہے گا' جیسے وہ کوئی دور افتادہ اجنبی مقام ہو' اس وقت تک اس کی قوم جدید نہیں ہوسکے گی۔

"جب کبھی مجھے اپنا دل بہلانے کی خواہش ہوتی ہے' میں خیابان فردوسی چلا جاتا ہوں۔ جہاں آقائے فردوسی کی قالینوں کی دکان ہے۔ یہ سب ذوق کا معاملہ ہے' وہ مجھ سے کہتا ہے" آقا' اصل بات ہے باذوق ہونا اگر کچھ زیادہ انسانوں کا ذوق کچھ زیادہ ترقی یافتہ ہوتا تو یہ دنیا اور طرح ہوتی۔ جھوٹ' فریب' چوری' مخبری' ان سب ہولناکیوں میں اسے ایک ہی چیز مشترک دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب کام وہ لوگ کرتے ہیں جو ذوق سے محروم ہوں۔" اسے یقین ہے کہ اس کی قوم ہر چیز سہارے گی اور یہ کہ حسن کو ختم نہیں کیا جاسکے گا کہ جس چیز نے فارس کے لوگوں کو پچھلے ڈھائی ہزار سال سے اپنے رنگ پر قائم رکھا ہے' جس چیز کی بدولت' تمام جنگوں' بیرونی حملہ آوروں اور فاتحوں کے باوجود ہم اپنا آپ رہ سکے ہیں وہ ہماری مادی نہیں بلکہ روحانی قوت ہے۔ ہماری شاعری' نہ کہ ٹیکنالوجی۔ ہمارا مذہب نہ کہ کارخانے۔ ہم نے دنیا کو کیا دیا ہے؟ شاعری' میناتور اور قالین۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ سب پیداواری نقطہ نظر سے بے مصرف چیزیں ہیں۔ لیکن ایسی ہی چیزوں کے ذریعے سے ہم اپنے اصل وجود کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم نے دنیا کو یہ تحیر خیز' منفرد بے مصرفیت دی ہے۔ ہم نے دنیا کو جو کچھ دیا۔ اس سے زندگی کم دشوار نہیں ہو گئی' بس تھوڑی سی آراستہ ہو گئی ہے۔"

34 سال پہلے کے حالات پر لکھی یہ تحریر حیرت انگیز طور پر ہمارے آج کے حالات کا آئینہ ہے۔

پانی سر تک آپہنچا ہے کیا ہمارے حکمران اور مقتدر ادارے پانی کے سر سے اونچا ہونے کا انتظار کررہے ہیں؟

کیا کوئی انقلاب ہمارے ہاں بھی دستک دے رہا ہے؟ اس سوال پر بہت سارے لوگوں کو غور کرنا چاہیے۔

عباسی خاندان کا گیارہواں خلیفہ المستنصر باللہ اپنے والد المتوکل علی اللہ (دسویں خلیفہ) کو قتل کرکے 247 ہجری میں مسند خلافت پر بیٹھا۔ چند دن کے بعد اس نے حکم دیا کہ میرے دربار کو اس طرح سجایا جائے کہ اس میں سونے کے تاروں سے منڈھے ہوئے ریشمی قالین بچھائے جائیں اور پھر سب وزیر امیر میرے سامنے حاضر ہوں' چنانچہ دربار میں اس قسم کے قیمتی قالین بچھا دیے گئے۔ ان میں سے ایک قالین کے درمیان ایک بڑا سا دائرہ تھا جس میں تاج پہنے ہوئے ایک شہسوار کی تصویر تھی اور دائرے کے گرد فارسی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ جب مستنصر باللہ دربار میں آکر بیٹھا اور سب امیر وزیر بھی دربار میں آگئے تو خلیفہ کی نظر تصویر والے قالین پر پڑی۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک درباری امیر سے پوچھا' اس دائرے کے گرد کیا لکھا ہے؟" یہ عبارت پڑھنے کے لیے کہا' لیکن وہ امیر اسے نہ پڑھ سکا۔ پھر اس نے دربار کے تمام وزیروں اور امیروں سے یہ عبارت پڑھنے کے لیے کہا' لیکن کوئی بھی اسے نہ پڑھ سکا۔ اب خلیفہ نے ایک خادم کو حکم دیا کہ کسی فارسی زبان جاننے والے کو بلا لاؤ۔

خادم دوڑا گیا اور ایسے ایک آدمی کو بلا لایا۔ خلیفہ نے اسے یہ عبارت پڑھنے کے لیے کہا۔ اس نے یہ عبارت پڑھی تو اس کا رنگ اڑ گیا اور وہ خاموش کھڑا رہا۔ خلیفہ نے پوچھا۔

"کیا لکھا ہے؟"

اس نے کہا۔ "امیر المومنین! یہ ایرانیوں کی حماقت ہے۔"

خلیفہ نے کہا۔ "بتاؤ تو سہی کہ کیا لکھا ہے۔"

وہ بولا۔ "امیر المومنین! یہ بے معنی عبارت ہے۔" (اس کا کچھ مطلب نہیں) خلیفہ کو اس شخص کی ٹال مٹول پر سخت غصہ آیا اور اس نے اس کو دھمکی دی کہ "اس عبارت کا جو بھی مطلب ہے' بیان کرو' ورنہ سخت سزا دوں گا۔"

اب اس شخص نے کہا کہ اس عبارت کے معنی یہ ہیں کہ۔

"میں شیرویہ بن کسریٰ بن ہرمز ہوں' میں نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا اور اس کے بعد چھ ماہ سے زیادہ میری سلطنت قائم نہ رہ سکی۔"

یہ سن کر مستنصر باللہ کا چہرہ زرد ہو گیا اور وہ اٹھ کر محل کے اندر چلا گیا۔ اللہ کی قدرت چھ مہینے کے بعد وہ بھی مر گیا۔ یوں شیرویہ اور اس کا انجام ایک جیسا ہوا۔

نقاب پوش مجاہد

بنو امیہ کے پانچویں خلیفہ عبدالملک کے ایک بیٹے کا نام مسلمہ تھا۔ وہ بڑا بہادر اور لائق نوجوان تھا اور نہ صرف ہر قسم کے ہتھیار چلانے کا ماہر تھا بلکہ دشمنوں سے لڑنے کا فن بھی خوب جانتا تھا۔ اسی لیے والد (عبدالملک) نے اسے اپنی فوج کے ایک حصے کا سپہ سالار بنا دیا تھا۔ وہ ہر سال سردی کے موسم میں پڑوس کے رومی علاقوں پر فوج کشی کیا کرتا تھا۔ (کیونکہ روم کا بادشاہ اسلامی حکومت کا دشمن تھا) اس طرح اس نے متعدد رومی قلعے فتح کرلیے تھے۔

ایک دفعہ مسلمہ بن عبدالملک نے ایک رومی قلعے کا محاصرہ کیا لیکن کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود قلعہ فتح ہونے میں نہ آیا۔ ایک دن مسلمہ فوج کے ایک خاص دستے کو ساتھ لے کر قلعے پر ایک زوردار حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ قلعہ میں موجود رومی فوج نے اس دستے پر تیروں اور آگ کے گولوں کی بارش کر دی جس سے اس کے لیے آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔

اس وقت لوگوں نے دیکھا کہ ایک مجاہد جان ہتھیلی پر رکھ کر تیروں اور آگ کی بارش میں دیوانہ وار قلعے کی طرف بڑھ رہا ہے' یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ اس مجاہد کو کسی طرح قلعے کی دیوار کے ایک کمزور مقام کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جان کی بازی لگا کر اس مقام تک پہنچ گیا اور دیوار میں نقب لگائی یہاں تک کہ اس میں شگاف ہو گیا۔ اس اثنا میں حملہ کرنے والا فوجی دستہ بھی ڈھالوں کی آڑ لیتا' ہلہ مار کر قلعے کی دیوار کے نیچے پہنچ گیا۔ چند بہادروں نے اس شگاف سے قلعے کے اندر داخل ہو کر اس کا دروازہ کھول دیا۔ اب ساری فوج تکبیر کے نعرے لگاتی قلعے میں داخل ہو گئی۔ رومیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

اب سارے لوگوں کی نگاہیں اس بہادر مجاہد کو تلاش کر رہی تھیں جس نے جان پر کھیل کر قلعے کی دیوار میں نقب لگائی تھی لیکن کوئی اسے پہچانتا نہ تھا۔ مسلمہ نے پورے لشکر کو جمع کیا اور اس کے سامنے اعلان کیا کہ جس مجاہد نے قلعے کی دیوار میں نقب لگائی' وہ سامنے آئے۔ لیکن اعلان کے جواب میں پورے لشکر پر سناٹا چھایا رہا اور کوئی سامنے نہ آیا۔ اب مسلمہ نے بلند آواز سے کہا۔

"میں اس مجاہد کو اس کے رب کی قسم دیتا ہوں کہ سامنے آجائے۔"

اچانک فوج میں سے ایک نقاب پوش (چہرے کو کپڑے سے ڈھانپے ہوئے) مجاہد آگے بڑھا۔ اس کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ وہ مسلمہ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کہا۔

"اے امیر! نقب میں نے لگائی۔ اگر آپ مجھے رب کی قسم نہ دیتے تو میں کبھی اپنے آپ کو ظاہر نہ کرتا۔ اب میں آپ کو رب کی قسم دیتا ہوں کہ مجھ سے میرا نام نہ پوچھیے گا اور اگر آپ کو معلوم بھی ہو جائے تو کسی کو نہ بتائیے گا کیونکہ میں نے جو کچھ کیا' اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کیا۔ میں اس کا صلہ اللہ تعالیٰ ہی سے چاہتا ہوں اور کسی قسم کے انعام کی مجھے خواہش نہیں ہے۔"

مسلمہ اب خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ جب دعا کرتا تو کہتا۔

"اے اللہ! مجھے نقب لگانے والے اس مجاہد کے ساتھ کر دیجیے گا۔"

مجاہد سپہ سالار کی دعا اور قسم

پہلی صدی ہجری میں قتیبہ بن مسلم باہلی مسلمانوں کے بہت بڑے جرنیل گزرے ہیں۔ وہ ایک فوجی گھرانے میں 49 ہجری میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد "مسلم" عرب قبیلے "بنو باہلہ" کے سردار اور ایک فوجی افسر تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کا بڑا اچھا انتظام کیا۔ اس کے نتیجے میں قتیبہ کو نہ صرف علم کی دولت مل گئی۔ بلکہ ہر قسم کے ہتھیار استعمال کرنے میں بھی مہارت حاصل ہو گئی' یہاں تک کہ وہ اپنے قبیلے کے ان نیک بہادر اور نڈر نوجوانوں میں شمار ہونے لگے جن کو اپنے دین سے سچی محبت تھی۔

اس زمانے میں اسلامی دنیا کا حکمران اموی خلیفہ ولید بن الملک تھا۔ اُموی کا مطلب ہے "بنو امیہ" سے تعلق رکھنے والا۔ بنو امیہ قبیلہ قریش ہی کی ایک شاخ تھا۔ ولید کا دور حکومت (86ھ سے 96ھ تک) اسلامی تاریخ کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے کیونکہ اس زمانے میں مسلمانوں نے کئی ملک فتح کرلیے اور اسلامی حکومت کی سرحدیں چین سے جا ملیں۔ نوجوان قتیبہ بن مسلم بھی اپنے والد کی طرح فوج میں بھرتی ہو گئے۔ جلد ہی وہ ایک سچے مسلمان اور نڈر سپاہی کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ انہوں نے حکومت کے باغیوں کے خلاف کئی لڑائیوں میں ایسی بہادری دکھائی کہ ان کی دلیری اور بے خوفی کی دھاک بیٹھ گئی۔ ان کی شجاعت اور قابلیت کو دیکھ کر خلیفہ نے انہیں خراسان کا گورنر مقرر کر دیا۔

خراسان کا گورنر مقرر ہونے کے بعد قتیبہ نے وسط ایشیا کے کئی ملکوں بخارا' خوارزم' طخارستان' ترکستان وغیرہ کو فتح کرکے ان پر اسلام کا جھنڈا لہرا دیا پھر آگے بڑھ کر کاشغر کو فتح کرلیا اور یوں چین کی سرزمین میں داخل ہو گئے۔ قتیبہ نے اپنی فتوحات کا آغاز بخارا کی طرف پیش قدمی کرنے

سے کیا۔ یہ علاقہ اس وقت بت پرستوں کا گڑھ تھا۔ اسلامی لشکر خراسان سے بخارا کی طرف بڑھا تو راستے میں دریائے جیحوں نے اس کو روک لیا' کیونکہ اسلامی لشکر کی یلغار کی خبر سن کر دشمن تمام کشتیاں دوسرے کنارے کی طرف لے گیا تھا۔ دریا بڑا گہرا تھا۔ اس وقت سپہ سالار قتیبہ نے دو رکعت نماز پڑھی اور پھر بڑی عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کی۔

"اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں تیرے دین کو سربلند کرنے کی خاطر جہاد کر رہا ہوں' اس لیے مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس دریا میں ڈوبنے سے بچانا۔ اگر میری یا میرے ساتھیوں کی نیت کچھ اور ہوتی تو بلاشبہ ہم سب اس دریا میں غرق کیے جانے کے لائق تھے۔"

یہ دعا مانگ کر قتیبہ نے اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور ان کے ساتھ ہی سارا لشکر دریا میں اتر گیا۔ اللہ کی قدرت سب لوگ اس طرح دریا پار کر گئے جیسے خشک زمین پر چل رہے ہوں۔

اس کے بعد جو کچھ پیش آیا' وہ لمبی داستان ہے۔ مختصر یہ کہ قتیبہ وسط ایشیا کے ملک پر ملک فتح کرتے چین جیسے بہت بڑے ملک میں جا داخل ہوئے اور کاشغر پر قبضہ کر کے عارضی طور پر وہاں ڈیرا ڈال دیا۔ اس وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں اور چینیوں کے درمیان خوفناک جنگ ہو گی لیکن چین کے بادشاہوں نے (جسے خاقان چین کہا جاتا تھا) عقل مندی سے کام لیا اور اس نے قتیبہ کو پیغام بھیجا کہ اپنے کسی معتبر آدمی کو میرے پاس بھیجو تاکہ میں اس سے معلوم کروں کہ تم لوگ میرے ملک میں کیوں داخل ہوئے اور تمہاری غرض کیا ہے۔ خاقان چین کا پیغام ملنے پر قتیبہ نے ہبیرہ بن مشرج کلابی کو دس ایسے دانا مجاہدوں کے ساتھ خاقان کے پاس بھیجا جو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کر سکتے تھے۔

اس وفد کی خاقان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں' لیکن کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ آخری ملاقات میں خاقان نے ہبیرہ سے کہا۔

"تم سب سے دانا آدمی معلوم ہوتے ہو' جاؤ! اپنے سپہ سالار سے کہہ دو کہ اگر خیر چاہتے ہو تو اس ملک سے نکل جاؤ۔ میرے پاس اتنے بڑے بڑے لشکر ہیں کہ تمہارے لشکر کی ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں۔ میرے یہ لشکر لمحہ بھر میں تمہارے چھوٹے سے لشکر کو کچل ڈالیں گے۔"

ہبیرہ نے تن کر جواب دیا۔

"اے بادشاہ! اس لشکر کو چھوٹا کیسے کہا جا سکتا ہے جس کا ایک سرا چین میں ہو اور دوسرا ملک شام میں اور یہ جو ہمیں کچلنے کی دھمکی دی گئی ہے تو ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ موت اپنے وقت سے پہلے کبھی نہیں آتی۔ اگر یہ جنگ کے میدان میں آئے تو ہم اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔"

ہبیرہ کے اس دلیرانہ جواب نے بادشاہ کو حیران کر دیا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہارا سپہ سالار کن شرطوں پر صلح کر سکتا ہے؟"

"وہ قسم کھا چکا ہے کہ جب تک تمہاری زمین کو روند نہ ڈالے اور تم سے خراج وصول نہ کر لے' واپس نہیں جائے گا۔"

خاقان کو معلوم ہو چکا تھا کہ یہ لوگ سارے وسط ایشیا کو زیر و زبر کر چکے ہیں اور ان سے لڑنے کے بجائے صلح کر لینا ہی بہتر ہے۔ اس نے کہا۔

"ہم تمہارے سپہ سالار کی قسم ابھی پوری کر دیتے ہیں۔"

پھر اس نے سونے کے چند قابوں (طشتوں) میں اپنی زمین کی مٹی بہت سا زر و مال اور قیمتی تحفے قتیبہ کے پاس روانہ کیے اور مسلمانوں سے صلح کی خواہش ظاہر کی۔ قتیبہ نے مٹی کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا اور تحفے وغیرہ قبول کر کے واپس اپنے ملک چلے گئے۔ اس سے پہلے چین کا بادشاہ مسلمانوں کے دشمن ملکوں کی مدد کر چکا تھا۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ایسا کرنا کتنا خطرناک ہے' چنانچہ مسلمانوں سے صلح کر کے اس نے بتا دیا کہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا اور یہی قتیبہ کا مقصد تھا جو پورا ہو گیا تھا۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کوفتے

اجزا :

روکھا قیمہ	آدھا کلو
خشخاش	2 کھانے کے چمچے
بھنے چنے	2 کھانے کے چمچے
سرخ مرچ	1 کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ	4 عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
لہسن ادرک پیسٹ	2 چائے کے چمچے
پیاز	3 عدد
پسا دھنیا	1 کھانے کا چمچہ
دہی	1 کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب :

قیمہ کو چوپر میں خشخاش ' بھنے چنے ' سرخ مرچ ' نمک ' گرم مسالا ' ہرا دھنیا ' ہری مرچ ' ادرک اور ایک عدد پیاز کے ساتھ پیس کر کوفتے بنالیں۔

ایک دیگچی میں تیل گرم کرکے اس میں بقیہ پیاز سنہری کرکے نکالیں اور دہی ملا کر پیس لیں۔ اب تیل میں نمک ' سرخ مرچ ' پسا دھنیا ' لہسن ' ادرک پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ ساتھ ہی کوفتے ڈال کر کپڑے سے پکڑ کر دیگچی ہلائیں۔ دو کپ پانی ڈال کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔ جب تیل الگ ہو جائے تو سمجھ جائیں کوفتے تیار ہیں۔

چکن بروسٹ

اجزا :

چکن	1 کلو
ادرک لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
لیموں کا رس	1 کھانے کا چمچہ
چلی سوس	2 کھانے کے چمچے
انڈا	1 عدد
پسی سیاہ مرچ	1 چائے کا چمچہ
میدہ	آدھا کپ
کارن فلور	2 کھانے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

چکن کے بڑے بڑے ٹکڑوں میں لہسن ادرک پیسٹ ' نمک ' لیموں کا رس ' چلی سوس ' انڈا ' پسی سیاہ مرچ ملا کر ایک گھنٹہ رکھ دیں۔

ایک الگ برتن میں میدہ ' کارن فلور اور بیکنگ پاؤڈر کو ملالیں چکن کو اس آمیزے میں رول کرکے ڈیپ فرائی کریں۔ مزے دار چکن روسٹ تیار ہے۔

رام پوری یخنی پلاؤ

اجزا :

چاول	1 کلو
گوشت	1 کلو
پیاز	2 عدد
دہی	1 کپ
ادرک ' لہسن پیسٹ	2 کھانے کے چمچے
زیرہ	1 چائے کا چمچہ
کالی مرچیں	10 عدد
لونگ	10 عدد
بڑی الائچی	8 عدد
تیزپات	2 پتے
کالا زیرہ	1 چائے کا چمچہ
چھوٹی الائچی	6 عدد
تیل	ڈیڑھ کپ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

گوشت کو دھو کر ایک پتیلی میں پانی اور نمک ڈال کر گلنے کے لیے رکھ دیں۔ سوتی سفید کپڑے میں کالا زیرہ ' لونگ ' چھوٹی الائچی ' بڑی الائچی ڈال کر پوٹلی بنا کر پتیلی میں ڈال دیں۔ پانی کو اچھی طرح ابلنے دیں تاکہ گوشت گل جائے اور گرم مسالے کا رس بھی نکل آئے۔

دوسری پتیلی میں تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز باریک کاٹ کر سرخ کرلیں۔ اس میں زیرہ ' کالی مرچیں ' لونگ ' بڑی الائچی ' تیزپات ' ادرک لہسن پیسٹ اور دہی ڈال کر بھونیں۔ گلا ہوا گوشت یخنی سے نکال کر اس میں ڈالیں پھر دھلے ہوئے چاول بھی ڈال دیں۔ اوپر سے حسب ضرورت یخنی ڈال کر خوب پکائیں پانی تقریباً" خشک ہو جائے تو دم لگا دیں۔ رام پوری یخنی پلاؤ تیار ہے۔

انڈوں کی پڈنگ

اجزا :

انڈے	3 عدد
دودھ	آدھا کلو
چینی	1 پاؤ

ترکیب :

انڈوں کی سفیدی چینی ملا کر اتنا پھینٹیں کہ آدھے گھنٹے تک اس کا جھاگ بیٹھ نہ سکے اور چینی کا دانہ باقی نہ رہے۔ زردی کو الگ پھینٹیں اور آہستہ آہستہ دودھ بھی شامل کرتی جائیں (دودھ ابلا ہوا ہو) زردی اور سفیدی کو الگ الگ پھینٹنے کے بعد ملا کر ایک بار خوب پھینٹیں۔ ایک برتن میں ایک کھانے کا چمچہ چینی گرم کریں۔ یہاں تک کہ وہ پگھل کر براؤن ہو جائے ' پھر اسے گرم حالت میں سانچے میں پھیلا دیں۔ اس کے اوپر دودھ انڈے کا آمیزہ ڈال کر سانچے کا منہ بند کردیں ایک بڑی پتیلی میں پانی گرم کریں ' اور اس میں سانچہ رکھ دیں۔ پانی سانچے سے نیچے تک ہو۔ پتیلی پر ڈھکن رکھ کر مدھم آنچ پر آدھا گھنٹہ پکنے دیں۔ تھوڑی دیر بعد چیک کریں۔ کچی لگے تو چند منٹ اور پکائیں۔ جب پک جائے تو اتار کر ٹھنڈا کرلیں۔ کسی پلیٹ میں الٹ دیں۔ اب دو کھانے کے چمچے چینی پھر گرم کرکے براؤن سا شیرہ بنا کر گرم گرم اس پر الٹ دیں۔ تھوڑی دیر فریج میں رکھ کر جمنے دیں پھر پیش کریں۔

ادارہ

موٹاپا شخصیت کی خوب صورتی کو مجروح کرتا ہے ڈاکٹر اسے کئی بیماریوں کا باعث بھی قرار دیتے ہیں۔ اکثر خواتین اپنے تیزی سے بڑھتے ہوئے وزن سے پریشان رہتی ہیں۔ موٹاپے کی کئی وجوہات ہیں مثلاً" ضرورت سے زائد خوراک لینا' مرغن غذاؤں کا زیادہ استعمال اور کوئی محنت طلب کام نہ کرنا وغیرہ۔

مناسب مقدار میں متوازن غذا کے استعمال اور باقاعدہ ورزش کے ذریعے اس مسئلے پر خاصی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔ ہم آپ کو کچھ ورزشیں بتا رہے ہیں۔ ان ورزشوں کو اپنا معمول بنا کر آپ کچھ ہی عرصے میں فالتو چربی اور زائد وزن سے نجات حاصل کرسکتی ہیں تاہم یاد رکھیے! کوئی بھی ورزش کرنے سے پہلے کچھ دیر آہستہ آہستہ دونوں کندھے ہلائیں تاکہ آپ کا جسم ورزش کے لیے تیار ہوجائے۔

پیٹ کم کرنے کی ورزش

1۔ بڑھے ہوئے پیٹ کو کم کرنے کے لیے فرش یا بستر پر سیدھی لیٹ جائیں۔ دونوں بازو [illegible] ہاتھ ناف پر رکھ لیں' پھر دونوں پیر جوڑ کر تقریباً" چھ انچ تک اوپر اٹھائیں۔ بیس تک گنتی گن کر پیر واپس نیچے کرلیں۔ دو تین گہرے سانس لے کر یہی عمل دہرائیں۔ جب یہ ورزش کرتے ہوئے کچھ دن ہوجائیں تو گنتی بڑھا دیں' یہاں تک کہ گنتی بیس سے سو تک پہنچ جائے۔ یہ ورزش پیٹ کم کرنے کے ساتھ ساتھ کمر کے عضلات کو بھی مضبوط کرتی ہے۔

2 صبح کے وقت ناشتے سے قبل فرش پر پیٹ کے بل لیٹ جائیں۔ دونوں پاؤں اوپر اٹھا کر ایسے حرکت دیں جیسے آپ سائیکل چلا رہی ہوں۔ چند ہی دنوں میں آپ نمایاں فرق محسوس کریں گی۔

کمر اور کولہوں کے لیے

1 کمر اور کولہوں کو متناسب بنانے کے لیے دونوں ہاتھ فرش پر رکھ کر بیٹھ جائیں۔ پھر دونوں پاؤں سیدھے پھیلالیں۔ بائیں بازو کو اٹھا کر دائیں بازو کے ساتھ رکھ لیں اور سر کو سیدھا رکھتے ہوئے جسم کو دائیں طرف جھکائیں' لیکن خیال رہے کہ کہنیاں نہ مڑنے پائیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح بیٹھی رہیں۔ پھر سیدھی ہوجائیں دو تین گہرے سانس لے کر یہی عمل دوبارہ کریں لیکن اس مرتبہ دایاں بازو اٹھا کر بائیں بازو کے ساتھ رکھیں اور جسم کو بائیں طرف جھکائیں۔ شروع میں یہ عمل دس مرتبہ کریں۔ (پانچ مرتبہ دائیں اور پانچ مرتبہ بائیں) بعد میں عمل کی تعداد بڑھاتی جائیں۔

2 فرش یا بستر پر سیدھی لیٹ جائیں۔ اپنا سر دھیرے دھیرے اٹھائیں' پھر گردن بھی اسی طرح اٹھائیں۔ تاہم دونوں ہاتھ جسم کے ساتھ فرش یا بستر پر سیدھے رہنے چاہئیں۔

آہستہ آہستہ کمر کی مدد سے اتنا اٹھ جائیں کہ آپ اپنے پنجوں یا ایڑیوں کو آسانی سے دیکھ سکیں۔ اس حالت میں رک جائیں اور دس تک گنتی گنیں۔ پھر دوبارہ آہستہ آہستہ واپس لیٹ جائیں۔ یہ عمل دو مرتبہ دہرائیں۔ اس عمل میں بھی گنتی کی تعداد بتدریج بڑھاتی جائیں' یہاں تک کہ پچاس تک پہنچ جائے۔

3 فرش پر پیٹ کے بل لیٹ جائیں۔ پیشانی کو فرش پر ٹکالیں۔ ہاتھوں کو رانوں کے ساتھ لگائے رکھیں۔ پھر آہستہ آہستہ سر کو اوپر کی طرف اٹھائیں۔ کمر پر زور دے کر سر اور گردن کو جتنا اوپر لے جاسکتی ہیں' لے جائیں۔ ایک منٹ کے لیے ٹھہر جائیں اور سر کو دوبارہ آہستہ آہستہ نیچے لے آئیں۔